خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماهنامه

سسپنس ڈائجسٹ

نومبر 2020ء

بانی
معراج رسول



صفحات 290
قیمت 100 روپے







مدیراعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ — مینا احمد
نائب مدیر — [illegible] حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333 3285269

جلد49 • شمارہ 11 نومبر 2020 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور G-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



انشائیہ

جون ایلیا

نجات

بوڑھے قدموں سے چل کر میں بچپن کی طرف گیا۔ انجام کی طرف جاتے ہوئے میں نے آغاز کا رخ کیا۔ میری تھکی ہوئی پنڈلیاں، میرے ناقص اور ناہنجار وجود کو بستیوں اور بازاروں میں، کوچوں اور کلبۂ احزان میں گھسیٹتی پھریں۔

میں سودائی اپنی گلیوں میں چلتے چلتے تھک گیا۔ میں غوغائی اپنے جنگلوں میں چیختے چیختے ہار گیا۔

میں نے راحت کو پکارا اور رنج کمایا۔

میں نے آرام کو آواز دی، آلام میرے حصے میں آیا۔

وہ تاریخ میں نے جس میں پہلا سانس لیا، وہ جغرافیہ میں جس میں عرصۂ دراز سے رہتا ہوں، انہوں نے مجھے مایوس کیا، مغموم کیا۔

تاریخ اور جغرافیے کے حوالے سے میرے چاروں طرف وحشتوں کا بہاؤ ہے اور خبروں کا اندھیاؤ ہے۔ افسوس کہ تاریخ نے حکمت سے ہاتھ اٹھایا۔ صد افسوس کہ جغرافیے نے دانائی فراموش کی۔

اچھے دنوں کی نوید دینے والے کہاں ہیں؟ کہاں چلے گئے؟

سب ہی کے دلوں سے خوش امیدی کوچ کر گئی کیا؟

کور چشموں اور بد باطنوں کو، احمقوں اور احدیوں کو نوشتۂ دیوار سنانے والا کوئی نہیں رہا کیا؟

وہ آنکھیں بستیوں سے کوچ کر گئیں کیا جو اس تحریر کو پڑھ سکیں، جسے دانائی نے اپنی انگلیوں سے لکھا اور جسے حکمت نے اپنے ہاتھ سے نصب کیا؟

لوگو! کیا تمہیں یاد نہیں کہ حکمت زور سے پکارتی ہے اور دانائی اپنی آواز بلند کرتی ہے ”وہ راہ میں اونچے مقاموں کی چوٹیوں اور رستوں کے بیچ میں کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل کے پاس یعنی دروازوں میں داخل ہونے کی جگہ زور سے پکارتی ہے۔“

وہ کہتی ہے ”اے آدمیو! میں تم کو بلاتی ہوں اور بنی آدم کے ساتھ میری بات ہے۔ اے نادانو! دانائی کو سیکھو۔ اے جاہلو! فہمید کو پہچانو۔ سنو! کیونکہ میں بڑی باتیں بولوں گی اور میرے لب درست باتوں کے لیے کھلیں گے کیونکہ میرا منہ حق بیان کرتا ہے اور میرے لب شرارت سے نفرت رکھتے ہیں۔ میرے منہ کی سب باتیں صداقت ہیں، ان میں کچھ ترچھا اور ٹیڑھا نہیں۔ وہ سمجھنے والے کے نزدیک سب کی سب درست ہیں اور علم رکھنے والے کے نزدیک راست ہیں۔ میری تادیب کو قبول کرو نہ کہ چاندی کو اور علم کو کندن پر فوقیت دو کیونکہ حکمت لعلوں سے بہتر ہے اور کوئی دل پسند چیز اس کے برابر نہیں۔

میں حکمت، مشورت کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں علم اور بصیرت رکھتی ہوں۔ ہر غرور اور شیخی اور بدراہی اور ضدی زبان والے منہ سے مجھے نفرت ہے۔ مشورت اور مہارت میرے ساتھ ہیں۔ میں فہمید ہوں۔ توانائی میری ہے۔ سلاطین میرے ذریعے سے مسلط ہیں اور حاکم انصاف سے عدالت کرتے ہیں۔ امرا میرے ذریعے سے امارت کرتے ہیں اور رئیس زمین پر حکمران ہیں۔

میں ان کو پیار کرتی ہوں جو مجھ کو پیار کرتے ہیں اور جو میری تلاش کرتے ہیں وہ مجھے پالیں گے۔ دولت اور عزت اور پائیدار سرمایہ اور اقبال مندی میرے پاس ہیں۔ میرا پھل سونے اور کندن سے بہتر اور میرا حاصل نفیس چاندی سے افضل ہے، میں صداقت کی راہ میں اور عدل کے رستوں کے درمیان چلتی ہوں تاکہ ان کو جو مجھے پیار کرتے ہیں، اچھے مال کے وارث بناؤں اور ان کے خزانے بھر دوں۔

میں ازل سے نصب کی گئی...... قدیم سے...... یعنی اس سے پیشتر کہ زمین بنائی گئی۔ پس اے لوگو! میری سنو...... مبارک ہیں وہ جو میری راہوں کو مانتے ہیں۔ تادیب کو سنو اور دانش مند بنو اور اس سے انکار نہ کرو۔ مبارک ہے وہ انسان جو میری سنتا ہے۔

کہاں گئے وہ مبارک انسان جو حکمت کی مشورت سنیں؟ دانائی کے موتی چنیں! میری تاریخ، میرا جغرافیہ کیا بانجھ ہوئے؟ لوگو! دانائی کیوں نہیں سیکھتے؟ کیوں نہیں فہمید کو پہچانتے؟ کہ تمہاری اور میری اور آنے والوں کی نجات اسی میں ہے۔







محترم قارئین
السلام علیکم!

وقت کسی کا غلام نہیں...... اپنے معین کردہ رستوں پر خاموشی سے محوِ سفر رہتا ہے۔ اب دیکھیے کورونا کے شور میں سال کے گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا اور نومبر 2020ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں آ گیا۔ سرد موسم کی آمد ہو چکی ہے۔ ٹھنڈی راتوں میں گرم بستر میں خشک میوہ جات کے ساتھ اکثر مطالعہ بہت خوشگوار اور فرحت بخش محسوس ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں جشنِ عید میلاد النبی ﷺ مذہبی جوش و خروش اور عقیدت کے ساتھ منایا گیا۔ اگر چہ مہنگائی نے تمام امور کی طرح اس جشن کی خوبصورتی کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے مگر مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی نے اس کی رونقوں کو ماند نہیں ہونے دیا لیکن دوسری جانب فرانس گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کر کے جس عظیم گناہ کا مرتکب ہوا ہے، اس نے ہر مسلمان کے دل کو مجروح کر دیا ہے۔ فرانس کی اس زہریلی حرکت کی تمام عالمِ اسلام نے شدید مذمت کی ہے اور کی جانی بھی چاہیے جس نے مسلمانانِ عالم کو شدید ذہنی اذیت اور اضطراب سے دوچار کر دیا ہے۔ فرانسیسی مصنوعات کا بائیکاٹ قابلِ قدر اقدام ہے۔ نومبر کا مہینا ہمارے لیے تاریخی اعتبار سے ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ 9 نومبر شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا یومِ ولادت تمام پاکستانیوں کے لیے بہت اہم دن ہے۔ آپؒ نے تحریکِ پاکستان میں بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا نہ صرف بھرپور ساتھ دیا بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے پاکستانی قوم کو مستحکم نظریات سے بھی روشناس کرایا اور آپ کے خواب کی تعبیر کے حوالے سے آج ہم الحمدللہ اپنے ملک، اپنی زمین پر زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنا گھر ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے مگر آج کل بدقسمتی سے ہمارے ملک کی معاشی بدحالی نے پاکستانی عوام کو بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ آپس کی لڑائی نے پاکستانیوں کو مسلسل ذہنی اذیت میں ڈال دیا ہے۔ جہاں کورونا، بے روزگاری، غربت اور مہنگائی نے سب کی قوتِ خرید کو شدید متاثر کر دیا ہے۔ ایک جانب مہنگائی کا عذاب تو دوسری جانب اسٹریٹ کرائم کے نام پر ہراس منٹ پھیلائی جا رہی ہے۔ ڈکیتی کی وارداتوں میں مسلسل اضافہ اور مال کے ساتھ ساتھ قیمتی جانوں پر ظلم نے معاشرے کو مکمل طور پر خوف کی چادر میں لپیٹ لیا ہے اور اس کی ایک وجہ شاید آئے دن اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اضافہ بھی ہے جو رفتہ رفتہ عوام کی دسترس سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ معاشی ابتری کا خاتمہ اور عوام الناس کو ذہنی سکون عطا فرمائے۔ آسانیاں بانٹنے سے آسانیاں ملتی ہیں۔ مشکلات پیدا کرنے سے اپنی مشکلات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ آسان سا فارمولا آسانی سے سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔ اسے سمجھانے کے لیے قدرت کو کچھ وقت درکار ہوتا ہے...... بہرحال اچھے کی امید تو کسی بھی حال میں نہیں چھوڑنا چاہیے...... ہم نے بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ اب دیکھیے وقت کیسا رنگ دکھاتا ہے۔ ان ہی رنگ برنگی باتوں سے دل بہلاتے ہوئے اب ذرا کچھ سن گن لیتے ہیں اپنی محفل کی، جہاں کبھی شور بہت ہوتا ہے اور کبھی خاموشی راج کرتی ہے۔

✻ محمد زبیر ساگر کا صبر گوجرہ سے۔ ''اکتوبر کا شمارہ سسپنس میرے ہاتھوں میں ہے۔ ستمبر کے شمارے میں آپ نے میرا خط شائع کیا مگر کہانی موت کا فرشتہ شائع نہیں کی (وہ کمزور کہانی تھی مگر ہمت نہیں ہارنی، اچھی کہانی لکھ بھیجیے)۔ خیر صبر کر لیا میں نے۔ اکتوبر کا سسپنس بہت جلد آیا۔ ٹائٹل خوبصورت اور بہت ہی پیارا لگا۔ سسپنس جلدی شائع کرنے کا شکریہ۔ کہانیوں میں پہلی کہانی بے منزل مسافر بہت ہی شاندار و جاندار اسٹوری لکھی ہے۔ زویا اعجاز کے قلم میں جادو ہے۔ سلسلے وار کہانیاں ساشا اور شہ زور بہت ہی زبردست کہانیاں ہیں۔ دونوں اسٹوریز تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اسما قادری اور عمر عبداللہ بہت ہی اچھے رائٹر ہیں۔ آخری صفحات کی کہانی زندان اچھی کہانی لگی۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں اور سسپنس ڈائجسٹ کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں۔ اللہ اس رسالے کو بہت زیادہ ترقی دے۔ ہمیشہ یہ دعا میرے دل سے نکلتی ہے۔ آخری صفحات کے لیے کوئی لو اسٹوری کہانی بھی شائع کر دیجیے، مہربانی ہوگی۔ آخر میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں دن رات کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب اللہ پاک کے علم میں ہے، یہ جو آج ہمارے ملک میں سے کورونا وائرس جا نہیں رہا یہ کیوں نہیں جا رہا ہے، کیا بات ہے؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ سمجھا رہے ہیں کہ مجھ سے ڈر جاؤ، میرا عذاب بہت دردناک ہے اس لیے ہماری سختی سے پکڑ ہو رہی ہے۔ کیوں ہے ایسا؟ ہم جب جھوٹ بولتے ہیں تو نہیں ڈرتے، کسی پر ظلم کرتے ہیں تو نہیں ڈرتے، کسی غریب کا حق چھینتے ہیں تو نہیں ڈرتے، کسی کے ساتھ دھوکا فریب کرتے ہیں تو نہیں ڈرتے، نماز چھوڑتے ہیں تو نہیں ڈرتے، قرآن پاک نہیں پڑھتے تو نہیں ڈرتے، درود شریف نہیں پڑھتے تو نہیں ڈرتے، ماں باپ کا ادب نہیں کرتے تو نہیں ڈرتے۔ ہم سب آج اللہ پاک کی پکڑ میں ہیں۔ اگر ہم یہ سب چھوڑ دیں تو میرا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کوئی بیماری نہیں لگائے گا۔''



٭ریاض بٹ کی حسن ابدال سے تشریف آوری۔ ''اپنا پسندیدہ پرچہ ماہ اکتوبر 2020ء چھ اکتوبر کو بک اسٹال پر آیا تو لے لیا۔ پچھلے ماہ بیماری کی وجہ سے غیر حاضری ہوگئی۔ خیر یہ سب تو زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اگر بیماری نہ ہوتی تو صحت کی قدر کیسے ہوتی؟ (شکر ہے اللہ کا کہ آپ کو شفا ملی۔ واقعی بیماری نہ ہوتی تو صحت کی قدر کیسے ہوتی) ۔ سرورق کی حسینہ کو دیکھ کر لگا جیسے اسے کوئی غم نہ ہو۔ جون ایلیا کا انشائیہ ہمیشہ کی طرح دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ اس میں سمجھنے کے لیے ہیرے موتیوں جیسے لفظ ہیں۔ بہت خوب۔ بات وہی ہے اب جس کے دل میں آئے وہ پائے روشنی...... ہم نے جلا کے دل سرِ عام رکھ دیا۔ اس کے بعد قدم رکھا اپنی پسندیدہ محفل ''آپ کے خط'' میں۔ پہلا خط ہے شاہانہ سلطان کا۔ بہن کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ اتنا دلچسپ اور مدلل تبصرہ ہے کہ تعریف کیے بنا چارہ نہیں۔ چودھری محمد رفیق مہر کا قدرے مختصر سا خط بھی خوب ہے۔ میرا شائع شدہ شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ ناہید یوسف کا خط بھی محفل کی جان ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ محمد انور ندیم نے ماہ اگست کے شمارے پر تبصرہ لکھا ہے۔ آپ کے تبصرے بھی خوب ہوتے ہیں۔ ڈوب کر تبصرے لکھتے ہیں۔ ویل ڈن۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ بابر عباس، فضل عباس، شاید آپ سے غلطی ہوگئی...... میں کرسیٔ صدارت پر بیٹھا تھا نہ کہ کسی کھٹارا گاڑی میں، پھر آپ کو کھاریاں میں بیٹھے دھچکا کیسے لگ گیا؟ رازق بخش ذکی آہیر بھائی مجبوری کی بات دوسری ہے ورنہ آپ باقاعدگی سے آتے رہیں تو اچھا ہے۔ محترم رمضان پاشا پچھلے شماروں میں آنکھیں آپ کے خط کو ترستی ہی رہیں۔ آپ کو ریگولر محفل میں دیکھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ خدا آپ کو لمبی حیاتی دے اور اسی طرح آپ سے آدھی ملاقات ہوتی رہے...... اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ بے منزل مسافر بہت اچھی کہانی ہے۔ پالے خاں اور زلیخا کا کردار تاریخ کے اوراق پر بکھرے خون کی یاد دلاتا ہے...... زویا اعجاز نے کہانی کو بڑے اچھے طریقے سے لکھا۔ بہت خوب۔ اس کے بعد حسبِ معمول ملک صفدر حیات صاحب سے ملے۔ اس بار کہانی میں بہت سسپنس ہے۔ اس میں انسانی ہوس، لالچ اور جنسی بے راہ روی بدرجہ اتم موجود ہے۔ سوتیلے رشتے تو ویسے بھی دل مشکل سے ہی قبول کرتا ہے اور اگر ایسے رشتوں کو شرمناک حالت میں دیکھ لیا جائے تو نفرت، غصہ اور انتقام دو آتشہ بن جاتا ہے اور برف میں بھی آگ لگ جاتی ہے اور سب کچھ جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ بہرحال کہانی بہت عمدہ ہے...... ویل ڈن جناب حسام بٹ صاحب۔ امجد جاوید کی بے نام بھی اچھی کہانی ہے۔ بعض اوقات کچھ رشتے مجبوری کے تحت قبول کرنے پڑتے ہیں جو آگے جا کر دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ صبا مغل کی تحریر آتشیں سوال وہ نشتر ہیں جو بے حس اور مُردہ ضمیروں کے لیے تازیانے ہیں۔ بلال کے آتشیں سوال ہم جیسے غریب اور متوسط طبقے کے دل کی آواز ہیں۔ واقعی ہماری ضرورتیں تو وہی ہیں، جوتی ٹوٹی ہوئی ہے تو اسے موچی سے مرمت کروا کے پہن رہے ہیں۔ کپڑے رفو کروا کے تن ڈھانپ رہے ہیں۔ یہ مہنگائی کیوں ہوگئی ہے؟ یہ ایک انگارے جیسا سوال ہے...... بلال کو اپنے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ کیا آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں؟ اور کیا آپ نے اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اپنے آپ کو کولہو کا بیل بنایا ہوا ہے؟ غلام قادر کی منزل درمیانے درجے کی کہانی لگی۔ بہرحال پسند اپنی اپنی۔ لازوال محبت بھی مجھے پسند آئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی اس بار پھر نمبر لے گئیں۔ ایسی ایمان تازہ کرنے والی تحریریں شائع کرنے پر سسپنس کی مہربانی، باقی تحریریں بھی اچھی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں تمام اشعار بہت اچھے اور دل میں اتر جانے والے ہیں۔ خاص کر ناہید یوسف، محمد شہباز اکرم نوکی، محمد انور ندیم اور ناصر خان نے محفل لوٹ لی۔''

٭ناہید یوسف کی حاضری اسلام آباد سے۔ ''اکتوبر کا سسپنس ملا۔ ٹائٹل کچھ خاص نہ لگا۔ یعنی چہرے پر حقیقت کا گمان نہ ہوا، ورنہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹائٹل پر بھلا چہرہ دیکھ کر بعض دفعہ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے یہ چہرہ کہیں دیکھا ہے۔ خیر فہرست پر نگاہ دوڑائی۔ صبا مغل کا نام دیکھ کر آتشیں سوال پر پہنچ گئے۔ مہنگائی کے مارے غریب عوام کے حالاتِ زندگی کی خوب منظرکشی کی گئی۔ واقعی مہنگائی بڑھنے کے بھی کئی اسباب ہیں۔ اگر ہم سب مقدور بھر بھی اپنا حصہ ڈالیں تو بہت سے مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ انتہائی اثر پذیر کہانی تھی۔ صبا مغل واقعی داد کی مستحق ہیں۔ اس کے بعد پہنچے اسماجی کی شہ زور پر۔ کہانی جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے کہانی میں تیز رفتاری آتی جارہی ہے۔ یہی کہانی کا خاصہ ہوتا ہے۔ عالم شاہ روبہ صحت ہوگیا اور اسے بہن کی زبانی معاذ کا بھی علم ہوا ہے اور اب وہ معاذ کے لیے پریشان ہے۔ ادھر معاذ وقاص کے پاس سے نکل کر خود دشمنوں کے سامنے پیش ہوگیا ہے کیونکہ اس کے بھائی کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جل رہی ہے اور اس نے سونیا خان کے ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ادھر وقاص، معاذ کا پتا چلانے کے چکر میں ہے اور اسی چکر میں وہ ایک پارٹی میں مشکوک شخص کے پیچھے چل پڑا ہے۔ کہانی کافی دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ کچھ لوگ جاننے معاذ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں کہ انہیں معاذ میں گہری دلچسپی ہے۔ آگے چل کر ''شہ زوری'' مزید بڑھنے والی ہے۔ مزہ آگیا بھئی۔ اس کے بعد منظر امام کی ہلکی پھلکی کہانی باپ کا باپ پڑھی۔ واہ کیا کہنے۔ منیر صاحب کے سارے منصوبے دھرے رہ گئے اور لڑکا اوور اسمارٹ نکلا۔ بہت ہی اچھی کہانی تھی۔ تاریخی کہانی بے منزل مسافر کا ٹیمپو بھی بہت فاسٹ تھا۔ زویا اعجاز نے خوبصورت انداز میں تاریخ کو پیش کیا۔ کسی بھی لمحے بوریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ویلڈن زویا صاحبہ۔ آپ کے قلم میں جادو ہے۔ اللہ آپ کو اور ترقی دے۔ غلام قادر کی منزل بس ٹھیک



لگی۔ کہانی میں ایسی کوئی خاص بات نہ تھی اور حقیقت سے دور رہی۔ عمر عبداللہ کی ساشا ابھی تک کوئی خاص رنگ نہ جما سکی ہے لیکن امید ہے کہ آگے چل کر کہانی بہتر ہو جائے گی۔ حسن عبداللہ کی انگوٹھی کی تلاش بہتر رہی۔ تنویر ریاض کی وصیت کہانی اچھی لگی۔ ملک صفدر حیات کی غور طلب پڑھی۔ ویسے ہم ان کی کہانیاں دلچسپی سے نہیں پڑھتے حالانکہ کہانی بہتر ہوتی ہے مگر روایتی پولیس اور وہی قتل و اغوا کی تفتیش۔ بوریت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ امجد جاوید کی بے نام میں کچھ زیادہ ہی مغربی رنگ دے دیا گیا۔ ہم مانتے ہیں کہ برائیاں ہمارے معاشرے میں بھی اپنی جڑیں پکڑ چکی ہیں مگر کہانی میں کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا۔ خیر رائٹر کی مرضی۔ شاہ زین رضوان کی لازوال محبت بس ٹھیک لگی۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے ہمیشہ کی طرح ایمان افروز واقعات پیش کیے۔ مظہر سلیم ہاشمی کی پس منظر نہایت کلاسک کہانی تھی۔ ماں بیٹی کی داستان اور ان کی کارروائیاں...... نہایت دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔ اینا نے آخر اپنی چور ماں کو گرفتار کرا ہی دیا۔ اسے ذرہ بھر بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ کہانی کا پلاٹ جاندار تھا، پسند آئی۔ آخری صفحات پر کبیر عباسی کی زندان تھی۔ نوید شاید نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھا اسی لیے اپنی اولاد کو قید رکھا اور آخر دم تک دونوں ایک ساتھ رہے اور ایک ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہوئے۔ محفل شعر و سخن بھی اچھی تھی۔‘‘

☒ شاہانہ سلطان، گلشنِ ظہور سے خراماں خراماں چلی آرہی ہیں۔ ’’بہت عرصے بعد کبیر عباسی کو سسپنس کے صفحات پر دیکھا اور وہ بھی آخری...... یا حیرت۔ بہرحال بہت اچھی کاوش تھی، زندان میں ایک خوفزدہ باپ اور اس کی شدید محبت کا احوال جس انداز میں بیان کیا گیا ہے، اسے پڑھ کر کچھ دیر کے لیے تو ذہن کو زوردار شاک لگا کیونکہ دنیا میں ہر انسان کے لیے سب سے بہترین پناہ گاہ اور رشتہ والدین اور اولاد کے درمیان بنایا گیا ہے اور جب انہی رشتوں میں انسان کو فرحت نہ ملے اور وہ مسلسل اذیت کا شکار رہے تو پھر ایسے میں انسان جائے تو جائے کہاں والی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال کبیر عباسی کا یہ محبت کا زندان بہت خوب رہا۔ آئندہ بھی کوششیں جاری رکھیے گا۔ شاہ زین رضوان باقاعدگی سے مغربی کہانیوں کا ترجمہ لے کر حاضر ہوتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں۔ اتنے سہل انداز میں کہانی اختتام پذیر ہو جاتی ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ اس بار لازوال محبت بھی انہوں نے بہت اچھی اور متاثر کن لکھی۔ کمال ہے کیا مغرب میں بھی عورت اپنے شوہر سے اتنی شدید محبت کر سکتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ اس کی محبت کی اسیر رہے۔ اس بار منظر امام باپ کا باپ لے کر آئے اور ہمیشہ کی طرح ایک معمولی بات سے غیر معمولی پیغام دے ڈالا۔ صحیح بات ہے، سیر کو سوا سیر مل جائے تب ہی تو کھیل میں مزہ آتا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر حضرت جنید بغدادیؒ پڑھی جو سیدھی دل و دماغ کو جھنجوڑ گئی۔ کیا روح پرور انداز جو دل میں اتر جائے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے بارے میں معلومات بہت بہترین لگی اور جناب اگر اس ماہ کی بہترین تحریر اگر پس منظر کو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ارے جناب مظہر سلیم ہاشمی جب اللہ نے آپ کو اتنی اچھی صلاحیت دی ہے لکھنے کی تو اسے نظرانداز کر کے زنگ کیوں لگاتے ہو آپ۔ یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ہم آپ کو کبھی کبھی نہیں بلکہ ہر ماہ باقاعدگی سے سسپنس کے صفحات پر پڑھنا چاہتے ہیں۔ پس منظر میں آخری لائن تک سسپنس بھرا تھا۔ آخر تک پتا ہی نہ چل سکا کہ سگی ماں بیٹی کے درمیان یہ کون سا رشتہ، نفرت اور رجہ کیا ہے۔ ویلڈن۔ غلام قادر کی منزل نے بھی خوب لطف دیا۔ یہ کیسے مسافر تھے جو منزل پر پہنچ کر بھی بے منزل ہی رہے۔ شہ زور تو اب بہت زوردار ہو گئی ہے۔ بشریٰ نے کتنا خطرناک راستہ اختیار کر لیا ہے اور معاذ کی راہوں میں کتنی اذیت ناک رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہیں...... ہر سطر میں سنسنی بھر گئی ہے۔ ویلڈن اسما قادری صاحبہ۔ تنویر ریاض کی انگوٹھی کی تلاش بھی اچھی تھی۔ ماں کا ورثہ اور بیٹیوں کی تلاش...... کتنا عجیب تعلق تھا ان سگے رشتوں میں۔ بہرحال ایسا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ ساشا نے بھی خوب دھوم مچا رکھی ہے۔ تاریخی ٹچ میں یہ سلسلہ بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ صبا مغل کی آتشیں سوال نے بھی دل میں جیسے ایک چٹکی سی کاٹ لی۔ ایک معصوم بچے کے دل کی حسرتوں میں ڈھالا یہ سوال کتنا اذیت بھرا تھا۔ بہرحال پیسا اپنے انداز میں سفر کرتا ہے۔ اور جناب محفلِ شعر و سخن تو ہر ماہ دل لوٹ لیتی ہے۔ کتنے اعلیٰ ذوق کے اشعار اس محفل میں جگہ پا رہے ہیں، اس سے قارئین کی قابلیت، اور ذوق کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر اکتوبر کا پرچہ ایک شاہکار ثابت ہوا۔‘‘

☒ رازق بخش ذکی آہیر، جلال پور پیر والا سے خط لکھ رہے ہیں۔ ’’ماہ اکتوبر کا سسپنس ملا۔ سب سے پہلے ملک صفدر حیات کی غور طلب پڑھی۔ ملک صاحب کی کہانیاں دلچسپ ہوتی ہیں۔ ان کی تفتیشی سوچ، طریقہ، منصوبہ بندی وغیرہ قابلِ داد اور تحریر و ترتیب قابلِ تعریف ہے۔ اصل معاملہ جائداد کا لگتا ہے۔ سوتیلے بھائی نے جائداد کی خاطر جانی نقصان کرائے۔ شہ زور کے معاذ پر ظلم کی انتہا ہو رہی ہے۔ اس کے بھائی کا گردہ نکالا گیا، ماں صدمے سے چل بسی۔ ماں کا جنازہ نصیب نہ ہوا۔ آگے دیکھو کیا ہوگا۔ آخر ایک دن ظالم گرفت میں ضرور آئے گا اور عالم شاہ اور وڈیروں کے حالات کے متعلق اگلا شمارہ کیا بتائے گا۔ ساشا بہترین ہے اور اب ایک اور خطرناک موڑ آگیا ہے۔ اب وہ غار سے کیسے نکلے گا؟ بے نام کی شاعرہ ماہین نے اچھا نہ کیا جس نے اولاد کو بے نام باپ دیا۔ منزل عجیب کہانی ہے۔ سنگ دل کا شہزاد بیوی کو قتل نہ کرتا، اسے چھوڑ دیتا اور دوسری شادی کر لیتا۔ لازوال محبت بور کہانی ہے۔ باپ کا باپ یعنی جیسا کرو گے ویسا



بھرو گے۔پس منظر کی اینا جس کے ماں باپ اور دادا جرائم پیشہ تھے، اینا بری صحبت میں رہ کر بھی بری صحبت سے بچ گئی۔کمال کر دیا۔محنت اور تعلیم کے بعد پولیس میں بھرتی ہوئی اور جرائم کو روکنے کے لیے ماں کو گرفتار کرا دیا۔کبیر عباسی کی زندان دکھ اور درد بھری کہانی ہے۔زندان کے نوید جیسا کسی کا بیٹا نہ ہو اور کسی اسد کو نوید جیسا باپ نہ ملے تاکہ کوئی بھی باپ بیٹے پر ظلم نہ کر سکے اور نہ قیدی بنا سکے اور کسی بچے کی ماں بچپن میں نہ مرے تاکہ اس کی پرورش ماں ہی کر سکے۔بے منزل مسافر کا پالے خاں بہادر، وفادار، جاںنثار، وعدے کا پاسدار، محبِ وطن، نیک سیرت، اس کے حالات زندگی پڑھ کر بے حد سکون ملا۔اولیاء کرام کے حالات زندگی کا سلسلہ بھی بہترین ہے۔مبارک بادی کا بے حد شکریہ۔مٹھائی تو حاضر ہے۔یہاں آ کر لیں گے یا میں بھیجوں تو کس طرح؟ (آپ نے کہہ دیا اور مٹھائی مل گئی...... بہت شکریہ)۔"

✠ رمضان پاشا کی شکایت کراچی سے۔"ڈرتے ڈرتے ایک شکایت ہے کہ کہانی "وصیت" کا عنوان تو بہت واضح طور پر چھپا ہے مگر کہانی بہت ہی مدھم مدھم چھپی ہے۔پڑھا نہیں جا رہا تھا، چشمے میں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔(اوہ...... افسوس کہ آپ کو پڑھنے میں دقت ہوئی۔ممکن ہے کہ پرنٹنگ کی غلطی سے ایسا ہوا ہو ورنہ باقی رسالوں میں ایسا نہیں تھا)۔اور اب تازہ شمارے پر تبصرہ۔"بے نام" ایک پُرکشش کہانی تھی، "آتشیں سوال" پسند نہیں آئی۔"انگوٹھی کی تلاش" کا اختتام بھی بور لگا۔"منزل" خالص دیسی کہانی تھی، لطف آ گیا۔"باپ کا باپ" ماضی میں منظر امام نے جتنی مزاحیہ کہانیاں لکھی ہیں ان سب کا ریکارڈ توڑ دیا "باپ کا باپ" لکھ کر۔"شہ زور" اور "ساشا" پر تبصرہ ان کے اختتام پر ہوگا۔"لازوال محبت" بہت ہی پُراثر کہانی تھی، لطف آ گیا۔"غور طلب" ملک صفدر حیات نے اس بار بڑی معرکہ آراء کہانی لکھی، جگہ جگہ تجسس اور سسپنس بھرا ہوا تھا۔"پس منظر" بھی بڑی اچھی کہانی تھی، مترجم کو داد دیتا ہوں۔"سنگ دل" بور، اس میں ساری باتیں غیر عقلی ہیں۔"زندان" تعجب ہے ایسے باپ بھی ہوتے ہیں جو اپنے بیٹے کو قید میں رکھ کر کہے کہ میں اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتا ہوں۔کیا اسد کا باپ نوید پاگل تھا؟ ہرگز نہیں۔اتنی بڑی فیکٹری چلا رہا تھا اور ضرورت پڑی تو فیکٹری فروخت کر کے شاپنگ پلازا خرید لیا۔"

✠ چلبلی ہیر، جھنگ سٹی سے کچھ تاخیر کے ساتھ گزشتہ شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہیں۔"2020ء میں صحیح وسلامت رہنے والے خوش قسمت دوستوں کو چلبلی ہیر کا سلام پیشِ خدمت ہے۔پورے چار مہینے دنیا سے کٹ کر صرف گھر میں بند رہنا بڑی سزا تھی مگر اس مشکل دنوں میں جون، جولائی اور اگست، ستمبر کے سسپنس ڈائجسٹ نے اچھا ساتھ دیا۔میں تو لکھنا ہی بھول گئی۔انشائیہ میں جون ایلیا صاحب کی حکمتِ عملی قابلِ عمل رہی۔اداریہ نے بھی ہماری بہترین دل جوئی کی۔خطوط کی محفل نے بھی خوب رنگ جمایا ہوا تھا۔ناہید یوسف کو صدارت مبارک۔نئے پرانے تبصرہ نگار نے اچھی کوشش کی۔میں خود سات ماہ بعد محفل میں حاضر ہو رہی ہوں، امید ہے قبول کریں گے (ہم آپ سے بے حد خفا ہیں۔بھلا کوئی مشکل وقت میں یوں بھی ساتھ چھوڑتا ہے۔خیر دیر سے سہی آپ آئیں تو سہی)۔بے منزل مسافر کو زویا اعجاز نے اچھا تاثر دیا۔شہ زور میں اسماجی کی گرپ ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ہم سسپنس ریڈرز کا دماغ اتنا خراب ہو چکا ہے کہ کم لیول کی کوئی کہانی پسند ہی نہیں آتی۔بہرحال گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔ساشا میں بھی عمر عبداللہ بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔نشور ہادی صاحب کو میں زیادہ پسند تو نہیں کرتی مگر اس بار فیصلے دل کے اچھی رہی۔دھمکی تنویر ریاض، نگہبان طاہر جاوید مغل صاحب، بھوبل مرزا امجد بیگ ابھی اتنا رسالہ پڑھ پائی ہوں، یہ تحریریں شاندار تھیں، ویلڈن۔آج کل میرے ساتھ کچھ پرابلم چل رہے ہیں۔قارئین سے دعا کی التماس ہے۔(اللہ تعالیٰ آپ کی تمام مشکلیں آسان کرے اور آپ پھر سے ہنستی مسکراتی محفل میں شامل رہیں۔الٰہی آمین)"

✠ انجم فاروق ساحلی کی تیزی لاہور سے۔"اکتوبر کا سسپنس تیزی سے 5 تاریخ کو مارکیٹ میں آ کے پڑھنے والوں کی مسرتوں میں اضافہ کرنے لگا۔ٹائٹل پر ایک مسکراتی ہوئی حسینہ آنکھوں میں حسین خواب لیے مستقبل میں جھانک رہی تھی۔فہرست کا ڈیزائن اس بار جاذبِ نظر تھا۔خواہش میں جون ایلیا صاحب نے مستقبل کی صف بندی کی۔خطوط کی مختصر محفل خوب تھی۔جن ریڈرز نے تذکرہ قلم بند کیا، میں ان کا مشکور ہوں۔محترم بابر عباس صاحب ساحلی تخلص میرے والد سعید اختر کا تھا۔وہ فلم رائٹر تھے۔یہ تخلص ان کے لیے بشیر نیاز نے تجویز کیا تھا۔مجھے یہ تخلص محمد فاروق انجم سے نام کی مماثلت کی وجہ سے لگانا پڑا۔کہانیوں میں اس بار بے منزل مسافر، منصوبہ ساز، غور طلب، باپ کا باپ، حضرت جنید بغدادیؒ خوب تھیں۔آخری ناول زیر مطالعہ ہے۔شہ زور ہنگامہ خیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

عاصمہ ہدایت، ملتان۔ریاض تبسم، کراچی۔سلیم قادر، پھالیہ۔غلام فرید، لیہ۔رانا احسان، کراچی۔شائستہ ضیا، جھنگ۔ریاض شیخ، لاڑکانہ۔محمد ریاض، کوئٹہ۔امتیاز احمد، حیدر آباد۔

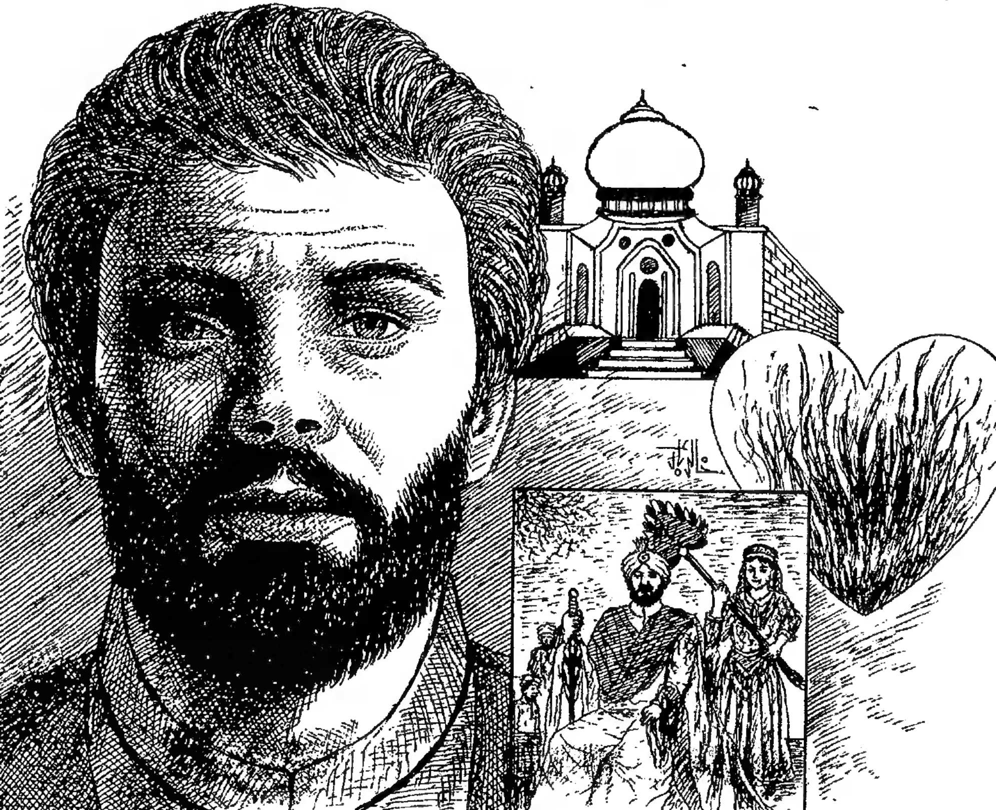
▼▼▼

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

نفس گزیدہ

زویا اعجاز

ایک جنگ تلوار سے لڑی جاتی ہے اور دوسری اپنے نفس سے... باہر کی جنگ میں کتنے ساتھی اور کتنے ہی ہمدرد آگے بڑھ کر ڈھال بن جاتے ہیں مگر ... نفس کی جنگ میں انسان تنہا حالتِ جنگ میں مسلسل برسرِ پیکار رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا جس نے زہد و تقویٰ کو اپنی خاص عینک سے دیکھا اور سمجھا۔ فطری تقاضوں کو باطل قرار دے کر صرف نظر کرنے والے اللہ کے اس بندے نے جب ٹھوکر کھائی تو منہ کے بل گر پڑا... کیونکہ ابلیس کو تو ایسے لوگوں کی خاص طور پر تلاش رہتی ہے ... تاکہ وہ اس کے ایمان سے کھیل جائے۔ بہرحال خوبصورت رستوں کے اس مسافر نے کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ بھول کر ڈالی تھی لہٰذا نقصان تو اٹھانا تھا مگر... ازالے کا موقع ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا... اور جب آجاتا ہے تو اس سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں ہوسکتا... شاید اس کا شمار بھی انہی خوش قسمت لوگوں میں ہونے والا تھا۔





وہ ایک سبزہ زار میں موجود تھا۔ رات دبے پاؤں اپنا سفر طے کر رہی تھی لیکن سبزہ زار میں کہیں بھی اندھیرے یا کسی وحشت کے آثار نہ تھے۔ چاندنی نے ہر سُو تقدس کا دودھیا غبار پھیلا رکھا تھا۔ چاند کی سبھا میں آج تارے بھی مکمل ضوفشاں بکھیر رہے تھے۔ پھولوں اور نباتات کی خوشبو بہت دلفریب تھی۔ سرسبز و شاداب درختوں پر ٹمٹماتے جگنو ستاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہوا ایسی معطر کہ دل و دماغ میں لطافت پیدا کر دیں۔ ایسا پُرتقدس ماحول روح میں ثنائے الٰہی کی رغبت پیدا نہ کرے، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ عارف بلخی بھی اطاعت و محبت کے جذبے سے سرشار ہو چکا تھا۔ اس نے مخملیں گھاس پر اپنا مصلّٰی بچھایا اور مغرب کی سمت رخ کر کے عبادت کی نیت کرلی۔ چاند اپنی دودھیا روشنی لٹاتا ایک ٹک اسی کو دیکھ رہا تھا۔

اس لطیف اور معطر ماحول میں عارف نے جانے کتنے نوافل ادا کر لیے۔ شوقِ عبادت تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ طویل رکوع اور سجدے۔ روح میں سرشاری پیدا کرنے لگے۔ اس نے سجدوں کی طوالت [illegible] جاوی۔ وقت گزرنے کا احساس بالکل بھی نہ رہا تھا۔ وہ ایک سرور کے عالم میں تھا۔ یہ ماحول اور فضا جانے کتنی گھڑیوں تک اپنا فسوں لٹاتی رہی۔ یکایک ایک نامعلوم سی تبدیلی نے اس کے دل میں بے عنوان سی خلش پیدا کردی۔ عبادت میں در آنے والی خلش پہلے کبھی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ عارف بلخی کے دل میں خیال پی[illegible] ہوئے [illegible] اس نئے جذبے [illegible] نوعیت [illegible] غور و فکر [illegible] لیکن عبادت [illegible] ایسی سوچ یا عمل [illegible] تصور ہی [illegible] رہا تھا [illegible] اپنا سر جھٹکتے اور منتشر خیالات و یکسو کرتے ہوئے [illegible] سلسلہ جاری رکھا۔

تبدیلی کی اگلی لہر قدرے منہ زور تھی۔ سبزہ زار میں چلنے والی لطیف اور معطر ہوا مزاج میں کثافت پیدا کرنے لگی تھی۔ عارف بلخی کی طبیعت مکدر ہونے لگی تاہم اس نے اپنی عبادت میں کسی قسم کا تعطل پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ کچھ دیر ہوا کی تندی اور ناگواری سہتے گزر گئی۔ پھر کسی پل چاندنی کا غبار مدھم پڑنے لگا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ رات کا سفر ابھی اختتام پذیر نہیں ہوا تھا تو چاندنی مدھم پڑنا چہ معنی دارد۔ عارف بلخی کو شدید گھبراہٹ نے گھیر لیا۔ تاروں اور جگنوؤں کی آنکھ مچولی میں بھی غیر مانوس سی سرسراہٹ پیدا ہونے لگی۔ ماحول یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا۔ عبادت صرف ایک ورزش محسوس ہو رہی تھی۔ تاریکی بڑھنے لگی تو عارف ہڑبڑا کر مصلّٰی تہ کرنے لگا۔ حدت سے جسم کا ہر مسام پسینا اگل رہا تھا۔

''یااللہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ اپنا کرم فرمانا میرے مالک!'' وہ گڑگڑاتے ہوئے دعا کرنے لگا۔ تاریکی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے سے ایک اور تبدیلی کے احساس نے شل کر دیا۔ مخملیں گھاس اب دلدلی زمین میں تبدیل ہو کر اس کے پاؤں بری طرح دھنسا رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانا شدید دشوار تھا۔ ہر قدم پہلے سے زیادہ دھنسا ہوا محسوس ہوتا، عارف بلخی حواس باختہ ہونے لگا۔ اسے خدشہ تھا کہ یہ دلدلی سرزمین کہیں اسے نگل ہی نہ لے۔ بے بسی اور خوف نے اس کی قوتِ ارادی کمزور کردی تھی۔ آنکھوں کے سامنے یکدم اندھیرا چھا گیا تھا۔

''یااللہ! میری مدد فرما...... میری مدد فرما۔'' وہ کرب سے چلّایا۔

☆☆☆

عارف اپنے بستر پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ بے یقینی سے آنکھیں مسلتے ہوئے قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا گویا ماحول کا ازسرِ نو معائنہ کر رہا ہو۔ وہ اپنی خانقاہ میں ہی موجود تھا۔ دیے کی ٹمٹماتی لو سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وقت تہجد بہت قریب ہے۔

''تو کیا وہ سب خواب تھا؟'' اس نے اپنے پاؤں اور ٹانگیں ٹٹولتے ہوئے سوچا۔

''شکر ہے میرے معبود! [illegible] ہے کہ وہ سب خواب ہی تھا۔'' اس نے [illegible] اختیار گہری سانسیں بھریں [illegible] لیکن اس خواب کا آخر مقصد کیا تھا؟ وہ سب [illegible] آخر کیا تھا؟'' عارف نے [illegible] اس خواب کو تصور میں دوبارہ [illegible] احساس ہوا تو اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے تہجد کی نماز کی تیاری شروع کردی۔ اب ذہن میں کسی دوسرے خیال کی گنجائش نہ تھی۔

عارف بلخی کی عمر پینتالیس سال تھی۔ اس کے جدِ امجد ایرانی تھے۔ خوش حالی اور تعیش پرستی میں سرشار زندگی بسر کیا کرتے۔ اسلام کی حقانیت نے جب عرب سے نکل کر ایران پر اپنا غلبہ پایا تو ایرانی عوام کی اکثریت نے اسلام کی آفاقی سچائیوں سے متاثر ہو کر اپنے آباؤ اجداد کا دین ترک کر دیا۔ جن افراد نے اس سچائی سے چشم پوشی اور مزاحمت کی راہ اپنائی تھی، انہیں اب اپنی ہی سرزمین پرائی لگنے لگی۔ وہ بادلِ ناخواستہ اپنی اس جنم بھومی سے منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ یہ افراد بھی مختلف طبقات میں بٹے ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے اپنی اس تقسیم کے تحت

اپنے مستقبل کی رہائش کا انتخاب کیا۔ تجارت پیشہ افراد کی ترجیح ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل تھے۔ مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے عوام کی پسندیدگی اندرونِ ہند ٹھہرا۔ موبدوں (مذہبی پیشواؤں) نے بلخ کا شمالی حصہ آباد کیا اور بزعمِ خود چین کی بانسری بجانے لگے۔ انہیں اس فرار کا بالکل فائدہ نہ ہوا۔ اسلام کی سچائی کے بادل ناقابلِ یقین سرعت سے ہر سو چھا کر اپنی رحمت کی بارش سے ہر کسی کو شرابور کرنے لگے۔ بالآخر ان موبدوں نے بھی اپنے ضمیر و روح کی اصل پکار پر لبیک کہتے ہوئے کفر و شرک کا طوق گلے سے اتار پھینکا اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد فوری صورتِ حال یہ پیش آئی کہ وہ تو ازل سے پیشوائی کا منصب سنبھالے ہوئے تھے۔ انہیں تجارت آتی تھی نہ ہی تیر و تلوار زنی کی ابجد کا علم تھا۔ زندگی تو ''آذر خش'' (مقدس آگ) کی دیکھ بھال کرتے آتش کدوں کی حدود سے کبھی باہر نکلی ہی نہ تھی۔ سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایسی ہی کوئی راہ اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بلخ میں اس وقت تصوف کی آمد اور چرچا بھی بہت زیادہ تھا۔ ان سابقہ موبدین نے تصوف کی راہ اپنا کر اپنے آتش کدے ''خانقاہوں'' میں تبدیل کر دیے اور رب کائنات سے لو لگالی۔

عارف بلخی بھی ایسی ہی ایک خانقاہ سے منسلک تھا۔ اس نے عبادت و ریاضت میں اپنا وجود غرق کر رکھا تھا۔ گزشتہ پچیس برس سے خانقاہ میں شب و روز اس طرح بسر کیے تھے کہ بیرونی دنیا قطعی فراموش ہو چکی تھی۔ اسے بالکل یاد نہ تھا کہ اس بستی کی سڑکوں، گلیوں، بازاروں، دکانوں اور گھروں کی ساخت کیسی ہے؟ عمر کی پینتالیس بہاریں دیکھ لینے کے باوجود چہرے پر وہ پختہ کاری نہ تھی جو اس عمر میں عموماً دیکھنے میں ملتی ہے۔ اس کا چہرہ اب بھی معصوم، پاکیزہ اور تر و تازہ ہی محسوس ہوتا۔ ہر کوئی اس کی عبادت، ریاضت اور مجاہدے کے گن گاتا، اعلیٰ اخلاق اور عبادت میں یکسوئی کی تعریفیں کرتا لیکن عارف ان باتوں پر خالی نظروں سے مقابل کو دیکھ کر رہ جاتا۔ وہ اپنی ذات میں تا حال بہت بڑا خلا محسوس کرتا تھا۔ اسے معرفت کا جو مرتبہ درکار تھا ابھی تو اس کی گرد بھی قلب و روح میں محسوس نہ ہوتی۔ اس صورت حال پر وہ اکثر افسردگی اور الجھن کا شکار رہتا لیکن جیسی الجھن آج اس خواب نے دی تھی، وہ پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اپنی تمام تر سوچوں اور محرومیوں کو ذہن سے جھٹک کر اس نے کامل یکسوئی سے نمازِ تہجد ادا کی۔ اس کے بعد اپنے معمولات کے مطابق سب فرائض سرانجام دیتے ہوئے اس نے ملاقاتیوں کو طلب کر لیا۔

''صوفی صاحب! میں ایک تاجر ہوں۔ میں نے اپنے شہر میں آپ کی بے حد تعریفیں سن رکھی ہیں۔ میں اپنے اور خاندان کے لیے آپ کی خصوصی دعاؤں کا طالب ہوں۔'' اس کے سامنے باریش، قیمتی پوشاک زیب تن کیے ایک تاجر موجود تھا۔

''پروردگارِ دو عالم اپنے محبوب ﷺ کے صدقے تمہاری ہر مشکل آسان فرمائے۔ تمہارا ہر خسارہ نفع میں تبدیل ہو۔ آل اولاد ٹھنڈک کا سبب بنے۔ اس ذاتِ اقدس کی تخلیق میں کبھی کوئی امتیاز نہ کرنا۔ کمزوروں اور ناداروں کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ اپنے مال و دولت میں صدقہ و خیرات کی صورت میں انہیں بھی مستفید کرتے رہنا۔'' عارف نے دعاؤں کے بعد نصیحت کا زادِ راہ اسے تھمایا۔ تاجر سرشار ہو گیا۔

''حضرت! میں کچھ نذرانے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا ہوں۔'' تاجر نے عاجزی سے کہا۔

''اللہ کی ضرورت مند مخلوق میں بانٹ دینا انہیں۔ ہمیں ان کی بالکل طلب نہیں ہے۔'' عارف بلخی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

اس بے نیازی میں کسی قسم کی کوئی بناوٹ نہ تھی۔ کسی تاجر یا صاحبِ ثروت شخص کی آمد اپنے مسائل کے حل کے لیے دعاؤں کی التجا اور بیش قیمت تحائف کا نذرانہ اس کے لیے کوئی نئی یا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایسا تو ایک معمول بن چکا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ عارف نے کبھی مال و متاع، ہیرے جواہرات یا آسائش کی تمنا ہی نہ کی تھی۔ اس کے مزاج کا استغنا اور بے نیازی خالص تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ تاجروں یا صاحبِ ثروت افراد کے روانہ ہوتے ہی خانقاہ میں رہائش پذیر معتقدین ان سے مال و اسباب کے حصول کی درخواست کر دیتے۔ وہ بہ رضا و رغبت سب کچھ ان کے حوالے کر کے یہی تصور کرتے کہ عارف بلخی بھی ضرور ان سے مستفید ہو گا جس کا ثمر دعاؤں کی صورت میں انہیں بھی ملتا رہے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوتا۔ عارف ان تحائف یا اسباب کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ اس تاجر نے خانقاہ سے باہر نکلنے سے قبل ہی تحائف قبول ہو جانے کی سرشاری محسوس کی۔

عارف اب دیگر ملاقاتیوں سے نمٹنے میں مشغول تھا۔ اس کے بعد اسے ایک کٹھن مرحلہ بھی درپیش تھا۔ سائلین میں آج دو خواتین بھی شامل تھیں۔ وہ ایسی خواتین اور

دوشیزاؤں سے ملاقات کے لیے گریزاں ہی رہتا تھا۔اس کی ذاتی زندگی میں بھی عورت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

''صوفی حضرت!میں آپ کے پاس بہت امید لے کر آئی ہوں۔''اس نازک اندام 'پری پیکراورغزالی آنکھوں والی دوشیزہ نے اس سے کہا۔

''امیداورتوقعات صرف اللہ کی ذات سے منسوب ہوں تو انسان بہت پُرسکون رہتا ہے۔ہم خاک کے پتلے کسی کی امید پوری کرنے کے قابل نہیں۔''اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''آپ کی بات بالکل بجا ہے حضرت!میں تو آپ سے دعا کروانے کے لیے آئی تھی۔میرا شوہر تجارتی قافلوں کے ساتھ مصروف رہتا ہے۔مہینوں تک میں اس کی شکل نہیں دیکھ پاتی۔وہ خود تو قافلے میں دادِعیش دیتا ہوگا لیکن میں اپنا درماں کہاں تلاش کروں؟ اسے میرا کوئی خیال ہی نہیں ہے۔''دوشیزہ کا لہجہ جذبات سے بوجھل ہوگیا۔

''اپنی توجہ عبادت میں مرکوز کرو۔پروردگار نے تمہارے لیے یقیناً کسی بہترین راہ کا انتخاب کر رکھا ہوگا۔ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی تمہارے لیے کوئی بہتری ہو۔'' عارف نے حسبِ سابق نظریں جھکائے جواب دیا۔

''یہ میرے لیے جبر ہے۔اس جبر میں کیا بہتری ہو سکتی ہے بھلا؟''عورت نہایت آزردہ تھی۔

''ظرف اور حوصلہ وسیع رکھو۔اجر تمہاری سوچ سے بھی زیادہ کشادہ ہوگا۔میں تمہارے لیے خصوصی دعا کروں گا کہ پروردگار تمہاری مشکلات آسان فرمائے۔''اس نے نظریں مزید جھکالیں۔

''اگر ایسا نہ ہوسکا تو میں بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سکون وسرشاری کی راہ تلاش کرلوں گی۔''وہ خودسری سے بولی۔عارف بلخی اس کے ارادے سن کر ساکت ہوگیا۔

''اپنی اس عاصی سوچ میں مجھے کیوں گواہ بنارہی ہو؟ پروردگار تمہیں راہِ ہدایت نصیب فرمائے۔''

''پتا نہیں!ایسی سوچ ذہن میں چلتی تو رہتی تھی لیکن اظہار پہلی بار کیا ہے اور مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ یہ خیال بھی آپ ہی کو دیکھ کر زبان پر مچلا ہے۔''اس کی باتیں اور انداز بے باک ہوچلا تھا۔

''ہوش کے ناخن لو خاتون!''عارف سختی سے بولا۔

''آپ کے چہرے پر چھایا تقدس اور معصومیت ایک وفادار مرد ہونے کی گواہ ہے۔ایسے مرد کی تو ہر عورت کو ہی تلاش ہوا کرتی ہے۔''اس کے ارادے مکمل آشکار ہو گئے۔عارف بلخی نے ایک گہری سانس لے کر خاموشی پر ہی اکتفا کیا۔

''کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہوگئے آپ؟ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔''وہ معصومیت سے بولی۔

''پروردگار اس مرض سے سب کو محفوظ رکھے جس میں گناہ کے گناہ ہونے کا احساس بھی نہ رہے۔تم جاسکتی ہو اب!''

''لگتا ہے آپ کو عورت ذات سے بات کرنے کا ڈھنگ ہی نہیں۔''اس نے منہ بنایا۔

''عورت اور اس کا حسن شر کے سوا کچھ بھی نہیں۔جس شباب پر اسے خالقِ کائنات کا ہر لمحے شکرگزار رہنا چاہیے، اسے منفی انداز میں استعمال کر کے وہ اپنے لیے مصائب کو دعوت دینے لگتی ہے۔''عارف نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اتنے بڑے بول نہ بولیں حضرت!کبھی کبھی انسان اپنے ہی خیالات'سوچوں اور نظریات کا تاوان ادا کرنے پر مجبور ہوجایا کرتا ہے۔''اس عورت کے انداز کی گہرائی عارف کو حیران کرگئی تاہم کچھ بھی کہنے سے گریز کرتے ہوئے منہ پھیرلیا۔اس کے جاتے ہی اگلی سائلہ چلی آئی۔

''مجھے آپ کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے حضرتؒ!'' شیریں لہجے میں التجا سامنے آئی۔

''پروردگار آپ کی ہر جائز ضرورت پوری فرمائے۔'' عارف بلخی نے نظریں اب بھی جھکا رکھی تھیں۔

''میں بہت پریشان ہوں۔یہ پریشانی میری جان لے کر ہی ختم ہوگی۔''وہ آنسو بہانے لگی۔

''پریشانی انسانی اعمال کا ہی نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ انسان کو خود احتسابی کے عمل سے ضرور گزرتے رہنا چاہیے کہ اس کے کون سے اعمال رضائے الٰہی کے خلاف ہیں۔'' اس نے متانت سے سمجھایا۔

''وہ سب بھی ضرور کروں گی لیکن میرا محبوب کسی اور کے فریب میں مبتلا ہوکر اسی کی محبت کا دم بھرنے لگا ہے۔ خدارا مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں؟''اب وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔

''دنیاوی اور نامحرم رشتوں کی چاہ میں بسر کیے گئے لمحات اور آنسو ایسا ہی اضطراب پیدا کرتے ہیں۔یہ نامحرم محبتیں انسان کو سدا ملول رکھتی ہیں۔ان سے گریز بہتر ہے۔برکت'چاشنی اور زندگی کا اصل حسن صرف محرم رشتوں میں ہے۔''عارف بلخی نے اسے سمجھایا لیکن وہ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔

''میں نے آپ کے زہد وتقویٰ اور مستجاب الدعوات

ہونے کی بہت شہرت سنی ہے۔ میں یہاں سے دعاؤں کا نذرانہ لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔ اگر آپ نے انکار کیا تو میں اس خانقاہ سے باہر قدم بھی نہیں رکھوں گی۔ دیکھتی ہوں میری مرضی کے خلاف کون مجھے یہاں سے نکال سکتا ہے۔'' اس کی سرکشی اور ہٹ دھرمی قابلِ دید تھی۔ عارف سخت مخمصے میں مبتلا ہو گیا۔

''میری دعا ہے کہ تمہارے دل کی مراد پوری ہو جائے۔ پروردگار اپنی جناب سے بہترین عطا فرمائے۔ تمہارے ہر دکھ کا مداوا کرے۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔ دوشیزہ اب مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ شکریہ ادا کر کے لوٹ گئی۔

''آج تو سائل مسائل لے کر نہیں بلکہ بذاتِ خود مسائل بن کر آئے ہیں حضرت!'' عارف کے معتقدِ خاص نے اس کی کیفیت بھانپ کر کہا۔

''انسان اپنے مدار کی جب بھی خلاف ورزی کرے گا ایسے ہی مسائل درپیش آتے رہیں گے۔'' وہ تھکاوٹ سے بولا۔

''نصیب دشمناں! مزاج کچھ بخیر محسوس نہیں ہو رہا؟'' معتقد نے پوچھا۔

''مجھے اپنے اس سفر میں اب بھی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے میں اپنے سفر کا حق ادا نہیں کر پا رہا ہوں۔ میں نے بغداد کے صوفیوں کی بہت شہرت سنی ہے۔ مجھے تو یہاں تک علم ہوا ہے کہ وہاں ایسے مردِ مجاہد بھی ہیں جن کی نظرِ التفات ہوتے ہی سلوک کی ہر منزل آسان ہو جاتی ہے۔'' وہ اشتیاق سے بولا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم سفر کی تیاری کا آغاز کیے دیتے ہیں۔ خانقاہ میں آنے والے درویشوں اور تاجروں سے میں نے بھی اس حسین شہر اور وہاں موجود مردِ مجاہدین کے کمالات کی بہت تعریفیں سن رکھی ہیں۔'' معتقد بھی اسی تجسس میں مبتلا تھا۔ عارف نے بغداد کے سفر کی حتمی منظوری دے دی۔ اس رات عبادات کے بعد وہ حسبِ سابق تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ خوش کن بات یہ تھی کہ اس رات کسی خواب نے پریشان نہ کیا۔

☆☆☆

بغداد روانگی کی تیاریاں بہت تیز رفتاری سے کی گئیں۔ عارف بلخی نے خود کو عبادت و ریاضت میں پہلے سے بھی زیادہ غرق کر لیا اور پھر وہ دن بھی چلا آیا جب اسے ایک قافلے کے ہمراہ اپنی منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہونا تھا۔ اس قافلے میں تقریباً ڈیڑھ سو معتقد شامل تھے لیکن خود عارف کی بے نیازی اور دنیا داری سے بے رغبتی کا یہ عالم تھا کہ اسے اپنے ہمراہیوں کے نام اور ذریعۂ معاش تک کا علم نہ تھا۔ اسے تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ اپنی خانقاہ سے کتنے عرصے بعد ایسے نظارے دیکھ رہا ہے۔ کیا ہی دلکش منظر تھے! سرو کے درخت اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ مغربی سمت میں جھکتا سورج اپنی حدت کافی حد تک کھو چکا تھا۔ ایک جانب چرواہے اپنے ریوڑ لیے گھروں کی جانب رواں تھے۔ ان کے تھکے ماندہ چہروں پر گھر لوٹنے اور اہلِ خانہ سے وقتی دوری کے بعد ملاقات کا جوش جھلک رہا تھا۔ جانوروں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں میں بھی ایک دلفریب نغمگی تھی۔ ان کا ہر ایک قدم متوازن انداز میں اٹھ رہا تھا جس سے ان گھنٹیوں کی موسیقی مزید خوش کن محسوس ہوتی۔ درختوں پر پرندوں کی واپسی اور شور بھی سماعت کو بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ یہ مناظر ہر لحاظ سے ''واپسی کا سفر'' کی عملی تفسیر تھے۔ عارف اس خوبصورتی میں جیسے کھو کر رہ گیا۔

''خانقاہ میں رہ کر ایسا حسن دیکھنے سے میں آج تک محروم رہا۔ واللہ! اس کائنات میں ہر قدم پر کیسی دلفریبی بسی ہے۔'' اس کے ذہن میں ایک اور خیال پیدا ہوا اور دوسرے ہی پل وہ لرز کر رہ گیا۔

''یہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ خانقاہ میرے لیے عبادت، تصوف اور رضائے الٰہی کے حصول کا زینہ ہے۔ ایسے منفی خیال یقیناً شیطانی وسوسے ہیں۔'' اس نے فوراً رفع نفسانی خیالات کے لیے ورد شروع کر دیا۔

معتقدین نے اپنا کام بہت پھرتی سے نمٹایا اور سب سے پہلے اسی کا خیمہ نصب کیا۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد خیمے میں موم بتیاں روشن کر دی گئیں۔ کئی عقیدت مند اس کے پاس معرفت کی گفتگو سننے اور اپنے قلب و روح کی تطہیر کے لیے آ بیٹھے۔ انہوں نے سفید کرتے زیب تن کر رکھے تھے۔ سروں پر بالوں کی مخصوص ٹوپیاں اور ہاتھوں میں تسبیحات تھیں۔

''حضرت! کیا واقعی بغداد میں مردِ کامل اور مردِ مجاہد رہائش پذیر ہیں؟ کیا واقعی آپ سے زیادہ کوئی متقی اور عبادت گزار بھی ہوگا؟'' ایک معتقد نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔ وہ اس کے حلقے میں کچھ عرصہ قبل ہی شامل ہوا تھا۔

''نہ میرے بچے! ایسا بالکل نہ کہو! میں تو اس کائنات میں ایک حقیر ذرّے سے بھی کمتر ہوں۔ میری تو کوئی بساط ہی نہیں۔ بغداد...... آہ بغداد...... اس کی شان و شوکت اور عظمت کے کیا کہنے۔ ابھی آج ہی کی بات سنو! میں نے

ہے۔'' ایک معمر عقیدت مند نے اپنی رائے دی۔
''لیکن میں ایسی تجویز بالکل نہیں دوں گا۔ یہ معاملہ ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ بردہ فروش ہمیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔'' اس کے معتقدِ خاص نے جواب دیا۔
اس کے بعد خیمے میں مختلف تجاویز اور آراء کا ایک بازار گرم ہوگیا۔ عارف بلخی کے لیے تکلیف دہ امر یہ تھا کہ اکثریت اسے پناہ دینے کے حق میں ہی تھی۔ اس کے ذہن میں بھی کشمکش جاری تھی۔ وہ دُہری اذیت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ خدشات حد سے سوا تھے۔ لڑکی کو اپنے خیمے میں پناہ دینے کا معاملہ کھل جاتا تو برسوں کی بنی بنائی عزت خاک میں مل جاتی۔ عزت تو خیر دوسری صورت میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ رشید اس لڑکی کو کہیں اور پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں ناکام ہو جاتا تو جگ ہنسائی کا تصور ہی ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اس کے معتقدین کے حلقے میں شامل تھا۔ ایسی غیر اخلاقی حرکت کا منظرِ عام پر آنا ہی اس کی ذات پر براہِ راست رسوائی کا داغ تھا۔ عارف کی شرمندگی، ذلت اور احساسِ توہین سے بے حد خائف تھا اور یہی جذبہ اس غیر متوقع فیصلے کا سبب بن گیا۔ اس نے رشید کی لائی ہوئی لڑکی کو خیمے میں قیام کی اجازت دے دی۔
''اس خیمے کے دوسرے کونے میں بستر لگوا دو!'' اس نے معتقدِ خاص کو حکم دیا۔
تھوڑی ہی دیر میں نمازِ عشا کا وقت ہو گیا۔ عارف اور اس کے ساتھی خیمے کے باہر کھلے میدان میں صف آراء ہو گئے۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ عارف بلخی نے اس طرح اَن گنت مرتبہ امامت کروائی تھی لیکن اس روز حالات و واقعات منفرد تھے۔ اس کے خیمے میں صنفِ نازک موجود تھی۔ اس کی موجودگی، ذات کی رعنائی اور انداز و اطوار ذہن سے ایسے چپکے تھے کہ رہائی کی صورت ہی نہ دے رہے تھے۔ ان خیالات نے عارف کو مزید خائف کر دیا۔ عبادت میں ایسا خلل زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ یکدم خود اطمینانی کی دولت سے محروم ہو گیا۔ روح میں سناٹا سا اترنے لگا۔ نماز سے فراغت پا کر وہ خیمے میں چلا آیا جہاں وہ فتنہ انگیز وجود اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھا۔

☆☆☆

عشا کی نماز سے فرصت کے بعد عارف بلخی کا کھانا اس کے خیمے میں پہنچا دیا گیا۔ مہمان لڑکی کا کھانا الگ فراہم کیا گیا۔ اس کے چہرے پر بیزاری اور تکدر کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ وہ ایسی سرد مہمان نوازی کی بالکل توقع نہ کر رہی تھی۔ اس کی دزدیدہ نظریں گاہے بگاہے عارف کا جائزہ لے لیتیں اور یہی نظریں عارف کو مزید مضطرب کر رہی تھیں۔ اس نے اذکار سے فراغت پا کر بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں موند لیں۔
نمازِ تہجد کے لیے اٹھنے سے قبل چند گھڑیوں کی نیند بے حد ضروری تھی۔ اس رات نیند بھی بہت بے سکون تھی۔ دماغ کا ایک حصہ جو عبادت کے خیال میں محو رہتا تھا، اب دوسرا بے چین تھا۔ خیمے میں لڑکی کی موجودگی اور اپنے خدشات تو قابلِ فہم تھے لیکن ایک بے عنوان خلش کی سمجھ ہی نہ آ رہی تھی۔ ایسی کیفیات پہلے تو کبھی محسوس نہ ہوئی تھیں۔ اسی سوئی جاگی کیفیت میں رات کا بقیہ وقت بھی گزر گیا۔
نمازِ تہجد کا وقت ہو چکا تھا۔ اسے لڑکی کی خود پر مرکوز نظروں کا بھی مکمل احساس تھا۔ لڑکی کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہونے لگی اور یہی چیز عارف کی جھنجلاہٹ میں اضافہ کر رہی تھی۔ وضو کے بعد اس نے نماز کے لیے مصلیٰ بچھایا ہی تھا کہ اسے مترنم دھیمی آواز سنائی دی۔ انداز کسی گنگناہٹ جیسا تھا۔
''کل رات ایک پروانہ بے تاب تھا۔
شمع کے گرد منڈلاتا اس سے بغلگیر ہونے کے لیے بے حال تھا۔
اس سے پوچھا کہ کیوں یہ حماقت کرتا ہے؟
شمع سے ایسی ملاقات سے موت کو کیوں مدعو کرتا ہے؟
کہنے لگا یہی تو محبت کی حقیقت ہے۔
عشق و محبت سود و زیاں کی پروا کب کرتے ہیں؟
اور عشق نہ کرنے والے زندگی کا حق ہی کہاں ادا کرتے ہیں۔
اس نے شمع کا بوسہ لیا اور جان ہار بیٹھا۔
ہاں شاید ٹھیک ہی کہتا تھا وہ۔
عشق اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔
عشق ساز ہے، سوز ہے، روگ ہے اور راگ ہے۔
عشق نرمی ہے، گداز ہے، زندگی جینے کا حقیقی انداز ہے۔
کائنات کے اس عظیم جذبے کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔
عشق سے منہ موڑنے والے احمق سے بڑھ کر کیا ہوں گے؟
وہ خالق تک رسائی کے لیے اس کی کائنات کے مظاہر کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟
عشق کر اے غافل! یہ کائنات اسی عظیم جذبے سے ہی تخلیق ہوئی ہے۔
عشق کر اے غافل!''

"وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ عارف بلخی کی داخلی کیفیات میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ وہ اس لڑکی کے حسن کے بعد گنگناہٹ کی شیرینی کے سحر میں بھی الجھنے لگا۔ کلام کی معنویت اس سے بھی سوا تھی۔ وہ مصلے پر کھڑے ہونے کے بجائے بے خود چلتا ہوا لڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"بہت خوبصورت کلام تھا۔"

"کیا آپ بھی خوبصورتی یا بدصورتی کے مطالب اور حقیقت سے آگاہ ہیں حضرت!" اس نے متانت سے پوچھا۔

"ایسا کیوں سوچ لیا تم نے؟" عارف حیران ہوا۔

"گزشتہ شب سے آپ کے جو معمولات، سوچ اور نظریات میرے سامنے آئے ہیں اس کے بعد ایسی سوچ اور ایسا ہی تاثر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔" لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"تم باتیں خوب بنا لیتی ہو۔ نام کیا ہے ویسے تمہارا؟" عارف کو اس کے انداز میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

"رخشندہ کہتے ہیں مجھے۔" اس نے اپنی زلفیں جھٹکتے ہوئے کہا۔ سرخ رومال بستر پر پڑا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں کس شاعر کا کلام گنگنا رہی تھیں؟"

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں گویا شاعری اور خوبصورت کلام سے ہمیشہ واقفیت رہتی ہے آپ کی۔" رخشندہ نے ایک اور طنز کیا۔

"خوبصورتی تو انسانی فطرت میں شامل ہے۔ بھلا کیسے اچھی نہ لگے گی؟" عارف کی سادگی پر وہ دھیرے سے ہنس دی۔ وہ اس کا اشارہ اور طنز واقعی نہ سمجھ پایا تھا۔ اس نے عارف سے مزید کسوٹی کھیلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو بتا دیتی ہوں کہ یہ میرا ذاتی کلام ہے۔ اب حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ احمقانہ سوال نہ کیجیے گا کہ کیا میں واقعی شاعرہ ہوں۔" رخشندہ نے ایک بار پھر ہنسی کا ترنم بکھیرا۔ عارف اس کے ہر ایک انداز سے گھائل ہو رہا تھا۔

"میں واقعی یہ پوچھنے والا تھا۔" وہ خجل ہوا۔

"چلیں تو پھر کچھ اور کہہ لیجیے۔" رخشندہ نے طرح دی۔

"تم واقعی ہر فن مولا لڑکی ہو۔" عارف کو اس کی ستائش کے لیے مزید الفاظ بن نہ پڑے۔

"اگر واقعی ایسا ہے تو اپنے ان عقیدت مندوں کے حلقے میں شامل کر لیجیے۔ تبھی مانوں گی کہ آپ میرے بارے میں یہی سوچتے ہیں۔"

"ایسا ممکن نہیں ہے۔ تمہارا وجود اور حسن کسی کی بھی ریاضت پل بھر میں ختم کر سکتے ہیں تم یقیناً اتنی ہی قیامت خیز ہو کہ کوئی بھی اپنی راہ سے بھٹک جائے۔" عارف کی صاف گوئی پر رخشندہ نے فخر و غرور سے قہقہہ لگایا۔ اسی لمحے خیمے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ عارف کی رنگت متغیر ہو گئی۔

"میں ہوں رشید...... اندر آنا چاہتا ہوں۔" اس نے اجازت لینے کے بجائے براہ راست اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ عارف نے اس کی آمد پر کوفت زدہ ہوتے ہوئے اندر طلب کر لیا۔

رشید نے آتے ہی خیمے کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس کے انداز میں شکوک واضح تھے۔ اس نے مغربی سمت میں بچھے مصلے کو دیکھا جس کا کوئی بھی کونا مڑا ہوا نہ تھا۔ اس امر سے صاف ظاہر تھا کہ عارف بلخی نے نماز شروع ہی نہ کی تھی۔

"کیا بات ہے؟ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" عارف نے سختی سے پوچھا۔

"مجھے خدشات ستا رہے تھے حضرت! اور یہاں پہنچ کر علم ہوا کہ میری چھٹی حس بالکل درست سمت میں اشارہ دے رہی تھی۔ آپ دونوں کی گفتگو کی آوازیں خیمے سے باہر تک پہنچ رہی ہیں۔ اگر میری جگہ کوئی بردہ فروش ہوتا تو سوچیے کیا انجام ہوتا؟" رشید کی دلگیر آواز پر رخشندہ کے حواس بھی شل ہو گئے۔ رخشندہ کو اگر ممکنہ قید کے تصور نے ہولایا تھا تو عارف بلخی کو اپنی عزت کا جنازہ نکلنے کے خیال نے لرزا دیا تھا۔ وہ رشید سے نظریں چرا کر رہ گیا۔

"اعلیٰ حضرت! میری التجا ہے کہ خیمے کی شمع بجھا دیجیے۔ احتیاط کا مظاہرہ بہت ضروری ہے۔" رشید نے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے عاجزی کا مظاہرہ کیا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا باہر نکل گیا۔

عارف نے شمع گل کر دی۔ خیمے میں نیم تاریکی چھا گئی۔ چاندنی کا پھیلا غبار ہی خیمے کے اندر مدھم روشنی کیے ہوئے تھا۔ عارف نے رخشندہ کو نظر انداز کرتے ہوئے نماز کا آغاز کیا تو پہلی ہی رکعت میں اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کے حواس پر کس بری طرح سوار ہو چکی ہے۔ قیام، قرأت، رکوع، سجدہ، قعدہ ہر ایک عمل پر کسی نہ کسی طرح اس کا وجود نظروں کے سامنے بہار دکھاتا رہا۔ عارف لرزتا، خائف ہوتا اپنے منتشر ذہن پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا لیکن بے سود۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ محض زمین پر ٹکریں مار رہا ہے۔ بدقت تمام آٹھ رکعات پڑھنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ آنسو چہرہ بھگونے لگے۔ اپنی

بے بسی اسے بے طرح تڑپا رہی تھی۔ ان کیفیات سے نجات کے لیے دعائیں کرنے کے بعد وہ دوبارہ بستر پر جا لیٹا۔ خلافِ توقع نیند بہت جلد مہربان ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک سبزہ زار میں موجود تھا۔ رات دبے پاؤں اپنا سفر طے کر رہی تھی لیکن سبزہ زار میں کہیں بھی اندھیرے یا کسی وحشت کے آثار نہ تھے۔ چاندنی نے ہر سو تقدس کا دودھیا غبار پھیلا رکھا تھا۔ چاند کی سبھا میں آج تارے بھی مکمل ضوفشاں بکھیر رہے تھے۔ پھولوں اور نباتات کی خوشبو بہت دلفریب تھی۔ سرسبز و شاداب درختوں پر ٹمٹماتے جگنو ستاروں سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہوا ایسی معطر کہ دل و دماغ میں لطافت پیدا کر دے۔ جنوبی سمت سے روشنی کا غبار بلند ہونے لگا۔ ایسی روشنی اور چمک اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جوں جوں یہ غبار نزدیک آ رہا تھا، اس کی تابانی میں مزید اضافہ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں روشنی کا یہ قافلہ اس کے قدموں میں آ گیا۔ قریب آنے پر اس کی دلکشی خیرہ کن تھی۔ روشنی اس کے قدموں سے لپٹنے کے لیے بے تاب دکھائی دیتی تھی لیکن وہ بے زار اور کوفت زدہ تھا۔ اسے اس چمک میں قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی نظریں دوسری جانب مرکوز تھیں جہاں ایک حسین و دلکش ہرن موجود تھا۔ عارف نے ایسا خوبصورت غزال پہلے کہیں نہ دیکھا تھا۔ دلکشی اعصاب اور حسیات کو رہائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ عارف بے اختیار آگے بڑھا۔ وہ اس غزال کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ غزال نے اسے آگے بڑھتے دیکھا تو چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا یہ گریز عارف کو مزید بے قرار کرنے لگا۔ وہ اپنے قدم بڑھاتا رہا، غزال دامن چھڑاتا رہا۔ یہ آنکھ مچولی کچھ دیر یونہی جاری رہی۔ عارف کی وحشت بڑھنے لگی۔ وہ کسی بھی طرح اس کا لمس اور قربت محسوس کرنا چاہتا تھا۔

گریز و تعاقب کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ غزال اب ایک نشیبی جگہ کی طرف بڑھ گیا۔ عارف کو یہ خدشہ ستانے لگا کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ عارف دیوانہ وار اس کی جانب لپکا۔ چند گز کا ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ تیز سنہری روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ اس روشنی میں نرمی یا سکون کے بجائے حدت اور لحہ بہ لحہ بڑھتی تمازت تھی۔ ایسی تمازت جو جسم و جان میں بے چینی بڑھا دے۔ خوش کن بات یہ تھی کہ غزال کا نشیب میں سفر بھی تھم گیا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں واضح طور پر عارف اور پھر اس روشنی پر بھٹکنے لگیں۔ عارف کے بدن میں سنسناہٹ بڑھتی گئی۔ وہ اس روشنی کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ عارف کے اس عمل نے غزال کو مسرور کر دیا۔ اس کی یہ کیفیات عارف پر براہِ راست اثر انداز ہو رہی تھیں۔ سرور بڑھنے لگا۔ وہ روشنی کے سامنے جھک گیا۔ غزال نے چوکڑی بھری اور اس کے قریب آ گیا۔ عارف کو اب اپنی وحشت دور کرنے کی راہ سجھائی دے گئی تھی۔ وہ بار بار اس روشنی کے سامنے اوندھے منہ لیٹ جاتا۔ غزال اور اس کا فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا اور پھر وہ لحہ بھی آیا جب اسے غزال کا لمس محسوس ہوا۔ وہ ایک سرور انگیز لحہ تھا۔ سنسنی اور سرشاری موسلادھار بارش کی طرح اسے سرتاپا بھگو گئی۔ ان کیفیات میں بے پناہ کیف و لذت تھی۔ ایسی لذت جس سے عارف پینتالیس برس بیت جانے کے بعد بھی نا آشنا تھا۔ اس نے غزال کی آنکھوں میں جھانکا اور خود سپردگی کے جذبات پا کر مزید نہال ہو گیا۔ سرشاری اب تند بارش جیسی بوچھاڑ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

عارف بلخی اپنے بستر پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے وہ بستر کانٹوں کا مسکن محسوس ہو رہا تھا۔ بدن پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اس خواب کی وحشت اب بھی اعصاب پر قابض تھی۔ وہ غیر مانوس سی سنسنی، لذت، سرور اور سرشاری بھی ہنوز جسم و جاں میں ہلکورے لے رہی تھی۔ عارف نے شدتِ اذیت سے سر دائیں بائیں پٹخا لیکن اس کیفیت میں رتی بھر تبدیلی نہ آئی۔ احساسِ بے بسی نے آنکھوں میں آنسوؤں کی باڑ پیدا کر دی۔ وہ کسی ایسے بچے کے مانند زار و قطار رو رہا تھا جو اپنی ہی کسی غلطی سے گھر کا رستہ بھول کر دوراہے پر آ گیا ہو اور اب اصل رستہ کھو دینے کا خدشہ، کسی سزا کا خوف جان نکالنے کے درپے ہو۔ آنسو چہرے سے پھسل کر گریبان بھگوتے رہے۔ گریہ وزاری نے آنکھیں متورم، دماغ بوجھل اور مزاج میں ایک سناٹا پیدا کر دیا لیکن اس کے باوجود اطمینان کہیں سے بھی نصیب ہو کے ہی نہ دے رہا تھا۔

اگلی صبح کا آغاز ہی بہت ہنگامہ خیز تھا۔ اس نے حسبِ سابق نماز اور تسبیحات کا آغاز کر کے اپنے انتشار پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی لیکن اب حالات و واقعات ایک غیر متوقع موڑ لے کر اس کے لیے نیا آزار ثابت ہونے لگے۔ نمازِ فجر سے فراغت پاتے ہی خیمے میں معتقدین کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"کہو! کیسے آنا ہوا عبدالمالک؟" اس نے اپنے

پہلے معتقد کو دیکھ کر استفسار کیا۔ وہ درمیانہ قدوقامت، متوازن صحت اور گول چہرے کا مالک تھا۔ ٹھوڑی سے نیچے آتی ڈاڑھی، قدرے سنجیدہ آنکھیں اور کم گو عبدالمالک ایک مثبت توانائی کا حامل شخص تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آج پہلی بار اس کی آنکھوں میں بھی سرخی نے جالا تان رکھا تھا۔ عارف بلخی یکدم چوکنا ہو گیا۔

''میں آپ سے ضروری مسئلے پر گفتگو کے لیے آیا تھا۔ وضو کے مسائل پوچھنے تھے مجھے۔'' عبدالمالک گڑبڑا گیا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے اس موضوع پر میں خانقاہ میں کئی بار بتا چکا ہوں بلکہ تم نے تو خوب دلجمعی سے اس محفل میں حصہ بھی لیا تھا۔'' عارف نے الجھ کر جواب دیا۔

''جی ہاں! آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہوا ہوگا۔ بس بندہ بشر ہوں نا تو ذہن سے نکل گیا۔ ابھی یاد کروں گا تو سب یاد آبھی جائے گا۔ اگر نہ آسکا تو آپ کے پاس دوبارہ حاضر ہو جاؤں گا۔'' عبدالمالک نے ترچھی نظروں سے رخشندہ کی طرف دیکھتے ہوئے بے ربطگی سے کہا۔ عارف کو اس کی آنکھوں میں سرخی شدید ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ یک لخت ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ جاری ہی ہو گیا۔ مختلف معتقدین کسی نہ کسی بہانے اس کے پاس آتے رہے۔ ان سب کے مسائل اور سوال مختلف تھے لیکن ایک بات بہرحال سب میں مشترک تھی کہ آنکھوں میں وحشت اور رخشندہ کے لیے دلچسپی پوشیدہ تھی۔ وہ اسے دیکھنے اور اس کی موجودگی محسوس کرنے کے لیے وہاں چکر کاٹ رہے تھے۔ عارف کی اذیت سوا ہونے لگی۔ وہ انہیں کس برتے پر اخلاقیات کی حدود یاد کرواتا؟ وہ تو خود ایک نادیدہ آتش میں جھلس رہا تھا۔

سارا دن اسی کشمکش اور آمدورفت میں بیت گیا۔ مغرب سے تھوڑی دیر قبل رشید اس کے پاس چلا آیا۔ وہ کافی پُرسکون اور خوش دکھائی دے رہا تھا۔

''کہاں رہ گئے تھے تم رشید...... میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا؟'' رخشندہ نے اسے دیکھتے ہی لگاوٹ سے کہا۔ عارف کے سینے میں ایک برچھی سی چبھی۔

''میں بہت ضروری کام میں الجھا تھا لیکن یقین کرو تمہارا خیال ایک لمحے کے لیے بھی دل سے جدا نہیں ہوا۔'' رشید نے بھی اسی گرمجوشی سے جواب دیا اور پھر عارف بلخی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''اعلیٰ حضرت! اپنی پریشانی کا خاتمہ ہی کیجیے اب۔ میں نے بھاگ دوڑ سے تمام بندوبست کر لیا ہے۔ حالات میرے قابو میں ہیں۔ سواری کا بندوبست بھی ہو چکا ہے۔ میں آج رات ہی رخشندہ کو ساتھ لے کر نکل جاؤں گا۔ آپ کی کرم فرمائی اور تعاون کا بہت شکریہ۔''

''شکر ہے خدایا!'' عارف کے کچھ بھی کہنے سے قبل رخشندہ بول اٹھی۔ ''میرا تو دم گھٹنے لگا تھا یہاں۔''

''کیوں؟ ایسا کیا ہو گیا؟ میرا تو خیال تھا کہ تم یہاں بالکل محفوظ اور خوش ہو گی۔'' رشید حیران ہوا۔ عارف نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔

''محفوظ اور خوش ہونا دو متضاد باتیں ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ''مجھے حقیقتاً ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی ایسی دنیا میں قید ہو گئی ہوں جہاں میرا وجود ہی نادیدہ ہو گیا ہے۔ اس دنیا کے رہائشی بس اپنی ذات میں مگن رہتے ہیں۔ انہیں کسی دوسرے کے جذبات، خوشی، دکھ یا الجھنوں سے سروکار ہی نہیں۔''

''تم شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ یہ ایک الگ دنیا ہے جہاں ہم جیسے گناہ گار اور دنیادار لوگوں کے لیے یہی سب ہے۔'' رشید نے بھی افسردگی جتائی اور اسے بھرپور دلاسہ دینے کے بعد عارف کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے خیمے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی عارف کی طبیعت کا بوجھل پن مزید گہرا ہو گیا۔ رخشندہ کی باتیں کسی ناگ کے مانند ذہن میں کنڈلی مار کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس کے دل میں کئی بار رخشندہ سے گفتگو کرنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن اس نے بڑی سختی سے اپنی یہ تمنا کچل دی۔

''خود پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہیں حضرت؟'' کچھ لمحوں بعد رخشندہ نے خود ہی اسے مخاطب کیا۔ ''اتنا ہی جبر کیجیے جتنا سہا جاسکے۔''

''یہ کیسی بات کی تم نے؟ میں بھلا خود پر ظلم کیوں کروں گا؟'' عارف اس کی آواز و انداز کی نغمگی میں کھو گیا۔

''صبح سے دیکھ رہی ہوں۔ بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن پھر ارادہ توڑ دیتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا تمہیں واقعی یہاں بہت گھٹن محسوس ہو رہی ہے؟'' عارف نے پوچھا۔

''جی ہاں! میں نے بالکل سچ کہا تھا۔'' رخشندہ سنجیدہ ہوئی۔ ''بلکہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میری یہاں موجودگی آپ کے لیے کراہت و ناگواری کا سبب ہے۔ خودداری اور عزتِ نفس بھی کوئی جذبہ ہوتا ہے حضرت! اسے نظرانداز کر کے

یا پسِ پشت ڈال کر بھی جیا نہیں جا سکتا۔'' رخشندہ کے خیالات کی گہرائی عارف کو لحہ بہ لحہ حیران کر رہی تھی۔

''نہیں! ایسی بات ہرگز نہیں۔ ہم میں سے کسی کو بھی کراہت یا ناگواری محسوس نہیں ہو رہی بلکہ وہ تو......'' عارف نے جلدی سے کہا۔

''بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ آپ عورت ذات کو فساد کا سبب اور شر کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اس لیے گریز کی راہ اپناتے ہیں۔'' اس کے بے باک تجزیے پر عارف ایک بار پھر اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔

''ایسا ہی تو ہے...... ایسا ہی ہوتا آیا ہے...... اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔'' عارف نے اعتراف میں کوئی عار نہ سمجھا۔

''اس فلسفے کو خود ساختہ طور پر اپنی زندگیوں میں لاگو کرتے ہوئے آپ ایک بات فراموش کر گئے ہیں اعلیٰ حضرت! عورت بھی مرد ہی طرح ایک جنس ہے۔ جنس کی بھوک روٹی اور کپڑے کی طرح انسان کی جبلت میں گندھی ہوئی ہے۔ عورت صرف شر نہیں خیر بھی ہے۔ وہ تباہی نہیں بلکہ ذات وجذبات کی تکمیل ہے۔ عورت کے بغیر اس کائنات میں کوئی کار ممکن نہیں۔ اسے نظر انداز کرنے کا مطلب وہی گھٹن، جبر اور لاچاری ہے جو مجھے گزشتہ رات سے یہاں نظر آ رہی ہے۔ فطرت وجبلت ایک بہتا ہوا دریا ہے حضور! اسے بہتے ہی رہنے دیں تو دنیا اور آخرت سہل ہو گی۔ اس پر بند باندھیں گے تو ہر طرف سڑاند پھیل جائے گی۔ جینا دشوار ہو جائے گا۔'' رخشندہ کسی ناصح کی طرح سمجھانے لگی۔

عارف کی انا پر ضرب سی لگی۔ اسے اپنے پچیس سالہ زہد کا بہت خیال تھا۔ اپنے نظریات وموقف سے ذرا بھی ہٹ کر وہ اس ریاضت کو داغدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے ذہن میں اب اپنے ان معتقدین کا خیال گردش کر رہا تھا جو صبح سے اس خیمے کے قریب بھی نہ پھٹکے تھے۔ یہ ان کی ناراضگی کا اظہار تھا یا ایمان کی مضبوطی۔ عارف کسی فیصلے پر پہنچ نہ پایا لیکن ایک بات تو طے تھی کہ وہ خود سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ نمازِ عشا کے بعد حسبِ وعدہ رشید آیا اور عارف بلخی کا بھرپور شکریہ ادا کر کے رخشندہ کے ہمراہ کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

رخشندہ چلی گئی۔ اپنے ساتھ عارف بلخی کا سکون و اطمینان بھی لے گئی۔ وہ رات بے حد بوجھل تھی۔ نیند کا کہیں کوئی پتا ٹھکانا نہیں تھا۔ بے چینی ایسی کہ ہر تھوڑی دیر بعد بستر سے اٹھ بیٹھتا۔ بار بار پیاس سے حلق خشک ہونے لگتا۔ نظریں اس کونے کا طواف کرنے پر مجبور ہو رہی تھیں جہاں کچھ دیر پہلے ہی رخشندہ موجود تھی۔ اسے ایک معطر سی مہک ہر سو چکراتی محسوس ہو رہی تھی۔ جوں جوں رات ڈھلتی گئی عارف کے دل میں گداز بڑھتا گیا۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی جلن تھی۔ ایسی نمی، گداز اور مزاج میں سوز تو اسے کبھی بھی درپیش نہیں رہا تھا۔

وہ اپنی ان کیفیات اور تبدیلیوں سے الجھتا رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند ایک لمحے کے لیے بھی مہربان نہ ہوئی تھی۔ ان کروٹوں اور اضطراب کے نتیجے میں اس کا بدن بری طرح ٹوٹنے لگا۔ بوجھل پن اور کثافت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس شب پہلی بار عارف بلخی نمازِ تہجد ادا نہ کر پایا۔ کوئی دکھ سا دکھ تھا۔ ذہن پر تناؤ اور روح وقلب پر دباؤ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اسی کشمکش میں نمازِ فجر کا وقت ہو گیا۔ عارف اپنا دکھتا بدن گھسیٹ کر بدقت اٹھا۔ وضو کے مراحل میں وہ خالی الذہن تھا۔ کئی بار غلطیاں کیں اور پھر سب کچھ چھوڑ کر اپنے بال مٹھیوں میں بھینچ لیے۔

اگلی کوشش قدرے بہتر تھی۔ اطمینان تو بہرحال اب بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ اگلا مرحلہ اس سے بھی دشوار تر ہے۔ نمازِ فجر کی چار رکعات اسے بے حد طویل محسوس ہو رہی تھیں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر بھی کسی قسم کا سکون واطمینان نہ تھا۔ الفاظ سپاٹ اور بے تاثر سے انداز میں زبان سے ادا ہوتے رہے۔

''صوفی صاحب! آج طبیعت کچھ بہتر نہیں لگ رہی آپ کی؟'' اس کے معتقدِ خاص نے دریافت کیا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں ایسا کیوں محسوس ہوا؟'' عارف نے نظریں چرائیں۔

''آپ نے پہلی رکعت میں دو رکوع اور تیسری رکعت میں تین سجدے ادا کیے ہیں۔ اسی لیے تشویش ہو رہی ہے۔'' عبدالقدوس نے نرمی سے بتایا۔ وہ عارف بلخی کی کیفیت پر حیران اور دیگر ارادت مندوں کی چہ میگوئیوں پر شرمسار بھی تھا۔ ارادت مند دبے لفظوں میں یہی کہہ رہے تھے کہ رخشندہ کے جانے پر عارف ذہنی طور پر غیر حاضر رہنے لگا ہے۔ مزید تشویش اس بات کی تھی کہ آج دبے لفظوں میں ہونے والی یہ باتیں واضح منہ ماری کی صورت بھی اختیار کر سکتی تھیں۔

اس روز قافلے نے پڑاؤ اٹھا لیا۔ اب وہ بلخ کی

مرکزی آبادی میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں قیام قدرے طویل ثابت ہونا تھا کیونکہ تاجروں نے اپنا اسباب مقامی سطح پر فروخت کرنا تھا۔ دوسرا گروہ بردہ فروشوں کا تھا۔ انہوں نے بھی بغداد جانے سے پہلے یہیں خیمہ زن ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ تیسری جماعت عارف بلخی کے ارادت مندوں کی تھی۔ وہ بھی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر کچھ عرصہ یہیں مقیم رہنے پر تیار تھے۔ تنہا سفر پُرخطر ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کی یہ عارضی خیمہ بستی آتش کدہ نوبہار کے پاس ہی تھی۔ یہاں پہنچ کر بھی عارف بلخی کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ خیمے کی محدود فضا اب اسے وحشت زدہ کرنے لگی تھی۔ وہ خیمے میں بیٹھے چنیدہ ارادت مندوں کی موجودگی نظر انداز کر کے یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا ہے اعلیٰ حضرت؟'' عبداللہ اسے باہر جاتے دیکھ کر استفسار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہم ایک نئی سرزمین' نئے علاقے میں آئے ہیں۔ اس علاقے کی سیاحت بھی تو کرنی چاہیے۔'' اس کی منطق پر سب چونک گئے۔ خانقاہ میں رہ کر عبادت و ریاضت کا درس دینے والا عارف بلخی بہت تبدیل دکھائی دے رہا تھا۔

''پروردگار کی سرزمین بہت متنوع ہے۔ ہر سو قدرت کی دلکشی کے نظارے بکھرے ہیں۔ ہمیں ان دلکش نظاروں اور رب ذوالجلال کی تخلیق کردہ ہر چیز میں اس کی ذات کو تلاشنا چاہیے۔'' وہ سادگی سے کہتا انہیں مزید حیرت زدہ کر رہا تھا۔

ارادت مند سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ عارف بلخی کا کون سا روپ ہے جو آج سے قبل سامنے نہیں آیا تھا۔ ان کے ذہنوں میں بھی دیگر معتقدین کی وہی چہ میگوئیاں گردش کرنے لگیں لیکن وہ کوئی بھی حتمی رائے قائم کرنے میں کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''کون آنا چاہے گا میرے ساتھ؟'' ان کی کیفیات سے بے خبر عارف نے پوچھا۔

''میں چلوں گا اعلیٰ حضرت! میں ہر قدم' ہر موڑ پر آپ کے ساتھ ہوں۔'' عبدالقدوس فوراً آگے بڑھا۔ اس کی دیکھا دیکھی عبداللہ نے بھی حامی بھر لی۔

عارف ان کے ہمراہ آتش کدہ نوبہار کی تاریخی عمارت میں داخل ہو گیا۔ اندرونی ماحول بے حد منفرد اور پراسرار تھا۔

''مجھے یہاں ایک عجیب اسرار کیوں محسوس ہو رہا ہے؟'' عبدالقدوس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

خود عارف بھی کسی سوچ میں گم دکھائی دے رہا تھا۔

''تم جانتے ہو میرے آبا و اجداد کا اس مقام سے بڑا گہرا تعلق ہے۔'' عارف نے انہیں بتایا اور کسی بھی جوابی ردعمل کا انتظار کیے بغیر مزید گویا ہوا۔

''میرے اسلاف یہاں موبد تھے...... مذہبی پیشوا۔ ان کی عزت و عظمت کا کوئی ثانی نہ تھا۔''

''حضرت! میں نے سنا ہے کہ موبد حکومت یا اعلیٰ عہدوں کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت بااختیار ہوتے تھے۔'' عبداللہ نے اپنا تجسس بیان کیا۔

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے میرے بچے! وہ اتنے بااختیار تھے کہ شہنشاہِ ایران کے سفیر یا خصوصی نمائندوں کو بھی ملاقات کے لیے ان کی خصوصی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اگر وہ ملاقات سے انکار کر دیتے تو خود شہنشاہ میں بھی اتنی تاب نہ ہوتی تھی کہ اس انکار کو جبری طور پر اقرار میں تبدیل کروا سکیں۔'' اس کے انداز میں فخر در آیا تھا۔

''آپ کے آباء نے یہاں کے عروج کی بابت بھی تو کچھ بتایا ہوگا۔ میں مسلسل یہی سوچ رہا ہوں کہ اس وقت آتش کدے کی ہیبت اور شان و شوکت کا کیا عالم ہوگا جب ایران ایک آتش پرست ملک اور یہ عبادت گاہ درجۂ اول کی عمارت ہوا کرتی تھی۔'' عبداللہ کے سوال نے عارف بلخی کے ذہن میں کئی بھولی بسری باتیں تازہ کر دیں۔

''پارسی مذہب کے بانی ''زردشت'' نے تیس برس کی عمر میں اپنی بزرگی کا اعلان کیا تھا۔ اس کا اثر و رسوخ خراسان کے مقام ''کشمار'' پر زیادہ تھا۔ پہلے وہاں ملکہ اور وزیر کے دونوں بیٹے اس کے پیروکار بنے پھر شہنشاہ گستاسپ نے بھی یہ مذہب قبول کر لیا۔ پیروکار بڑھتے گئے۔ آتش پرستی کے رجحان میں اضافہ ہوتا رہا پھر وہ وقت آیا جب تورانیوں کے دوسرے حملے میں ایک تورانی سپاہی نے زردشت کو اسی عبادت گاہ میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میرے آباء بتاتے تھے کہ اس عبادت گاہ کی ہیبت ہی نرالی تھی۔ کوئی بھی سمت بتوں سے خالی نہ تھی۔ ان بتوں کے پیروکار انہیں دیبا' حریر کے بیش قیمت لباس پہناتے۔ موبدوں کی رہائش کے لیے خصوصی حجرے بھی یہیں قرب و جوار میں قائم تھے۔ ان تین سو ساٹھ حجروں کی تعداد ایک مکمل بستی معلوم ہوتی۔ اسلام برحق ہے۔ وہ اپنی حقانیت اور آفاقیت سے ہر رنگ پر غالب آ جاتا ہے۔ ہم پروردگار کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے کہ ہم نے ہدایت کی راہ پائی ہے۔'' عارف نے تسبیح کو بوسہ دیا۔

آتش کدے کا دورہ اور معائنہ ختم ہوا تو وہ دونوں عارف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ان کا گمان تھا کہ اب وہ خیمے میں واپسی کی راہ لے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ عارف کی نگاہیں مقابل سمت میں ایک سڑک پر مرکوز تھیں جہاں ترتیب سے کچھ مکانات بنے تھے۔ اس نے قدم اسی جانب بڑھا دیے۔ عبداللہ اور عبدالقدوس کے پاس خاموشی سے اس کے پیچھے چلتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مکانات کے پاس جاتے ہی انہیں احساس ہوا کہ یہاں آتش پرستوں کی ہی رہائش ہے۔ مکانات کی تزئین و آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ رہائشیوں کا شمار امراء و خواص میں ہے۔ وہ متجسس نظروں سے ہر ایک شے کا جائزہ لیتے آگے بڑھتے رہے۔

چند گز کا فاصلہ طے ہونے کے بعد عارف کو ایک نہایت منفرد اور خوش کن آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ کسی مکان سے بربط بجانے کی آواز آرہی تھی۔ اس کے دل میں فوری طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہے بربط کے ساتھ کوئی مترنم شیریں آواز اور گنگناہٹ بھی سنائی دے جائے۔ کئی لمحات تک وہاں کھڑے رہنے کے باوجود جب سماعت کی تشنگی دور نہ ہوئی تو وہ مایوس ہو گیا۔ عبداللہ اور عبدالقدوس بڑی گہری نظروں سے اس کی ہر ایک حرکت کا معائنہ کررہے تھے۔ بربط کی آواز پر اس کا ردعمل انہیں دکھی سا کر گیا۔ رہائشی علاقے سے آگے بڑھتے ہی وہ ایک بازار میں پہنچ گئے جہاں خریداروں اور اشیائے خریداری دونوں ہی کثیر مقدار میں تھے۔ ایک مقام پر پنجروں میں خوش رنگ خوش الحان پرندے مقید تھے۔ ان کے ہر ایک انداز میں افسردگی اور شکستگی تھی، گویا قید نے مایوس اور آزاد فضاؤں کی یاد نے بے حال کردیا ہو۔

''کس قدر ظالم ہے انسان بھی!'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''فطرت بھی قید کی جاسکتی ہے بھلا؟''

دونوں معتقدین خاموشی سے سنتے رہے۔ انہیں عارف کی خلافِ معمول حرکات بالکل سمجھ نہ آرہی تھیں۔ کچھ قدم اور آگے بڑھے تو ایک اور منظر نے قدم ساکت کر دیے۔ وہاں انسانی منڈی لگی تھی۔

''بہت بہترین موقع پر آئے ہیں آپ!'' ایک خرانٹ صورت شخص نے اسے مخاطب کیا۔ ''آج میرے پاس زبردست نگینے موجود ہیں۔ صحت مند، سلیقہ شعار، خوش گفتار اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ۔ نگاہِ کرم اٹھا کر تو دیکھیے! دام بھی نہایت مناسب ہیں۔''

اس بیوپاری کی بات پر عارف ہی نہیں بلکہ عبداللہ اور عبدالقدوس کے چہرے بھی متغیر ہو گئے۔ انسانی تجارت کے بارے میں کسی سے علم ہونا اور بات تھی لیکن اس طرح آنکھوں کے سامنے ان مناظر اور ایک سے بڑھ کر ایک وجود کی دید بالکل منفرد تجربہ تھی۔

''ہچکچایئے مت جناب! اس میں کچھ غلط تو نہیں۔'' بیوپاری نے مزید شیرینی جتائی۔ ''لونڈیاں اور کنیزیں رکھنے کی تو مذہب میں بھی اجازت ہے۔'' وہ جہاں دیدہ شخص اس کی رمز سمجھ گیا تھا۔

''عورت کی ذات میں بہت سے فتنے پوشیدہ ہیں۔ اس کا شر راہیں کھوٹی کردیتا ہے۔'' عارف نے نظریں چراتے ہوئے اس بیوپاری کو جواب دیا۔ لہجے اور انداز میں سابقہ مضبوطی مفقود تھی۔ یہ کھوکھلا پن بیوپاری کے علاوہ دونوں ارادت مندوں کو بھی محسوس ہوا۔ بیوپاری معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔ آپ ہم سے زیادہ دین اور دنیا کے معاملات جانتے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کسی کنیز کی ضرورت ہو تو اس ناچیز کو ہی یاد کیجیے گا۔ بہترین نگینہ دکھاؤں گا۔'' وہ پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔

عارف اسے نظرانداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے خیمے میں واپسی کا ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

خیمے سے باہر اس مختصر سے دورے نے عارف کو تھکا دیا تھا۔ مزاج پر خاموشی پہلے سے بھی زیادہ طاری ہوچکی تھی۔ عشا کی نماز سے فراغت پا کر وہ اسی خاموشی کی ردا اوڑھے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ وہ اس وقت خود احتسابی کے کڑے عمل سے گزر رہا تھا۔ آج دن بھر پیش آنے والے معمولات نظرانداز کیے جانے کے قابل ہرگز نہ تھے۔ سوچ و نظریات کی یہ تبدیلی پریشان کن تھی۔ ضبط کا دامن مزید تار تار ہوتا تو ربع صدی کی ریاضت خاک میں مل جاتی۔ مداوا تو کہیں بھی نہ مل پاتا۔

کچھ روز اسی کشمکش اور خود احتسابی میں بیت گئے۔ معتقدین کی آمد و رفت اور معمولات جاری رہے۔ ایک دن خیمے میں چند اجنبیوں کی آمد ہوئی۔ ان کے لباس، انداز اور اطوار غیر معمولی تھے۔ ان میں وقار اور شاہانہ عکس جھلکتا تھا۔

''ہم خراسان کے عامل کی جانب سے آئے ہیں حضرت!'' ان کے سربراہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''کہیے! کیا خدمت کرسکتا ہوں آپ کی؟'' عارف

نے خوش خلقی اور نرمی سے جواب دیا۔

''آپ کے زہد و کرامات کے چرچے سنے تھے حضور! آپ جیسی عظیم ہستی سے ملاقات کی تمنا کھینچ لائی ہے یہاں۔'' سربراہ کے اس جواب پر عارف سر جھکائے اپنے ہونٹ کچلنے لگا۔ وہ انسانی فطرت کے اس پہلو سے واقف تھا اور قدرے بیزار بھی۔ کسی بھی نیک یا راہِ حق کے متلاشی فرد کی ذات سے مختلف کرامات، قصے اور توقعات منسوب کر لینا ایک عام بات تھی۔ عارف بلخی کا دل لرز کر رہ گیا۔ اپنی کمزوریاں اور کوتاہیاں اسے شرمسار کر رہی تھیں۔

عامل کے نمائندۂ خصوصی نے اس کے جھکے ہوئے سر کو عاجزی پر محمول کرتے ہوئے عقیدت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے ساتھ لایا ہوا ایک چوبی منقش صندوق اس کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ حقیر سا نذرانہ قبول کیجیے۔ ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔'' اس نے التجا کی۔ عارف کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''دعائیں دل کی تمکین ہوتی ہیں محترم! انہیں یوں معاوضہ دے کر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔'' اس نے نرمی سے جواب دیا۔

''ہم ایسی جسارت کیسے کرسکتے ہیں اعلیٰ حضرت! یہ تو آپ کے لیے عزت مآب عامل نے چند تحائف بھجوائے ہیں۔''

''مجھے ان کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ آپ انہیں میری طرف سے غرباء اور مستحق افراد میں تقسیم کردیجیے گا۔'' عارف کے دوٹوک انداز پر وہ نمائندے مزید کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کرسکے۔

ان کے جاتے ہی عارف کو اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹتا محسوس ہوا۔ دل میں خوشی کی ایک لہر بھی موجزن تھی کہ اس نے دنیاداری سے پیدا ہونے والی رغبت کو پچھاڑنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ چند روز مزید گزرے تو ایک اور حیرت مجسم روپ میں اس کے سامنے چلی آئی۔ علم ہوا کہ خراسان کا عامل بنفسِ نفیس ملاقات کے لیے آیا ہے۔ عارف نے گرمجوشی سے معانقہ کیا اور مہمان نوازی کے بہترین آداب نبھائے۔

''حضرت! آپ کی دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔'' عامل نے اصل مدعا بیان کیا۔

''پروردگار آپ کی سب مشکلات آسان فرمائے!'' عارف نے خشوع و خضوع سے کہا۔

''آپ نے میرے بھیجے گئے نذرانے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ میں التجا کرتا ہوں کہ اس فیصلے پر کوئی نظرِ ثانی کیجیے۔''

''بار بار اصرار سے شرمندہ نہ کیجیے۔ ہمیں اس مال و دولت کی کوئی تمنا نہیں ہے۔'' عارف نے اسے بھی دوٹوک جواب دیا۔ عامل نے مناسب الفاظ میں مزید اصرار کیا لیکن اس کا انکار اٹل رہا۔ خیمے سے واپسی کے وقت عامل اس کی بے نیازی اور کردار کی پختگی سے متاثر ہو کر رخصت ہوا تھا۔

☆☆☆

عارف ظہر کی امامت کے بعد اپنے خیمے میں واپس آیا تو اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال بچھا تھا۔ چہرہ تشویش، بے یقینی اور تاسف کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے عبدالقدوس کو اپنے پاس طلب کرلیا۔

''آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں حضرت؟'' اس نے عارف کی کیفیت فوراً بھانپ لی۔

''پریشانی کی بات تو ہے۔ میں ایک دو روز سے دیکھ رہا ہوں کہ نمازیوں کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے۔ آج تو گویا حد ہی ہوگئی۔ ایک تہائی سے زیادہ نمازی غیر حاضر تھے۔ کہیں کسی مرض میں تو مبتلا نہیں ہوگئے؟'' وہ فکرمند تھا۔

''مرض ہی سمجھیے حضور! آپ کا کشف بالکل درست سمجھا۔ انہیں مرض ہی لاحق ہوا تھا...... طمع کا مرض۔'' عبدالقدوس نے ندامت سے بتایا۔

''کھل کر بات کرو میرے بچے! کیا مسئلہ درپیش ہوا ہے انہیں؟'' عارف الجھ گیا۔

''انہیں اس بات پر خدشات لاحق تھے کہ آپ نے خراسان کے عامل کی پیش کش کیوں ٹھکرادی؟ کہنے لگے اگر وہ تحائف مریدوں میں بانٹ کر ان کی زندگیاں آسان کر دی جاتیں تو کیا حرج تھا؟ اسی بات کو بنیاد بنا کر وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔'' عبدالقدوس کی پیشانی عرق آلود ہونے لگی۔ اسے اپنے ساتھیوں کی اس سوچ و عمل پر سخت شرمندگی تھی۔

''مال و دولت کے لیے ایسی رغبت راہِ حق میں اکثر آزمائش بن کر بھی آتی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ہم سب کی آزمائش تھی جس میں کامیابی اور ناکامی کا تناسب تمہارے سامنے ہی ہے۔ جو ہوا بہتر ہے۔ ہمیں بہترین کے لیے دعاگو رہنا چاہیے۔'' عارف نے متانت سے اسے سمجھایا۔ عبدالقدوس نے سر جھکا دیا۔

عارف اپنی عبادات و اذکار میں مشغول ہوگیا۔ بظاہر وہ بہت پُرسکون، بے نیاز اور قانع نظر آرہا تھا لیکن درونِ خانہ پیدا ہونے والے تغیرات اس کے لیے اب بھی شدید

پریشان کن تھے۔اپنے معمولات میں ارتکاز کے باوجود نظریں خیمے کے اسی کونے پر بھٹکنے لگتیں جہاں رخشندہ نے قیام کیا تھا۔اسے خیمے کے اس کونے سے دلفریب سی مہک چکراتی محسوس ہوا کرتی۔کبھی کبھی دل چاہتا کہ وہ اس بستر پر لیٹ کر خوشبو کا پیراہن اوڑھ لے۔ رخشندہ کی مترنم آواز خوبصورت کلام ساعت میں اکثر گونجتا اور دل بے اختیار مچلنے لگتا کہ مظاہر کائنات کی کھوج کا ایک بار پھر آغاز کیا جائے۔ ضبط کا یارانہ رہا تو اس نے خیمے سے باہر جانے کا ارادہ کر لیا۔اس بار عبدالمالک اور تبریز اس کے ہمراہ تھے۔

عارف کے قدم آتش کدے کی جانب اٹھ گئے۔

اسے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ یہاں کیوں چلا آیا ہے؟علم تھا تو بس اتنا کہ بصارت کسی حسین و نازک پیکر کی دید چاہتی ہے۔ساعت شیریں آواز کی طالب ہے۔اپنے ان خیالات سے الجھنے اور شرمساری کی کشمکش بھی بدستور جاری تھی۔اسی پل عارف کو آتش کدے میں ایک لڑکی داخل ہوتی نظر آئی۔ سراپا نوجوان اور دلکش تھا۔اس کے عقب میں ایک ادھیڑ عمر عورت بھی تھی۔عارف کی نگاہیں لڑکی پر ساکت ہو چکی تھیں۔اسے ایسا محسوس ہوا کہ رخشندہ لباس تبدیل کر کے ایک بار پھر اس کے سامنے چلی آئی ہے۔اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور وہ بے اختیار لڑکی کے پیچھے چل دیا۔ اسے اپنے ہمراہ آئے ارادت مندوں کی پروا تھی نہ ہی ادھیڑ عمر عورت کی۔

لڑکی متوازن قدموں سے چلتی آتش کدے کے اس حصے کی جانب بڑھ گئی جہاں ''شت آفتاب'' کا بت نصب ہوتا تھا۔اس کی چال میں تمکنت اور بے نیازی تھی۔وہ مخصوص مقام پر پہنچ کر سجدہ ریز ہوئی اور مناجات ادا کرنے لگی۔ عارف پلکیں جھپکنا بھول گیا۔اسے خدشہ تھا کہ کہیں پلک جھپکنے کے اس معمولی عمل میں بھی وہ لڑکی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

عبادت سے فارغ ہوتے ہی لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس لمحے اس کی نظر اپنی جانب محویت سے دیکھتے ایک معصوم صورت شخص پر پڑی۔اس کے انداز میں ایسی تشنگی تھی کہ وہ گھبرا کر ایک طرف ہوئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔اس وقت تاکرے سے عارف کے علم میں آیا کہ وہ ہو بہو تو نہیں البتہ کافی حد تک رخشندہ سے مشابہ ہے۔اس اتفاق اور ستم ظریفی پر حیران ہوتا وہ بھی اس کے پیچھے لپکا۔

''میری بات سنیے محترم خاتون!میں آپ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

لڑکی ان سنی کر کے آگے بڑھ گئی۔

''آپ میرے بارے میں غلط گمان کر رہی ہیں۔مجھے ایک حیرت انگیز امر پر آپ سے بات کرنی ہے جس کا تعلق آپ کی ذات سے ہی ہے۔''اس نے ایک اور صدا دی۔

لڑکی کے قدموں میں مزید تیزی آگئی۔عارف کو اسے روکنے کی کوئی بھی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔اس کی نظریں لڑکی پر ہی مرکوز تھیں۔وہ اب ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ بیرونی دروازے پر پہنچ گئی تھی۔

''ارے!دیکھ کیا رہا ہے؟کیا اپنی زندگی میں آنے والا یہ دوسرا موقع بھی گنوا دے گا؟''عارف کے ذہن میں ایک طاقتور سوچ ابھری۔

''وہ رخشندہ نہیں ہے۔مجھے ہی مغالطہ ہوا۔''اس نے مایوسی سے سوچا۔

''رخشندہ نہ سہی لیکن اس جیسی تو ہے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی لڑکی تجھے نئی منازل سے آشنا کر دے۔''اس کے اندر تحریک پیدا ہوئی۔

''ایک بار رخشندہ کو کھو دیا ہے۔کیا دوبارہ بھی کھو دے گا؟اور اگر آج ایسا ہوا تو دوبارہ کہاں تلاش کرتا پھرے گا؟''ذہن کے کواڑوں پر دستک جاری تھی۔

عارف کو اس دستک کے شور میں کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔اس نے مزاحمت ترک کر دی اور اپنے قدم لڑکی کے پیچھے بڑھا دیے۔اسے اپنے اردگرد کوئی اور منظر یا شے دکھائی ہی نہ دے رہی تھی۔اس نے دونوں معتقدین کو بھی نظرانداز کر دیا جو حیرانی سے اس کی بے ربط جسمانی حرکات اور مضطرب آنکھیں دیکھ رہے تھے۔عارف کے قدموں کی تیزی نے جلد ہی درمیانی فاصلہ کم کر دیا۔دونوں خواتین اب گفتگو کرتے ہوئے سڑک کے کنارے پہنچ چکی تھیں۔ عارف کے دل میں خوش گمانی پیدا ہوئی کہ وہ اسی کے بارے میں بات چیت کر رہی ہوں گی۔

کچھ ہی دیر میں وہ اس سڑک پر واقع ایک مکان میں بڑھ گئیں۔مکان کی ظاہری ہیئت ،تزئین اور آرائش لاجواب تھی اور صفائی شاندار۔کہیں کسی کونے میں بھی گرد یا گندگی کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔بیرونی جانب ایک باغیچہ بھی تھا جس میں سرو کے درخت آنکھوں کو مزید تراوٹ بخش رہے تھے۔

''اس جیسی حسین لڑکی کی رہائش گاہ ایسی ہی دل فریب ہونی چاہیے۔مکان اور مکین دونوں ہی بے مثال

ہیں۔'' ذہن نے فوراً تجزیہ کیا۔ عارف کے چہرے پر پل بھر کے لیے سراسیمگی ابھر آئی۔ وہ لڑکی کے اس انتظار اور تعاقب کی لذت تو محسوس کر رہا تھا لیکن ان کیفیات سے کہیں نہ کہیں خائف بھی تھا۔

انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں۔ عارف اب مایوس ہونے لگا تھا۔ جانے کیوں اسے یہ امید تھی کہ وہ لڑکی اس کے پاس ایک بار ضرور آئے گی۔ امید بر نہ آئی تو شکستگی سے اٹھا اور واپس خیمے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس کے دل میں واحد اطمینان صرف یہ تھا کہ وہ نامراد نہیں لوٹا۔ رخشندہ سے مماثل اس لڑکی کی رہائش گاہ دیکھ لی ہے۔ ملاقات اور گفتگو کا کیا ہے؟ وہ تو پھر ہوتی رہیں گی۔

☆☆☆

خیمہ بستی میں شدید تناؤ اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔ کچھ دیر قبل عبدالمالک اور تبریز کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ سخت کبیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ آتے ہی خیمے سے باہر ایک بڑے پتھر پر سر نیہوڑائے بیٹھ گئے۔ عبدالقدوس ان کی اس حالت اور عارف کی غیر موجودگی پر تشویش زدہ ہو کر قریب چلا آیا۔

''اعلیٰ حضرت کہاں ہیں؟'' اس نے قرب وجوار کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ایک بہت ہی اہم کام کے لیے گئے ہیں۔ آجائیں گے کسی بھی وقت۔'' عبدالمالک کی آواز بھنچی ہوئی تھی۔

''ایسا کیا کام آن پڑا انہیں؟ تم لوگ ساتھ کیوں نہ گئے؟''

''ان کا ذاتی کام تھا وہ۔ ہم کیسے شامل ہو جاتے؟'' تبریز بھی اپنے جذبات پر بمشکل قابو رکھے ہوئے تھا۔

''پہیلیوں میں بات کیوں کر رہے ہو؟ کھل کر بتاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے؟'' عبدالقدوس جھنجلا گیا۔ کئی اور ارادت مند بھی وہیں چلے آئے تھے۔

''کھل کر جاننا چاہتے ہو تو پھر سنو! اعلیٰ حضرت ہمیں آتش کدہ نوبہار لے گئے تھے۔ معاملہ یہیں تک رہتا تو چلو ٹھیک تھا۔ پھر انہیں وہاں ایک لڑکی نظر آئی۔ وہ اس لڑکی سے کافی ملتی جلتی تھی جسے رشید خیمے میں لایا تھا۔ بس پھر کیا تھا؟ اعلیٰ حضرت اپنے حواس کھو بیٹھے۔ اس کے پیچھے آتش کدے میں گئے۔ یہی نہیں بعد میں ان کا ایسے تعاقب کرتے ہوئے سڑک پر واقع مکانوں تک گئے جیسے ان کے کھو جانے سے شدید خوفزدہ ہوں۔ ہم نے سڑک کے کنارے سے دیکھا تھا آخری بار انہیں۔ اسی کے مکان پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔'' عبدالمالک کے اس انکشاف پر سبھی دنگ رہ گئے۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' عبدالقدوس بے یقین تھا۔

''ایسا ہو چکا ہے۔ سچ بتاؤ! کیا تمہیں اعلیٰ حضرت کے مزاج میں یہاں آنے کے بعد تبدیلیاں محسوس نہیں ہو رہیں؟'' تبریز نے پوچھا۔ عبدالقدوس کے پاس خاموشی ہی واحد جواب تھی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم!'' ایک اور ارادت مند نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''میں اس حلقے میں نیا سہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے یہاں آکر مایوسی ہی ہوئی ہے۔ اعلیٰ حضرت سے وابستہ کرامات میں کوئی صدق نظر نہیں آیا فی الحال۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' شمس نامی ایک شخص بولا۔ ''اگر وہ اتنے ہی باکمال تھے تو پچیس برس بعد بھی ایسے سفر اور کسی مرد کامل کی تلاش کیوں پیش آگئی؟''

''یہ کیسی لغو گوئی کر رہے ہو تم لوگ؟'' عبدالقدوس کی برداشت کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ ''تم سب شاید بھول رہے ہو کہ اعلیٰ حضرت نے طویل ریاضت کی ہے۔ وہ غنی اور مال و دولت سے بے نیاز ہیں۔ ان کے کردار میں کوئی کجی نہیں۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ! ان کی تعلیمات ونظریات کی بنیاد ہی کیوں لڑکھڑا گئی ہے؟ جب بنیاد ہی قائم نہ رہے تو عمارت ریت کی طرح بھربھرا جاتی ہے۔ میں اس ڈوبتے سفینے میں مزید سوار نہیں رہ سکتا۔ اپنے لیے کوئی بے ریا اور قول وفعل میں یکساں مرشد کی تلاش کرلوں گا۔'' عبدالمالک نے اعلان کیا۔ کئی افراد اس کے ہمنوا دکھائی دینے لگے۔ چند ایک اب بھی عارف کے حق میں دلائل دے کر اس کی حمایت کر رہے تھے۔ عبدالقدوس اس نئی صورتِ حال پر خود بھی چکرا گیا تھا۔

☆☆☆

نمازِ فجر کی تکمیل ہو چکی تھی۔ آسمان پر تاریکی کے پردے بھی چھٹ گئے تھے۔ ایک نئی اجلی اور سہانی صبح طلوع ہوئی تو عارف کے دل میں تمناؤں کی کلیاں بھی سر اٹھانے لگیں۔ انتظار کی لذت...... میٹھی میٹھی سی کسک بن کر رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ اس نے ایک ہی لمحے میں دوبارہ اسی مکان پر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ سرشاری اور محویت ایسی تھی کہ کسی بھی مرید کو ساتھ لے جانے کا بھی نہ پوچھا۔ چہ میگوئیاں بڑھتی گئیں اور دو تجسس پسند مرید اس کے تعاقب میں چل دیے۔ عارف اپنی سوچوں میں اس قدر مگن تھا کہ اسے تعاقب کا بالکل احساس نہ ہو سکا۔ جوں جوں فاصلہ کم

ہو رہا تھا اس کی سنسنی میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔
مکان آج بھی بالکل خاموش تھا۔ کہیں کوئی آہٹ یا سرسراہٹ نہ تھی۔ وہ گزشتہ روز ہی کی طرح کونے میں کھڑا ہو گیا۔ لذت تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وقت بہت دھیمی رفتار سے گزر رہا تھا۔ بالآخر مراد بر آئی۔ مکان سے ایک کھڑکی کھلی اور اوٹ سے لڑکی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ عارف اس مسکراہٹ میں کھو کر رہ گیا۔ چہرے پر خوشی کسی آبشار کی طرح بہنے لگی۔
''مجھے ایسے ہی کسی انکشاف کی توقع تھی۔'' ایک مرید نے تاسف سے سر ہلایا۔
''اور مجھے اب بھی اپنی بصارت پر یقین نہیں ہو رہا۔'' دوسرا دکھی تھا۔
''یقین کرنے یا نہ کرنے کے لیے اب کون سی گنجائش باقی رہ گئی ہے؟ سب کچھ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اعلیٰ حضرت چوری چھپے اس لڑکی سے ملنے آتے ہیں۔ شناسائی بھی بہت لگتی ہے۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ یونہی تو نہیں ہوا کرتا۔ میں ابھی یہ سارا واقعہ سب کو جا کر سناتا ہوں۔ ہمیں کوئی نہ کوئی حتمی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔'' پہلا مرید تلملاتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں عارف کا مزید انتظار کیے بغیر واپس چلے آئے۔
دوسری جانب عارف بھی ایک نئی لذت سے آشنا ہو کر وہاں سے لوٹ آیا۔ اس روز اسے مسکراہٹ کا توشہ ملا تھا جس کا خمار سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ظہر سے قبل عارف اپنے ساتھیوں میں لوٹا تو ماحول میں کشیدگی تو محسوس ہوئی لیکن دل و دماغ کسی بھی ایسی صورت حال کے متعلق سوچنے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ نمازیوں کی واضح کمی کے متعلق البتہ اسے کافی تشویش تھی۔ عبدالقدوس سے بات چیت میں اندازہ ہوا کہ نصب شدہ خیمے سمیٹنے کا آغاز ہو گیا ہے اور قافلہ کسی بھی وقت کوچ کر جائے گا۔ عارف کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔
''میں ابھی یہیں قیام کروں گا۔ قافلے کو اطلاع دے دو۔''
''لیکن آپ تو بغداد......'' عبدالقدوس شدت حیرت سے گنگ ہونے لگا۔
''ہاں! بغداد تو جانا ہی ہے لیکن فی الحال میں یہیں رہوں گا۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا۔
''اعلیٰ حضرت! قافلے میں پہلے ہی بہت باتیں اور افواہیں......'' وہ اس بار بھی اپنی بات مکمل نہ کر پایا۔
''راہِ حق میں ایسی باتوں اور افواہوں پر کان نہیں دھرے جا سکتے۔'' عارف کی بے نیازی سوا تھی۔ ''میں کچھ عرصہ بلخ میں ہی رہوں گا۔''
عبدالقدوس نے اس کے ارادے میں کوئی لچک نہ دیکھی تو اہلِ قافلہ کو اطلاع دینا ہی بہتر سمجھا۔ معنی خیز نظروں کا تبادلہ اور طنز بھرے جملے اس کا دل خون کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک جماعت نے عارف بلخی سے بالمشافہ ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ ہجوم کا یہ اشتعال بڑھنے لگا تو معاملہ فہم افراد نے صورت حال کو ٹھنڈے مزاج سے قابو کرتے ہوئے صرف ایک معتبر شخص کو یہ ذمے داری سونپ دی۔ عارف بلخی نے اس کا استقبال سابقہ خوش دلی سے ہی کیا۔ اس کے ذہن میں کسی قسم کی کوئی منفی سوچ نہ تھی۔
''اعلیٰ حضرت! میں آپ کے پاس بہت اہم موضوع پر گفتگو کے لیے آیا ہوں۔ آپ کے حلقے میں پیدا شدہ اضطراب سے تو آپ واقف ہی ہوں گے؟''
''ہاں! مجھے علم ہوا تھا کہ خراسان کے عامل کی آمد پر موصول ہونے والے تحائف پر نظر تھی۔ لوٹا دینے پر خفا ہو گئے سب۔'' عارف نے اپنی فطری سادگی کے تحت جواب دیا۔
''اس کے بعد بھی تو انہیں بہت سے شکوے ہیں۔ اس بارے میں کچھ علم نہیں ہے کیا آپ کو؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔
''نہیں! کیسے شکوے؟ اس کے بعد تو ایسا کچھ بھی ہوا ہی نہیں۔'' عارف کے انداز میں بھی کسی قسم کا کوئی تصنع نہ تھا۔ نمائندہ مزید حیران ہوا۔
''حضرت! آپ ہمارے پیر و مرشد ہیں۔ ہم آپ کی بات پر آنکھیں بند کیے یقین کرتے رہے۔ آپ کے کردار و افعال میں کبھی کسی نے کھوٹ نہ پایا۔''
''الحمدللہ...... کھوٹ تو اب بھی کہیں نہیں ہے۔ طمع کا مرض انہیں لاحق ہوا اور انہوں نے جماعت سے کنارہ کشی کر لی۔ پروردگار ان کے حال پر رحم فرمائے۔'' عارف نے ایک بار پھر سادگی سے جواب دیا۔
''لیکن ایک گروہ تو اس لیے کنارہ کش ہوا ہے کہ انہیں اپنے پیر و مرشد کے قول و فعل میں تضاد نظر آنے لگا تھا۔ آپ خود سوچیے کسی مرید کے لیے یہ صورت حال تکلیف دہ نہیں ہے کیا؟'' اس نے دکھ سے کہا۔
''کبھی کبھی بظاہر جو نظر آتا ہے درحقیقت ویسا کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کو تصویر کے دونوں پہلو دیکھنے چاہئیں۔'' عارف اب بھی بے نیاز ہی نظر آتا تھا۔
''حضرت! آپ ہی تو کہتے تھے کہ عورت کا وجود

تصوف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آپ ہی ہم سب کو درس دیتے تھے کہ اس نرم و نازک پیکر میں شر پوشیدہ ہے۔ یہ انسان کو اس کے مقصد بھلا دیتی ہے۔''
''میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔''
''تو پھر ایک غیر مسلم لڑکی سے آشنائی کیسی؟ اس کے گھر جانے کا بھلا کیا مقصد؟ اس سے روابط بڑھانے کی کیا منطق؟'' نمائندے کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔
''میں تصوف کو ایک نئے زاویے سے تسخیر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کائنات کے ہر مظہر میں خالق کی صفات پوشیدہ ہیں۔ ہمیں یہ تلاش جاری رکھنی چاہیے۔'' اس نے اپنے عمل اور منطق کی توجیہہ بلا جھجک بیان کر دی۔
''یعنی آپ اسی راہ کو اختیار کیے رکھیں گے؟'' نمائندے نے دکھ سے پوچھا۔
''ہاں! میں اس نئے زاویے سے اپنی تلاش کا سفر جاری رکھوں گا۔'' وہ دوٹوک بولا۔
''جماعت کی ایک کثیر تعداد آپ سے کنارہ کش ہونے کے لیے تیار ہے۔ انہیں یہ بے عملی اور قول و فعل کا تضاد گوارا نہیں ہے۔ وہ اسے سراسر منافقت قرار دے رہے ہیں۔''
''یہ ان کی ذاتی صوابدید ہے میرے بچے! میں کسی کو زبردستی اپنے ساتھ تو نہیں باندھ سکتا۔ انہیں اپنے لیے جو راہ بہتر لگتی ہے وہ اسے اختیار کرلیں۔'' عارف کے اس جواب کے بعد کسی بحث کی گنجائش نہ تھی۔
نمائندے نے اس کی ''بے دینی'' اور ''گمراہی'' کے متعلق بلا کم و کاست سب کچھ بیان کر دیا۔ قافلے میں دکھ، اضطراب اور اشتعال کے جذبات سلگنے لگے تاہم ایک بار پھر معاملہ فہم افراد نے صورتِ حال پر قابو پا لیا۔ شام تک وہ میدان خیموں سے خالی ہو چکا تھا۔ عارف کے ہمنوا صرف دس افراد تھے جنہیں اب بھی اس کے ہر عمل پر بھرپور یقین تھا۔ ان کا گمان تھا کہ اس نئی راہ میں بھی ضرور ان سبھی کے لیے کوئی نہ کوئی بہتری ہوگی۔ ڈیڑھ سو خیموں کی وسیع بستی سمٹ کر اب صرف چار خیموں تک محدود رہ گئی تھی۔
اگلے دو روز تک روانگی کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ عارف اپنے جذبات پر بمشکل بند باندھے ہوئے تھا۔ اس کا دل مسلسل اس آتش پرست لڑکی سے ملنے کی تمنا میں مچل رہا تھا اور دماغ کسی شریر بچے کی طرح اسے ہر لحظہ تحریک دینے میں مگن تھا۔ تیسرے روز جب ضبط کا یارا نہ رہا تو وہ چاشت کی نماز سے فراغت پا کر کشاں کشاں آتش کدے کی سمت بڑھ گیا۔ لڑکی کے مکان سے آتش کدے کی عمارت واضح دکھائی دیتی تھی۔ وہ حسبِ سابق مکان کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اسے توقع تو یہی تھی کہ اس روز بھی طویل انتظار کے بعد ہی گوہرِ مقصود کا دیدار نصیب ہو سکے گا لیکن قسمت کچھ مہربان نظر آتی تھی۔ لڑکی پہلے سے ہی کھڑکی میں موجود تھی۔ اس کے انداز سے یہ بھی واضح محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کی آمد کی منتظر بھی تھی۔ عارف کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ کھڑکی بند ہو چکی تھی لیکن اس کا دل ایک ہی بات دہرا رہا تھا کہ آج کوئی نہ کوئی پیش قدمی ضرور ہوگی۔
دل کا یہ نقارہ بالکل درست تھاپ دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ادھیڑ عمر خاتون قرب و جوار کا جائزہ لیتی ہوئی اس کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ اس کی چال میں عجلت اور انداز بے حد محتاط تھا۔ اس نے عارف کے پاس پہنچ کر بھی چاروں اطراف کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ عارف کا بدن سنسنا کر رہ گیا۔ یہ عورت یقینی طور پر اس لڑکی کی جانب سے ہی کوئی سندیسہ لائی تھی۔
''کون ہو تم؟ ہمارے ہم مذہب تو نہیں ہو سکتے۔'' اس نے عارف کے لباس اور داڑھی کی طرف اشارہ کیا۔
''میں آپ میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں تو ایک ادنیٰ سا شخص اور راہِ حق کا متلاشی ہوں۔'' وہ عاجزی سے بولا۔
''تمہیں شاید اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ یہاں کھڑے ہو کر ہمارے مکان کی طرف دیکھتے رہنا میری آقازادی کے لیے کتنی مشکلات کا سبب بن سکتا ہے۔'' وہ قدرے سختی سے بولی۔
''بخدا! میں اس کی رسوائی نہیں چاہتا۔ میری ذات سے اسے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' عارف نے یقین دلایا۔
عورت کچھ لمحے خاموش ہوئی اور دوبارہ قرب و جوار کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔
''چلو میرے ساتھ!''
عارف پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ہواؤں کے دوش پر قدم رکھتا اس عورت کے پیچھے چل دیا۔ عورت نے اسے مکان سے ملحق باغیچے میں سرو کے درخت کی آڑ میں کھڑے ہونے کی تاکید کی اور خود مکان کے رہائشی حصے میں چلی گئی۔
عارف کا دل پسلیوں کا قفس توڑ کر باہر آنے کے لیے بے تاب تھا۔ یہ کیفیت اس وقت مزید شدت اختیار کر گئی جب رخشندہ کا ''عکس'' وہ لڑکی سہج سہج کر قدم اٹھاتی اس کی جانب

بڑھتی نظر آئی۔اس کا لباس پہلے روز کی نسبت زیادہ دلکش تھا۔عارف اسے دیکھتے ہوئے پلکیں تک جھپکانا بھول گیا۔

''عبادت گاہ میں تمہیں پہلی بار دیکھا تو اندازہ اسی وقت ہوگیا تھا کہ مسلمان ہو اور شاید ان کے مذہبی پیشوا بھی۔تم ہماری عبادت گاہ میں کیا کر رہے تھے؟'' لڑکی کی آواز نے سماعت میں رس گھولا۔

''میں تمہیں دیکھ کر ہی وہاں گیا تھا۔'' عارف نے اپنی دھڑکنوں پر قابو رکھنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

''تم نے شاید مجھے کوئی گری پڑی لڑکی سمجھ لیا ہے۔میں تمہیں اتنا بتادوں کہ میرے والد ''فیروز'' بلخ کے نامور تاجر ہیں۔اس وقت تجارت کے ہی سلسلے میں بغداد میں موجود ہیں۔'' لڑکی نے منہ بنایا۔

''تم میرے بارے میں غلط اندازے لگا رہی ہو۔میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔میں تو تمہارے نام تک سے واقف نہیں۔'' عارف جلدی سے بولا۔

''میرا نام سیمان ہے۔'' اس نے معصومیت سے عارف کی آنکھوں میں جھانکا۔نظروں کا یہ ٹکراؤ ہوش ربا ثابت ہوا۔عارف کے بدن کی سنسنی ایسی بے قابو ہوئی کہ وہ اپنی ذات سے اختیار ہی کھو بیٹھا۔

''میرا نام عارف بلخی ہے۔کچھ عرصہ قبل ہی یہاں آیا ہوں اور آتے ہی قدرت کے مظاہر میں کھو کر رہ گیا ہوں۔ہمارے قافلے میں ایک مجبور اور ضرورت مند لڑکی پناہ گزیں تھی۔اس کا قد کاٹھ اور نقوش بالکل تم جیسے ہی تھے۔میں یہی دیکھ کر حیران ہوا اور تمہارے پیچھے چلا آیا۔'' عارف ان آنکھوں کے سمندر میں ڈوب اور ابھر رہا تھا۔

''تو اب کیا چاہتے ہو تم؟ اب تو تمہیں علم ہوگیا کہ میں وہ لڑکی نہیں بلکہ زردشت کی پیروکار سیمان ہوں۔'' اس کے لہجے میں ایک عجیب حلاوت تھی۔عارف کے اعصاب منتشر ہونے لگے۔

''میری صرف یہ خواہش ہے کہ جب تک بلخ میں قیام پذیر ہوں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار لیا جائے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمارا مذہب بالکل جدا ہے۔یہ اختلاف ہمارے لیے بہت مسائل کھڑے کرے گا۔'' سیمان نے اپنی زلفیں سنوارتے ہوئے اس پر ایک اور بجلی گرائی۔

''میرے آباؤ اجداد بھی آتش کدہ نوبہار کے موبد تھے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارا ''اصل'' یکساں ہی ہوا نا؟'' عارف اپنی حیثیت اور رتبہ فراموش کرنے لگا تھا۔

''لیکن دیکھنے والوں کو تو تمہارے ماضی کا علم نہیں۔وہ تو یہی دیکھیں اور سوچیں گے کہ ایک ''مسلمان'' تاجر فیروز کے گھر آنے جانے لگا ہے۔میرے والد کے نام کے ساتھ میری ذات بھی بدنامی کے بھنور میں آجائے گی۔تم تو مسافر ہو۔کل کو اپنی منزل کی طرف کوچ کر جاؤ گے لیکن بدنامی کسی مستقل داغ کی طرح میرا دامن گھیر لے گی۔کیا تمہیں علم نہیں کہ لڑکی ذات کانچ جیسی ہوتی ہے۔اس پر لگا کوئی بھی داغ ہمیشہ نظروں میں رہتا ہے۔'' سیمان کے انداز میں اتنی معصومیت اور دلکشی تھی کہ عارف اپنی ذات سے ہی بیگانہ ہوگیا۔ذہن پر دھند طاری ہوئی جس نے اعصاب پر ایسا قابو پایا کہ وہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

''میں تمہاری بدنامی ہرگز نہیں چاہتا۔تم جیسا کہو گی میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

عارف کے ذہن پر طاری دھند دبیز ہو کر ایک بار پھر اس پر غالب آگئی۔اس نے والہانہ نظروں سے سیمان کو دیکھتے ہوئے سرِ تسلیم خم کر دیا۔وہ اگلے روز ملاقات کا وقت طے کر کے خیمے میں لوٹا تو خمار کی شدت سے بے حال ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک برف پوش وادی میں موجود تھا۔اس کے سامنے بلند و بالا پہاڑ تھے جن کی ہیبت دل کو لرزا دیتی۔وہ چشمِ تصور سے اپنے لیے ان پہاڑوں کی بانہیں وا دیکھ رہا تھا۔دل میں ایک جذبہ شدت سے پروان چڑھنے لگا کہ وہ اس پہاڑ کو تسخیر کر سکتا ہے۔جوانی کا جوش ہر لحہ تحریک دے رہا تھا۔اس نے پہاڑ کی جانب بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔چوٹی بلند و بالا تھی۔وہ محتاط انداز میں چلتا چوٹی کی جانب گامزن ہونا چاہتا تھا۔

سفر کا آغاز ہوگیا۔بظاہر آسان دکھائی دینے والی یہ چڑھائی اپنے اندر کئی کٹھنائیاں سموئے ہوئے تھی۔قدم بڑھتا رہا۔فاصلہ کم ہوتا رہا۔اس مسافت میں شباب پختہ کاری اور پھر پختہ کاری ادھیڑ عمری کی جانب رواں تھی۔خوش کن بات یہ تھی کہ یہ روانی سفر کو مزید سہل بنا رہی تھی۔چوٹی اب بالکل پاس دکھائی دینے لگی تھی۔دل خوشی و جوش سے لبریز تھا۔اس نے قدم مزید بڑھا دیے۔مسافت کچھ اور کم ہوئی۔یکایک چوٹی کی اوٹ سے سورج طلوع ہوتا دکھائی دیا۔اس کی آنکھیں سنہری کرنوں کی تمازت سے چندھیا سی گئیں۔دل میں فوری طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ اس منظر سے نظریں ہٹا کر چوٹی کی جانب ارتکاز مبذول کرلے لیکن ان کرنوں میں ایسی لذت، تمازت اور سرور تھا کہ وہ چوٹی کے بجائے اسی کی جانب دیکھتا رہا۔سورج کا

سفر بھی جاری رہا۔ سنہری کرنیں اپنی رنگت بدلنے لگیں۔ یہ نیا رنگ مزید خوش کن تھا۔ وہ مسحور سے انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ دل میں یہ خیال پنپنے لگا تھا کہ یہ سورج بھی اس پہاڑ کی چوٹی سے ہی طلوع ہوا ہے۔ یہ لازماً اس کا بقیہ سفر سہل انداز میں طے کروادے گا۔

یہ خیال آتے ہی قدموں میں جوش بھر گیا۔ کرنیں اس کے وجود کو بڑی محبت اور نرمی سے سہلا رہی تھیں۔ ان کی نرمی میں خمار تھا۔ اسے اپنی منزل بہت قریب محسوس ہونے لگی اور قدموں نے اپنا رخ بدل لیا۔ اب یہ قدم پہاڑ کے بجائے ہوا میں استادہ تھے۔ کرنیں مزید مہربان ہونے لگیں۔ فیصلہ آسان تر ہوگیا۔ خلا میں معلق قدم اسی انداز میں آگے بڑھے۔ بدن کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ تیزی سے معکوس سفر کرنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے پہاڑ کو دوبارہ تھامنے کی کوشش کی لیکن اب کہیں کوئی سہارا یا آسرا نہ تھا۔ اس کی خوفزدہ نظریں نشیب کی جانب دیکھنے لگیں۔ ایک ہولناک پستی بانہیں وا کیے اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

عارف ہڑبڑا کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ ذہن اس طرح چکرا رہا تھا گویا بہت بلندی سے نشیب کا نظارہ کرلیا ہو۔ اس نے پانی پی کر سانس متوازن کیا اور گہرے سانس لیتا ہوا خیمے سے باہر چلا آیا۔ تہجد کا وقت ابھی دور تھا۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ ستاروں کی محفل سجی ہوئی تھی۔ ان کی خوابناک روشنی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ عارف اپنا چہرہ ہتھیلی میں ٹکا کر اس روشنی کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔

حیران کن بات یہ تھی کہ وہ کچھ دیر پہلے دیکھے جانے والے خواب کے بجائے سیمان کے متعلق سوچ رہا تھا۔ گزشتہ کچھ دنوں میں وہ بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ سیمان ایک نرم خو اور حسین خیالات کی حامل لڑکی تھی۔ عارف کو اس کی قربت بہت اچھی لگتی۔ وہ اپنے معمولات نظرانداز کر کے اس سے ملاقات کے لیے چلا جاتا۔ مکان میں داخل ہونے سے پہلے اسے ایک لباس فراہم کردیا جاتا۔ یہ مجوسی ساختہ لباس پہن کر وہ سیمان کے پاس چلا جاتا۔ وہ اسی کی منتظر ہوتی۔ عارف اس کے پاس بیٹھا کتنی ہی دیر محوِ گفتگو رہتا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ اس محویت میں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ نماز قضا ہو جاتی۔ دل میں ملال بھی گھر کرتا تاہم سیمان کا تصور جلد ہی حاوی ہوجاتا۔ عارف کو اپنے وجود پر ایک کثافت سی لدی بھی محسوس ہوتی۔ ناپاکی کا احساس ایک بوجھل کیفیت پیدا کرتا، بالآخر سیمان کی کسی نئی ادا اور بات کے زیر اثر مغلوب ہوجاتا۔ عارف کے شب و روز اسی کے تصور و خیال میں بیتتے تھے۔ صنفِ نازک کی دلکشی لطافت اور قربت کی آنچ میں اس قدر سرور کا تو اسے اندازہ ہی نہ تھا۔ وہ لذت کسک کے اس نئے سفر میں بہت سرشار تھا۔ اس وقت بھی سیمان کے متعلق سوچتا ہوا مسکرانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بھی ایسے ہی جذبات میں مبتلا ہوگی۔

☆☆☆

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ زرد شتوں کے اس رہائشی علاقے میں بھی معمول کی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ سیمان ناشتے سے فراغت پاکر اپنے لباس کے انتخاب میں مشغول تھی۔

”تمہاری تیاری بتا رہی ہے کہ آج بھی اس شخص سے ملاقات طے ہے؟“ اس کی ادھیڑ عمر ملازمہ نے دبے لفظوں میں پوچھا۔ سیمان کی والدہ کی وفات کے بعد پرورش کے فرائض اسی نے سنبھالے تھے اور سیمان اپنی والدہ ہی کی طرح اس کی تکریم کرتی تھی۔

”آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا۔ عارف ابھی تھوڑی دیر تک آتا ہی ہوگا۔“ سیمان نے ایک لباس نکال کر اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔

”یہ سب تم کیا کررہی ہو میری بچی؟ تمہارے والد کی غیر موجودگی میں احوال دریافت کرنے کے لیے آنے والے سبھی رشتے دار کس قدر خفا ہیں۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں؟“

”نہیں! مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ میں ایسا کوئی بھی بے کار جھنجٹ پالنا ہی نہیں چاہتی۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”وہ تمہاری ذات و کردار پر انگلیاں اٹھانے لگے ہیں۔“ اس نے دکھ سے بتایا۔

”جب انہیں میرے اصل کھیل کا اندازہ ہوگا تو وہ خود شرمسار ہو کر مجھ سے معافی مانگیں گے۔ بلکہ فخر کریں گے کہ فیروز کی بیٹی سیمان کس قدر ذہین اور باصلاحیت ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

”تم آخر کرنا کیا چاہتی ہو؟ کچھ ہی روز میں تمہارے والد بھی بغداد سے لوٹنے والے ہیں۔ وہ ایک مسلمان کو تمہارے ساتھ دیکھیں گے تو ان کے دل پر کیا بیتے گی؟“ ادھیڑ عمر عورت مضطرب ہونے لگی۔

”خواہ مخواہ کے خدشات مت پالیں۔ میں نے آج تک عارف سے لمس کا کوئی رشتہ استوار نہیں کیا۔ میرا کھیل ویسے بھی اب اختتامی مراحل میں ہے۔ تم سب مجھ پر فخر کروگے کہ

میں نے کیا عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔'' وہ پُراعتماد تھی۔

اپنی تیاری اچھی طرح مکمل کر کے اس نے چہرے پر تشویش وافسردگی کے ایسے تاثرات سجائے جنہیں کسی بھی طور مصنوعی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اب اسے عارف کا انتظار تھا۔ آخری اور اہم ترین بازی کھیلنے کا وقت قریب تھا۔

☆☆☆

عارف اپنے خیمے میں موجود تھا۔ روزمرہ کے اذکار کی تکمیل ہوچکی تھی۔ گزشتہ چندروز میں حالات وواقعات بہت تیزی سے تبدیل ہوئے تھے۔ اس کے معمولات اور سیمان سے وابستگی اب کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہ رہی تھی۔ اس کے ہمنوار ہنے والے بقیہ دس مرید بھی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ عارف کو ان کی علیٰحدگی کی بالکل پروانہ تھی۔ وہ اپنا شعار ہی درست سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب مرید بہت جلد اپنی غلطی تسلیم کر کے اس کی جماعت میں دوبارہ شامل ہو جائیں گے۔ وہ سیمان سے ہونے والی ممکنہ ملاقات اور گفتگو کا تصور کیے خیمے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ دو نوجوان خیمے کے دروازے پر چلے آئے۔ ان کے چہروں پر اشتیاق اور جوش کی ملی جلی کیفیت تھی۔

''ہم شاید غلط وقت پر چلے آئے ہیں۔ آپ کہیں جانے کے لیے تیار نظر آرہے ہیں۔'' پہلے نوجوان نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''تم نے بالکل درست اندازہ لگایا میرے بچے! لیکن مہمان کی آمد باعثِ رحمت ہوتی ہے۔ آؤ! اندر چلے آؤ۔'' عارف نے شفقت سے جواب دیا۔

''ہم نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے اعلیٰ حضرت! بہت امید لے کر آئے ہیں یہاں۔'' دوسرے نوجوان نے مدعا بیان کیا۔

''تعریف صرف پروردگار کے لیے...... بشر کی کوئی بساط نہیں۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔

''ہم آپ کے حلقے میں شمولیت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اپنا علم وتجربہ ہمیں نوازدیں تو سدا ممنون رہیں گے۔'' پہلا نوجوان کہنے لگا۔

''میں نے اس علم اور تجربے کی بنیاد پر پچیس سال تک ریاضت کی۔ اب میری راہ تبدیل ہوگئی ہے۔ میں نے ایک طویل سفر کے بعد یہ بات جان لی ہے کہ ہمارے نفس کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کو کچلنا فطرت سے براہِ راست جنگ کے مترادف ہے۔ ہم اپنے نفس کے جن پہلوؤں کو محروم یا تشنہ رکھیں گے منزل تک رسائی میں یہی پہلو رکاوٹ ثابت ہوں گے۔'' عارف نے سادگی سے کہا۔

''ہم آپ کے اس فلسفے کا کیا مطلب سمجھیں؟'' دونوں نوجوان الجھ گئے تھے۔

''عشق کرو میرے بچے! عشق کا سوز ایک نئی لذت سے آشنا کرے گا۔ خدا کی تلاش خدا کے تخلیق کردہ مظاہر میں کرو۔ تلاش کامیاب ہوگئی تو منزل بھی پالوگے۔ عشق میں ہی سوز ہے، ساز ہے، لذت اور گداز ہے۔ عشق کرو۔'' وہ بے خودی کے عالم میں کہتا چلا گیا۔

دونوں نوجوان حیرت، صدمے اور تاسف سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ ان کی توقعات بہت بری طرح منتشر ہوئی تھیں۔ مایوسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عارف کو ان کی کیفیات کی بالکل پروانہ تھی۔ وہ ان کے جاتے ہی خیمے سے نکل کھڑا ہوا۔ اس کا جوش وولولہ سیمان کی صورت دیکھ کر سرد ہوگیا۔ وہ بے حدملول دکھائی دے رہی تھی۔ عارف کے اصرار پر ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگی۔

''ہماری ملاقاتیں اب ممکن نہیں رہ پائیں گی۔ میرے والد بغداد سے لوٹنے والے ہیں۔ وہ کسی صورت یہ برداشت نہ کریں گے کہ ایک مجوسی خاندان کی لڑکی کسی مسلمان سے یوں ملاقات کرے۔'' اس انکشاف پر عارف تڑپ کر رہ گیا۔

''یہ بات تم نے پہلے کیوں نہ سوچی؟ اب کوئی راہ نہیں نکل سکتی کیا؟''

''نہیں! مجھے تو کوئی دوسری راہ نظر نہیں آرہی۔ میں نے اپنے عزیز واقارب کے طعن وتشنیع تو برداشت کرلیے لیکن والد کو دکھ دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔'' سیمان دھیرے دھیرے اپنے اصل مقصد کی جانب بڑھ رہی تھی۔

''کوئی تو ایسا طریقہ ہوگا جس سے ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہے اور تمہارے والد بھی دلبرداشتہ یا دکھی نہ ہوں۔'' عارف کو اپنی دنیا ہی اندھیر ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ سیمان کسی گہری سوچ میں غرق دکھائی دینے لگی۔

''ہمارے عزیز واقارب میں بہت سے نوجوان ایسے ہیں جن سے اگر کبھی بات چیت ہوجائے تو میرے والد کو اعتراض نہیں ہوتا۔'' اس نے تجاہل برتا اور پھر ایک توقف سے بولی۔

''لیکن وہ تو ہمارے ہم مذہب ہیں۔''

''اور میں...... میں کیا ہوں سیمان؟'' اس نے دکھ سے پوچھا۔

''تم ہمارے لیے غیر مذہب کے ہو اور وہی رہو

گے۔ حقیقت سے منہ تو نہیں موڑا جاسکتا نا۔ ہم یہاں دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ مسلم حکومت کی رعایا ہیں۔ انہیں جزیہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارا تم سے کوئی جوڑ ہی نہیں اور اس بے جوڑ رشتے کے لیے میں اپنے والد کو دکھی نہیں کر سکتی۔'' سیمان کے اس جواب پر عارف کی انا مجروح ہوئی۔ وہ اب تک اسی گمان میں تھا کہ سیمان نے ذاتی پسندیدگی اور چاہت کی بنیاد پر ہی اس سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

''کیا تمہاری زندگی میں میری کوئی بھی حیثیت نہیں ہے؟'' اس کا دل بری طرح دہل رہا تھا۔

''میرے والد سے زیادہ اہم بہرحال کچھ بھی نہیں۔'' اس جواب پر عارف کا ذہن آندھیوں کی زد میں آگیا۔ زبان کچھ بھی کہنے کی اہل نہ رہی تھی۔

''لیکن سیمان! اس مسئلے کا کوئی تو حل ہوگا؟'' اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

''ہاں! ایک حل ہے تو سہی۔ مذہب کی تبدیلی سارے آزار اور رکاوٹیں دور کردے گی۔'' سیمان نے اطمینان سے کہا۔

''آہ سیمان! تم نے میرے دل کی بات چھین لی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم گمراہی اور بے دینی کی یہ زندگی ترک کرکے راہِ حق کی مسافر بن جاؤ۔'' عارف کا چہرہ کھل اٹھا۔

''تمہاری اس بات سے تو مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ تم واقعی مجھ سے محبت کرتے بھی ہو یا نہیں؟'' سیمان نے جارحانہ انداز اپنایا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے مجھ سے اسی لیے تعلقات استوار کیے تھے کہ اپنے دین کی طرف موڑ لو۔''

''مذہب کی اس بات کو درمیان میں لانے کا تمہارا اور کیا مطلب ہے؟'' عارف ششدر تھا۔

''سیدھی سی بات ہے۔ تم نے میری طرف بڑھنے کی پہل کی تھی۔ یہ تم ہی تھے جس نے پروانوں کی طرح میرے گھر کے چکر کاٹنے شروع کیے تھے۔ محبت اور ملاقات کرتے رہنے کی التجائیں بھی تم ہی نے کی تھیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس محبت کو ثابت بھی کرو۔ اگر تمہیں واقعی میری چاہت کی تمنا ہے تو میرا مذہب اختیار کرلو۔'' سیمان نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے سہلاتے ہوئے کہا۔ یہ لمس قیامت خیز تھا۔ عارف کی دنیا تہ و بالا ہونے لگی۔

''یہ ممکن نہیں ہے سیمان! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ لرز گیا۔ مذہب ترک کرنے کا تصور ہی ناممکن تھا۔

''اگر یہ نہیں ہوسکتا تو پھر ہمارا تعلق بھی مزید قائم نہیں رہ سکتا۔ میں نے اپنی ترجیحات اور فیصلہ تمہیں بتا دیا ہے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر مجھے بتا دینا۔ اب تم یہاں سے جاسکتے ہو۔'' سیمان نے رکھائی سے کہا اور منہ موڑ کر اندر چلی گئی۔

عارف کا وجود کسی تیز آندھی کی زد میں آئے کمزور پتے کی طرح لڑکھڑانے لگا۔ ذہن بے طرح چکرا رہا تھا اور آنکھوں تلے شدید اندھیرا اعصاب کو شکستہ کرنے لگا۔ وہ اسی کیفیت میں جانے کس طرح خیمے تک پہنچا۔ ہر ایک لمحہ پھانس کی طرح چبھتے ہوئے گزر رہا تھا۔ اسے نمازیں' اذکار اور عبادات یکسر فراموش ہوگئے۔ وہ ایک جان لیوا دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک راہ ''ربع صدی'' کی ریاضت' پاکبازی' زہد و تقویٰ کی جانب صدا دے رہی تھی۔ دل کا ایک کونا مسلسل ملامت کررہا تھا کہ وہ اپنا مقصدِ حیات کیونکر پسِ پشت ڈال سکتا ہے۔

دوسری راہ بہت دلفریب تھی۔ خوشبو' نزاکت' رعنائی' خوبصورتی' کسک' لذت' خمار اور سرشاری اسے شدت سے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ اس کے ہاتھ پر سیمان کا لمس انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور اس کی حدت میں محسوس ہونے والی سنسنی انمول تھی۔ ایمان اور کفر کے درمیان یہ کشمکش رات گئے تک اسے آزماتی رہی۔ یکے بعد دیگرے اپنے سبھی خواب بھی یاد آنے لگے۔ ماحول کی کثافت' چاندنی کا مدھم ہوتا غبار' دلدلی زمین میں دھنستے پاؤں' غزال کا تعاقب' گریز' سورج کے سامنے دوزانو ہونا' چوٹی کے عقب سے سورج طلوع ہوتے دیکھ کر نظریں خیرہ ہونا' قدم موڑ کر ہوا میں استادہ ہونا اور پھر نشیب کا سفر اس کے لیے غیبی اشارے تھے۔ قدرت اسے مسلسل تنبیہ کرتی رہی تھی لیکن اس نے نفس گزیدگی میں کچھ بھی سمجھنے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔

رات ڈھلتی رہی۔ عارف کے وجود میں کوئی شمع پگھلتی رہی۔ سیمان سے علیحدگی کا تصور اور آئندہ زندگی کے متعلق سوچ کا آغاز کیا تو ذہن ہر قسم کے خیال سے عاری ہو گیا۔ اندھیرا دبیز ہوتا رہا۔ گھٹن بڑھتی رہی اور ضمیر کے کوڑے برستے رہے۔ ہر ایک کوڑے سے ہاتھ پر دہکتا انگارہ اپنی سرشاری میں اضافہ کردیتا۔ نفس نے اپنا جال مزید مضبوط کیا اور صبح ہونے سے قبل عارف بلخی نے ایسا فیصلہ کرلیا جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح بے حد روشن اور نکھری ہوئی تھی لیکن عارف کے مضمحل اعصاب اور روح کی شکستگی اسے کوئی خوبصورتی محسوس ہونے ہی نہ دے رہے تھے۔ اسے اپنا وجود کھوکھلا

اور بے جان لگنے لگا۔ اسی شکستہ عالم میں وہ سیمان کے گھر پہنچا تو ادھیڑ عمر ملازمہ نے حسب سابق اندر لے جانے کے بجائے باغیچے میں ہی بیٹھنے کا کہہ کر اسے مزید مضطرب کر دیا۔ اعصاب شکن انتظار کے بعد سیمان باغیچے میں آگئی تو عارف اس گھٹن اور وحشت سے مغلوب تر ہو چکا تھا۔

''امید ہے تم نے کوئی فیصلہ کرلیا ہوگا۔'' وہ کروفر سے بولی۔

''ہاں! میں نے بالآخر ایک راہ کا انتخاب کر لیا ہے۔'' عارف نے دھیرے سے کہا۔ سیمان خاموشی سے ایک جانب دیکھتی رہی۔ وہ اس خاموشی اور رکھائی سے اسے اپنی بے نیازی کا مزید تاثر دے کر اعصابی طور پر تباہ کر دینا چاہتی تھی۔

''میں تمہارے مذہب میں آمد کے لیے تیار ہوں لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔'' عارف کی بات پر سیمان کی آنکھوں میں کہکشاں اتر آئی۔ اسے اپنے قدم زمین پر پڑتے محسوس نہ ہو رہے تھے۔

''کہو! کیا شرائط ہیں؟''

''میں نے اس تبدیلی کا فیصلہ جس جبر سے کیا ہے تم یا کوئی اور شاید ان کیفیات کو سمجھ ہی نہ سکے۔ بہرحال اس کے بعد میں اپنے مذہب، الہامی کتاب اور اپنے آقا ﷺ کے بارے میں کسی قسم کی کوئی منفی بات برداشت نہیں کروں گا۔ تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ تمہارے اہلِ خانہ یا عزیز و اقارب میں سے کوئی ایسی گستاخی کی جسارت نہ کرے۔'' عارف کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا تھا۔ اسے اپنے سامنے اپنا ہی ضمیر جاں بہ لب دکھائی دے رہا تھا۔

''بالکل ایسا ہی ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔'' سیمان نے یقین دہانی کروائی۔

''ہمارے رشتے کا محفوظ مستقبل کیا ہوگا؟'' عارف نے اگلی شرط بیان کی۔

''اس بارے میں میرے والد ہی حتمی فیصلہ کریں گے۔'' سیمان نے ٹالا۔ عارف کے نیم مُردہ ضمیر نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بہ زبانِ خاموشی احساس دلایا کہ اس کا زیاں ناقابلِ تلافی ہے جبکہ معاوضہ تو اب بھی غیر یقینی ہی ہے۔

''تمہیں کوئی نہ کوئی ضمانت دینی ہوگی سیمان!'' عارف نے اس کی نظروں میں جھانکا۔ سیمان ٹھٹک گئی۔ اسے اپنا کھیل بگڑتا محسوس ہوا تو فوراً پینترا بدلتے ہوئے بولی۔

''میں ''اہرمن'' اور ''اہورامزدا'' کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گی۔ حالات اور میرے والد کا فیصلہ خواہ کیسا ہی ہو، میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ جدا نہ ہونے دوں گی۔'' سیمان نے اس کا ہاتھ سہلایا۔ سرور و انبساط کی لہریں عارف کی مزاحمت اپنے ساتھ بہالے گئیں۔ اس کی قوتِ ارادی نے دم توڑ دیا اور ایمان نے شرمناک شکست تسلیم کرلی۔

عارف کی رضامندی بھانپ کر سیمان نے اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کی اور اسے اپنے ہمراہ اندر لے آئی۔ ادھیڑ عمر ملازمہ کو ہدایات پہلے ہی مل چکی تھیں۔ اس نے گھر میں موجود آتش کدے کا دروازہ کھول دیا۔ سیمان اسے ''آذرخش'' کے سامنے لے آئی۔ اس کے لمس کی حدت، نرماہٹ اور استحقاق بھرا انداز عارف کے دل و دماغ میں چھڑی جنگ پر غالب آچکا تھا۔ عارف نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا اور کسی شکست خوردہ جواری کی طرح آذرخش کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا۔ اس لمحے روح میں ایسا خلا در آیا گویا کسی کا انتقال ہوگیا ہو۔ سینے میں دل کی جگہ ایک بھاری پتھر محسوس ہونے لگا اور آنکھیں آنسوؤں کی باڑ بہاتے نہ تھک رہی تھیں۔

سیمان کی آنکھوں میں ہزاروں قندیلیں روشن دکھائی دینے لگیں۔ ایمان اور لذت کی سوداگری میں اپنا گوہرِ مقصود پا کر بھی عارف کو کامل خوشی محسوس نہ ہوئی۔

☆☆☆

عارف بلخی نے اس روز کے بعد خود کو تقدیر کے سپرد کر دیا۔ وہ دن بھر سیمان کے پاس ہی موجود رہتا۔ اس کا قرب، گفتگو، وجود کی مہک، سیاہ زلفیں، خوش رنگ لباس، آنکھوں میں جوت اور لبوں پر کھلی رہنے والی مسکراہٹ دیکھتے کچھ اور سجھائی ہی نہ دیتا۔ لذت و سرور بڑھتا ہی جاتا۔ سیمان نے اسے مکمل طور پر اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ اس سرور کے باوجود خلش کے کانٹے کی چبھن ایک نادیدہ زخم کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔ زخم بھی ایسا جس سے ہر پل ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوتیں۔ یہ ٹیس آنکھوں سے کرب بن کر چھلکتی تو سیمان سے پوشیدہ نہ رہ پاتی۔ اس لمحے وہ عارف کا ہاتھ پکڑے آذرخش کے سامنے لے جاتی۔

''دل کا سکون اور روح کی آسائش صرف اسی کی حدت میں ہے۔ آؤ! اپنا سکون پالو۔'' وہ اس کی سماعت میں محبت بھری سرگوشیاں کرتی۔

اس عمل کی تکمیل میں عارف کا دل پھڑپھڑاتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کرتا اور اظہارِ ناراضگی کے طور پر

سنا ٹے اور خلا میں گھیر کر رہ جاتا۔ شب و روز انہی معمولات میں بیت رہے تھے۔ عارف کا زیادہ تر وقت سیمان کے حسن کو ستائش پیش کرتے ہی گزرتا۔ جیسے کار رستہ شاذ و نادر ہی یاد آتا۔ بلخ میں قیام پذیر چند ارادت مندوں سے اس کی یہ کیفیات اور معمولات اوجھل نہ تھے۔ عارف کی عبادت و اذکار سے کنارہ کشی انہیں خون کے آنسو رلاتی۔ عارف کو ان کے جذبات کی بالکل پروا نہ تھی۔ وہ سیمان کے ساتھ بہت خوش رہتا۔ کچھ ہی روز گزرے تھے کہ سیمان کے والد فیروز بغداد سے لوٹ آئے۔ ان کے ہمراہ ایک وجیہہ، باوقار اور خوش پوش نوجوان بھی تھا۔ وہ تقریباً سیمان کا ہی ہم عمر تھا۔ دونوں ہی عارف کو اپنے مکان میں دیکھ کر الجھ گئے۔

"یہ عارف بلخی ہیں ابا جان! انہوں نے مجوسیت سے متاثر ہو کر ہمارا مذہب قبول کر لیا ہے۔" سیمان نے فخر سے بتایا۔ عارف کا چہرہ پل بھر کے لیے متغیر ہو گیا۔

فیروز کی جہاندیدہ نظروں نے ساری صورت حال ایک لمحے میں ہی بھانپ لی۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ ایک مسلم ریاست میں کسی شخص کا مرتد ہونا اس کے ساتھ ساتھ ذمے داران کے لیے بھی کیا مشکلات کھڑی کر سکتا تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی عارف بلخی صاحب!" فیروز خندہ پیشانی سے بولا اور پھر نوجوان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "ان سے ملیے! یہ سیمان کا منگیتر دانیال ہے۔ بہت جلد یہ دونوں شادی کے مقدس بندھن میں بندھ جائیں گے۔"

شادی کی بات پر سیمان شرم سے بل کھا کر رہ گئی۔ عارف کے سر پر ساتوں آسمان یکدم ٹوٹ پڑے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سیمان کو دیکھنے لگا جس نے اسے ایک یادگار دھوکا دیا تھا۔

"آپ تھکے ہوئے ہیں۔ میں کھانے کا انتظام کرواتی ہوں۔" سیمان کی والہانہ نظریں دانیال پر مرکوز تھیں۔ ان نظروں میں جلنے والی قندیلیں عارف کو واضح طور پر بتا رہی تھیں کہ وہ دانیال سے حقیقتاً محبت کرتی ہے۔ احساسِ زیاں اور فریب کی اس چوٹ نے اسے زمین بوس کر دیا۔

☆☆☆

تاجر فیروز کے گھر میں حالات و واقعات ایک نیا موڑ لے چکے تھے۔ وہ عارف بلخی جو کچھ روز پہلے گھنٹوں سیمان کے پاس بیٹھا اس کے حسن سے اپنی نظریں سیراب کیا کرتا تھا، اب انہی نظروں سے اسی سیمان کو دانیال کے گرد

پروانوں کی طرح منڈلاتے دیکھا کرتا۔ اس کے انداز میں ایسی وارفتگی اور شدت ہوتی تھی کہ حسد ورقابت سے عارف کا تن من سلگ کر رہ جاتا۔

اس نے ابتدائی روز ہی سیمان سے دانیال کے متعلق حقائق پوشیدہ رکھنے پر پرسش کرنی چاہی لیکن اس کی رکھائی' بدلحاظی اور بے زاری دیکھ کر خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ اب یہی خاموشی حسد' رقابت' احساسِ زیاں اور خلش اس کی روح کا ایسا آزار بنی تھیں کہ سانس لینا بھی دشوار محسوس ہوتا۔ فیروزان معاملات سے قدرے لاتعلق اپنے کاروباری معاملات میں الجھا رہتا۔ اس کے لیے بیٹی کا ''کارنامہ'' باعثِ فخر تھا۔ سیمان کی آنکھوں میں شادی کے حوالے سے بہت سے خواب تھے۔ وہ دانیال سے بے حد محبت کرتی تھی اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے اس کا وقت وتوجہ چاہتی تھی لیکن دانیال کے مزاج پر ایک سرد موسم طاری رہتا۔ وہ خاموشی سے اس کی گفتگو سنتا اور سرگرمیاں دیکھتا رہتا۔

دانیال کی اس کیفیت نے سیمان کے دل میں ڈھیروں خدشات پیدا کردیے۔ وہ اپنے محبوب کے مزاج کا ہر ایک رنگ جانتی تھی۔ یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہوئی تو اس نے دانیال سے براہِ راست بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک روز دانیال کا ہاتھ تھاما اور اسے آتش کدے میں آذرخش کے سامنے لا بٹھایا۔ دانیال اس حرکت پر تلملا کر رہ گیا۔

''عورت کی نگاہ اپنے مرد کے معاملے میں بہت حساس اور تیز ہوتی ہے۔ وہ اس کی ہر کیفیت کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیا کرتی ہے۔ مجھے علم ہے کہ تم عارف کی وجہ سے تحفظات کا شکار ہو۔ میرا یقین کرو۔ میں آذرخش کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے یہ کھیل صرف اسے بے دین کرنے کے لیے کھیلا تھا۔'' سیمان نے اس کے گھٹنے تھام لیے۔

''مجھے تم سے اس غیر اخلاقی حرکت کی امید نہ تھی۔'' دانیال رکھائی سے بولا۔

''میں تو سوچتی تھی کہ تمہیں مجھ پر فخر ہوگا۔'' سیمان آزردہ ہوئی۔ ''لیکن تمہاری نظروں میں پیدا ہونے والے شبہات میرا دل زخمی کردیتے ہیں۔''

''دل زخمی ہونے کا مطلب تم کیا جانو سیمان! تمہیں تو اس کرب کا اندازہ ہی نہیں ہے جو میں محسوس کرتا ہوں۔ میں یہ بات کیسے تسلیم کرلوں کہ عارف نے محض تمہاری وقتی قربت کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھالیا ہے۔ میں مسلمانوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنا دین ترک نہیں کیا کرتے۔ عارف جیسے مذہبی پیشوا نے اگر یہ قدم اٹھایا ہے تو کسی نہج پر ایسا فیصلہ کیا ہوگا؟'' دانیال نے زہر اگلا۔ سیمان ششدر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس کے پاس ایسے الفاظ ہی باقی نہ رہے جن کا سہارا لے کر وہ دانیال کی غلط فہمی دور کرسکتی۔ دانیال نے اس کے ہاتھ جھٹکے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اسی لمحے آتش کدے کے دروازے پر دستک ہوئی اور شکست خوردہ جواری کے مانند سر جھکائے عارف اندر چلا آیا۔ اس کی حالت' شکستگی اور چہرے کی معصومیت دیکھ کر دانیال کا دل تاسف سے بھر گیا۔

''تم دونوں سے کچھ ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' عارف کی آواز بھی آنسوؤں سے بوجھل تھی۔ دانیال سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''میں اس بارے میں بات نہیں کروں گا کہ میں کیا تھا اور کیا بن گیا ہوں۔ مجھے تم دونوں میں استوار ہونے والی سرد مہری اور تناؤ بھی واضح محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے سیمان سے صرف یہ گلہ ہے کہ اس نے ایک بار بھی کسی اشارے کنائے میں تمہارا ذکر نہیں کیا۔ میں منہ زور گھوڑے کی طرح نفس کے چابک کھاتا اس راہ پر سرپٹ دوڑتا رہا۔''

''میں نے تم سے کبھی اظہارِ محبت یا عہد وپیمان نہیں کیے تھے۔'' سیمان نے تڑخ کر جواب دیا۔

''بالکل! لیکن میری کسی بھی پیش قدمی یا جذبات کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کی تھی۔'' عارف افسردگی سے بولا۔ ''خیر! تم سے شکوہ کیسے کروں؟ غلطی سراسر میری ہے۔ میں اپنے پچیس سالہ سفر میں آنے والی پہلی آزمائش بھی برداشت نہ کرسکا۔ میرا نفس اتنا کمزور تھا کہ ترغیب کا جال توڑ ہی نہ سکا۔ ستم ظریفی تو دیکھو! یہ نفس ساری حقیقت اور کھیل جان لینے کے بعد بھی اپنے شر سے باز نہیں آرہا۔ حسد ورقابت میں مبتلا ہوکر مجھے دانیال کو کسی بھی طرح رستے سے ہٹانے کی راہ سجھاتا ہے۔ میں اتنا کمزور ہوں کہ اس وقتی سرشاری اور خمار کے عوض زندگی بھر کی ریاضت خاک میں ملادی۔ اب زندگی تو دوبارہ نہیں ملے گی۔ اس تباہی کو کیسے سہہ پاؤں گا؟ اس گناہ کا کفارہ کیسے ادا کرپاؤں گا؟ ربع صدی کی وہ عبادت دوبارہ ہو بھی پائے گی کیا؟ میں کس منہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں جاؤں گا؟ کس منہ سے آپ ﷺ کا سامنا کروں گا؟'' عارف ہذیانی انداز میں اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگا۔ آنکھوں پر گھونسے رسید کرتا وہ زاروقطار رو رہا

تھا۔ دانیال کا دل دکھ سے لبریز ہوگیا۔

''کیا تم اپنے دین میں پلٹ جاؤ گے؟'' سیمان نے بے چینی سے استفسار کیا۔

''یہ جاننے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے اے حسین ناگن! میں نے معراج حاصل کرنے کے لیے اس سفر کا آغاز کیا تھا لیکن بدترین پستی میں جا گرا۔ کچھ عرصہ بلخ میں رہوں گا۔ بغداد بھی جاؤں گا۔ میری ذات شجر سے جھڑے اس پتے کی طرح ہوگئی ہے جو ہر ایک کے قدموں تلے روندا جانے لگا ہے اور چاہ کر بھی اس درخت کی ہریالی کا حصہ نہیں بن سکتا۔''

عارف کے آنسو دانیال کے دل پر اثر پذیر ہونے لگے۔ وہ بالآخر ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

☆☆☆

اگلی صبح موسم قدرے ناخوشگوار تھا۔ عارف کی گریہ و زاری اور دانیال کے دل و دماغ میں پہنچنے والے خدشات نے سیمان کو بھی ذہنی طور پر منتشر کردیا۔ وہ ایک بار پھر دانیال سے تفصیلی گفتگو کر کے اپنی ذات شفاف ثابت کرنا چاہتی تھی۔ دانیال کا کمرا.... خالی تھا۔ سلوٹوں سے پاک بستر اس بات کا شاہد تھا کہ مکین بہت پہلے ہی یہاں سے کوچ کر چکا ہے۔ سرہانے کے پاس ایک کاغذ پھڑ پھڑا رہا تھا۔

سیمان بے جان ہوتی ٹانگوں کو گھسیٹتے بمشکل آگے بڑھی اور کاغذ تھام لیا۔ مختصر سی عبارت کا آغاز کسی بھی قسم کے القابات سے مبرا تھا۔ سیمان کا وجدان گواہی دینے لگا کہ وہ کسی عظیم نقصان سے دوچار ہو چکی ہے۔

''آج زندگی میں پہلی بار سمجھ نہیں آرہا کہ تم سے کیا اور کس طرح بات کروں۔ میں نے تمہیں اپنی زندگی میں سب سے برتر مقام دیا۔ ہر انسان کی طرح مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ میری پسند دنیا میں سب سے منفرد ہے۔ مجھے تمہاری ذات و کردار پر فخر تھا لیکن تم نے وقتی فائدے کے لیے اس شخص کے جذبات کو جس طرح روندا ہے، وہ اخلاقیات اور انسانیت کی پست ترین حرکت تھی۔ زردشت کا کوئی بھی پیروکار ایسے عمل کا تصور نہیں کرسکتا۔ میں خواہش کے باوجود تمہاری طرف مائل نہیں ہو پا رہا۔ ہمارا رشتہ بے جان ہو چکا ہے۔ میرا اعتبار کھو چکا ہے۔ جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ اگر ہم نے شادی کر بھی لی تو مستقبل میں تم پھر کسی عارف کو میرے سامنے لا کر کھڑا کردو گی۔ میں یہ بار اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔''

دانیال کے اس انتہائی قدم نے سیمان کی ہمت پاش پاش کردی۔ دل پر لگنے والی اس ضرب نے پہلی بار آنکھوں کو آنسوؤں سے متعارف کروایا۔ اس کی آہ و زاری اور سسکیاں سن کر فیروز بھی وہیں چلا آیا۔ سیمان کے ہاتھ میں کاغذ کے ٹکڑے کا متن پڑھ کر وہ سناٹے میں آگیا۔ اسے سیمان کے اس کھیل سے انہی خدشات کی توقع تھی۔

''تو فکر نہ کر میری بچی! دانیال خواہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو، اسے جلد ہی تیرے قدموں میں لا پھینکوں گا۔'' فیروز پدرانہ شفقت سے مغلوب ہوا۔ سیمان کے آنسوؤں میں مزید تیزی آگئی۔

''مجھے خیرات میں ملنے والی محبت درکار نہیں ہے۔ دانیال کے اس قدم نے میری عزتِ نفس اور انا مجروح کر دی ہے۔'' وہ بلک اٹھی۔

فیروز کا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ دانیال کے بعد عارف کو اپنے زیرِ اثر رکھنا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔ اگر وہ بھی سرکشی پر مائل ہو گیا تو سیمان کا مستقبل نہایت مخدوش ہو جائے گا۔ خاندان بھر میں سیمان اور عارف کی ملاقاتوں نے پہلے ہی بہت منفی صورتِ حال پیدا کردی تھی۔ اس صورت میں کوئی بھی لڑکا اس کا ہاتھ تھامنے پر راضی نہیں ہوسکتا تھا۔ فیروز نے نرمی اور محبت سے یہ خدشات بیٹی کے گوش گزارے جو اس کی سمجھ میں آبھی گئے۔ اس سمجھداری میں انتقام کا عنصر زیادہ مددگار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے منتشر دل و دماغ پر قابو پانے کے لیے کچھ وقت تنہائی کی نذر کیا اور خود کو سنبھالنے کے بعد عارف کے کمرے میں چل دی جہاں ایک اور جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ عارف روانگی کے لیے بالکل تیار نظر آتا تھا۔ اس کی متورم آنکھیں اور کرچی کرچی شدہ آئینے جیسا چہرہ عبرتناک منظر تھا۔

''کہو! اب کیا کھیل کھیلنے آئی ہو حسین ناگن؟'' اس نے تلخی سے پوچھا۔ لہجہ گریہ و زاری کے سبب بے انتہا بوجھل تھا۔ بستر بھی آنسوؤں سے جابجا تر دکھائی دے رہا تھا۔

''میں تو صرف تم سے ملنے آئی تھی۔'' وہ نرمی سے بولی۔ ''لیکن تمہاری طبیعت کچھ بہتر دکھائی نہیں دے رہی۔''

سیمان کی اس تشویش اور التفات پر عارف ہنسنے لگا۔ اس ہنسی میں بھی کراہ نمایاں تھی۔

''تم شاید یہ سمجھ رہی ہو کہ یہ آنسو اور کیفیت تمہارے فراق میں ہیں۔ اس غلط فہمی کو دل میں جگہ مت دو۔ یہ میرے زیاں اور حماقت کا وہ تاوان ہے جو ساری زندگی بھی ادا کرتا رہوں تو بھی ادائیگی مکمل نہیں کر پاؤں گا۔ میں نے نفس کی شرارتیں جان لی ہیں اور ان پر قابو پانے کا رستہ بھی تلاش

کرلیا ہے۔ تمہیں دانیال کا ساتھ مبارک رہے۔ میں تم دونوں کی بہترین اور خوشگوار زندگی کے لیے دعا گو رہوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں سیمان کے لیے سابقہ تڑپ اور جذبات ناپید ہو چکے تھے۔ سیمان کا دل چھلنی ہو گیا۔ انا پر ایک بار پھر کاری ضرب لگی۔

"کیا یہ تیرا آخری فیصلہ ہے؟ میں تو تیرے پاس اپنی دائمی رفاقت کا سندیسہ لے کر آئی تھی۔" اس نے آخری کوشش کرنی چاہی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو عارف اس پیشکش پر جھوم جاتا لیکن اب ضمیر کے کوڑے اس کے حواس تقریباً "بحال" کر چکے تھے۔ اسی لمحے فیروز وہاں چلا آیا۔ اس کا چہرہ فق اور حواس باختہ تھے۔

"وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ عارف کے اس ارتداد کی خبر خراسان کے عامل کے توسط سے بغداد میں خلیفہ تک پہنچ چکی ہے۔ باہر سرکاری اہلکار عارف کی گرفتاری کے لیے آئے ہیں۔" فیروز کے انکشاف نے عارف اور سیمان کے وجود میں بھی تلاطم برپا کر دیا۔

☆☆☆

عارف بلخی کی گرفتاری کے بعد اسے فوری طور پر خراسان سے بغداد منتقل کر دیا گیا۔ عارف کا یہ سفر گریہ د زاری، رب کے حضور معافی اور نفس کی سرکشی پر توبہ میں ہی بیتا۔ سیمان کی یاد کو کچلنے کے لیے طبیعت پر بے انتہا جبر کرنا پڑتا لیکن اب وہ نفس کو کسی بھی طرح دوبارہ غالب نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

بغداد کی دلکشی اور خوبصورتی تصورات سے بالا تر تھی۔ سڑکیں، گلی کوچے، بازار اور نہریں لاتعداد تھیں۔ سڑکوں کے کنارے دل موہ لینے والے بازار اور ایوانات تعمیر کیے گئے تھے۔ ان بازاروں کی گزرگاہ کے درمیان "العطاریہ" تھا جہاں انواع واقسام کے پھول اور عطریات کی خوشبو ہواؤں میں اڑانے لگتی۔

العطاریہ سے ہوتے ہوئے خلیفہ ہارون الرشید کے "قصر الذہب" پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ سابقہ اہلکاروں نے اسے چند نئے سپاہیوں کے حوالے کر دیا جنہوں نے عارف کو ایک کوٹھری میں قید کر دیا۔ وہ رات بھی آہ وزاری اور اپنے گناہ کی معافی طلب کرنے میں گزری۔ اس کے دل میں خلیفہ کے سامنے پیشی سے زیادہ اس بات کے خوف و خدشات تھے کہ اگر طبعی یا غیر طبعی موت نے دبوچ لیا تو بعد از مرگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں کیسے حاضری دے گا؟

اس کرب وتڑپ میں صبح ہو گئی۔ درباری سرگرمیوں کا آغاز ہوتے ہی اسے خلیفہ ہارون رشید کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ خلیفہ کے دربار کی بابت سنی گئی ہر بات حرف بہ حرف درست تھی۔ اس کا تخت دو سیاہ چھتر کے درمیان رکھا گیا تھا۔ یہ سیاہ چھتر غلاموں نے نیزوں کے پھروں سے سنبھالا ہوا تھا۔ خلیفہ کا لباس سیاہ حریر سے بنا تھا۔ اس نے کندھوں پر سبز چادر نبوی ﷺ اوڑھ رکھی تھی۔ اس چادر کی دید نے عارف کے اشکوں میں مزید روانی پیدا کر دی۔ ہاتھ میں عصائے خلافت اور انگلی میں مہر خلافت نے دل کا گداز شدید تر کر دیا۔

درباریوں کے لباس میں بھی سیاہ رنگ نمایاں تھا۔ تخت کے دونوں جانب ایرانی، رومی اور حبشی غلام سنگی مجسموں کی طرح کھڑے تھے۔ ان کے مخصوص زریں لباس یکساں وردی کا تاثر دیتے۔ سب سے ہولناک نظارہ "مسرور" نامی اس گرز بردار کا تھا جس کا لباس، چہرہ اور بدن اپنی آبنوسی رنگت کی وجہ سے دل میں دہشت پیدا کرتا۔ مسرور خواجہ سراؤں اور جلادوں کا سردار تھا۔ وہ محافظ کے فرائض خلیفہ کے عین سرہانے استادہ ہو کر سرانجام دیتا تھا۔ عارف کا حلق خشک تر ہونے لگا۔ تخت کے سامنے زریں مسندوں پر خاندان کے سرکردہ افراد کے علاوہ وزراء اور امراء براجمان تھے۔

اس ماحول نے عارف کو لرزا کر رکھ دیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ آج وہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جا پائے گا۔ ہارون رشید کی تیز نظریں جسم کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"تجھ پر الزام ہے کہ تو نے ارتداد جیسے ناقابل معافی گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔" وہ سختی سے بولا۔ شاہانہ جلال نے عارف کی سٹی گم کر دی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ اس کی زندگی کے ممکنہ آخری لمحات تھے۔

"تو نے زندگی میں بے پناہ گناہ کیے ہیں۔ کبیرہ بھی اور صغیرہ بھی۔ اپنی زندگی کی ان اختتامی گھڑیوں میں جھوٹ بولنے کا گناہ نہ کرنا۔ اپنے جرائم و گناہوں کا بہادری اور سچائی سے سامنا کر!" اس کے ضمیر نے جھنجوڑا۔

"جی ہاں! میں ہی وہ بدبخت ہوں جس نے اپنے نفس سے مغلوب ہو کر یہ داغ پیشانی پر سجالیا۔ وہ میری وقتی گمراہی تھی۔ میں اس کا ہر ممکن کفارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں اس جرم کی وجہ جاننا چاہوں گا اے عاقبت نااندیش انسان!" خلیفہ مزید جلال میں آیا۔ عارف بلخی نے

درباری آداب کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی مختصر پیرائے میں اس کے گوش گزار دی۔

''کیا تجھے اب بھی سمجھ نہیں آئی کہ تیرے اس ارتداد کی اصل وجہ کیا تھی؟'' خلیفہ نے کڑک کر پوچھا۔

''بہت دیر سے سمجھ میں آئی لیکن اب یہ حقیقت جان گیا ہوں کہ میرا قبلہ روزِ اول سے ہی غلط تھا۔ پروردگار نے مرد و زن کو ایک دوسرے کی تکمیل و خوشی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ مومنین اپنے لیے حلال کردہ اشیاء خود ساختہ طور پر حرام نہ ٹھہرالیں۔ میں نے بھی غلطی کی۔ جبلت و فطرت کے سب سے بڑے تقاضے سے منہ موڑ لیا۔ میں کم عقل تو یہ بھی فراموش کر بیٹھا کہ حلال طریقے سے نکاح میرے نبی ﷺ کی سنت ہے۔ میں نے یہ فطری خوشی اپنی ذات پر ہی نہیں بلکہ سیکڑوں عقیدت مندوں پر بھی حرام کر دی۔ بہت گناہ کمایا میں نے...... نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہت گناہ کمایا میں نے......'' عارف کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔

''مجبوری کی بات نہ کر احمق! انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ مجبوری کی آڑ میں چھپ کر گناہ کی توجیہہ تلاش نہیں کر سکتا۔ یہ مجبوری اور بے بسی کی منطق میں تسلیم ہی نہیں کرتا۔''

عارف اس جواب پر مسکرانے لگا۔ ممکنہ موت اور بدترین انجام نے اسے عجیب دلیری عطا کر دی تھی۔ وہ متوازن لہجے میں بولا۔

''مجبور تو ہو جاتا ہے انسان...... خواہ مجھ جیسا کم عقل اور عام شخص ہو یا امیر المومنین جیسا صاحبِ اختیار...... میں رخشندہ اور سیماں کی خوبصورتی کا شکار ہوا اور امیر المومنین کے حرم میں سیکڑوں کنیزیں اسی مجبوری کی ایک اور شاخ ہیں...... مجبور تو ہر ایک ہوتا ہے۔ روپ بس مختلف ہوتے ہیں۔ ہم سبھی مجبور ہیں اور سبھی احمق ہیں۔''

عارف کے اس جواب نے دربار پر سکوت طاری کر دیا۔ امراء اور وزراء کے چہروں پر سراسیمگی نمایاں تھی۔ انہیں اس گستاخ کا بدترین انجام واضح نظر آ رہا تھا۔ ہارون رشید کی کیفیات بھی مختلف نہ تھیں۔ اسے علم تھا کہ مسرور اس شخص کا سر قلم کرنے کے لیے محض ایک اشارے کا منتظر ہے۔ خلیفہ نے خود پر ضبط کیا اور دربار برخاست کر کے عارف کے نگران کو اسے وہیں رکھنے کا حکم دینے کے بعد محل میں چلا گیا۔ عارف بھی اپنے انجام سے واقف تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی موت نے اسے بے خوف کر رکھا تھا۔

کچھ وقت گزرا تو اندرونی سمت سے ایک خواجہ سرا چلا آیا۔

''تمہیں امیر المومنین نے بلایا ہے۔''

''ہمارے لیے کیا حکم ہے؟'' نگران افراد نے دریافت کیا۔

''واپس لوٹ جاؤ! تم لوگ اس کی ذمے داری سے آزاد ہو۔'' خواجہ سرا نے خلیفہ کا اگلا حکم سنایا۔

عارف اس کی معیت میں محل کے اندرونی راستوں کی طرف بڑھ گیا۔ خواجہ سرا اسے ایک بڑے سے کمرے میں لے آیا جس کی سجاوٹ میں خوبصورت و نفیس آرائشی اشیا کا استعمال نمایاں تھا۔ دروازوں پر رنگین ریشمی پردے بہار دکھا رہے تھے۔ خواجہ سرا نے اسے ایک نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عارف کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی پل گزرے تھے کہ اسے وہ مانوس آواز اور کلام سنائی دیا جس نے اس کی زندگی کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دی تھی۔ رخشندہ کی یہ آواز اور موجودگی اسے ایک فریب معلوم ہوئی۔ اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید کو ایک دروازے سے رخشندہ کے ہمراہ آتے دیکھا تو بصارت بھی ایک واہمہ محسوس ہونے لگی۔ رخشندہ خلیفہ کے اشارے پر عارف کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ہارون رشید نے عظیم الشان تخت پر اپنی نشست سنبھال لی۔ عارف اس نئی صورتِ حال پر چکرا کر رہ گیا۔

''میں تیری دلی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تو نے ابھی جس حق گوئی کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے میری بصارت و بصیرت پر پڑا پردہ ہٹا دیا ہے۔ تو نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ کمزور ہوں یا صاحبِ اختیار، عام ہوں یا خواص...... نفس کے ہاتھوں سبھی کہیں نہ کہیں مجبور ہو جاتے ہیں۔ تو مجبور ہوا۔ اس لڑکی کو قافلے سے اغوا کر کے لانے والا شخص بھی مجبور ہی تھا۔ اس نے دربار کے لیے لائی جانے والی کنیزوں کو بردہ فروشوں کا نام دے کر نفس کی شرارت سہی اور بالآخر شاہی عتاب کا مزہ چکھ کر اپنے انجام کو پہنچا۔ تو نے کفارے کی خواہش کی تھی۔ میں تجھے اس کفارے اور ایک متوازن زندگی جینے کا موقع دیتا ہوں۔ دلی دعا کرتا ہوں کہ پروردگار تیری توبہ قبول فرمائے، دین و دنیا کے معاملے میں میانہ روی اختیار کرنے کا موقع عنایت فرما کر گناہوں کی بخشش بھی فرمائے۔ یہ لڑکی تیری حق گوئی کا انعام ہے۔ اسے اپنے لیے حلال بنا کر زندگی کا آغاز کر تا کہ پھر کبھی نفس تجھ پر شب خون نہ مار سکے۔'' خلیفہ نے وقار سے کہا۔

''آپ کا اقبال بلند رہے۔'' عارف کی آنکھوں سے

آنسو بہنے لگے۔

''باب خراسان کی راہ میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک رہائش گاہ میری جانب سے ایک اور انعام سمجھ لو۔ زندگی دوبارہ موقع دینے کی قائل نہیں ہوتی تاہم خوش قسمتی سے اگر ایسا ہوجائے تو اس سے استفادہ نہ کرنا حماقت در حماقت ہوتی ہے۔'' خلیفہ نے ان دونوں کو خواجہ سرا کے ساتھ محل سے باہر بھجوادیا۔

مکان میں رہائش، دربار کی جانب سے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی اور رخشندہ سے نکاح ایک خواب کی صورت تھا۔ عارف بلخی اس نئی زندگی پر سجدۂ شکر بجالاتے نہ تھکتا۔

☆☆☆

جاڑوں کی آمد ہوچکی تھی۔ موسم کی شدت مزاج پر بھی بیزاری بن کر چھائی ہوئی تھی۔ آتش کدہ نو بہار میں روایتی عبادت کے بعد بھی اہلِ علاقہ اپنے گھروں میں مقید تھے۔ تاجر فیروز کے گھر میں یہ حالات کسی موسم کے محتاج نہ تھے۔ اس کے گھر میں سرد موسم نے دائمی ڈیرے جما رکھے تھے۔

''سیمان! میری بچی۔ تھوڑا سا کھانا کھالو۔ بخار نے تمہیں نقاہت میں مبتلا کررکھا ہے۔'' ملازمہ نے ایک پیالہ اس کی جانب بڑھایا۔

''ابا جان نے کھانا کھالیا ہے کیا؟'' سیمان کا سوال حسب توقع تھا۔ اس کے باوجود ملازمہ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو چھلکنے کے لیے بے تاب تھے۔

''ہاں میری بچی! کھالیا ہے۔ وہ آج رات بغداد روانہ ہوجائیں گے۔'' ملازمہ نے جھوٹ تراشا۔ وہ ہر مرتبہ کسی نئے شہر کا نام لیے یہی جھوٹ بولتی تھی۔

''ان سے کہنا مجھ سے مل کر جائیں۔ پچھلی دفعہ بھی مجھے ملے بغیر ہی چلے گئے تھے۔'' سیمان نے اپنا سر کھجایا۔ اس کے دراز ریشمی گیسو بے رنگ، کھردرے اور کسی حد تک سرمئی رنگت اختیار کرچکے تھے۔ چہرے کی شادابی بھی مدھم ہوچکی تھی۔ سرخ و سفید رنگت جھلسی ہوئی معلوم ہوتی۔

''ٹھیک ہے بیٹی! میں تمہارا پیغام انہیں دے دوں گی۔'' ملازمہ کے لبوں سے سسکی برآمد ہوئی۔ تاجر فیروز کی وفات کو ایک سال بیت چکا تھا لیکن سیمان تاحال ذہنی طور پر یہ حقیقت قبول نہیں کرپائی تھی۔ دانیال کی رخصت، عارف کی گرفتاری و غیاب اور پھر والد کی رحلت نے اسے کئی ذہنی و جسمانی امراض میں مبتلا کرکے شباب کی رعنائی ہی چھین لی تھی۔

''انہیں اپنے طور پر بھی ایک بات سمجھا دینا۔ دانیال کو تلاش کرنے یا کسی منت سماجت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خیرات میں ملی محبت نہیں چاہیے۔ اسے میرا اعتبار کرنا چاہیے تھا۔ اسے میری چاہت پر بھروسا ہونا چاہیے تھا۔'' سیمان نے ایک بار پھر وہی بات دہرائی جو ہر مرتبہ کہتی تھی۔

''میں نے انہیں کہہ دیا تھا بیٹی! وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہماری بچی شہزادیوں جیسی آن بان والی ہے۔ اسے بھلا کسی خیرات کی کیا ضرورت؟'' ملازمہ نے لقمہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالا۔

''ہاں! یہ میرا حسن ہی تو تھا جس نے عارف بلخی کو بے دین ہونے پر مجبور کردیا۔'' سیمان فخر سے بولی۔ ''ابھی آتا ہی ہوگا وہ۔ اس کے لیے لباس کا انتظام کروادینا۔''

''ٹھیک ہے میری بچی! میں انتظام کردوں گی۔'' ملازمہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ضبط بالکل ختم ہوچکا تھا۔ نفس کی پکار پر سرپٹ دوڑتی سیمان کی ایسی حالت اس کے لیے اب ناقابلِ برداشت ہوچکی تھی۔ اس کے دل میں یہ خواہش بھی شدت سے بیدار ہوتی کہ کسی طرح وقت کا پہیا الٹا گھما کر وہ لمحات واپس لے آئے جب آتش کدہ نو بہار میں عارف سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ کسی بھی طرح سختی یا پیار سے سیمان کو اس راہ کی مسافر بننے ہی نہ دیتی۔ کبھی یہ بھی دل چاہتا کہ جب وقت کا پہیا الٹا گھمائے تو اس روز سیمان کو آتش کدے میں جانے سے ہی روک لے۔ وہ عارف کے وجود سے ہی ناواقف ہوتی۔ دانیال جب سفر سے لوٹتا تو دھوم دھام سے شادی کے بعد وہ اپنی زندگی میں مگن ہوجاتی۔ وقت کے سفر کرنے کے یہ خیال بارہا اس کے ذہن میں ڈوبتے ابھرتے اور انجام کار وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر ایک ہی بات سوچنے پر مجبور ہوجاتی۔

''زندگی کبھی دوسرا موقع فراہم نہیں کرتی۔ کاش کہ ایک موقع فراہم کردیا کرے...... ہائے کاش!''

ماخذات:

ہارون رشید... از: آلدرے کلاٹ... خلیفہ ہارون الرشید... راجہ طارق

رقیب

شاکر لطیف

اکثر خوش گمانیاں بھی انسان کی زندگی پُرسکون رکھنے کا سبب بن جاتی ہیں یہ اور بات کہ جب اس پُرسکون سمندر میں کوئی پتھر پھینک دے تو پھر دائرہ در دائرہ پھیلتی سوچوں کا انتشار سارا سکون درہم برہم کر ڈالتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے تو محبت کے بچھڑ جانے پر صبر کرلیا تھا مگر ... شاید محبت کو اس کا صبر کچھ اچھا نہیں لگا۔

جھوٹی تسلی...... دھندلے خوابوں کے سہارے جینے والے ایک ناکام عاشق کا قصہ



میرے سیل فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے نمبر دیکھا اسی نے پھر فون کیا تھا۔ چند ثانیوں کے تذبذب کے بعد میں نے فون اٹھالیا۔

''ہیلو......'' میں نے حتی الامکان اپنا لہجہ نرم رکھا۔ شاید میں اب اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس سے سخت لہجے میں بات کرسکتا۔ مجھے سمجھداری سے کام لے کر اس سے نمٹنا تھا۔ میرے سخت الفاظ اسے مشتعل کرسکتے تھے اور یہ میرے حق میں اچھا نہیں تھا۔ اس کا ایک مشتعل قدم

میرے لیے مصیبت پیدا کرسکتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے جبکہ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس سے پہلے اس نے مجھے دو دفعہ فون کیا تھا اور اس سے بات چیت میں مجھے حالات کی سنگینی کا بخوبی ادراک ہو چکا تھا۔

''یہ میری تیسری کال ہے اور اب میں دوبارہ کال نہیں کروں گا۔'' اس کی کرخت اور بھاری آواز سنائی دی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دانستہ آواز بدل کر بات کررہا تھا' شاید وہ مجھ سے اپنی شناخت چھپانے کی کوشش کررہا تھا مگر ایسا تو اسی صورت ممکن تھا جب میں اسے جانتا ہوتا۔ تو کیا واقعی وہ کوئی ایسا شخص تھا جسے میں جانتا تھا؟

''اگر ہمت ہے تو سامنے آکر بات کرو۔'' میں نے کہا۔

''بکواس بند کرو۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا'' میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میں دوبارہ کال نہیں کروں گا۔ اب تمہیں مجھے اسی نمبر پر کال کرنا ہے۔ یاد رکھنا اس نمبر کے ذریعے تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ آج سوچنے کے لیے تمہارے پاس آخری دن ہے۔ اس کے بعد مجھے آگاہ کردینا۔ بصورتِ دیگر میں کوئی سخت فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

میں کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا اور پھر میں نے موبائل فون سامنے موجود ٹیبل پر پٹخ دیا۔

'حرامزادہ......! اگر میرے سامنے آگیا تو میں اس کا خون پی جاؤں گا مگر وہ بہت چالاک ہے، سامنے نہیں آئے گا اس کی بات مان لینے میں ہی بھلائی ہے۔' میں نے سوچا۔

'اس بارے میں بعد میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے' فی الحال مجھے مارسیلا کی سالگرہ منانی ہے' میں نے اس منحوس فون والے پراسرار شخص کو وقتی طور پر اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور پھر میز کی دراز کھولی اور مارسیلا کی وہ اکلوتی تصویر نکال لی جو میرے پاس برسوں سے موجود تھی۔ میں نے مارسیلا کو پچھلے چھ برس سے نہیں دیکھا تھا تاہم وہ میری یادوں میں اس طرح آباد تھی جیسے میں اسے روزانہ دیکھتا تھا۔ اگرچہ میں نے اسے طویل عرصے سے نہیں دیکھا تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہوگی جس طرح تصویر میں دکھائی دے رہی تھی۔ مارسیلا جس کے گالوں پر ہنستے وقت گڑھے پڑ جاتے تھے۔ جو جب دور سے چلتی ہوئی آتی تھی تو اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وقت اپنی جگہ تھم سا گیا ہے۔

میں جانتا تھا کہ آج اس کی سالگرہ ہے اور وہ شاید اپنی سالگرہ اس منحوس چارلی کے ساتھ منا رہی ہوگی جس سے میں بے انتہا نفرت کرتا تھا۔ جس طرح مارسیلا میری یادوں میں ہمیشہ کے لیے آباد ہو چکی تھی، میرا دل اس کی یاد کی مہک سے معطر رہتا تھا، اسی طرح چارلی بھی میرے ذہن میں ان اشخاص کے ساتھ موجود تھا جن سے مجھے بے انتہا نفرت تھی۔

چارلی وہ شخص تھا جس نے مارسیلا کو مجھ سے چھین کر میری زندگی برباد کرڈالی تھی۔ مجھے عمر بھر کا ایک ایسا روگ دیا تھا جس سے جان چھڑانا اب میرے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا تھا کہ اس حرامزادے کو موت کے گھاٹ اتار دوں تاہم میں اپنے ذہن میں پنپنے والے اس منصوبے کو کبھی عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ مجھے چارلی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر میں مارسیلا کو کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو آئیں۔

میں نے مارسیلا کو پانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے تھے، اس کی خاطر کئی لڑائیاں لڑنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔

مجھے کالج کا وہ دن آج بھی یاد تھا جب میں نے اس کی خاطر کالج کے سب سے خطرناک اور جھگڑالو لڑکے راک سے لڑائی مول لی تھی۔ اگرچہ راک کالج کا باکسنگ چیمپئن تھا مگر اس کے باوجود میں اس کی ناک توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ اپنی اس فتح کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ میری محبت کی طاقت تھی تاہم کالج کے دوستوں کی رائے کے مطابق کیونکہ میں نے اس لڑائی میں ایک عدد ہاکی کا استعمال کیا تھا اسی لیے میری جیت ممکن ہوئی تھی۔

بہرحال بات جو بھی تھی، جیت میرے ہی حصے میں آئی تھی...... اگرچہ اس لڑائی سے پہلے بھی میں مارسیلا کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتا تھا تاہم اس کے بعد میں اس کے کافی قریب آگیا تھا اور کسی حد تک اس غلط فہمی میں بھی مبتلا ہو گیا تھا کہ مارسیلا بھی مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ یہ میری خام خیالی اور خوش فہمی تھی تاہم مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھے نہیں بلکہ چارلی کو پسند کرتی ہے۔

میرے لیے اس صدمے کو برداشت کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مارسیلا میری محبت تھی اور میں اس پر دل و جان سے فدا ہو چکا تھا۔ میں تو اس غلط فہمی میں مبتلا رہا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے مگر شاید وہ حرامزادہ چارلی مجھ سے زیادہ تیز نکلا تھا۔ میں منہ دیکھتا رہ گیا اور وہ بازی مار گیا تھا۔ انسان کو کسی اور جگہ شکست ہو جائے تو وہ سنبھل جاتا ہے

اور اگر وہ محبت میں شکست سے دوچار ہو جائے تو زندگی بھر نہیں سنبھل پاتا۔ عشق میں ہاری ہوئی بازی دوبارہ جیتنا ناممکن ہوتا ہے۔ میں بھی آج تک اپنے ناکام عشق کو رو رہا تھا، شاید اسی عشق نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ بس ایک بے کیف سی زندگی تھی جو میں گزار رہا تھا۔

میرا نام الیگزینڈر ہے۔ مارسیلا سے میری پہلی ملاقات کالج میں ہی ہوئی تھی اور شاید میں پہلی ہی نظر میں اس پر مرمٹا تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ اور ملنسار لڑکی تھی۔ ہر ایک سے بہت جلدی گھل مل جاتی تھی اس لیے اس کا حلقۂ احباب بھی خاصا وسیع تھا تاہم راک کو پیٹنے کے بعد میں اس کے خاص دوستوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ راک ویسے تو ایک باکسر تھا لیکن اندر سے انتہائی بزدل انسان ثابت ہوا۔ مجھ سے مار کھانے کے بعد اس نے بدلہ لینے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی الٹا وہ مجھ سے خوفزدہ رہنے لگا تھا۔

اسے پیٹنے کے بعد کالج میں اس کا سارا رعب ودبدبہ ختم ہو گیا تھا اور میرا طوطی بولنے لگا تھا۔ مارسیلا کے قرب نے تو میرے اندر کی مردانگی کو مزید طاقت اور جلا بخش دی تھی اس لیے میں مارسیلا کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کرنے والوں کی اکثر اوقات دھنائی کر دیا کرتا تھا۔ میں اپنے اس رعب ودبدبے سے خوش تھا اور اس زعم میں مجھے احساس بھی نہ ہوسکا کہ رفتہ رفتہ میری شہرت کالج کے ایک جھگڑالو اور اکھڑ مزاج غنڈے کی سی ہو چکی ہے۔ شاید مارسیلا بھی میری ان حرکتوں سے دل ہی دل میں نالاں رہنے لگی تھی۔

مگر میں رعب ودبدبے اور برتری کے زعم میں مگن تھا۔ مجھے چارلی کی مارسیلا کی جانب پیش قدمی کا پتا ہی نہ چل سکا۔ اس وقت مجھے چارلی سے بھی کوئی پُرخاش نہیں تھی بلکہ وہ میرا اچھا دوست تھا۔ چارلی کے بارے میں میرے دل میں پہلی مرتبہ جذبۂ رقابت اس وقت بیدار ہوا جب کچھ دوستوں کے توسط سے مجھے یہ علم ہوا کہ مارسیلا اور چارلی آپس میں محبت بھرے عہدو پیماں کر چکے ہیں اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شادی کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں۔ مارسیلا نے یہ بات اپنی کئی سہیلیوں کو بھی بتائی تھی اور میں نے اس بارے میں ان سے بھی تصدیق کر لی۔

میں مارسیلا کے ساتھ ایک خوشگوار اور حسین زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میرے سارے خواب اتنی جلدی ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، یہ مجھے گوارا نہ تھا۔

میں نے مارسیلا سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ جب اسے علم ہوگا کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں تو وہ چارلی کے بارے میں اپنے فیصلے پر نظرثانی ضرور کرے گی۔

مجھے آج بھی وہ وقت بلکہ مارسیلا کا ایک ایک لفظ اچھی طرح یاد تھا جو اس نے میرے پروپوزل کے جواب میں کہے تھے۔

”آئی ایم سوری الیگزینڈر! میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں چارلی کا پروپوزل قبول کر چکی ہوں۔“

”مگر مارسیلا میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ چارلی تم سے محض دل لگی کر رہا ہے، وہ تمہیں خوش نہیں رکھے گا۔“ میں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

”بس.....“ مارسیلا نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید بولنے سے روک دیا۔ ”میں چارلی کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کروں گی۔ وہ اب میرا ہونے والا شوہر ہے۔“

مارسیلا کا لہجہ دوٹوک تھا، میرا دل بجھ سا گیا۔

”جیسے تمہاری مرضی، مارسیلا! میری بس یہ خواہش ہے کہ تم جہاں بھی رہو خوش رہو۔“ میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور پھر وہاں سے چلا آیا۔

آتے وقت بھی میرے ذہن میں یہ امید بھرے خیالات گردش کرتے رہے کہ شاید وہ مجھے عقب سے آواز دے کر روک لے، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس ستم گر نے تو مجھے ایک بار روک کر جھوٹی تسلی دینے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک دفعہ روک کر پیار سے سمجھا دیتی تو اس کا کیا جاتا؟ اس طرح شاید میرے دل کو کچھ تسلی ہو جاتی۔

قصہ مختصر کہ مارسیلا اور چارلی شادی کے بندھن میں بندھ گئے اور میں شہر سے دور دراز اس پہاڑی علاقے میں بس گیا جہاں میرے گھر کے علاوہ گنتی کے چند گھر اور تھے تاہم میں کسی سے بھی زیادہ میل جول پسند نہیں کرتا تھا۔ آس پاس کے ہمسایوں نے کچھ مرتبہ مجھ سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی تاہم میرے سرد اور درشت رویے کی وجہ سے اب انہوں نے بھی مجھ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ میرا اگر اس چھوٹے سے قصبے کے کسی باسی سے مختصر سا تعارف تھا تو وہ اس چھوٹی سی آبادی والی جگہ کا واحد دکان دار تھا جس سے میں خورونوش کا سامان وغیرہ خریدتا تھا۔

مارسیلا کی شادی اور اس سے بچھڑنے کے بعد میری طبیعت میں عجیب سی تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ میں ذہنی خلجان میں مبتلا ہو کر نشے کا عادی ہو چکا تھا۔ میری طبیعت میں ہر وقت ایک عجیب سا اضطراب اور بے چینی طاری رہتی تھی۔ مارسیلا کی یادیں اور خیالات ہر وقت میرے تعاقب میں

رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو مجھ پر وحشت سی سوار ہوجاتی، دل کرتا کہ خود کو ختم کرلوں تاہم میں اپنے اس جارحانہ خیالات پر قابو پالیتا تھا۔ میں اس کے عشق میں پاگل ضرور تھا مگر اتنا پاگل بھی نہیں تھا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیتا۔

میرے دل کی بہت عجیب حالت تھی۔ کبھی مجھے اس کی یاد سے وحشت ہونے لگتی تھی اور کبھی مزہ آنے لگتا تھا۔ کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ میرے پاس ہی موجود ہے ایسے میں، میں اس سے گھنٹوں باتیں کرتا رہتا اور پھر یک بیک مجھے احساس ہوتا کہ میں اکیلے میں خود سے باتیں کررہا ہوں۔ حقیقت کا اور اپنی تنہائی کا ادراک ہوتے ہی میری ہنسی چھوٹ جاتی۔ شاید اس کے عشق نے مجھے نفسیاتی مریض بناڈالا تھا۔

اب مجھے اس پہاڑی اور سرد مقام پر رہتے ہوئے چھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں نے ایک بار بھی مارسیلا سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں خوش ہوگی اور حقیقت یہ بھی کہ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ خوش رہے۔ میرا خیال تھا کہ اب تک اس نے مجھے بھلا دیا ہوگا مگر افسوس میں اسے نہیں بھلا پایا تھا اور آج بھی اس کے عشق میں گرفتار تھا۔ اب تو مجھے یہ تڑپنا اچھا لگنے لگا تھا۔ اس درد سے مجھے ایک عجیب قسم کی لذت اور سرشاری کا احساس ہوتا تھا تاہم یہ کیفیت کبھی کبھی ہی طاری ہوتی تھی۔

میرے پاس بس اس کی ایک ہی تصویر تھی جسے میں نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ مجھے اس کی سالگرہ کا دن کبھی نہیں بھولتا تھا اس لیے میں ہر سال ایک چھوٹا سا کیک کاٹ کر اس کی سالگرہ مناتا تھا اور یہ سوچ کر خوش بھی ہوتا تھا کہ وہ بھی اس وقت اپنے شوہر اور بچوں وغیرہ کے ساتھ سالگرہ کا کیک کاٹ رہی ہوگی۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کے کتنے بچے تھے، بس اندازہ تھا کہ جب شادی ہوئی ہے تو بچے بھی ہوں گے۔

ابھی مارسیلا کی سالگرہ کا کیک نہیں آیا تھا۔ قصبے کے اکلوتے دکان دار مورس کو میں نے کچھ رقم دے کر شہر کیک لانے کے لیے بھیجا ہوا تھا اور اسے تلقین بھی کی تھی کہ ہر سال کی طرح اس بار بھی کیک پر مارسیلا کا نام لکھوانا ہے۔

مورس نامی اس بوڑھے دکان دار کو اس بات سے کوئی غرض یا دلچسپی نہیں ہوتی تھی کہ مارسیلا کون ہے اور میں ہر سال اس کے نام کی سالگرہ کیوں مناتا ہوں۔ اس نے کبھی مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اسے بس اس انعام سے غرض رہتی تھی جو میرا کام کرنے کے بدلے میں اسے ملتا تھا۔ اب مجھے اس کی آمد کا انتظار تھا مگر اس کی جگہ جس شخص کی آمد ہوئی اس نے مجھے ششدر کردیا۔

انسان کی زندگی میں کبھی کبھی بڑے عجیب اتفاقات ہوتے ہیں۔ وہ جس بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے وہی حقیقت بن کر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ میں جب بھی مارسیلا کے بارے میں سوچتا تھا تو میرے ذہن میں ساتھ ہی چارلی کا خیال بھی آتا تھا۔ محبوبہ کا خیال آئے اور رقیب کا خیال نہ آئے یہ ممکن نہیں مگر یہاں تو رقیب خود آدھمکا تھا۔ یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ چارلی اس دور دراز اور ویران جگہ پر مجھے تلاش کرتا ہوا میرے دروازے تک پہنچ جائے گا۔

میں اکثر گھر کا دروازہ بند نہیں کرتا تھا اور آج تو میں نے دانستہ دروازہ کھلا چھوڑ رکھا تھا کیونکہ مجھے اس بوڑھے مورس کا انتظار تھا جسے میں نے کیک لینے کے لیے بھیجا ہوا تھا۔

”الیگزینڈر! کیا یہ تم ہی ہو؟“ کسی نے میرے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ میرے گھر کا ڈرائنگ روم خارجی دروازے سے متصل تھا اس لیے میں نے اندر آنے والے کو نہ صرف دیکھ لیا بلکہ فوراً پہچان بھی لیا۔ میں بھلا اپنے رقیب کو کیسے بھول سکتا تھا۔

اگرچہ میں نے چارلی کو چھ برس بعد دیکھا تھا مگر اس کے باوجود اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ اس کے حلیے اور وضع قطع میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی، بس توند نکل آئی تھی۔

”چلے آؤ چارلی! تم درست پتے پر آئے ہو۔“ میں نے مارسیلا کی تصویر اپنی جیب میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ چارلی کی آمد پر میں اپنے چہرے پر ایک منافقانہ مسکراہٹ لیے اپنی جگہ سے کھڑا بھی ہوگیا تھا۔

”الیگزینڈر! تم سے ایک طویل عرصے بعد مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ چارلی نے آگے بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا اور پھر مجھ سے علیحدہ ہوکر میرے سامنے موجود صوفے پر براجمان ہوگیا۔ میں بھی دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کچھ پرانے دوستوں سے تمہارے اس پتے کا علم ہوا تھا۔ تاہم ادھر آنے کا اتفاق آج ہی ہوا ہے۔ میں ایک ضروری کام سے ادھر قریب ہی آیا تھا تمہارا پتا میرے ذہن میں تھا اس لیے سوچا تم سے بھی مل لوں۔ بہرحال تمہارا پتا تلاش کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ یہ جگہ اور آس

پاس کا سارا علاقہ ویران ہے۔ مجھے دو میل تک کا سفر پیدل طے کرنا پڑا ہے۔"

"ہاں، اس جگہ دو میل پیچھے گاڑی چھوڑنی پڑتی ہے کیونکہ آگے کی سڑک اتنی چوڑائی نہیں رکھتی کہ اس پر گاڑی چل سکے۔ ہاں اچھی قسم کی اور پاور فل انجن والی بائیک یہاں تک آجاتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو میں بہرحال تم سے ملنے میں تو کامیاب ہو گیا ہوں ورنہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اب بھی اس پتے پر موجود ہو گے۔" چارلی نے کہا۔ "ویسے تمہاری دروازہ کھلا چھوڑنے کی پرانی عادت آج تک نہیں گئی۔ کالج کے ہاسٹل میں بھی تم رات کو اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول جاتے تھے۔ اس عادت کی وجہ سے تمہاری کئی قیمتی اشیا بھی چوری ہو گئی تھیں۔"

"اور تمہاری منہ اٹھا کے کسی کے گھر میں داخل ہونے کی عادت بھی نہیں بدلی۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا تو چارلی بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

ہنستے وقت اس کا بلڈاگ نما چہرہ مزید بدصورت لگنے لگتا تھا۔ نہ جانے مارسیلا کو اس میں کیا دکھائی دے گیا تھا؟ میں نے نفرت سے سوچا تاہم چہرے پر بدستور مسکراہٹ بکھیرے رکھی۔ میں چارلی کا پرانا دوست تھا، اس کی عادات اور فطرت سے بخوبی آگاہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بلا مطلب اپنے باپ سے ملنے بھی نہ جائے، میں تو صرف اس کا دوست تھا۔ وہ اس جگہ مجھ سے ملنے بھی کسی خاص وجہ سے ہی آیا تھا تاہم میں خود اس سے کچھ پوچھنے کے بجائے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ پتا بھی شاید اسے شہر میں رہنے والے میرے کسی دوست سے اتفاقیہ طور پر مل گیا تھا ورنہ میرے پرانے دوستوں میں بھی بہت کم افراد کو اس جگہ کا علم تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ جلد ہی اپنے مطلب کی بات پر آجائے گا مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

"میں اس وقت تم سے بہت ضروری کام کے سلسلے میں ملنے آیا ہوں۔" کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "مگر پہلے تمہیں تمام صورتِ حال سے آگاہ کرنا پڑے گا۔ پس منظر میں جائے بغیر شاید تمہیں میری بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئے۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے اس بار سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

"تو پھر غور سے سنو، میں ان دنوں پرائیویٹ سراغ رسانی کا کام کر رہا ہوں، اس سلسلے میں، میں نے اپنا ایک آفس بھی بنا رکھا ہے۔ میں معقول معاوضے پر سراغ رسانی کا کام کرتا ہوں اور تمہارے پاس بھی اسی سلسلے میں آیا ہوں۔ اس وقت میں ایک قتل کی انویسٹی گیشن کر رہا ہوں اور مجھے پولیس سے پہلے قاتل تک پہنچ کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری مدد کرو گے۔" چارلی نے جواب دیا۔

"مگر میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ...... اور اس ویران جگہ پر ایک قتل کے سلسلے میں تمہاری آمد کا کیا مقصد ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے یونہی ادھر کا رخ نہیں کر لیا میرے دوست! مجھے میری تفتیش ادھر لے آئی ہے۔ اب اس سے آگے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"میں شاید تمہاری اس معاملے میں کوئی مدد نہ کر سکوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سچ ہے کہ مجھے اس علاقے میں رہتے ہوئے چھ سال کا عرصہ بیت گیا ہے تاہم پھر بھی میں اس علاقے کے زیادہ افراد کو نہیں جانتا۔ میں ذرا آدم بیزار قسم کا آدمی ہوں اس لیے زیادہ افراد سے میل جول پسند نہیں کرتا اور دوسری بات یہ ہے کہ ابھی تک میں تمہاری بات کا مطلب ہی نہیں سمجھ پایا۔ تم ایک پرائیویٹ سراغ رساں بن گئے ہو، چلو اچھی بات ہے مگر تم کس کے قتل کے بارے میں تفتیش کر رہے ہو اور وہ تفتیش تمہیں اس علاقے تک کیسے اور کیوں لے آئی؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔" میں نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس سے مرڈر والے موضوع سے ذرا ہٹ کر بات کرنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے مارسیلا کے بارے میں بھی کوئی بات کرے۔ وہ کیسی تھی اور ان دنوں کیا کر رہی تھی؟ کیا اس نے کبھی اس کے سامنے میرا ذکر کیا تھا...... کبھی مجھے یاد کیا تھا؟ مارسیلا میری کالج فرینڈ بھی تو تھی، وہ بطور ایک دوست ہی اس کا کچھ ذکر کر دیتا مگر اس کی باتوں سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ فی الحال اس کا ذکر کرنے کے موڈ میں نہیں۔

"میں اس مرڈر کے بارے میں بات کر رہا ہوں جو یہاں سے صرف چار کلومیٹر کی دوری پر ہوا ہے۔ تم مشہور شکاری جانسن کو تو جانتے ہی ہو گے؟ اسے کل دوپہر اس وقت کسی نے گولی ماردی جب وہ ان پہاڑوں میں برفانی خرگوش کا شکار کھیل رہا تھا۔ پولیس اس بارے میں تفتیش کر رہی ہے تاہم جانسن کے والد نے اس کے قاتل کو تلاش

کرنے کے لیے میری خدمات بھی حاصل کی ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ پولیس کی تفتیش خاصی سست روی سے آگے بڑھے گی اور وہ جلد از جلد اپنے بیٹے کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کے خواہاں ہیں اسی لیے انہوں نے قاتل کی تلاش کا فریضہ مجھے سونپا ہے اور مجھے شک ہے کہ قاتل کا تعلق اسی پہاڑی علاقے سے ہے۔'' چارلی نے اس بار پوری تفصیل سے مجھے ساری بات بتاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں جانسن کے قتل کے بارے میں خبر ٹی وی پر دیکھ چکا ہوں۔ وہ خاصا مشہور شکاری تھا تاہم میں نے صرف اس کا نام ہی سن رکھا تھا، اس کی کسی گینگسٹر کے ساتھ دشمنی کے قصے بھی میں سن چکا ہوں اور ٹی وی پر خبروں میں بھی اسی گینگسٹر کا نام لیا جا رہا ہے۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' چارلی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے بھی سو فیصد یقین ہے کہ جانسن کا قتل اسی گینگسٹر نے کروایا ہے تاہم جس وقت جانسن کو قتل کیا گیا، اس وقت وہ گینگسٹر اپنے گھر میں موجود تھا۔ اس کی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ اس وجہ سے اس کے گھر کافی تعداد میں مہمان بھی موجود تھے۔ اس کے پاس قتل کے وقت جائے وقوع سے اپنی غیر حاضری کا ٹھوس ثبوت موجود ہے۔''

''اگر وہ قتل کے وقت اپنے گھر پر ہی موجود تھا تو پھر تم اسے ذمے دار کیوں مان رہے ہو؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تم بھی نرے گاؤدی ہو، شاید تم نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا...... میں نے یہ نہیں کہا کہ اس نے قتل کیا ہے، میں نے یہ کہا ہے کہ اس نے قتل کروایا ہے۔'' چارلی جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بھئی اتنا بڑا گینگسٹر کیا اپنے دشمن کو مارنے کے لیے خود آئے گا؟ سیدھی سی بات ہے کہ جانسن کو مروانے کے لیے اس نے کسی کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کی ہیں۔ پولیس کے بعد میں نے بھی جائے وقوع کا معائنہ کیا ہے اور مجھے ایک ایسا ثبوت ملا ہے جو پولیس کو نہیں مل سکا۔ برفانی علاقے میں کل برف باری ہوتی رہی تھی اس لیے برف پر قاتل کے قدموں کے نشانات اور فنگر پرنٹس تو نہیں مل سکے مگر مجھے جائے وقوع سے صرف چار سو میٹر کے فاصلے پر ایک انگوٹھی ملی ہے جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ قاتل کی ہی ہے اور اس انگوٹھی کی وجہ سے مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ قتل کرنے کے بعد قاتل کس سمت پیدل گیا تھا، اسی وجہ سے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ یہ انگوٹھی برف میں دب چکی تھی بس اتفاق سے میرے پاؤں کی ٹھوکر لگنے سے باہر آ گئی اور مجھے دکھائی دے گئی۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک انگوٹھی نکال کر میری آنکھوں کے سامنے کی تو میں بے اختیار چونک پڑا۔ میں نے چارلی کے ہاتھوں سے انگوٹھی لے کر کچھ دیر تک اس کا بغور جائزہ لیا اور پھر حلق سے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے انگوٹھی اسے واپس دے دی۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے اس انگوٹھی کو کہیں دیکھا تھا تاہم فوری طور پر مجھے یاد نہیں آ سکا کہ یہ انگوٹھی میں نے کہاں دیکھی تھی تاہم میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ انگوٹھی میں نے اپنے ہی علاقے کے کسی آدمی کی انگلی میں دیکھی تھی۔ اس انگوٹھی پر ذرا منفرد قسم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور شاید اسی لیے یہ میری یادداشت میں موجود تھی۔

''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ انگوٹھی اس قاتل کی ہی ہے۔'' چارلی بولا۔

''میرے خیال میں یہ انگوٹھی واقعی ہمارے قصبے کے کسی آدمی کی ہے اور شاید میں نے اسے کسی کے ہاتھ میں دیکھا بھی ہے مگر فی الحال وہ آدمی میرے ذہن میں نہیں آ رہا۔ تم کچھ دیر انتظار کر لو، میں نے اس قصبے کے اکلوتے دکان دار جس کا نام موری ہے کو شہر ایک ضروری کام سے بھیجا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس انگوٹھی کو ضرور پہچان لے گا کیونکہ اس کی دکان پر یہاں کے ہر شخص کا آنا جانا ہے۔''

موری کی واپسی کے قضیے میں، میں نے مارسیلا کے نام والا کیک منگوانے کا قصہ سرے سے گول کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ چارلی کے لیے یہ ناقابل برداشت ہوتا کہ اس کی بیوی کا کوئی پرانا اور خبطی قسم کا عاشق ہر سال اس کی سالگرہ مناتا ہے۔ آج اصولی طور پر تو چارلی کو مارسیلا کے پاس ہونا چاہیے تھا مگر شاید وہ اس کیس کے چکر میں مارسیلا کی سالگرہ کا دن بھول گیا تھا۔

''ویری گڈ! مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ قاتل کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ اب میں پولیس سے پہلے اس تک پہنچ جاؤں گا۔'' چارلی مسرت بھرے لہجے میں بولا۔

''مگر جائے وقوع کے پاس سے کسی انگوٹھی کا ملنا یہ ثابت نہیں کرتا کہ یہ قاتل کی ہی انگوٹھی ہے۔ ممکن ہے یہ کافی عرصے سے اسی جگہ پڑی ہو اور تمہیں اتفاق سے مل گئی ہو۔ تم اس کو قاتل کے ساتھ نتھی کیسے کر سکتے ہو؟'' میں نے کہا۔

چارلی سے گفتگو کے دوران میں ذہن پر زور دے کر

یہ یاد کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا کہ اس انگوٹھی کو میں نے کہاں دیکھا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ میں نے اس انگوٹھی کو کسی کے ہاتھ میں ضرور دیکھا تھا مگر وہ کون تھا؟ یہ میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ انگوٹھی کے اوپری حصے پر بنے نقش و نگار میرے ذہن کے کسی دریچے میں محفوظ تھے۔ میں نے وقتی طور پر اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ ذہن کو آزاد چھوڑنے سے مجھے جلد ہی انگوٹھی والے شخص کے بارے میں یاد آجائے گا۔

''تمہاری بات میں وزن ہے مگر میں ایک امکانی نکتے پر تفتیش کر رہا ہوں۔ یہ ممکن ہے یہ اسی قاتل کی ہو، اگرچہ برف باری کی وجہ سے اس بات کا تعین نہیں ہوسکا کہ قاتل کس جانب گیا تھا مگر مجھے ایک چٹان کے نیچے قدموں کے نشانات ملے ہیں۔ چٹان کا وہ حصہ برف باری سے محفوظ رہا تھا اور قدموں کے نشانات بھی پرانے نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ قاتل کے قدموں کے ہی نشانات ہیں۔'' چارلی نے جواب دیا۔

''تمہارا دماغی توازن تو خراب نہیں ہوگیا؟'' میں نے اس بار غصیلے لہجے میں کہا۔ ''قدموں کے نشانات تو کسی کے بھی ہوسکتے ہیں اور پھر اس علاقے میں تو کئی جنگلی قبیلے آباد ہیں۔ یہ نشانات اور انگوٹھی ان کی بھی ہوسکتی ہے۔ تم نے ان سب قبیلوں کو چھوڑ کر اسی جانب کا رخ کیوں کیا؟ میرے سامنے خوانخواہ شرلاک ہومز بننے کی کوشش مت کرو۔''

''تم سراغ رسانی کے پیشے سے وابستہ نہیں ہو اسی لیے ایسی باتیں کر رہے ہو۔'' وہ میرے سخت لہجے کا برا منائے بغیر بولا۔ ''میں تمہیں دوبارہ ذرا تفصیل سے سمجھاتا ہوں۔ دیکھو چٹان کے نیچے مجھے جو قدموں کے نشانات ملے ہیں وہ پرانے نہیں ہیں ورنہ معدوم ہوجاتے۔ دوسری بات یہ کہ اس علاقے میں جتنے قبیلے آباد ہیں وہ سب جنگلی قبائل ہیں۔ ان کا رہن سہن آج بھی قدیم طرز کا ہے۔ وہ اس قسم کے جوتے پہنتے ہی نہیں جس قسم کے قدموں کے نشانات ہیں۔ یہ انگوٹھی مجھے ان نشانات کے کافی قریب سے ملی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اسی کی ہے جس کے قدموں کے نشانات مجھے ملے تھے۔ اب میں اس طرف آتا ہوں کہ میں تمہارے اس چھوٹے سے قصبے میں ہی قاتل کی تلاش میں کیوں آیا ہوں؟ تو دیکھو کسی بھی قاتل کا پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ جائے وقوع سے جتنی جلدی دور ہوسکے ہوجائے۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے اس لیے اگر قدموں کے وہ نشانات قاتل کے ہی ہیں تو پھر ان قدموں کا رخ تمہارے ہی قصبے کی جانب تھا۔ نشانات بڑے بڑے بوٹوں کے ہیں اور راستے میں پڑنے والے قبائلی قدیم رسم و رواج سے وابستہ ہیں، وہ تو جدید دور کے لباس نہیں پہنتے، بوٹ کیسے پہنیں گے؟ اب رہ گیا تمہارا قصبہ تو پھر اس شخص کا تعلق اسی قصبے سے ہوسکتا ہے کیونکہ یہ آخری رہائشی علاقہ ہے، اس سے آگے آبادی ہی نہیں ہے۔ قدموں کے نشانات کے رخ سے اس جگہ کا تعین ہوتا ہے۔ چٹان کے نیچے وہ قاتل جتنا بھی آگے بڑھا، اس کے قدموں کا رخ تبدیل نہیں ہوا۔''

''تم ہوا میں تیر چلا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لازم نہیں ہے کہ قاتل ادھر ہی آیا ہو۔ ہوسکتا ہے اس نے یہ نشانات پولیس کو ڈاج دینے کے لیے چھوڑے ہوں اور بعد میں مین روڈ کی جانب بڑھ گیا ہو۔''

''ہماری تفتیش اندازوں کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہے۔ میں پولیس سے پہلے اس کیس کو حل کرنا چاہتا ہوں، اگر میں کامیاب رہا تو ہر طرف میرے نام کا ڈنکا بج جائے گا۔ ویسے تم خود بھی اس انگوٹھی کے بارے میں اعتراف کرچکے ہو۔'' چارلی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

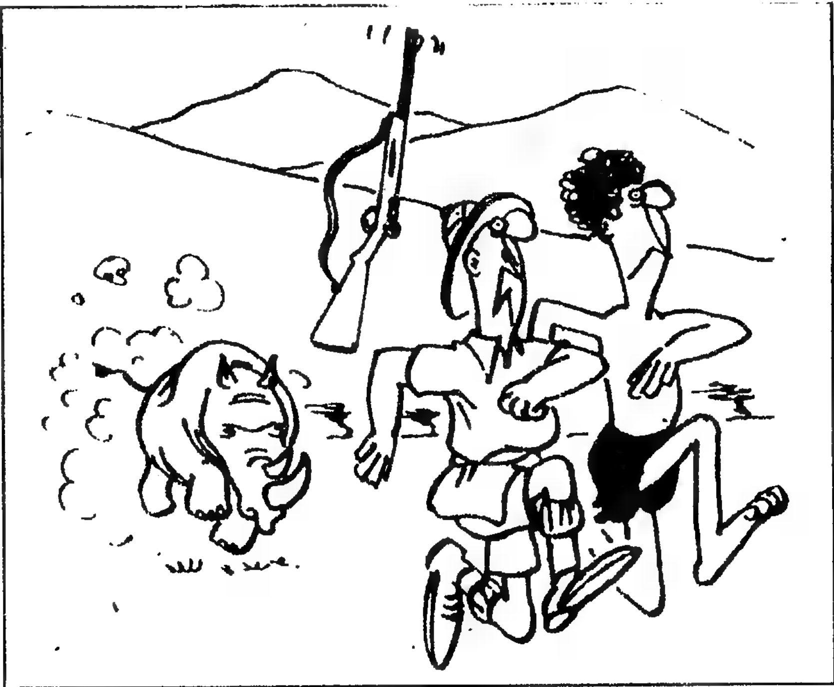
''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میری یادداشت میں اس انگوٹھی کے نقش و نگار محفوظ ہیں تاہم مجھے فی الحال یاد نہیں آرہا کہ میں نے اس انگوٹھی کو کس کے ہاتھوں میں دیکھا تھا مگر اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہے میری اس سے ملاقات ضرور ہوئی ہے اور شاید اسی ملاقات میں اس انگوٹھی کے نقش و نگار میری یادداشت میں محفوظ ہوگئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی وہ شخص میرے لاشعور سے شعور میں آجائے گا۔'' میں نے اپنی یادداشت پر ایک بار پھر زور دیتے ہوئے کہا اور پھر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

میں کافی دیر سے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس انگوٹھی کو میں نے کہاں اور کس کے ہاتھوں میں دیکھا تھا اور اب بالآخر مجھے یاد آگیا تھا کہ وہ کون تھا۔

میں اس کے بارے میں سوچنے لگا، بادی النظر میں ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ اس قسم کا آدمی ہوگا تاہم اب انسان کسی کے دل میں جھانکنے سے تو رہا۔ اپنی زندگی میں مجھے بارہا اس بات کا تجربہ ہوچکا تھا کہ بظاہر شریف نظر آنے والے افراد بھی اندر سے کرمنل مائنڈڈ ہوسکتے ہیں اور اس انگوٹھی والے شخص نے میرے اس تجربے کو آج پھر سچ ثابت کردیا تھا۔

''تم کن خیالات میں گم ہوگئے ہو؟'' چارلی نے مجھے

خاموش دیکھ کر سوال کیا۔
''کچھ نہیں، میں بس یہ سوچ رہا تھا کہ بعض لوگ بظاہر کتنے سیدھے سادے دکھائی دیتے ہیں مگر اندر سے کتنے ٹیڑھے ہوتے ہیں۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' چارلی نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
میں نے اسے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے کے سامنے موٹر بائیک کے انجن کے شور کی آواز سنائی دی۔ میں نے قصبے کے اکلوتے دکان دار مورس نامی بوڑھے کو شہر سے مارسیلا کا نام لکھوا... کر کیک لانے کے لیے بھیجا تھا۔ شاید وہ واپس آ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کیک ڈبے میں بند ہوگا اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ چارلی اس پر مارسیلا کا نام پڑھ لیتا۔
ایکسکیوز می......'' میں نے چارلی سے کہا اور اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔
بوڑھا مورس دروازے پر موجود تھا اور اس نے بائیک کا انجن بھی بند کر دیا تھا۔ اس نے خاموشی سے کیک کا ڈبا میرے حوالے کیا اور پھر میرے سامنے ہاتھ پھیلا دیے۔
میں جانتا تھا کہ اب اسے کام کا معاوضہ درکار ہے اور یہ معاوضہ بھی اسے کیش کے بجائے کسی اور صورت میں درکار ہوتا تھا۔ کیش کی خاطر شاید وہ میرا یہ کام کرنے پر آمادہ بھی نہ ہوتا۔
بوڑھا مورس بھی میری طرح نشے کا عادی تھا، فرق بس اتنا تھا کہ میں سگریٹ میں بھر کر ہیروئین پینے کا عادی تھا اور وہ ناک کے راستے سونگھ کر نشہ کرتا تھا۔ میں نشہ کرنے کے معاملے میں کچھ حدود و قیود کا خیال رکھتا تھا تاہم بوڑھا مورس اس معاملے میں ایک بے لگام گھوڑا تھا اور گھوڑا بھی وہ جو اکیلا میدان میں دوڑے۔
میں نے اسے دروازے پر ہی رکنے کا کہا اور پھر اندر آ گیا۔ چارلی خاموشی سے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا تاہم وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں مجھے کچھ وقت لگا تاہم میں وہاں سے مورس کا مطلوبہ سامان لے کر اس کے پاس آ گیا۔ کیک کا ڈبا میں نے کمرے میں ہی رکھ دیا تھا۔
''یہ لو عیش کرو۔'' میں نے ہیروئین کی پڑیا مورس کے حوالے کی تو اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے اسے ہفت اقلیم کی کوئی دولت مل گئی ہو۔ اسے اس کی مطلوبہ شے مل چکی تھی اس لیے اب اس کے رکنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے اپنی بائیک موڑی اور پھر اسے اسٹارٹ کیے بغیر ہی دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس کا گھر یہاں سے کچھ ہی دوری پر تھا شاید اسی لیے اس نے اپنی بائیک اسٹارٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور پھر اسے ڈھلوانی راستے پر جانا تھا۔ بائیک خود بہ خود آگے بڑھتی چلی جاتی۔ میں کچھ دیر تک پُرخیال نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر اندر آ کر دوبارہ چارلی کے پاس بیٹھ گیا۔
''تم نے مجھ سے مارسیلا کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا؟'' جیسے ہی میں اس کے سامنے بیٹھا، اس نے بالآخر وہ ذکر چھیڑ ہی دیا جس کا میں کافی دیر سے منتظر تھا۔
''بس مجھے اس کا خیال نہیں رہا تھا۔ چلو اب پوچھ لیتا ہوں، کیسی ہے وہ؟'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''میرے اور اس کے درمیان طلاق ہو چکی ہے۔'' چارلی نے مجھ پر میری زندگی کا سب سے خوشگوار انکشاف کیا۔
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے شدید ترین حیرت سے پوچھا۔ ''تم دونوں نے تو محبت کی شادی کی تھی پھر یہ کب اور کیسے ہو گیا؟''
''آج کل اکثر محبت کی شادیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔'' چارلی نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ کیسے ہو گیا...... شاید اس کا جواب تو میں نہیں دے پاؤں گا مگر یہ کب ہوا، اس سوال کا جواب میں دے سکتا ہوں۔ یہ صرف تین مہینے پرانا قصہ ہے۔''
''مگر کوئی تو وجہ ہوگی جس کی وجہ سے تم دونوں نے اتنا اہم فیصلہ کر لیا؟'' میں نے پُرتجسس لہجے میں استفسار کیا۔
''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مجھ سے بیزار ہونے لگی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا کہ اس نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ چھ برس کی رفاقت کے باوجود ہم اولاد جیسی نعمت سے محروم رہے اور شاید اسی وجہ سے ہمارے تعلق میں وہ مضبوطی اور پائیداری نہ آ سکی جو اولاد کی وجہ سے آ سکتی تھی بہرحال تین ماہ پہلے ہم علیحدہ ہو گئے ہیں۔ تمام قانونی کارروائی بھی مکمل ہو چکی ہے۔ اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''
''اوہ......'' میں نے اپنے لہجے میں زبردستی افسردگی کا تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اب [illegible] کہاں ہے؟''
''اب [illegible] اپنے اسی آبائی گھر میں رہ رہی ہے جہاں کالج کے زمانے میں رہتی تھی۔'' چارلی نے جواب دیا۔



’’چھ برس تک ساتھ رہنے اور اولاد جیسی نعمت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے تعلقات میں سرد مہری آگئی تھی اس لیے اس نے مجھ سے طلاق کی ڈیمانڈ کردی، میں نے بھی اسے منانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔‘‘

’’مگر میرا خیال تھا کہ تمہیں اسے منانے کی ایک آدھ کوشش کرنی چاہیے تھی، اپنے گھر کو بچانے کی ہر مرد کوشش کرتا ہے۔‘‘ میں نے مصنوعی ہمدردی سے کہا ورنہ یہ حقیقت تھی کہ چارلی اور مارسیلا کی طلاق کے بارے میں سن کر میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ دل کی برسوں سے مضطرب کیفیت کو گویا ایک سکون سا آنے لگا تھا۔

’’شاید میں اپنا گھر بچانے کی ایک آخری کوشش کرتا مگر مارسیلا نے مجھ سے ایک ایسی بات کردی جس کے بعد مجھے اسے طلاق ہی دینا تھی بلکہ میں تو کیا اگر میری جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو ایسی صورت میں وہ طلاق کا آپشن ہی استعمال کرتا۔‘‘ چارلی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

’’اس نے تم سے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ تم نے اس سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا؟‘‘ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’اس نے مجھ سے کہا کہ اسے کسی اور مرد کی یاد آتی ہے جو اس کے کالج کا فرینڈ تھا اور اس نے اسے شادی کے لیے پروپوز بھی کیا تھا مگر وہ اس وقت میری محبت کے دھوکے میں اسے انکار کر بیٹھی جس کی وجہ سے آج تک پچھتا رہی ہے۔ اب تم خود سوچو جب کسی مرد کو اس بات کا علم ہوجائے کہ اس کی بیوی کسی اور مرد کو پسند کرتی ہے تو اس کے پاس اپنی بیوی کو چھوڑنے کے علاوہ کیا آپشن رہ جاتا ہے۔‘‘

چارلی کے آخری جملوں نے گویا میرے کانوں میں شیرینی سی گھول دی۔ مجھے لمحہ بھر کے لیے یقین ہی نہ آیا کہ یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہیں مگر میرے کان دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ چارلی نے کہا تھا کہ مارسیلا اپنے کالج کے کسی ایسے دوست کو یاد کرتی تھی جس نے اسے پروپوز کیا تھا اور وہ اسے انکار کرنے پر آج تک پچھتا رہی تھی۔

یعنی مارسیلا بھی اس آگ میں جل رہی تھی جس نے برسوں سے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں ہی تو وہ شخص تھا جس نے مارسیلا کو پروپوز کیا تھا اور چارلی کی باتوں کا صاف اور سیدھا مطلب تھا کہ مارسیلا آج بھی میری یاد میں تڑپ رہی تھی مگر اگر ایسا ہی تھا تو اس نے مجھ سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا اور میں اس سوال کو زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکا۔

''چارلی! کیا مارسیلا کو وہ کالج والا دوست مل گیا جس کے پروپوزل کو ٹھکرا کر وہ پچھتا رہی تھی؟''

''مجھے نہیں معلوم اس نے مجھے اس کا نام نہیں بتایا تھا تاہم طلاق کے پیپر سائن کرتے وقت اتنا کہا تھا کہ وہ اس کالج کے دوست کو تلاش کر رہی ہے، اگر وہ اسے مل گیا اور ابھی اس کی شادی نہ ہوئی ہو تو اس بار وہ خود اس سے معافی مانگے گی اور اسے پروپوز کرے گی۔'' چارلی کے جواب نے میرا دل باغ باغ کر دیا۔

''ویسے ابھی تک میری معلومات کے مطابق مارسیلا پچھلے تین ماہ سے اکیلی رہ رہی ہے۔ شاید وہ جس کالج کے دوست سے شادی کرنا چاہتی تھی، وہ اسے نہیں ملا یا اس کی شادی ہوگئی ہے۔ میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ مجھے اب اس کی مصروفیات کا زیادہ علم نہیں ہے۔'' قدرے توقف کے بعد چارلی دوبارہ بولا۔

'ارے نہیں، وہ اسے اس لیے نہیں ملا کیونکہ وہ اپنے ماضی سے ہر قسم کے تعلق کو توڑ کر ان پہاڑوں میں آ کر بس گیا تھا۔ شاید مارسیلا کو اس کا پتا نہیں مل سکا۔ کوئی بات نہیں اب وہ خود مارسیلا تک پہنچ جائے گا۔' میں نے دل ہی دل میں سوچا تاہم ان خیالات کو زبان پر لانے سے گریز کیا۔

آج برسوں بعد مجھ پر ایک عجیب قسم کی سرشاری کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں اپنی اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر تھا۔ آج تک میں یہ سمجھتا رہا کہ مارسیلا سے میری محبت یک طرفہ تھی مگر نہیں، آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایسا نہیں تھا۔ اسے بھی مجھ سے محبت تھی، بس احساس ذرا دیر سے ہوا تھا۔

''مارسیلا اب دکھائی کیسی دیتی ہے؟ کیا ویسی ہی ہے جیسی کالج میں تھی یا کچھ بدل گئی ہے؟'' میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر سوال کر دیا۔

''اس حرافہ کو دفع کرو۔'' چارلی نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا اور اس کا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ میری طرف سے اب وہ مرے یا جیے، مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس انگوٹھی کے بارے میں کچھ یاد آیا؟

''ہاں۔'' میں نے اپنے غصے پر وقتی طور پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا ورنہ مارسیلا کے بارے میں حرافہ جیسے الفاظ سن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ کوئی میری ہونے والی بیوی کے بارے میں ایسی بات کرے، یہ مجھے کسی صورت بھی گوارا نہیں تھا۔

''تو پھر بتاؤ تاکہ میں اس جانسن نامی شکاری کے باپ کو مطلع کر کے اس سے اپنی فیس وصول کرسکوں۔ میں نے پولیس سے پہلے اس کیس کو حل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے ہیں حتیٰ کہ اپنی اس طرف آمد کو بھی صیغۂ راز میں رکھا ہے تاکہ پولیس والے میری تفتیش سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔''

''تم نے بہت اچھا کیا ہے۔'' میں نے رسانیت سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس انگوٹھی کے بارے میں سب یاد آ گیا ہے۔ یہ اسی آدمی کی ہے جو اب سے کچھ دیر قبل میرے گھر کے دروازے پر مجھے ایک ڈبا دینے آیا تھا۔ اس کا نام مورس ہے اور وہ اس قصبے کا اکلوتا دکاندار ہے۔ اس کی عمر خاصی زیادہ ہے اور وہ نشے کا عادی بھی ہے۔ دراصل میں نے کافی عرصہ پہلے یہ انگوٹھی اس کی انگلیوں میں دیکھی تھی۔ اس کے بعد اس نے شاید اسے بھی پہنا نہیں تھا، اسی وجہ سے میرے ذہن سے یہ بات محو ہوگئی تھی تاہم ذہن پر زور دینے پر یاد آ گیا کہ یہ مورس کی انگوٹھی ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مورس اتنا تیز آدمی ہے۔ میں تو اسے ایک عام سا آدمی سمجھتا تھا جو بس اپنے نشے کی دنیا میں مگن رہتا ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ جانسن کو مورس نے قتل کیا ہے اور اتفاق سے اس نے یہ انگوٹھی دوبارہ پہن رکھی تھی جو ایک اور اتفاق سے وہاں گر گئی اور پھر سب سے بڑا اتفاق رونما ہوا...... یہ انگوٹھی مجھے مل گئی اور میں یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب میڈیا میں میرے چرچے ہوں گے۔ پولیس کو بڑی ہتک کا سامنا کرنا پڑے گا کہ ان سے پہلے جانسن کے قتل کا معما ایک پرائیویٹ سراغ رساں نے حل کر لیا۔'' چارلی مسرت بھرے لہجے میں بولا۔

''میں نے اسے قاتل قرار نہیں دیا، صرف اتنا کہا ہے کہ وہ کل وہاں اس وقت موجود تھا جب یہ قتل ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بھی مجھے تمہارے توسط سے معلوم ہوا ہے۔ اگر تم مجھے یہ انگوٹھی نہ دکھاتے تو شاید مجھے یہ بات معلوم نہ ہو پاتی۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا تو چارلی بے اختیار چونک پڑا۔

''کیا مطلب......؟'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''مطلب یہ پیارے کہ جانسن کا قتل مورس نے نہیں بلکہ میں نے کیا ہے۔'' میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے سائلنسر لگا ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

''مورس تو وہ شخص ہے جس نے اتفاق سے مجھے یہ قتل

کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور کل سے مجھے کسی انجان نمبر سے کال کرکے بلیک میل کررہا تھا۔ حرامزادہ آواز اس مہارت سے بدلتا ہے کہ میں بھی نہ پہچان سکا۔''

میرے ہاتھوں میں ریوالور اور اس پر لگے سائلنسر نے چارلی کو یک بیک خطرے کا احساس دلا دیا۔ اس نے گھبرا کر صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ ''چارلی......!'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کوئی بے وقوفی کرو گے تو اپنی چند لمحوں کی زندگی میں سے چند لمحے مزید کم کرلو گے۔ میرے ہاتھ کی حرکت تمہارے جسم کی حرکت سے زیادہ تیز ہے۔''

میرے سخت اور دوٹوک لہجے نے چارلی کو اپنی نازک پوزیشن کا احساس دلا دیا تھا۔ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا تاہم اس کے چہرے پر بے چینی اور گھبراہٹ کے تاثرات نمایاں تھے۔

''جانتے ہو چارلی، میں مارسیلا سے شدید محبت کرتا ہوں اور تم سے شدید نفرت......تم ہی وہ شخص ہو جس کی وجہ سے مارسیلا مجھ سے دور ہوگئی۔ وہ تمہاری جھوٹی محبت کے جھانسے میں آکر میری سچی محبت کو ٹھکرانے کی غلطی کر بیٹھی۔ میں ہی وہ شخص ہوں جس کا پروپوزل اس نے تمہاری خاطر مسترد کردیا تھا تاہم اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ میں تمہیں مارنے کے بعد اس سے ملاقات ضرور کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بار میرا پروپوزل نہیں ٹھکرائے گی بلکہ بہ قول تمہارے تو اس شخص کو یعنی مجھے خود پروپوز کرکے اپنے ماضی کی غلطی کا ازالہ کرنے کی خواہش مند ہے، جس کا پروپوزل ٹھکرانے کا اسے پچھتاوا ہے۔''

''تو کیا تم واقعی جانسن کے قاتل ہو؟ نہیں، تم مجھ سے شاید مذاق کررہے ہو۔ تم کسی انسان کی جان کیسے لے سکتے ہو؟ اگرچہ تم کالج میں بھی خاصی جھگڑالو قسم کی شہرت رکھتے تھے مگر پھر بھی اتنے برے تو نہ تھے کہ لوگوں کو جان سے مارنے لگو۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی جان نہیں لے سکتا۔ یہ درندگی ہے اور پھر تم نے جانسن نامی اس شکاری کو کیوں قتل کیا؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟'' چارلی نے سوال کیا تاہم اس کے لہجے میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔ میرے ہاتھوں میں ریوالور دیکھنے کے بعد اس کا یہ خوف بجا بھی تھا۔

''میری جانسن کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔'' میں نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ ''کسی کو قتل کرنا میرا پیشہ ہے، میں ایک پروفیشنل کلر ہوں...... معقول معاوضے پر کسی کو بھی قتل کرسکتا ہوں۔ جب تمہاری اور مارسیلا کی شادی ہوئی تو میں بہت افسردہ تھا۔ میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ مجھ پر ہر وقت بے چینی اور وحشت سی طاری رہتی تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی کہہ لو یا کچھ اور، ان دنوں میری ملاقات جارڈن نامی ایک بوڑھے شخص سے ہوئی۔ جارڈن بھی کسی دور میں ایک پروفیشنل کلر رہ چکا تھا تاہم بڑھاپے کی وجہ سے اب خود عملی کام سے ریٹائر ہوگیا تھا۔

''جارڈن نے میرے اندر کی وحشت کو سمجھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب میں کسی کام کے قابل نہیں رہا اور جو کسی کام کے قابل نہ رہے اس کے پاس ایک ہی کام رہ جاتا ہے کہ وہ جرم کی دنیا میں داخل ہوجائے۔ میں بھی اس انوکھی دنیا میں داخل ہوگیا۔ جارڈن مجھے کام لے کر دیتا ہے اور میں اس کام کو پورا کرتا ہوں۔ جارڈن اپنا کمیشن لے کر باقی معاوضہ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردیتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ جانسن کو قتل کرنے کا ٹاسک جارڈن کو کس نے دیا تھا۔ ممکن ہے وہی گینگسٹر ہو جس کے بارے میں تم بات کررہے تھے۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ کون ہے۔ مجھے بس جارڈن سے جانسن کے بارے میں معلومات اور اس کی موجودہ لوکیشن کے ساتھ ساتھ اس کی ایک عدد تازہ تصویر ملی تھی۔ اب یہ ایک اتفاق تھا کہ جس جگہ وہ شکار کھیلنے کے لیے آیا ہوا تھا وہ جگہ میری رہائش گاہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے وہاں جاکر اسے قتل کیا اور پھر واپس آگیا تاہم مورس نے کسی چٹان کے پیچھے چھپ کر مجھے ایسا کرتے دیکھ لیا تھا۔ اگر میں اس وقت اسے دیکھ لیتا تو اسے بھی مار ڈالتا۔ کسی بھی پروفیشنل کلر کی زندگی کا انحصار اسی ایک نکتے پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت یا گواہ نہ چھوڑے۔ میں نے آج تک جتنے بھی انسانوں کو مارا ہے، انتہائی صفائی سے قتل کیا ہے۔ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا، بس اس بار اتفاق سے مورس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مورس نے پولیس کو مطلع کرنے کے بجائے کسی انجان نمبر سے آواز بدل کر مجھے بلیک میل کرنا شروع کردیا۔ میں اس کے معاملے میں حقیقتاً پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے کل مجھ سے پچاس ہزار ڈالرز کی رقم مانگی تھی اور آج تمہاری آمد سے قبل مجھے فون کرکے آج کے دن کی آخری مہلت بھی دی تھی۔

''میں اسے واقعی رقم دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر پھر تمہاری آمد ہوئی۔ تم نے مجھے مارسیلا والی خوشخبری سنا کر پھر سے زندہ کردیا اور ساتھ ہی تمہاری وجہ سے مجھ پر مورس کی حقیقت بھی عیاں ہوگئی۔ یہ انگوٹھی میں نے کافی عرصہ

پہلے اس کی انگلیوں میں ہی دیکھی تھی۔ وہ اسے اپنی انگلیوں میں گھماتا رہتا تھا۔ شاید یہ انگوٹھی اس کی انگلیوں میں فٹ نہیں تھی اس لیے وہ اسے عام طور پر نہیں پہنتا تھا مگر کل اس نے یہ انگوٹھی پہن رکھی تھی اور مجھے قتل کرتے وقت گھبراہٹ میں بھاگتے ہوئے اسی جگہ گر گئی جو تمہیں مل گئی اور تم اسے لے کر یہاں پہنچ گئے۔

''مجھے چہرہ شناسی کا بڑا دعویٰ تھا مگر بوڑھے مورس کے معاملے میں، میں شکست کھا گیا۔ آج صبح میں نے اسے شہر سے کیک لانے کے لیے بھیجا تو اس وقت یہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مورس ہی وہ بلیک میلر ہے جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ بہرحال تم اگرچہ مورس کو ہی قاتل سمجھ رہے تھے مگر تمہاری آمد نے میری رسائی اس تک کروادی۔ وہ بہت گہرا آدمی نکلا۔ اب مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ تم اس کیس کا کریڈٹ لینے کے چکر میں خفیہ طور پر اس جگہ آئے ہو اس لیے تمہاری گمشدگی کا تعلق مجھ سے نہیں جوڑا جاسکتا، نہ کسی کو تمہاری یہاں آمد کا علم ہے۔ رہ گیا تمہاری لاش ٹھکانے لگانے کا مسئلہ تو میرے گھر کے عقبی جانب ایک گہری کھائی موجود ہے جہاں سے تمہاری لاش صدیوں تک دریافت نہیں ہوسکے گی۔''

''مجھے مت مارو، تم میرے دوست ہو۔'' چارلی نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ موت کے خوف سے اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور جسم پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوگئی تھی۔

''شاید میں اس بارے میں سوچتا مگر اب تمہیں مارنا ہی پڑے گا کیونکہ ایک تو میں تمہیں اپنی حقیقت سے آگاہ کرچکا ہوں اور دوسرا تم نے مارسیلا کو حرافہ کہہ کر اپنی موت کو دعوت دے دی ہے۔ میں مارسیلا کے معاملے میں بہت زود رنج اور حساس واقع ہوا ہوں۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں جواب دیا۔

''تم مجھے نہیں مار سکتے۔'' چارلی تیز لہجے میں بولا۔ ''مورس جب یہاں آیا تھا تو اس نے دروازے سے اندر جھانک کر مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت تم اپنے کمرے میں گئے ہوئے تھے اور پھر وہ جانسن کے مرڈر کی حقیقت سے بھی آگاہ ہے۔ تم مجھے مار کر بچ نہیں سکو گے۔''

''اچھا چلو، یہ بات مورس سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔'' میں ذرا اس کا نمبر ملاتا ہوں۔'' میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

پھر اپنے بائیں ہاتھ سے ٹیبل پر پڑا موبائل فون اٹھالیا۔ میں نے مورس کا نمبر ملا دیا۔ کافی دیر تک گھنٹی کی آواز سنائی دیتی رہی تاہم دوسری طرف سے فون نہیں اٹھایا گیا۔ فون کرنے کے دوران بھی میں چارلی سے غافل نہ تھا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے پسٹل بدستور اس پر تان رکھا تھا۔ ویسے میں اس کی بزدلانہ طبیعت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک تو مانگ سکتا ہے مگر مزاحمت کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔

''لو اس نے فون نہیں اٹھایا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ویسے یہ فون میں نے اپنی تسلی کے لیے کیا تھا۔'' دو تین مرتبہ مورس کا نمبر ٹرائی کرنے کے بعد میں نے سیل فون ٹیبل پر رکھ دیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' چارلی نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ مجھے بلیک میل کر کے وہ اپنی موت کو تو آواز دے ہی چکا تھا۔ یہ فون تو میں نے بس اس کی موت کے بارے میں کنفرم کرنے کے لیے کیا تھا اور اس کے فون نہ اٹھانے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ دراصل آج میں نے اسے ہیروئین کی جو پڑیا دی تھی، اس میں تھوڑی سی مقدار ایک مخصوص قسم کے زہر کی بھی ملادی تھی۔ یہ کام میں نے اس وقت کیا تھا جب میں کمرے میں گیا۔ کمرے سے ہی میں نے ریوالور بھی اپنے کوٹ کی جیب میں منتقل کیا تھا۔ میں نے ہیروئین کی پڑیا میں بہت خطرناک قسم کے زہر کو معمولی مقدار میں شامل کیا تھا، اس لیے جیسے ہی مورس نے ناک کے راستے پاؤڈر سونگھا ہوگا، اس کی موت واقع ہوگئی ہوگی۔ یہ زہر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ظاہر نہیں ہوتا اس لیے جب مورس کی لاش دریافت کی جائے گی تو سب اس کی موت کو نشے کی زیادتی کا شاخسانہ ہی سمجھیں گے۔ اس کے فون نہ اٹھانے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہیروئین سونگھ کر دوسری دنیا رخصت ہوچکا ہے۔ میں خود بھی نشے کا عادی ہوں اس لیے اپنی قبیل کے افراد کی فطرت سے بھی بخوبی آگاہ ہوں۔ مورس نے گھر جاتے ہی سب سے پہلے ہیروئین سونگھی ہوگی۔ وہ کافی دنوں سے ترسا ہوا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری تھی اور اب تمہاری موت بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد میں مارسیلا کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کروں گا۔''

''نہیں نہیں، مجھے مت مارو۔'' میری آخری بات سن کر چارلی کے چہرے پر شدید ترین خوف کے تاثرات ابھر آئے۔ شاید اس کی چھٹی حس نے اسے قریب آتی موت کا احساس دلا دیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر منہ کھولا۔ شاید وہ

کچھ کہنا چاہتا تھا تاہم میں نے اسے مزید بولنے اور دوبارہ منہ بند کرنے کا موقع نہیں دیا۔ سائلنسر لگے ریوالور کی گولی اس کے منہ کے اندر گھستی چلی گئی۔ اس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور پھر وہ ساکت ہوگیا۔

میری چلائی ہوئی گولی نے اسے تڑپنے کا موقع دیے بغیر موت سے ہمکنار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے یک بیک بے نوری جھلکنے لگی تھی۔ چہرہ مرتے ساتھ ہی عجیب سا ہوگیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے چہرے اور ابلی ہوئی بے نور آنکھیں دیکھ کر ایک بار خوف کا شکار ضرور ہوتا مگر مجھے کوئی اثر نہ ہوا۔ میں ایسے مناظر دیکھنے کا عادی تھا۔ میرا تو پیشہ ہی لوگوں کو موت دینا تھا۔

وقت برباد کرنا مناسب نہ تھا۔ چارلی کی لاش کو فوراً ٹھکانے لگا دینا ہی بہتر تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چارلی کی لاش کو اٹھا لیا اور پھر اپنے گھر کے عقبی دروازے کے پاس آ گیا۔

اس وقت سخت سردی کی وجہ سے ایک تو یہاں کے باسی ویسے ہی گھروں میں دبکے رہتے تھے اور دوسرے میرے گھر کے عقبی جانب کچھ پہاڑی ٹیلے موجود تھے۔ اس اوٹ کی وجہ سے مجھے دیکھ لیے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ ویسے بھی مجھے بس کچھ ہی دوری پر موجود گہری کھائی تک جانا تھا۔

سب کچھ میری توقع کے مطابق ہوگیا۔ کچھ دیر میں، میں عقبی دروازے سے واپس آیا تو چارلی کی لاش کو خوش اسلوبی کے ساتھ ٹھکانے لگا چکا تھا۔ اب چارلی کے قتل کے بارے میں میرے خلاف کوئی ثبوت موجود نہیں رہا تھا اور موریس کے بارے میں بھی مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا کیونکہ اس علاقے کا بچہ بچہ اس کے نشہ کرنے کی عادت سے واقف تھا۔ جو زہر میں نے استعمال کیا تھا، وہ میں پہلے بھی اپنے ایک دو شکار افراد پر آزما چکا تھا۔ بسا اوقات کسی کے قتل کی سپاری دینے والے کی ڈیمانڈ ہوتی تھی کہ موت بظاہر طبی لگے۔ ایسی صورت میں، میں اپنے شکار کو اسی قسم کے زہر کا نشانہ بناتا تھا۔ زہر سے آلودہ باریک سوئی راہ چلتے ہوئے شکار سے اچانک ٹکراتے ہوئے اس کے جسم میں اتار دی جاتی تھی اور اسے بس اتنا درد محسوس ہوتا جتنا کسی چیونٹی کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ میں سوری کہتے ہوئے آگے نکل جاتا تھا اور دس منٹ بعد ہی میرا شکار دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر جاتا تھا۔ موریس نے کیونکہ یہ زہر ہیروئین کے ساتھ براہِ راست ناک کے راستے اپنے اندر منتقل کیا تھا اس لیے میرے خیال میں اسے شاید دس منٹ کی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی۔

چارلی کی لاش ٹھکانے لگ چکی تھی۔ موریس بھی اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اب میں فارغ تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور وہاں رکھا وہ کیک اٹھا لیا جو آج میں نے موریس کو شہر بھیج کر منگوایا تھا۔ میں کیک لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ٹیبل پر کیک کا ڈبا رکھتے ہوئے میں نے اپنا موبائل فون اٹھا لیا اور پھر جارڈن کا نمبر ڈائل کر دیا۔ جارڈن مجھے لوگوں کو مارنے کا ٹاسک دیتا تھا۔ اسی کی وجہ سے میں نے ایک کرائے کے قاتل کا روپ دھارا تھا مگر آج میں نے پروفیشنل کلر سے ایک عام آدمی بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''ہیلو......'' کچھ ہی دیر میں اس کی آواز سنائی دی۔

''جارڈن! میں نے جرم کی دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لیے اس کال کو میری آخری کال سمجھنا۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جیسے تمہاری مرضی۔''

جارڈن کی بھی سنجیدہ آواز سنائی دی۔ ''میں نے جانسن کے قتل کا معاوضہ تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ تم نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بڑی صفائی سے کام کیا ہے، شاید مجھے تمہارے جیسا آدمی دوبارہ نہ مل سکے۔''

''شکریہ جارڈن!'' میں نے مختصر جواب دیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے اب جارڈن کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ یا تعلق نہیں رکھنا تھا۔ میں نے آج جرم کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے تائب ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

چارلی کی باتوں سے مجھے اتنا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ مارسیلا کو میرا پروپوزل ٹھکرانے کا قلق تھا اور وہ مجھے تلاش بھی کر رہی تھی۔ میرے پاس مارسیلا کا نمبر ایک پرانی ڈائری میں محفوظ تھا۔ میں نے ٹیبل کی دراز میں سے وہ ڈائری نکالی اور پھر اس میں سے مارسیلا کا نمبر تلاش کر کے اپنے سیل فون سے وہ نمبر ملا دیا۔ میں نے پچھلے چھ برسوں میں اس سے ایک بار بھی رابطہ نہیں کیا تھا اس لیے مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اب وہ یہ نمبر استعمال کرتی ہے یا نہیں، تاہم گھنٹی بجنے کی آواز سے اتنا اندازہ تو ہوگیا کہ نمبر کسی کے استعمال میں ہے۔

''ہیلو......'' چند ثانیوں بعد ہی سنائی دینے والی آواز نے میرے کانوں میں رس گھول دیا۔ میں نے اس کی آواز برسوں بعد سنی تھی تاہم مجھے اس کی مدھر آواز پہچاننے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہوئی۔

''مارسیلا! میں الیگزینڈر بول رہا ہوں۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔

"الیگزینڈر......!" مارسیلا کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

"ہاں مارسیلا! میں الیگزینڈر بول رہا ہوں۔ تمہارے کالج کا سب سے قریبی دوست۔" میں نے دوست کے ساتھ قریبی کے الفاظ دانستہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ مائی گاڈ! الیگزینڈر یہ تم ہو؟ تم کہاں چلے گئے ہو؟ کالج لائف کے بعد تم ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔" مارسیلا نے تیز لہجے میں کہا۔

"بس مارسیلا! میں کہیں دور چلا گیا تھا تاہم اب میں واپس آگیا ہوں۔ تم اپنی سناؤ چارلی کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے۔" میں نے جان بوجھ کر چارلی کا ذکر چھیڑا۔ اب میں اسے یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ چارلی کو اب سے کچھ دیر قبل میں ایک گہری کھائی کے سپرد کر کے آیا ہوں۔

"میرے سامنے اس کا ذکر مت کرو۔ میری اور اس کی تین ماہ پہلے طلاق ہو گئی ہے اس کا پروپوزل قبول کر کے میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی بھول کی تھی۔" مارسیلا کی غصیلی آواز سنائی دی۔

"کوئی بات نہیں مارسیلا! انسان غلطی کا پتلا ہے تاہم اگر اسے اپنی غلطی سدھارنے کا موقع ملے تو پھر دیر نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" مارسیلا نے تنبیہی لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے بھی اپنی غلطی سدھارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دراصل کالج کے دنوں میں مجھے چارلی کے علاوہ بھی کئی لوگوں نے پروپوز کیا تھا، شاید تمہیں یاد ہو کہ ان میں تم بھی شامل تھے۔"

"ہاں ہاں مجھے سب کچھ یاد ہے۔" میں نے باچھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں بھلا وہ وقت کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"مجھے بھی وہ وقت یاد ہے جب میرے انکار پر تمہارا چہرہ لٹک گیا تھا۔" مارسیلا ہنستے ہوئے بولی۔ "بہرحال چھوڑو اس قصے کو میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس وقت راک نے بھی مجھے پروپوز کیا تھا۔ تمہیں راک تو یاد ہی ہوگا...... وہی راک جس کی ایک دفعہ تم نے ناک توڑ ڈالی تھی۔ میں نے اس وقت راک کا پروپوزل بھی اس چارلی کی خاطر ٹھکرا دیا تھا تاہم چارلی سے شادی کے بعد مجھے احساس ہو گیا کہ میں نے راک کا پروپوزل ٹھکرا کر بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ چارلی جیسے سنکی آدمی کے ساتھ چھ برس کا سفر بہت مشکل اور کٹھن ثابت ہوا تاہم اس سے علیحدہ ہونے کے بعد مجھے راک کی یاد بہت شدت سے ستانے لگی۔ میں نے اسے تلاش کرنا شروع کر دیا اور چند دن پہلے ہی ہماری ایک اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ تم یہ جان کر حیران رہ جاؤ گے کہ راک نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ وہ آج بھی میری یاد اپنے دل میں بسائے ہوئے ہے۔ مجھے راک کے اپنے بارے میں خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی اور ہم دونوں نے ایک نئی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ دو دن بعد ہماری شادی ہے۔ آج میری سالگرہ ہے اور راک میرے لیے ایک بڑا سا کیک لے کر آیا ہے جس پر میرا نام بھی لکھا ہے۔ ارے...... وہ مجھے آواز دے رہا ہے، شاید اس نے کیک پر موم بتیاں لگا دی ہیں اور اب کیک کاٹنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اوکے پھر بھی بات ہوگی......" یہ کہتے ہوئے مارسیلا نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس نے تو رابطہ منقطع کر دیا تھا تاہم میں کافی دیر تک فون کان سے لگائے خاموش بیٹھا رہا۔ کرب کی ایک تیز لہر نے میرے پورے وجود کو گویا چھلنی کر ڈالا تھا۔ میرے اندر وحشت، اضطراب اور بے چینی کی وہی کیفیات دوبارہ امڈ آئی تھیں جن کی وجہ سے مجھے برسوں سے سکون نصیب نہیں ہو سکا تھا۔

میں کچھ دیر تک مزید اسی طرح خاموش بیٹھا رہا اور پھر میں نے جارڈن کا نمبر دوبارہ ملا دیا۔

"تم نے تو کہا تھا کہ یہ تمہاری آخری کال ہے۔" فون اٹھاتے ہی اس کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

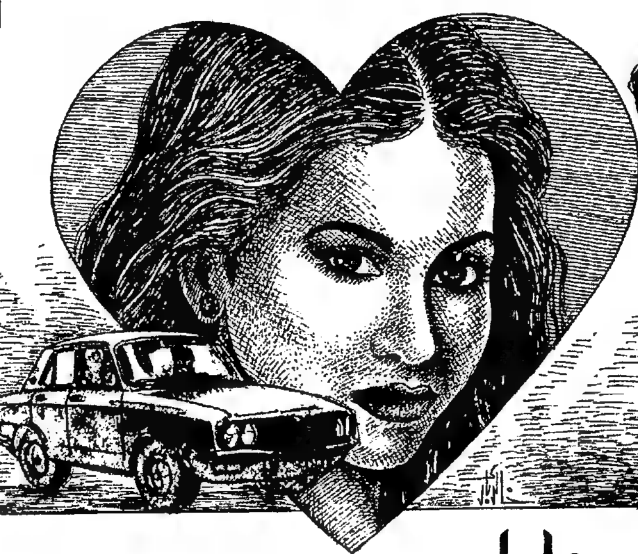
"جارڈن! میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ میں ابھی کام کرنا چاہتا ہوں...... جیسے ہی کوئی کام ملے، مجھے آگاہ کر دینا۔" میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں وہ نہیں تھا جس کو مارسیلا پسند کرتی تھی، میں تو بس کچھ دیر کے لیے غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ مارسیلا کے عشق کا روگ، میری بے چین اور بے راہ زندگی۔

ہاں بدلا تھا تو رقیب بدل گیا تھا...... چارلی کی جگہ اب راک نے لے لی تھی۔

میں نے سامنے پڑے ڈبے سے وہ کیک نکال لیا جس پر مارسیلا کا نام لکھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح مجھے اس کی سالگرہ اس کی یادوں کے ساتھ ہی منانی تھی۔ مارسیلا، راک کے ساتھ مل کر سالگرہ منا رہی تھی اور مجھے ہمیشہ کی طرح تنہا کیک کاٹنا تھا۔

⌘⌘⌘



چارا

غوشیہ شبیر

کبھی کبھی اپنی بے وقعتی پر دل خون کے آنسو رونے کے باوجود اپنی ذات کو بکھرنے سے بچانے کے لیے انسان کچھ وقتی سہاروں کو تلاش کرلیتا ہے مگر اس نے اپنا گھر اور اپنے خوابوں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے جس عجیب راہ کا انتحاب کیا اس نے گھر تو گھر... دنیا کو ہی اجاڑ ڈالا... جس نے سنا انگشت بد نداں رہ گیا۔

دو بہنوں کی محبتوں، خودغرضی اور انتقام کی تکلیف دہ روداد

"کیا واقعی یہ سچ ہے مس سوہا اعجاز کہ یہ قتل آپ کے ہاتھوں ہوا ہے؟"

"میں نے معزز عدالت کے روبرو مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا ہے کہ جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں قتل جیسے جرم کا جھوٹا اعتراف کرلوں؟"

اس کی آنکھوں میں وحشت لیکن لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ اس اعتماد نے اس سے جرح کرتے وکیل کو جزبز ہونے پر مجبور کردیا لیکن وہ وکیل تھا اور اسے کل کی لڑکی کے سامنے ہتھیار

ڈالنا اچھا نہیں لگا تھا اس لیے بحث کو جاری رکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
''کیا آپ معزز عدالت کو اس قتل کی وجہ سے آگاہ کرسکتی ہیں؟''
''جی نہیں!'' اس نے مختصر لیکن مستحکم لہجے میں جواب دیا۔
''کیوں؟'' وکیل کا لہجہ تیکھا تھا۔
''ذاتی وجوہات کی بنا پر...... اور یہ میرا حق ہے کہ اگر میں کسی سوال کا جواب نہ دینا چاہوں تو نہ دوں۔'' اس نے وکیل سے بھی زیادہ تیکھا انداز اپنایا اور یہ تو وکیل بھی جانتا تھا کہ ''وجہ'' اس نے جسمانی ریمانڈ کے عرصے میں پولیس والوں کے روایتی ہتھکنڈوں کے باوجود بھی نہیں بتائی تھی۔
''وجہ بتا کر آپ عدالت سے اپنے لیے رعایت حاصل کرسکتی ہیں۔'' وکیل نے اسے للچایا۔
''اقبالِ جرم کے بعد مجھے کسی رعایت کی خواہش نہیں۔'' اسے واقعی رعایت سے دلچسپی نہیں تھی۔
''کیا یہ قتل فوری اشتعال کا نتیجہ تھا؟'' وکیل نے اسے گھما پھرا کر گھیرنے کی کوشش کی۔
''نہیں۔ میں نے باقاعدہ پلان بنا کر قتل کیا تھا۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ کمرائے عدالت میں موجود لوگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔
''کیا آپ کو اپنی بہن کے گھر میں ذہنی، جسمانی یا جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا؟'' وکیل کسی بھی طرح وجہ.... کھوج نکالنا چاہتا تھا۔
''بالکل نہیں۔ میں وہاں ایک پُرتعیش زندگی گزار رہی تھی۔'' اس نے قطعیت سے جواب دیا۔ پولیس کی تیار کردہ تفتیشی رپورٹ بھی اس بیان کی تصدیق کررہی تھی۔ اردگرد کے لوگوں سے حاصل شدہ معلومات اور میڈیکل رپورٹ کی گواہیاں بھی اس کے بیان سے مطابقت رکھتی تھیں۔
''سنا ہے آپ کی آپ کے بہنوئی سے بہت زیادہ بے تکلفی تھی۔ کیا کبھی آپ کی بہن کو اس بے تکلفی پر اعتراض ہوا؟'' وکیل کسی طرح اس کی جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے اس سوال پر سوہا کی آنکھوں سے ناگواری جھلکی لیکن خود پر قابو پا کر بہت سنبھل کر بولی۔
''میری بہن نے کبھی معمولی سا بھی اعتراض نہیں کیا۔ میں ثاقب علی صاحب کی سالی ہی نہیں، کزن بھی ہوں اور ہم ایک ساتھ ایک گھر میں پل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سے گھر بھر کی لاڈلی رہی ہوں اس لیے میری بہن کے کسی اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''
''آپ کی تعلیم مکمل ہوچکی تھی اور آپ ایک اچھی ملازمت کررہی تھیں۔ شکل صورت بھی آپ کی بری نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اب تک آپ کی شادی کا کوئی سلسلہ نہیں بن سکا؟'' وکیل پینترے بدل بدل کر سوال کررہا تھا۔ اصل میں اسے یہ بات ہضم نہیں ہورہی تھی کہ اتنی آسانی سے قتل کا اعتراف کرلینے والی کسی صورت وجۂ قتل بتانے پر راضی نہیں تھی۔
''میری چچی میرے لیے رشتے تلاش کررہی تھیں لیکن فی الحال مجھے اور میرے بہن بہنوئی کو کوئی رشتہ پسند نہیں آسکا تھا۔'' اس کا جواب سادہ سا تھا۔
''کیا آپ کو کبھی سلیپنگ پلز یا ٹرنکولائزر وغیرہ کے استعمال کی ضرورت پڑی ہے؟'' وکیل نے ایک بار پھر قلابازی کھائی۔
''بالکل بھی نہیں۔ میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنہیں بستر پر لیٹتے ہی چند منٹوں کے اندر نیند آجاتی ہے۔''
''کبھی کسی ماہر نفسیات وغیرہ سے علاج کی ضرورت پڑی ہو؟'' وہ اسے پوری طرح کھنگال لینا چاہتا تھا۔
''مجھے تو کبھی ماہرِ اطفال کے پاس بھی نہیں لے جانا پڑا۔ میری ذہنی اور جسمانی صحت ہمیشہ قابلِ رشک رہی ہے۔'' اس کے انداز میں بے ساختگی تھی۔
''تو کیا پھر قتل شغل میں کرڈالا؟'' وکیل جھنجلایا۔
''شغل میں قتل کرنے والے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔'' اس نے وکیل کو جتایا۔
''یوں اتنے قریبی رشتے کو بے وجہ تو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ ہر قتل کا کوئی نہ کوئی موٹیو (Motive) ضرور ہوتا ہے۔'' وکیل کو وجہ کھوج نکالنے کی بے حد فکر تھی۔
''میں نے کب کہا کہ موٹیو نہیں ہے۔ میں نے صرف آپ کو بتانے سے انکار کیا ہے۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔ اس کی آنکھوں کی طرح اس کی مسکراہٹ میں بھی وحشت سی تھی۔
''کہیں پسند کی شادی وغیرہ کا تو معاملہ نہیں تھا؟ ہوسکتا ہے آپ کے بہن بہنوئی نے آپ کو اجازت دینے سے انکار کردیا ہو؟'' وکیل اب بھی سرا کھوجنے کے چکر میں تھا۔
''میں بالغ اور خودمختار ہوں۔ ایسی صورت میں میرے پاس کورٹ میرج کا راستہ کھلا تھا۔ قتل جیسا جرم کیوں کرتی؟'' اسے بھی گویا وکیل کو زچ کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ آخری حجت کے طور پر وکیل نے قتل کے دن، وقت، طریقۂ کار سب کے بارے میں بے شمار سوال کرڈالے۔ ہر سوال

کے نتیجے میں وہ آخر کار پھر اس مقام پر کھڑے تھے کہ وہ ایک پلانڈ مرڈر کی اعترافی ملزمہ تھی اور اس نے اپنے اس عمل پر عدالت کے سامنے کسی ندامت کا اظہار کیا تھا، نہ ہی رحم کی درخواست کی تھی۔ وکیل بحث مکمل کر کے اپنی جگہ واپس جا کر بیٹھا تو اسے یقین تھا کہ ملزمہ سوہا اعجاز عدالت سے اپنے لیے کوئی رحم لانہ یا رو رعایت رکھنے والا فیصلہ ہرگز بھی حاصل نہیں کر پائے گی۔

☆☆☆

''بڑا بُرا زمانہ آگیا ہے۔ جب دیکھو ایک سے بڑھ کر ایک بُری خبر سننے کو ملتی ہے۔''

''صحیح کہا بہن! بڑا برا وقت ہے۔ انسان کسی پر بھروسا ہی نہیں کر سکتا۔''

''لوگوں کا خون سفید ہو گیا ہے۔ کسی رشتے کا کوئی لحاظ ہی نہیں رہا۔''

''پرانے وقتوں میں تو بڑی بہن کو ماں جیسی عزت دی جاتی تھی لیکن یہاں دیکھو، بہن ہی بہن کی دشمن نکلی۔''

''کہتے ہیں ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر وار کرتی ہے لیکن سوہا نے تو سگی بہن تک کا خیال نہیں کیا۔''

''بہن تو بہن، معصوم بھانجا بھانجی پر بھی رحم نہیں آیا۔ کم از کم یہی سوچ لیتی کہ اس کی اس حرکت کے نتیجے میں معصوم بچے رل جائیں گے۔''

''بچوں کا سوچ کر تو میرا ابھی کلیجا منہ کو آتا ہے۔ سوہا آنی، سوہا آنی بول بول کر اپنا منہ سکھاتے رہتے تھے بے چارے سارا وقت۔''

''انسان کے سر پر شیطان سوار ہو جائے تو ہر رشتے ناتے کا خیال اٹھ جاتا ہے۔''

''کیسا شیطان......؟''

''اے لو۔ تم بھی تو اسی محلے میں رہتی ہو۔ کیا تمہاری آنکھوں نے وہ سب نہیں دیکھا تھا، جو میں نے دیکھا۔''

''دیکھا تو تھا لیکن دل میں آئے شک کو خود ہی یہ سوچ کر رد کر دیتی تھی کہ بچپن کی بے تکلفی ہے۔''

''بچپن کی بے تکلفی کو بچپن گزر جانے کے بعد سگے بہن بھائی کے درمیان بھی ایک حد میں رکھنا پڑتا ہے۔ سویرا نے تو بہن کو بالکل بے لگام چھوڑ رکھا تھا۔''

''بے چاری محبت اور اعتماد میں ماری گئی۔ اسے کہاں گمان ہوگا کہ اس کی سگی بہن اسی کے لیے خطرہ بن جائے گی۔''

''اسی لیے تو کہتے ہیں کہ کسی پر بھی حد سے زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ سویرا نے چھوٹی بہن پر اندھا اعتماد کر کے بڑی غلطی کی۔''

''غلطی کی تو اس کی سزا بھی تو بھگت لی...... اب سوہا کی باری ہے۔ انشاءاللہ اپنے کیے کی کڑی سزا بھگتے گی۔''

''ہاں بھئی! انسان کو اپنا کیا بھگتنا تو پڑتا ہے۔ اس دنیا میں نہ سہی، آخرت میں سہی۔''

''جس کے اعمال وہ جانے۔ ہم تو بس اپنی ہی فکر کر سکتے ہیں۔''

''صحیح کہا۔ انسان کے اپنے ذاتی مسائل کون سے کم ہیں۔ ابھی مجھے سنی کے اسکول جانا ہے۔ وہاں سے مسلسل کمپلین آرہی ہے کہ وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دے رہا۔''

''تم اسکول جا کر معلوم کرو، بچے کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ مجھے بھی اب کچن دیکھنا ہے۔ آفتاب نے رات کے کھانے پر دوستوں کو انوائٹ کر رکھا ہے۔ کہیں کوئی کمی رہ گئی تو ہفتہ بھر تک ان کا آف موڈ برداشت کرنا پڑے گا۔''

''مجھے بھی واشنگ مشین لگانی ہے۔ کمبخت ماسی پندرہ دن سے اپنے گوٹھ جا کر بیٹھی ہوئی ہے، آنے کا نام نہیں لے رہی۔'' دھیرے دھیرے خواتین کا وہ گروہ منتشر ہونے لگا۔ وہ سب سوہا اعجاز کی محلے دار تھیں اور ہر صبح مردوں کے دفتر اور بچوں کے اسکول جانے کے بعد سبزی کے ٹھیلے سے سبزی لیتے ہوئے آپس میں اسی طرح گپ شپ لگایا کرتی تھیں۔ سوہا کی بہن سویرا بھی اس حادثے سے قبل عورتوں کے اس گروہ کا حصہ تھی اور سبزی کے ٹھیلے پر کھڑے ہو کر سبزی لینے سے زیادہ باہمی دلچسپی کے امور پر گفت و شنید کی جاتی تھی۔ آج عورتوں کے اس گروہ میں اسے اور اس کے خاندان کو موضوعِ گفتگو بنایا جا رہا تھا لیکن وہ ان کے درمیان موجود نہیں تھی۔ موجود ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

''تم کچھ ٹینس لگ رہی ہو؟'' کھانے کے وقت بھی ماحول کچھ بوجھل بوجھل سا تھا۔ ایاز احمد نے بیوی کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے انہیں کھوجتی نظروں سے دیکھا۔

''وہی، سویرا کا مسئلہ ہے۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرائیں۔

''مطلب؟'' انہوں نے نا سمجھی کے عالم میں اپنی بھویں اچکائیں۔

''آج پھر رشتے والی کچھ خواتین کو لے کر آئی تھی۔ حسبِ معمول وہ خواتین سویرا کو ریجیکٹ کر کے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد سویرا نے رشتے والی کے سامنے ہی مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ آئندہ کسی کو اس مقصد کے

لیے گھر میں نہ بلایا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ ہرگز بھی کسی کا سامنا نہیں کرے گی۔''

''روز روز کی پریڈ سے بچی بیزار آگئی ہوگی۔ بار بار ریجیکٹ ہونے سے انسان کی عزتِ نفس بھی مجروح ہوتی ہے۔'' ایاز احمد نے سیکنڈوں میں بھتیجی کا مسئلہ سمجھ لیا۔

''اس بات کا مجھے بھی اندازہ ہے لیکن اس کے سوا ہمارے پاس چارہ بھی کیا ہے۔ ستائیسویں سال میں لگ گئی ہے سویرا۔ اصولاً اب تک اس کی شادی ہوجانی چاہیے تھی۔ لوگ بھی ہماری نیت پر شک کرتے ہیں کہ شاید شادی کا خرچ بچانے کے لیے لڑکی کو گھر بٹھا کر رکھا ہوا ہے۔'' وہ اپنی جگہ پریشان تھیں۔

''لوگوں کی باتوں کی مجھے اتنی فکر نہیں ہے۔ اپنی بھتیجیوں کے معاملے میں، میں لوگوں سے زیادہ خود کو اللہ اور اپنے مرحوم بھائی کے سامنے جوابدہ محسوس کرتا ہوں۔ اگر یہ بچیاں میری چھت کے نیچے تکلیف میں رہیں تو میں روزِ حشر اپنا سر نہیں اٹھا سکوں گا۔''

ایاز احمد یکدم ہی بہت اداس ہوگئے تھے، یہاں تک کہ فرمائش کر کے بنوائی گئی چائے بھی پینے کا خیال نہیں رہا تھا۔

''اتنے پریشان نہ ہوں۔ اللہ کے حکم سے آپ نے ہمیشہ بچیوں کا بساط سے بڑھ کر خیال رکھا ہے۔ اب بھی ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں کہ کسی بھلی جگہ سویرا کی بات بن جائے لیکن اس معاملے میں ہمارا کوئی اختیار تو ہے نہیں۔'' وہ شوہر کو تسلی دینے کی اپنی سی کوشش کرنے لگیں۔

''تم سویرا کی دلجوئی کی کوشش کیا کرو۔ ایسے حالات میں بچیاں عموماً ماں کو بہت مس کرتی ہیں۔'' ایاز نے انہیں نصیحت کی۔

''آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں ہے ایاز! مجھے خود بھی اس چیز کا احساس ہے کہ وہ ٹینس ہے اور اسے میری ہمدردی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اسی لیے آج میں اس کا اپنے ساتھ اتنا روڈلی بیہو برداشت کر گئی۔ میرے علاوہ آج وہ ثاقب اور سوہا سے بھی بہت بری طرح پیش آئی ہے۔ ثاقب کو اس نے بلاوجہ ڈانٹ دیا اور سوہا بے چاری کو تو ایک تھپڑ ہی دے مارا لیکن میں نے سب کچھ نظر انداز کر دیا کہ وہ خود تکلیف میں ہے۔''

انہوں نے ایاز احمد کو بتایا تو انہیں اندازہ ہوا کہ سویرا کا کہیں رشتہ نہ ہوسکنا گھر والوں کے لیے روز بروز ایک گمبھیر مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی شریکِ حیات ناعمہ نے بھتیجیوں کے سلسلے میں ہمیشہ وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا تھا اور کبھی انہیں شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب بھی وہ تحمل اور سمجھ داری سے ہی کام لے رہی تھیں لیکن سویرا کا رویّہ حالات کو بدل بھی سکتا تھا۔

''آپ اتنے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں خود اس مسئلے کو ہینڈل کرنے کی کوشش کروں گی۔ ابھی سویرا کا موڈ آف ہے، دو چار دن گزر جائیں تو میں آرام سے اسے سمجھاؤں گی۔'' ایاز کے چہرے کے اتار چڑھاؤ نے ناعمہ کو ان کی دلجوئی پر مجبور کیا۔

اس رات ایاز سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو نیند ان پر مہربان نہیں ہوسکی۔ سویرا اور سوہا ان کے مرحوم بھائی کی بیٹیاں تھیں۔ ان کے بھائی اور بھابی رحیم یار خان جاتے ہوئے ریل کے حادثے کا شکار ہوگئے تھے۔ بھابی نے تو موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا لیکن بھائی ان کے اسپتال پہنچنے تک سانس لے رہے تھے۔

''میری بچیاں تیرے حوالے ہیں ایاز! ان کا خیال رکھنا۔'' مرتے ہوئے بھائی نے ان سے یہ واحد بات کہی تھی۔ ایاز احمد بھائی کی حسرت زدہ نظریں اور جان کنی کے عالم میں ادا کیا گیا ان کا وہ واحد جملہ کبھی فراموش نہیں کرسکے تھے اور انہوں نے ہر پل یہ کوشش کی تھی کہ بچیوں کو والدین کی کمی محسوس نہ ہو۔ اپنی کوششوں سے وہ خاصی حد تک مطمئن بھی تھے لیکن اب اس مقام پر آکر وہ بے بس ہوگئے تھے۔ گریجویشن کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ کر ایک نجی اسکول میں تدریس کے فرائض انجام دینے والی سویرا کی شادی کا مسئلہ روز بروز گمبھیر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی دبتی ہوئی شکل اور بائیں پیر کا معمولی سا لنگ اس کی شادی کی راہ میں حائل دو بڑی رکاوٹیں تھیں۔ اچھے لڑکوں کی ماؤں کو اپنے بیٹوں کے لیے بے عیب بہو درکار تھی۔ چنانچہ وہ سویرا کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ چند ایک لوگ جو سویرا کے لیے دلچسپی ظاہر کر گئے تھے، خود ایاز احمد کے دل کو نہیں بھائے تھے کہ یا تو لڑکے کی تعلیم اور آمدنی تسلی بخش نہیں تھی یا پھر وہ خود سویرا سے بھی بڑے جسمانی عیب کا شکار تھے۔ ان کی ذاتی رائے میں دو ادھورے افراد کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دینا ایک احمقانہ عمل تھا اور دونوں میں سے کسی ایک کو لازماً مکمل طور پر صحت مند ہونا چاہیے تھا تاکہ وہ دوسرے کو سہارا دے سکتا۔ رہی کم حیثیت کے رشتوں پر غور کرنے کی بات تو انہیں اندازہ تھا کہ ناز و نعم میں پلی ان کی بھتیجی کے لیے ساری زندگی سمجھوتے کرنا ایک مشکل کام ثابت ہوگا اس لیے انہوں نے وہ رشتے بھی رد کر دیے تھے

اور اب پریشان تھے کہ ستائیسویں برس میں قدم رکھ چکی اپنی لاڈلی بچی کے فریضے سے کیسے سبکدوش ہوں۔ سوچتے سوچتے ایک خیال ان کے ذہن میں آیا تو انہیں لگا کہ اندھیرے میں روشنی کی کرن ہاتھ لگ گئی ہو۔

اگلی صبح ہی وہ ناعمہ سے اپنے ذہن میں آنے والے خیال پر تبادلہ خیال کررہے تھے۔ ناعمہ فطری طور پر اپنے اٹھارہ سالہ زیرِ تعلیم بیٹے کے لیے سویرا کے رشتے پر راضی نہیں تھیں لیکن ایاز احمد کے سامنے ان کی نہیں چلتی تھی۔ سویرا اور ثاقب کے ممکنہ سخت ردِعمل سے نمٹنے کی ذمے داری بھی ایاز احمد نے خود سنبھالی۔ عمومی حالات میں وہ ایک ہمدرد اور نرم مزاج آدمی تھے لیکن جب کسی بات پر اڑ جاتے تھے تو اہلِ خانہ کے پاس ان کی بات تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا تھا۔ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ تمام فریقین کو ان کے ضدنما حکم کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے اور یوں اٹھارہ سالہ ثاقب، جس کا ابھی انجینئرنگ یونیورسٹی کے پہلے سال میں داخلہ ہوا تھا، سویرا اعجاز کو سویرا ثاقب بنا کر اپنی زندگی میں شامل کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس زبردستی کی شادی پر ایاز کے سوا اگر کوئی خوش تھا تو وہ ثاقب سے چار سال چھوٹی، سویرا کی چھوٹی بہن سوہا اعجاز تھی۔

☆☆☆

''سوہا جاؤ! ذرا اپنے جیجو کو یہ چائے تو دے آؤ۔'' سویرا نے چائے کا تیار شدہ کپ کوکیز کی پلیٹ کے ساتھ ٹرے میں رکھتے ہوئے لاؤنج میں بیٹھی سوہا کو پکارا۔

''آپا...... بٹر کوکیز۔ بڑی چالاک ہیں آپ سویرا آپا۔ سب اچھی چیزیں اپنے میاں جی کے لیے چھپا کر رکھتی ہیں۔'' سوہا اندر آئی اور کوکیز دیکھ کر شکوہ کیا۔

''میاں جی جو ہوئے۔ ویسے بھی مجھے یاد ہے کہ امی کہا کرتی تھیں مرد کو خوش رکھو تو وہ بھی آپ کو خوش رکھتا ہے اور گھر میں سکون رہتا ہے۔'' سویرا نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

''توبہ ہے آپا! آپ آج کے دور میں بھی امی کے نسخوں کو اپلائی کرتی ہیں حالانکہ اب یہ سب باتیں دقیانوسی ہوگئی ہیں۔ آج مرد کے دل کا راستہ معدے سے نہیں آنکھ اور کان سے ہو کر جاتا ہے۔ وہ یا تو چمکتی دمکتی لڑکی سے متاثر ہوتا ہے یا اس چنک منک حسینہ سے جو اس کی ذہنی اور جذباتی ضرورت کے مطابق بات کرنے کا ہنر جانتی ہو۔'' سوہا نے روانی سے اس کی بات پر تبصرہ کیا اور ٹرے اٹھا کر ہوا کی طرح کچن سے باہر نکل گئی، پر سویرا کے دل سے اس کی بات نہیں نکل سکی۔ سبزی کی ٹوکری اٹھا کر لاؤنج میں آئی تو بے اختیار ہی آئینے پر نظر اٹھ گئی۔ وہ معمولی شکل وصورت کی مالک تھی اور شادی کے سات سالوں میں تین بچوں کی پیدائش کے بعد اور بھی گئی گزری ہوگئی تھی۔ ایک طرف گھر کے کام کاج اور بچوں کی ذمے داریاں اسے خود پر توجہ دینے کی فرصت نہیں دیتی تھیں تو دوسری طرف ثاقب سے اپنا غیر جذباتی تعلق بھی اسے اپنے آپ سے بے پروا بنا گیا تھا۔

ان دونوں ہی کے دلوں میں وہ ارمان اور جذبے نہیں پنپ سکے تھے جو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے مرد وزن کے جسم وجان میں خوشی بن کر دوڑتے ہیں اور اس خوشی سے توانائی پا کر دونوں ایک دوسرے کی زندگیوں میں خوشبو بکھیرتے ہیں۔ وہ دونوں ہی میاں بیوی ہونے کے فطری، سماجی اور اخلاقی فرائض تو ضرور ادا کرتے تھے لیکن اس بے ساختگی سے محروم تھے جو اس رشتے کا حقیقی حسن ہوتا ہے۔ تکلف اور جھجک پر مبنی اس رشتے کو صرف اولاد کی کڑی نے سہارا دے رکھا تھا۔ بچوں میں دونوں ہی کی جان تھی اور دونوں خود سے زیادہ بچوں کے بارے میں سوچتے تھے۔

''لاؤ یہ سبزی ادھر لے آؤ۔ میں بنوانے میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔'' ناعمہ چچی کی آواز نے اسے اپنی گہری سوچ سے نکالا تو وہ سر جھٹک کر سبزی کی ٹوکری سمیت ان کے مقابل تخت پر آبیٹھی۔

''کیا پکانے کا ارادہ ہے؟'' چچی نے مٹر کے دانے نکالتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''چائنیز رائس۔'' گاجر کو کیوبس کی شکل میں کاٹتے ہوئے اس نے مختصر جواب دیا۔ ثاقب کو چائنیز ڈشز مرغوب تھیں اور وہ چھٹی والے دن خاص طور پر اس کی پسند کا کھانا بناتی تھی۔ وہی مشرقی عورت کی معدے کے راستے شوہر کے دل تک پہنچنے کی ازلی کوشش...... لیکن اس وقت وہ سوہا کی کہی باتوں کے زیرِ اثر تھی اس لیے اپنی یہ مشقت فضول محسوس ہورہی تھی۔

''مجھے تو بھئی تم دوپہر کے سالن کے ساتھ پھلکے بنا دینا۔ میرے حلق سے یہ چائنیز اور تھائی کھانے نیچے نہیں اترتے۔'' چچی نے فوراً فرمائش کی۔

''مجھے بھی زیادہ پسند نہیں ہیں لیکن ثاقب کی خاطر بناتی ہوں۔ سوہا اور بچے بھی شوق سے کھالیتے ہیں۔''

''پرانے زمانے کے لوگ ایسے ہی بورنگ ہوتے ہیں۔'' چچی کو جواب دیتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب سوہا وہاں آگئی۔

"مجھ پر تو یہ الزام صحیح ہے لیکن سویرا کہاں سے پرانے زمانے کی ہوگئی؟" چچی نے فوراً اسے ٹوکا۔ اگرچہ وہ ثاقب اور سویرا کی شادی کے حق میں نہیں تھیں لیکن جب شادی ہوگئی تو انہوں نے سویرا کے خلاف محاذ نہیں بنایا اور جس طرح جیٹھ جیٹھانی کی موت پر ان کی بچیوں کی ذمے داری خوش دلی سے نباہی تھی، یہ نیا رشتہ بھی خوش اسلوبی سے نباہنے لگیں۔

"میرے سامنے تو پرانے زمانے کی ہی ہیں۔ بارہ تیرہ سال کا فرق کوئی معمولی تو نہیں ہوتا۔ اتنے عرصے میں تو ایک دنیا بدل جاتی ہے۔" مٹر کے چھلے ہوئے دانے منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے بے نیازی سے اپنے موقف کی حمایت میں دلیل دی۔

"بہت باتیں بنانی آگئی ہیں تمہیں۔ ذرا چھری تلے دم لو۔ ایم بی اے مکمل ہوتے ہی کوئی رشتہ ڈھونڈ کر تمہیں تمہارے گھر کا کرتی ہوں۔ چولہے ہانڈی کی جھنجھٹوں میں پڑوگی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا۔" انہوں نے سوہا کی بات پر سویرا کا ایک دم سے خاموش ہوجانا محسوس کرلیا تھا لیکن اس موقع پر سوہا کو براہِ راست ٹوک بھی نہیں سکتی تھیں اس لیے دانستہ لہجے میں ہلکی سی خفگی اور شوخی کی آمیزش کرتے ہوئے اسے عام سی سرزنش کی۔

"میں تو ہرگز بھی اتنی جلدی شادی نہیں کرنے والی۔ ایم بی اے کمپلیٹ ہونے کے بعد میرا جاب کرنے کا ارادہ ہے اور اس سلسلے میں، میں نے جیجو کو راضی بھی کرلیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اپنے آفس میں میرے لیے جگہ نکال لیں گے۔" سوہا نے شانے اچکا کر بے نیازی بھرے اعتماد سے جواب دیا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ کسی کی پروا کیے بغیر دوٹوک فیصلہ سنانے والی۔ سویرا بڑی ہونے کے باوجود بھی اس طرح کے رویے کا مظاہرہ نہیں کرسکی تھی۔ اپنی کم صورتی اور پاؤں کے نقص نے اسے اعتماد سے محروم کردیا تھا جبکہ سوہا اس کے مقابلے میں نسبتاً اچھی شکل وصورت کی مالک تھی۔ اسے خود کو سجانا سنوارنا بھی آتا تھا اور مخلوط اور اچھے تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے باعث گفتگو کے فن سے بھی واقف تھی اس لیے اس میں بھرپور اعتماد تھا۔

"واہ بھئی! تم نے تو اپنے بہنوئی کے ساتھ مل کر بالا ہی بالا... کھچڑی پکا ڈالی اور ہمیں کچھ خبر ہی نہیں ہے۔"

"آفٹر آل میں ان کی اکلوتی سالی ہوں اور سالی کو آدھی گھر والی کہتے ہیں۔ وہ میری بات ٹال دیتے اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔" اب وہ گاجر کے کٹے ہوئے ٹکڑے ٹونگ رہی تھی۔

"ہاتھ پیچھے کرو۔ کچھ پکنے سے پہلے ہی بکری کی طرح بکر بکر ساری سبزی کھا جاؤ گی۔" سویرا نے اسے سختی سے ٹوکا پھر سبزی کی ٹوکری کے ساتھ ساتھ کٹ جانے والی سبزی بھی سمیٹ کر کچن کی طرف چل پڑی۔

"پتا نہیں کس بے ہودہ انسان نے یہ آدھی گھر والی بات ایجاد کی ہے۔" کوئی اس کی زیرِلب جاری بڑبڑاہٹ سنتا تو غصے کی اصل وجہ بھی جان لیتا۔

"انہیں اچانک کیا ہوگیا؟" پیچھے سوہا حیرت سے ناعمہ چچی سے پوچھ رہی تھی۔

"تمہاری فضول باتیں سن کر برا مان گئی ہے۔"

"ہائیں! میں نے کیا کہا انہیں؟" وہ چچی کا جواب سن کر حیران ہوئی۔

"اس کے سامنے عمر کا موضوع چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ معلوم ہے نا کہ یہ اس کا ویک پوائنٹ ہے۔" چچی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ سچ تو سچ ہوتا ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"بے وقوف...... ہر سچ بولنے کے لیے نہیں ہوتا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے عمر کے فرق کو جتانے پر اس نے اپنی اور تمہاری عمروں کے فرق سے زیادہ اپنے اور ثاقب کے درمیان عمروں کے فرق پر غور کیا ہوگا۔" چچی نے آواز دبا کر اسے سمجھایا۔

"جتانے یا نہ جتانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ فرق تو اتنا واضح ہے کہ بندہ پہلی نظر میں محسوس کرلیتا ہے۔ ویسے سچ کہوں چچی! آپ لوگوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ سویرا آپا اور وہ تو کسی بھی لحاظ سے ایک دوسرے کے جوڑ کے نہیں ہیں۔" وہ لاکھ منہ پھٹ سہی لیکن اتنا شعور تھا کہ اس گفتگو کو بہن کے کانوں تک نہیں پہنچنا چاہیے اس لیے نیچی آواز میں بات کررہی تھی۔

"سب نصیب کے کھیل ہیں بیٹا! ثاقب کا جوڑ سویرا کے ساتھ ہی لکھا تھا جب ہی تمہارے مرحوم چچا کے دل میں بات آگئی اور انہوں نے ثاقب کی ادھوری تعلیم کی پروا کیے بغیر اس کا بیاہ سویرا کے ساتھ کردیا۔ اسی بہانے اللہ نے انہیں مرنے سے پہلے پوتے پوتی کی خوشی بھی دکھادی ورنہ اگر ہم رواج کے مطابق چلتے تو اب جاکر کہیں ثاقب کی دلہن تلاش کی جارہی ہوتی اور تمہارے چچا بے چارے ان خوشیوں سے محروم ہی دنیا سے چلے جاتے۔" وہ فطرتاً راضی بہ رضا رہنے والی خاتون تھیں، دوسرے سویرا اور سوہا سے

اپنی اولاد جیسا ہی پیار تھا اس لیے سویرا کو بہو کی حیثیت سے قبول کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا یا تھا۔

''اکلوتے سپوت کی اتنی قناعت پسند ماں بس آپ ہی ہوسکتی ہیں ورنہ ایسے بیٹوں کی ماؤں کے تونخرے دیکھنے والے ہوتے ہیں۔'' وہ سچ مچ ناعمہ کی قناعت پسندی سے مرعوب ہوئی۔

''مجھے ان چھچھوری عورتوں سے مت ملاؤ۔'' انہوں نے منہ بنایا۔

''اوکے! بیوٹی فل لیڈی...... نہیں ملاتی۔'' اس نے چٹاچٹ ان کے رخسار پر پیار کیا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ ثاقب جو اپنے کمرے سے نکل رہا تھا، اس سے ٹکرا گیا۔

''کیا آفت آئی ہے جو یوں بھاگ رہی ہو؟'' اس نے ناک پکڑ کر اسے ٹوکا۔

''میرے ہوتے کسی آفت کو آنے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شوخ لہجے میں بولی تو وہ اسے گھورنا بھول کر ہنس پڑا۔ سوہا کی شوخ کھنکتی ہنسی بھی اس کے قہقہے کے ساتھ شامل ہوگئی۔

☆☆☆

''واہ بھئی بڑی خوشبوئیں آرہی ہیں۔'' سوہا یونیورسٹی سے آئی تو کچن سے آتی خوشبوئیں سونگھتی سیدھی وہیں پہنچ گئی۔ اندر سویرا بری طرح مصروف تھی۔

''کیا کوئی آرہا ہے؟'' شیشے کی خوبصورت ڈش میں رکھے شاہی ٹکڑوں پر بادام پستے کی ہوائیاں چھڑکتی سویرا سے دریافت کیا۔

''تمہیں میری فرینڈ حمیرا یاد ہے، وہ جس نے میرے ساتھ گریجویشن کیا تھا؟'' سویرا کا حلیہ ابتر ہو رہا تھا اور وہ خاصی تھکی ہوئی بھی لگ رہی تھی لیکن اس کے انداز میں ایک محسوس کی جانے والی خوشی تھی۔

''وہی جو رزلٹ آنے سے پہلے ہی شادی کرکے کینیڈا چلی گئی تھی؟'' سوہا کو یاد آیا۔

''ہاں وہی۔ وہ آج کل پاکستان آئی ہوئی ہے۔ رات اس کا فون آیا تھا۔ میں نے لنچ پر انوائٹ کرلیا۔ بس اب آتی ہی ہوگی۔'' سویرا پُرجوش سی تھی۔

''وہ آنے والی ہے اور آپ ابھی تک اسی گندے حلیے میں ہیں؟'' سوہا نے فوراً اسے ٹوکا۔

''بس یہ کام سمٹ جائے تو نہانے جاتی ہوں۔ کم بخت ماسی نے بھی آج چھٹی کرلی اور مجھے دعوت کے انتظام کے ساتھ ساتھ صفائی کا کام بھی نمٹانا پڑا۔'' شاہی ٹکڑوں کی ڈش فائنل کرکے سلاد کے لیے فریج سے کھیرا، گاجر وغیرہ نکالتے ہوئے اس نے سوہا کے اعتراض کا جواب دیا۔

''لائیں سلاد میں بناتی ہوں۔ آپ جاکر نہالیں۔'' سوہا کو بہن کی حالت پر رحم آیا۔ سویرا نے بھی اس کی پیشکش قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''بریانی دم پر ہے۔ پانچ منٹ بعد چولہا بند کردینا۔'' اس نے نکلتے نکلتے سوہا کو ہدایت دی اور اپنے کمرے میں جانے سے پہلے چچی کے کمرے میں جھانکا۔ دو سالہ مناہل ان کے قریب آرام سے سو رہی تھی جبکہ بڑے دونوں بچے ابھی اسکول سے واپس نہیں آئے تھے۔ اس نے اپنے کمرے میں جاکر الماری سے ایک استری شدہ جوڑا نکالا اور غسل خانے میں گھس گئی۔ نہا کر ابھی بال ہی بنا رہی تھی کہ ثاقب بچوں کو لے کر آگیا۔ غیر محفوظ ماحول کی وجہ سے انہوں نے بچوں کے لیے اسکول وین نہیں لگائی تھی اور ثاقب خود بچوں کو پک اینڈ ڈراپ دیتا تھا۔ اس بہانے وہ لنچ بھی گھر پر کرلیتا تھا۔ سویرا جلدی جلدی بچوں کو چینج کروانے لگی۔ آج اتفاق سے چچی کی طبیعت بھی کچھ ناساز تھی اس لیے وہ حسب عادت اس کی مدد بھی نہیں کرواسکی تھیں اور وہ زیادہ ہی گھن چکر بن گئی تھی۔ بچوں کو معقول حلیے میں لانے کے دوران اس نے ثاقب کو اپنی سہیلی کی متوقع آمد کے بارے میں بتایا اور پھر دوبارہ باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ سوہا سلاد بنا کے فارغ ہونے کے بعد کچن کا پھیلاوا بھی سمیٹ چکی تھی اور اب سنک میں پڑے استعمال شدہ برتن دھو رہی تھی۔

''تھینک یو سو مچ، سوئٹ سسٹر!'' سویرا کو اس پر بہت پیار آیا۔ اس نے خود سے اس پر گھر کے کاموں کا بوجھ نہیں ڈالا تھا کہ اس کی پڑھائی خاصی ٹف تھی لیکن سوہا فطرتاً سگھڑ اور پھرتیلی تھی اور جب کوئی کام کرنے کھڑی ہوتی تھی تو اسے سلیقے اور تیزی سے نمٹا لیتی تھی۔

''شکریہ تو آپ سر اشفاق کا ادا کریں جو آج وہ ٹلا (چھٹی) مار گئے اور میں لاسٹ پیریڈ فری ہونے کی وجہ سے جلدی گھر واپس آگئی۔'' وہ حسب عادت شوخی سے ہنس کر بولی۔ جواب میں سویرا ابھی کچھ بولتی اس سے قبل اطلاعی گھنٹی نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

''میرے خیال میں حمیرا آگئی ہے۔'' وہ بولتی ہوئی کچن سے باہر نکلی لیکن ثاقب اس سے پہلے دروازے پر جاچکا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا، حسب توقع حمیرا ہی تھی۔ ماضی میں ان کے گروپ کی سب سے خوبصورت لڑکی حمیرا

تھی۔ گزرے برسوں نے اسے دبلی پتلی نوخیز کلی جیسی لڑکی سے کھلے گلاب جیسی خاتون میں تبدیل کرنے کے سوا کوئی اثر مرتب نہیں کیا تھا۔ سویرا لپک کر باہر نکلی اور اسے گلے لگا کر اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ ثاقب واپس پلٹ چکا تھا۔ سویرا، حمیرا کو اپنے ساتھ لیے سلیقے سے سجے صاف ستھرے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔

''یہ ہینڈسم جس نے دروازہ کھولا تھا، تمہارا دیور ہے؟'' برسوں بعد بھی حمیرا کا انداز ویسا ہی شوخ اور بے تکلف تھا اور اپنی بات پر سویرا کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھے بغیر روانی سے بول رہی تھی۔

''آج کل امی میری سب سے چھوٹی بہن کے لیے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ کم بخت نے جوان ہو کر ہم سب بہنوں سے زیادہ رنگ روپ نکالا ہے۔ تمہارے دیور کو دیکھ کر خیال آیا کہ بڑا پرفیکٹ میچ رہے گا۔''

''وہ میرے شوہر ثاقب تھے۔'' سویرا نے کسی اعتراف جرم کی طرح حقیقت گوش گزار کی تو حمیرا کی چلتی زبان کو بریک لگے۔ وہ پل بھر کو گنگ ہوئی، پھر خود کو سنبھال کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

''شاندار یار! تم نے تو بہت زبردست ہاتھ مارا ہے۔ کہاں سے ہاتھ لگ گیا یہ ڈرنایاب؟''

''ثاقب میرے چچازاد ہیں۔ چچا نے ہماری شادی کروائی تھی۔'' سویرا بہت مشکل سے اپنے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو سکی۔ پہلی بار ثاقب کو اپنے شوہر کی حیثیت سے متعارف کروانے پر عموماً اسے ایسے ہی ردعمل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

''تم بچوں کو نہیں لے کر آئیں؟'' حمیرا کو خفت سے نکالنے کے لیے اس نے خود ہی موضوع بدل ڈالا۔

''بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ انہیں ماما کی کسی اولڈ فرینڈ سے ملنے آنے سے زیادہ اپنے ہم عمر کزنز کے ساتھ ٹائم اسپینڈ کرنے میں دلچسپی تھی۔ میں نے بھی زبردستی نہیں کی کہ پہلی بار تو ان کو اپنے کزنز سے ملاقات کا موقع ملا ہے۔ اچھا ہے، واپس جانے سے پہلے بہت ساری خوشگوار یادیں جمع کر لیں۔'' حمیرا نے مسکرا کر اس کے سوال کا مفصل جواب دیا۔

''تم شادی ہو کر ایسے کینیڈا گئیں کہ کبھی لوٹ کر ہی نہیں آئیں۔ بندہ سال دو سال میں تو اپنے گھر والوں سے ملنے آتا ہی ہے۔''

''بس آ ہی نہیں سکی۔ وقاص وہاں اپنا بزنس سیٹل کر رہے تھے۔ انہیں سپورٹ کرنے اور اضافی اخراجات سے بچانے کے چکر میں، میں اتنے عرصے اپنا دل مارتی رہی۔ اب اللہ کا شکر ہے کافی خوشحالی آ گئی ہے تو میں بچوں کے ساتھ اپنی فیملی اور دوستوں سے ملنے کے لیے آ گئی ہوں۔ وقاص کے یہاں کوئی قریبی رشتے دار باقی نہیں رہے ہیں اس لیے انہوں نے ہمارے ساتھ آنے کے بجائے اپنے بزنس کو توجہ دینا زیادہ مناسب سمجھا۔'' اس کے خوبصورت چہرے پر کہیں کہیں گزرے برسوں کی تھکن کی جھلک تھی۔

''السلام علیکم، حمیرا آپی! کیسی ہیں آپ؟'' اسی وقت سوہا وہاں چلی آئی اور خوش گوار لہجے میں حمیرا کو سلام کرتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کی۔

''یہ سوہا ہے نا؟ کتنی بڑی ہو گئی ہے اور پیاری بھی۔ اسٹوڈنٹ لائف میں جب کبھی میں تمہارے گھر آتی تھی تو یہ زیادہ تر روتی دھوتی ہی ملتی تھی۔ مجھے یاد ہے اس زمانے میں ہر وقت اس کی ناک بہتی رہتی تھی۔'' سوہا کی آمد پر حمیرا دوبارہ اپنی شوخ جون میں آ گئی۔

''وہ گئے وقتوں کی بات ہے، اب تو مابدولت ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔'' کاٹن کے اسٹائلش سوٹ میں نامحسوس ہونے والے میک اپ نے خود کو پرکشش بنائے سوہا نے اپنی ناک سکیڑ کر ایک ادا سے جواب دیا تو حمیرا کے ساتھ ساتھ سویرا بھی ہنس دی۔

''میں آپ خواتین کو کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے آئی تھی۔ جیجو کو واپس آفس بھی جانا ہے اس لیے پہلے آپ لوگ کھانا تناول کر لیں، پھر آرام سے بیٹھ کر یادِ ماضی کو آواز دیتی رہیے گا۔'' سوہا نے اطلاع دی تو سویرا جو آداب میزبانی نبھانے کے چکر میں ثاقب کو تاخیر ہونے کے خیال کے باوجود اپنی جگہ سے اٹھ نہیں پا رہی تھی، خوش ہو گئی۔

سب نے اس کا کئی گھنٹے لگا کر تیار کردہ لنچ خوش گوار ماحول میں بہت شوق سے تناول کیا۔ حمیرا کی تو تعریفیں کر کر کے زبان سوکھ گئی۔ اس نے چچی، بچوں، سوہا اور ثاقب سمیت ہر ایک کو جتایا کہ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں سویرا جیسی سگھڑ خاتون کی خدمات حاصل ہیں۔ اتنی تعریفوں پر سویرا تو شرمندہ ہی ہونے لگی۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹنے اور بچوں کو دیکھنے کی ذمے داری سوہا نے سنبھالی۔ ناعمہ چچی نے دوا لے کر دوبارہ آرام کرنے کا عندیہ دیا جبکہ ثاقب آفس سدھارا۔ اب دونوں سہیلیوں کے پاس فرصت تھی۔ انہوں نے دوبارہ ڈرائنگ روم میں ڈیرا جمایا اور گزرے برسوں کی داستانیں ایک دوسرے کو سنانے لگیں۔ گھنٹے، منٹ بن کر بیتنے لگے۔ اگر حمیرا کی بیٹی کی اس کے

موبائل پر کال نہ آجاتی تو وہ دونوں جانے کب تک دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی باتوں میں لگی رہتیں۔ بیٹی کی کال کے بعد حمیرا کو واپسی کی فکر ہوئی لیکن جانے سے پہلے وہ سویرا کو ایک دوستانہ مشورہ دیے بغیر نہیں رہ سکی اور سنجیدگی سے بولی۔

''تم میری بہت اچھی دوست ہو سویرا اور میں جانتی ہوں کہ تم میں بہت ساری خوبیاں ہیں، لیکن آج کے دور میں جبکہ میڈیا نے اپنی آزاد پالیسی سے بہت سی اقدار کو بدل ڈالا ہے، عورت کا محض سگھڑ ہونا کافی نہیں۔ آج کی عورت کو پر کشش اور قابلِ توجہ بھی نظر آنا چاہیے۔'' وہ الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ وہی بات کہہ رہی تھی جو کچھ دن پہلے سوہا بھی اس سے کہہ چکی تھی۔

''میری بات غور سے سنو!'' اس نے سویرا کا ہاتھ پکڑ کر بطور خاص اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''جن بھی حالات کے تحت تمہاری ثاقب سے شادی ہوئی، آج کی حقیقت یہ ہے کہ تم ثاقب کی بیوی ہو اور اس پر تمہارا حق ہے۔ اپنے اس حق کو قائم رکھنے کے لیے تمہیں خود پر توجہ دینی ہوگی۔ تم ماشاء اللہ خوش حال ہو۔ خود کو وقت دو اور اپنے اوپر تھوڑا پیسا لگاؤ تاکہ اس گھر کی ملازمہ کے بجائے مالکن نظر آسکو اور ثاقب کے لیے بھی اتنی بے کشش نہ رہو کہ وہ گھر سے باہر اِدھر اُدھر اپنی دلچسپیاں ڈھونڈے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ خوش شکل اور خوش حال مردوں کو شکار کرنے کے لیے باہر کیسی کیسی چلتر لڑکیاں گھوم رہی ہیں۔ ثاقب جیسا گھر میں واجبی دلچسپی رکھنے والا مرد تو کبھی بھی بہت آسانی سے شکار ہوسکتا ہے۔''

''کیسی خوفناک باتیں کر رہی ہو حمیرا۔'' سویرا نے سن کر ایک جھرجھری سی لی۔

''حقیقت پسندانہ باتیں کر رہی ہوں۔ میری مانو اور اب بھی عقل کے ناخن لو۔ ثاقب جیسے مرد کی بیوی ہو، اسے گھر کے کھونٹے سے باندھے رکھنے کے لیے تمہیں ہاتھ پیر تو چلانے پڑیں گے۔'' حمیرا چلی گئی اور وہ سوچوں کے گرداب میں گھر کر رہ گئی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نے ثاقب سے بہ خوشی شادی نہیں کی تھی، خود سے اتنے سال چھوٹے کزن کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے اس کا ذہن تیار نہیں ہوتا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اب جبکہ وہ اس کی بیوی تھی، اسے یہ قطعی منظور نہیں تھا کہ کوئی اور عورت اسے لے اڑے اور پیچھے وہ اور اس کے بچے بے آسرا رہ جائیں۔

☆☆☆

''واؤ آپا! آپ تو پہچانی ہی نہیں جارہیں۔'' دو دن

بعد ہی وہ پارلر میں چار گھنٹے لگا کر آئی تو آئینے میں اپنی ہی شکل اجنبی اجنبی لیکن اچھی لگی۔ خصوصاً ہمیشہ سادہ چٹیا کی شکل میں بندھے رہنے والے بال اسٹیپ کٹنگ کے بعد بہت اچھے لگ رہے تھے۔ گھر آکر سب سے پہلے سوہا سے سامنا ہوا اور اس نے بے ساختہ ہی اسے سراہا۔

''آپ تو بالکل ہماری میم کی طرح لگ رہی ہیں، مما!'' ہر معاملے میں اپنی ٹیچرز کو آئیڈیلائز کرنے والے بچوں نے بھی اپنے انداز میں تعریف کی۔ ناعمہ چچی نے بھی تعریفی کلمات ادا کیے۔

''لگتا ہے یہ سارا حمیرا آپی کی آمد کا کرشمہ ہے۔ انہیں دیکھ کر آپا کو خیال آیا ہوگا کہ انہیں بھی کچھ ڈھنگ سے رہنا چاہیے۔'' سوہا نے تبصرہ کیا اور ثاقب کو مخاطب کر کے بولی۔

''آپ ملے تھے نا جیجو، آپا کی فرینڈ حمیرا آپی سے؟ کتنی اسٹائلش لیڈی تھیں۔''

''تھیں تو...... لیکن میرے خیال میں ان کے اتنے اسٹائلش نظر آنے میں مصنوعی سہاروں سے زیادہ ان کی قدرتی خوبصورتی کا دخل تھا۔'' ثاقب نے تبصرہ کیا اور بے نیازی سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے ایسے تبصرے پر سویرا کے دل کو جو دھچکا لگا سو لگا، سوہا بھی چپ سی ہوگئی۔

''آئی ایم سوری آپا! مجھے معلوم ہے کہ جیجو کی بات نے آپ کا دل دکھایا ہوگا۔ مجھے خود بھی ان پر غصہ آیا تھا لیکن پھر ذرا غیر جانبداری سے سوچا تو وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی لگے۔ چچا جان نے اتنی کم عمری میں ان کو زبردستی آپ سے باندھ دیا کہ وہ اب تک اس جھنجلاہٹ سے نہیں نکل سکے ہیں۔'' رات کو جب وہ روٹیاں بنا رہی تھی، سوہا نے سلاد بناتے ہوئے اس سے کہا۔ سویرا اور ثاقب کی شادی کے وقت وہ ٹین ایجر تھی اور شوخی میں ثاقب کو بھائی کے بجائے جیجو کہنے لگی تھی۔ بعد میں یہ اس کی مستقل عادت بن گئی۔

''مجھے تمہاری بات سے اختلاف نہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شادی کے وقت میں بھی ثاقب جتنی ہی بے بس تھی۔ چچا جان نے مجھ سے اس شادی کے لیے اجازت نہیں مانگی تھی بلکہ کہا تھا کہ اگر میں خود کو ان کی بیٹی سمجھتی ہوں تو مجھے ان کے فیصلے کا مان رکھنا پڑے گا۔'' سویرا کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس نے خود کو پرکشش بنا کر ثاقب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی کوششیں تو ترک کر دیں لیکن اس خوف کو اپنے دل سے نہیں نکال سکی کہ اس کا جوان اور خوبصورت شوہر کبھی بھی کسی دوسری عورت کا اسیر ہو کر اسے اور اس کے بچوں کو چھوڑ کر جا سکتا ہے۔

☆☆☆

''آفس جاتے ہوئے سوہا کو اس کی فرینڈ کے گھر ڈراپ کر دیں ثاقب!''

''سوہا کے پاس لان کے کپڑے نہیں ہیں۔ میری شاپنگ سینٹرز میں گھومنے کی ہمت نہیں ہو رہی، ذرا آپ جا کر اسے شاپنگ کروا لائیں۔''

''بچے بہت دنوں سے کہیں گھومنے نہیں گئے۔ آپ اور سوہا جا کر انہیں آئس کریم تو کھلا لائیں۔''

''سوہا! ذرا اپنے جیجو کے کپڑے تو پریس کر دو۔ مجھے کچن کے کام نمٹانے ہیں۔''

''سر میں درد ہے تو سوہا سے تیل کی مالش کروا لیں۔ اس کی انگلیوں میں جادو ہے۔ ذرا سی دیر میں درد اڑنچھو ہو جائے گا۔''

''یہ شاشلک سوہا نے خصوصاً آپ کے لیے تیار کیا ہے۔''

''سوہا کتنی پیاری لگنے لگی ہے نا ثاقب! کل پڑوس والی روبی بھابی بھی مجھ سے اس کی تعریف کر رہی تھیں۔''

کہنے کو یہ بالکل عام سی باتیں تھیں جنہیں کسی نے محسوس تک نہیں کیا لیکن غیر محسوس طور پر ایک ایسی تبدیلی ظہور میں آنے لگی جو نہایت خوفناک ہونے کے باوجود سویرا کے لیے باعثِ اطمینان تھی۔ ناعمہ چچی جو جوڑوں کے درد میں مبتلا ہو کر اب زیادہ وقت اپنے کمرے تک محدود رہنے لگی تھیں، اس تبدیلی کو محسوس ہی نہیں کر سکیں جبکہ بچے ابھی اتنے سمجھ دار نہیں تھے کہ ایسی باتوں کو نوٹ کرتے۔ سوہا جو پہلے ہی ایک کزن اور سالی کی حیثیت سے ثاقب سے بے تکلف تھی، اب پہلے سے بھی زیادہ بے تکلفی سے اس پر اپنا حق جتانے لگی۔

''فرنٹ سیٹ پر تو بھئی میں ہی بیٹھوں گی...... پیچھے بچہ پارٹی کے ساتھ بیٹھ کر میں نے اپنے کپڑوں کی استری خراب نہیں کروانی۔'' سویرا کبھی کبھی ہی ان کے ساتھ کہیں جاتی تھی۔ اس کبھی کبھی کے موقع پر بھی سوہا فرنٹ سیٹ پر قابض ہو جاتی تو وہ ہنس کر پچھلی نشست پر بیٹھ جاتی۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس نے ثاقب کے ساتھ اس کا دفتر جوائن کر لیا تو فرنٹ سیٹ مستقلاً اسی کی ہوگئی۔

''اب سوہا کی شادی کی فکر کرو، سویرا! دو چار لوگوں نے مجھ سے سوہا کے لیے کہا ہے۔ ان میں سے کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اسے اس کے گھر کا کر دو۔'' ناعمہ چچی نے مشورہ دیا تو سویرا نے انہیں ٹال دیا۔

''ابھی کچھ دن بے فکری سے گزار لینے دیں، چچی۔ گھر داری کی جھنجٹ میں پھنس کر لڑکیاں زندگی کا لطف ہی بھول جاتی ہیں۔ ویسے بھی ابھی سوہا اپنی جاب کو انجوائے کرنا چاہتی ہے۔ اس کا شادی کا کوئی موڈ نہیں ہے۔''

''سویرا ٹھیک کہہ رہی ہے امی! سوہا جیسی ٹیلنٹڈ لڑکی کو اس کی صلاحیتوں کے استعمال کا موقع تو ملنا چاہیے۔ ڈگری لے کر اسے چولہے میں جھونک دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟'' اس موقع پر ثاقب نے بھی سویرا کی بھرپور تائید کی۔

حسبِ عادت ناعمہ چچی نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے۔

''مجھے اور سوہا کو کافی بنا کر دے جاؤ، سویرا! ہمیں آفس کا کچھ کام کرنا ہے۔''

کبھی کبھی ثاقب اس سے کہتا اور وہ اور سوہا باہر لاؤنج میں ڈیرا ڈال لیتے۔ اندر بیڈ روم میں بچوں کے ساتھ لیٹی سویرا رات گئے تک ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سنتی رہتی۔ یہ سب تکلیف دہ تھا لیکن اسے سہنا ہی تھا۔ اس کی برداشت کی وجہ سے گھر کے ماحول میں ذرا بھی تلخی پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ بسا اوقات تو اسے لگتا تھا کہ ماحول پہلے سے بھی زیادہ خوش گوار ہو گیا ہے۔

''یہ دیکھیں آپی! جیجو آپ کے لیے کتنا پیارا سوٹ لائے ہیں۔'' کسی دن ثاقب اور سوہا دفتر سے واپسی پر شاپنگ کے لیے نکل جاتے اور لدی پھندی گھر آنے والی سوہا اس کے سامنے کوئی شاپنگ بیگ رکھ دیتی۔ خود اپنی کمائی سے بھی وہ اس کے اور بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتی تھی۔ کبھی کبھار ناعمہ چچی کے لیے بھی کوئی تحفہ ہوتا تھا۔

''آج کھانا میں بناؤں گی۔ آپ سارے ہفتے اتنا کام کرتی ہیں۔ ایک دن چھٹی آپ کا بھی حق ہے۔'' لاابالی سی سوہا اب اس کا احساس کرنے لگی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ کسی نہ کسی طور اس کی مدد کر سکے۔

''خیال سے کام کرنا، کہیں ہاتھ واتھ زخمی کر بیٹھیں تو آفس سے چھٹی ہرگز نہیں ملے گی۔'' ثاقب شوخی سے اسے ٹوکتا۔

''کیسے نہیں ملے گی؟ باس تو میری مٹھی میں ہے۔''

سوہا کے بے ساختہ جواب پر ثاقب زیرِ لب مسکراتا۔ وہ جو پہلے گھر میں بہت سنجیدہ اور لیے دیے رہتا تھا، اب اکثر ہنستا بولتا نظر آتا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنی ذات پر جو خول چڑھا رکھا تھا، وہ ٹوٹنے لگا تھا۔ اس کی یہ ہنسی اور شوخی سویرا کے لیے نہیں تھی پھر بھی وہ مطمئن رہتی۔ اس کے لیے یہ اطمینان ہر شے سے بڑھ کر تھا کہ اس کا شوہر اس گھر سے باہر کوئی دلچسپی نہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ ایک روز اس نے چپکے سے ثاقب اور سوہا کی باتیں سنیں تو اطمینان بڑھ گیا۔ الجھی الجھی سی سوہا، ثاقب سے کہہ رہی تھی۔

''یہ سب اتنا عجیب ہے کہ کبھی کبھی مجھے سویرا آپا کا سامنا کرنا مشکل لگتا ہے۔ یہ احساس کہ میں اپنی سگی بہن کے شوہر کے ساتھ انوالو ہو گئی ہوں، مجھے عجیب سی شرمندگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔''

''جو کچھ ہوا، اس میں ہماری کوئی غلطی نہیں۔ ہم بلا ارادہ ہی خود بخود اس تعلق سے بندھ گئے ہیں اور شاید محبت ایسے ہی ہوتی ہے۔ یہ جذبہ خود بخود دلوں میں پیدا ہوتا ہے سوہا! اس لیے تم خود کو مجرم سمجھ کر گلٹی فیل نہ کیا کرو۔ ویسے بھی ہم کوئی سویرا کو دھوکا دے کر رنگ رلیاں تو نہیں مناتے پھر رہے ہیں۔ ہم تو صرف ایک خوبصورت فطری جذبے سے بندھ گئے ہیں اور حدود میں رہتے ہوئے اس جذبے کو نبھا رہے ہیں۔''

ثاقب مرد تھا۔ مرد اپنی غلطیوں پر کم ہی نادم ہوتا ہے۔ وہ سوہا کو بھی کمزور دلائل سے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ایسا کب تک چلے گا؟ ابھی تو آپا نے میری خواہش پر میری شادی کا معاملہ ٹال دیا ہے لیکن سال چھ مہینے بعد دوبارہ یہ ایشو اٹھے گا تو سہی۔'' سوہا کی کوئی ایک الجھن نہیں تھی۔

''یہ تو میں بھی سوچتا ہوں کہ تم شادی ہو کر اس گھر سے چلی جاؤ گی تو میرا کیا ہو گا؟'' ثاقب نے اداسی کا اظہار کیا۔

''کہیں نہیں جا رہی میں۔ محبت کسی سے اور شادی کسی سے۔ ایسی دوغلی زندگی گزارنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔'' وہ ناراضگی سے بولی۔

''ساری زندگی کنواری رہ کر گزارو گی کیا؟'' ثاقب نے پوچھا۔

''گزار لوں گی۔ میرے لیے آپ کی محبت اور یہ احساس ہی کافی ہے کہ میں آپ کے ساتھ ایک چھت تلے موجود ہوں اور ہر روز بلا روک ٹوک آپ کو دیکھ سکتی ہوں، آپ سے باتیں کر سکتی ہوں، آپ کو آپ کی پسند کی ڈشز اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلا سکتی ہوں۔ آپ جو کپڑے پہنتے ہیں، ان پر میرے ہاتھوں کا لمس موجود ہے۔'' وہ وہی جذباتی باتیں کر رہی تھی جو اس عمر کی لڑکیاں محبت کی ابتدا میں کرتی ہیں۔ زندگی کے حقائق سے ناواقف ان لڑکیوں کو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی اپنی جذباتی تسکین کے لیے کافی محسوس ہوتی ہیں اور وہ نہیں جانتیں کہ تسکین کے اس مرحلے کے بعد نفس کے مزید تقاضے بھی سامنے آتے ہیں جن کو ماننا اور رد کرنا دونوں ہی بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔

"میں بھی بالکل اسی طرح محسوس کرتا ہوں سوہا! بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے بھی کچھ زیادہ کا طلب گار ہوں لیکن مذہبی اور معاشرتی حدود و قیود میری راہ کی رکاوٹ ہیں۔ تمہیں اپنانے کی صرف ایک راہ ہے کہ میں سویرا کو طلاق دے دوں۔" وہ مرد تھا...... وہ بھی ایسا مرد جو عورت کو برتنے کا تجربہ رکھتا تھا اس لیے اس کے اظہار میں بے باکی تھی۔ سویرا کو اس کی اس بے باکی پر تو اعتراض نہیں تھا لیکن اس کے آخری جملے پر وہ ہل کر رہ گئی تھی۔ ایسا ہی کچھ سوہا کے ساتھ بھی ہوا اور وہ دہل کر بولی۔

"ایسا کچھ سوچیے گا بھی نہیں۔ میں پہلے ہی آپا سے شرمندہ ہوں کہ ان کے شوہر کی محبت میں حصے دار بن بیٹھی ہوں۔ میری وجہ سے ان کا گھر خراب ہوا تو مرتے دم تک خود کو معاف نہیں کر سکوں گی۔" اس کے الفاظ نے سویرا کے ڈوبتے دل کو سہارا دیا۔

"تھینک یو۔ تھینک یو سوئٹ ہارٹ! آخر بہن ہو نا۔ تمہیں میرا خیال تو ہونا ہی ہے۔" دروازے کی جھری سے جھانکتی وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"مجھے بھی ابو سے کیے ہوئے وعدے کا پاس ہے۔ ساتھ ہی بچوں کی بھی فکر ہے اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی گلے پڑا یہ ڈھول بجانے پر مجبور ہوں۔" ثاقب جو [illegible] سے کہہ رہا تھا، وہ اس سے پہلے ہی واقف تھی اس لیے زیادہ تکلیف محسوس نہیں کی اور خاموشی سے بچوں کے [illegible] جا کر لیٹ گئی۔ دل ویران تھا لیکن دماغ کو اطمینان تھا کہ اس کی گھر گرہستی کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ ہے۔

☆☆☆

اس نے سلاخوں کے پار نظر آتے اس چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اس ایک نظر کو پلٹائے بغیر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھتی چلی گئی۔ اس چہرے کو دیکھنے کے لیے اسے پورے سوا چار ماہ کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ ان سوا چار ماہ کا ایک ایک دن اس نے انگلیوں پر گن کر گزارا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس ملاقاتی کو اس کے پاس آنا ہی آنا تھا کہ اس کے پاس اسے دینے کے لیے اس ایک سوال کا جواب تھا جو اس نے اس عرصے میں کسی کو بھی نہیں دیا تھا۔

"کیوں! آخر کیوں سوہا! تم نے مجھ پر ظلم کا یہ پہاڑ کیوں توڑا؟ یہ سب کرتے ہوئے تمہیں ان تین معصوم جانوں کا بھی خیال نہیں آیا جو اپنے باپ کے جانے کے بعد یتیم اور بے آسرا ہو گئے ہیں۔" سفید چادر میں لپٹی وہ میک اپ سے عاری چہرے اور آنکھوں کے نیچے پڑے حلقوں کے ساتھ ہمیشہ سے بھی زیادہ کم رو لگ رہی تھی۔

"نہیں۔ مجھے کسی پر رحم نہیں آیا کیونکہ مجھ پر جو ظلم توڑا گیا تھا اس نے مجھے اس لائق نہیں رہنے دیا تھا کہ میں زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کر سکتی۔ خود پر ظلم ڈھانے والی ذات کی اولاد کے لیے میں اپنے دل میں کیوں اور کس لیے رحم کرتی؟" وہ سپاٹ اور ہموار لہجے میں بول رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کے شعلوں کی لپک تھی۔

"کیا ثاقب نے تمہارے ساتھ [illegible]؟" سویرا نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم نے عدالتی کارروائی کے دوران ایسی کسی بات سے انکار کیا تھا اور تمہاری میڈیکل رپورٹس نے بھی ایسی کسی امکان کو مسترد کر دیا تھا۔"

"[illegible] شاطر ہوتے ہیں کہ پیچھے اپنے قدموں کے نشان نہیں چھوڑتے۔ [illegible] کو میرے جرم کا سراغ تک نہ [illegible]۔" اس کے لہجے میں آزردگی در آئی...

"تم کیسی ابھی ابھی باتیں کر رہی ہو سوہا! کیا واقعی ثاقب نے تمہارے ساتھ [illegible] کیا تھا؟ کوئی بہت بری حرکت؟" سویرا ایک بار پھر الجھ گئی۔ ابھی ہوتی تو وہ پچھلے سوا چار ماہ سے [illegible] سوال کا جواب حاصل کر لینے کے لیے [illegible] ختم ہونے کے بعد بھی ملاقات کا وقت [illegible] چند دن انتظار کرنا پڑا تھا اور وہ اس سوال کا جواب لیے بغیر وہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی کہ کیوں اس کی بہن نے اس [illegible] اس کا سہاگ اور بچوں سے ان کا باپ چھین لیا۔

"وہ کچھ کر جاتا تو وہ اس ظلم سے کم ہی ہوتا جو تم نے سگی بہن ہو کر میرے ساتھ کیا۔" آخر کار وہ پھٹ پڑی۔

"میں نے [illegible] میں نے کیا کیا تمہارے ساتھ؟"

سویرا نے سینے پر ہاتھ رکھ کر حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"تم نے [illegible] ساتھ جو کیا اسے یاد کرنے کے لیے [illegible] سوا چار ماہ پہلے کے اس پیر کے دن پر واپس آؤ جب تمہارے خیال میں میرے، ثاقب اور بچوں کے گھر سے چلے جانے کے بعد گھر میں ایسا کوئی فرد موجود نہیں تھا جو تمہارے وہ بھیانک الفاظ سن سکتا۔ بیماری اور تکلیف سے نڈھال اپنے کمرے میں پڑی رہنے والی ناعمہ چچی کا ہونا نہ ہونا تو برابر ہی تھا نا؟" چبا چبا کر ادا کیے گئے سوہا کے الفاظ نے سویرا پر ایسا اثر کیا کہ لگا وہ لفظ نہیں، سیسے کی گولیاں ہیں جنہوں نے اس کے وجود میں اتر کر اس کے جسم کا سارا خون بہا ڈالا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں خطرناک حد

تک پیلی پڑ گئی تھی۔
"اس روز ایک ضروری فائل گھر میں رہ گئی تھی۔ ثاقب کے کلائنٹ کے ساتھ مصروف ہونے کی وجہ سے میں آفس کی گاڑی میں گھر آئی اور اپنے پاس موجود چابی سے لاک کھول کر اندر آ گئی۔ فائل اٹھا کر لے جاتے ہوئے میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں کہ آج کا لنچ ہم ایک چائنیز ریسٹورنٹ سے لے کر آئیں گے اس لیے تم کچھ نہ بنانا۔ میں اس ارادے سے تمہارے کمرے کے دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ اندر سے آتی تمہاری آواز پر بلا ارادہ رک گئی۔ تم اپنی سہیلی حمیرا سے کہہ رہی تھیں......"
سوہا نے اسے شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے ذرا سا توقف کیا لیکن سویرا کو اس کے بولنے کا انتظار تھا بھی نہیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے حمیرا سے کیا کہا تھا۔ اپنے کہے ان الفاظ نے اس کے قدموں کو لرزا دیا اور خود کو گرنے سے بچانے کے لیے بے اختیار ہی اس نے ان سلاخوں کو تھاما جن کے پیچھے اس کی بہن اس کے کیے کی سزا بھگت رہی تھی۔ سلاخیں پکڑنے سے وہ گرنے سے تو بچ گئی لیکن اپنے ہی الفاظ کی گونج سے نہ بچ سکی۔ اس روز اس نے حمیرا سے کہا تھا۔
"تم نے مجھے بروقت ہوشیار کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا حمیرا! واقعی حالات ایسے تھے کہ ثاقب باہر کسی کا شکار بن سکتا تھا۔ میری ذات میں اتنا دم نہیں تھا کہ اسے شکار ہونے سے بچا سکوں اس لیے میں نے خود اسے شکار کرنے کا فیصلہ کیا اور ایسا چارا ڈالا کہ مچھلی کے پاس کانٹا نگلنے کے سوا کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اب وہ کانٹے میں پھنسا تڑپتا مچلتا ہے لیکن خود کو آزاد نہیں کروا پاتا۔ سوہا میری سگی بہن ہے اور مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہے کہ خود بکھر جائے گی لیکن میرا گھر نہیں بکھرنے دے گی۔ سوہا کی صورت میں میں نے وہ ضمانت حاصل کر لی ہے جو ثاقب کو کبھی اس گھر سے باہر نہیں دیکھنے دے گی جس گھر کی میں ثاقب کی بیوی کی حیثیت سے مالکن ہوں۔ ثاقب سوہا سے جتنی چاہے محبت کر لے، اس کا مقام بہر حال میرے بعد ہی ہوگا۔"
"تمہیں ایسی بھیانک حرکت کرتے ہوئے ذرا خیال نہیں آیا کہ تم یہ سب اپنی سگی بہن کے ساتھ کر رہی ہو۔ اس بہن کے ساتھ جس نے ماں کو کھونے کے بعد خود سے تیرہ سال بڑی بہن کو ہی اپنی ماں سمجھ لیا تھا اور جو اندھا دھند تمہاری ہر بات، ہر مشورے پر عمل کرتی تھی۔ اس لیے جب تم نے اسے اپنے شوہر کی طرف راغب کرنا شروع کیا تو وہ بنا کچھ سوچے سمجھے تمہارے جال میں پھنستی چلی گئی اور اسے یہ احساس تک نہیں ہوا کہ اس کی حیثیت محض چارے کی ہے۔ الٹا میں ہمیشہ تم سے شرمندہ رہی کہ میں تمہیں دھوکا دے رہی ہوں۔" سویرا کی حالت گواہ تھی کہ اسے اپنا ایک ایک لفظ یاد ہے اس لیے اس نے ان الفاظ کو دہرانے کے بجائے اسے لتاڑنا شروع کر دیا۔
"میں مجبور تھی سوہا! مجھے اپنا گھر بچانے کے لیے......" سویرا نے خشک حلق کے ساتھ وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی بات پوری نہ کر سکی۔
"تم مجبور تھیں تو میں بھی مجبور تھی کہ اپنے ساتھ اتنا بڑا ظلم کرنے والی عورت کو معاف نہ کروں۔" وہ جو اس کے ساتھ آپ جناب سے گفتگو کرتی تھی اور بڑے پیار سے آپا کہہ کر پکارتی تھی، آج اس کے لیے تم اور عورت جیسے الفاظ ادا کر کے اپنی بھرپور نفرت اور بیگانگی کا اظہار کر رہی تھی۔
"میں مجرم تھی تو مجھے مارا ہوتا۔ ثاقب کو کیوں قتل کر دیا؟" سویرا سسکنے لگی۔
"تمہیں مار دیتی تو یہ کوئی سزا تو نہیں ہوتی۔ سزا تو یہ ہے کہ جس شوہر کے چھن جانے کے ڈر سے تم نے اپنی سگی بہن پر ظلم کیا، اب ساری زندگی اس کے بغیر گزارو اور پرتعیش زندگی چھوڑ کر اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ساری عمر محنت مشقت کرو۔ یہی دو ڈر تھے نا تمہیں؟ شوہر کا کھونا اور معاشی عدم تحفظ۔ اب تم اپنی ان دونوں سزاؤں کے ساتھ جیو۔ میں بھی جیل کی ان سلاخوں کے پیچھے اپنے اس جرم کی سزا کاٹوں گی کہ تمہاری چال کو سمجھنے کے بجائے میں نے اپنے قدموں کو ڈگمگانے کیوں دیا؟" وہ بولتے بولتے اپنا رخ موڑ گئی۔ سویرا نے اس کی پشت پر ایک شرمندہ اور حسرت ناک نظر ڈالی۔ اسے معلوم تھا کہ اس سے رخ موڑ کر کھڑی ہو جانے والی اس کی بہن اب کبھی پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھے گی، چاہے وہ قیامت کے دن تک یونہی سلاخیں پکڑے اس کی نظرِ کرم کی منتظر کھڑی رہ جائے۔ احساسِ شکست اور ندامت سے بوجھل قدموں سے پلٹتے ہوئے اس کی رفتار بہت سست تھی اور دماغ ایسی کسی بھی تدبیر کو سوچنے سے قاصر تھا جو وقت کو واپس پلٹا کر اسے اس کی غلطی کی تلافی کرنے کا موقع دے سکے۔

⌘⌘⌘

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

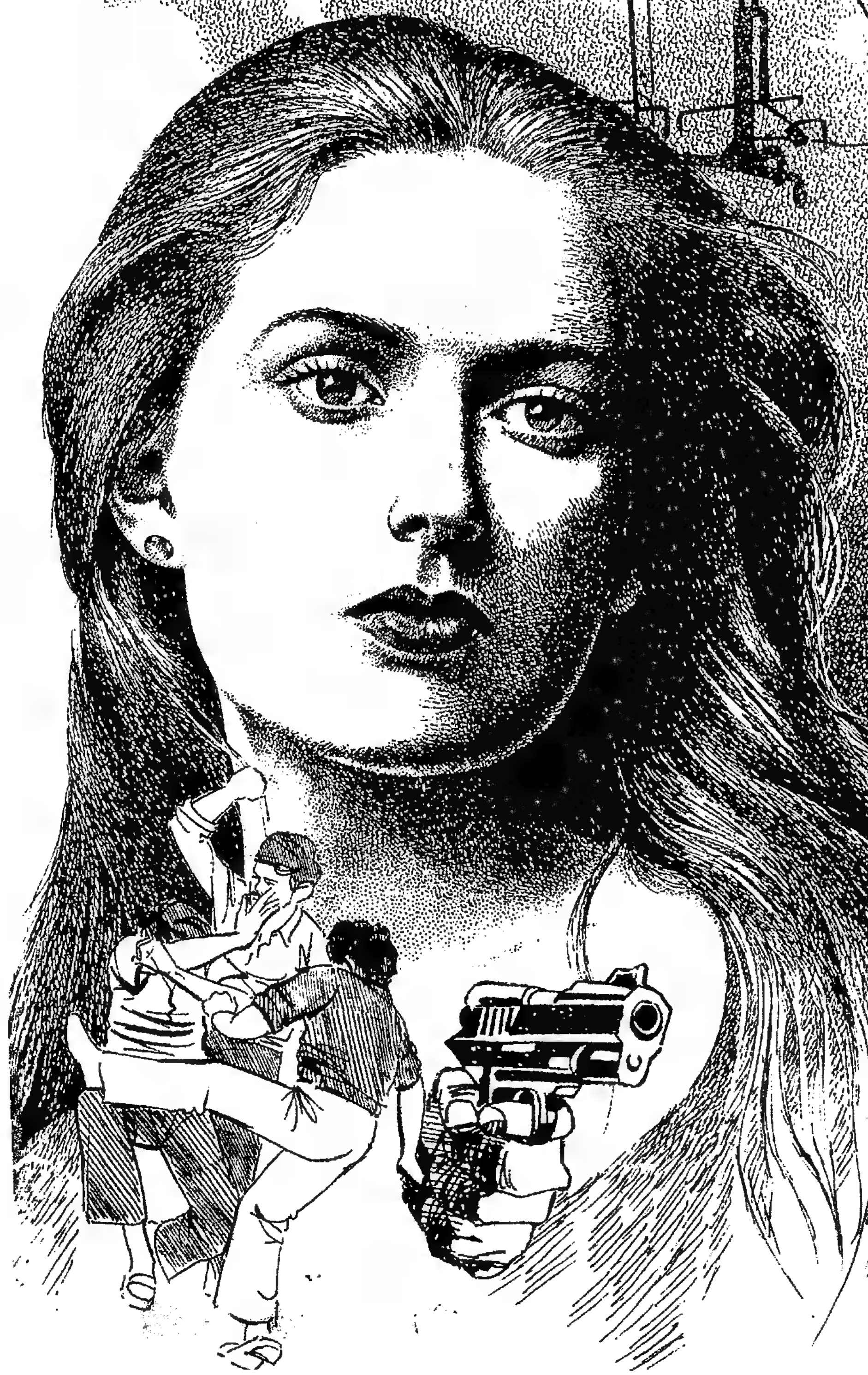
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

شہ زور

اسما قادری

قسط: 9





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کردیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھرلیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب رول نکلوا کر تصویریں دھلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کررہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ خاموش بیٹھنے کے بجائے فوراً کیس کے انویسٹی گیشن افسر سے رابطہ کرکے اپنے شک کا اظہار کرتی ہے اور اس واقعے سے بھی آگاہ کرتی ہے جو معاذ اور کامران کے درمیان دشمنی کا باعث بنا۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کرکے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ بشریٰ کو بہت مایوسی ہوتی ہے لیکن وہ اپنے طور پر جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کرتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کردیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے باذل کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کرکے اسے ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

گاڑی آندھی اور طوفان کی طرح دوڑ رہی تھی پھر بھی پچھلی سیٹ پر براجمان عالم شاہ کو لگ رہا تھا کہ سفر کسی طور کٹنے کا نام نہیں لے رہا۔ معظم شاہ کو گولی لگنے کی خبر معمولی نہیں تھی۔ معظم کے فون پر اس کی کال ریسیو کرنے والا اسے زیادہ کچھ بتا بھی نہیں پایا تھا۔ وہ شخص خود زخمی تھا اور اس کے سوالات کے جواب میں ڈوبتی ہوئی آواز میں صرف اتنا بتا سکا تھا کہ لطیف سومرو کے ہاں سے واپسی میں اچانک انہیں گھیر کر ان پر فائرنگ کر دی گئی تھی۔ اس اچانک حملے میں معظم شاہ سمیت گارڈ بھی زخمی ہو گئے تھے اس لیے حملہ آوروں کو کامیابی سے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ اتنی بات بتانے کے بعد وہ شخص شاید بے ہوش ہو گیا تھا کیونکہ اس کے بعد عالم شاہ کو اپنی کسی پکار کا جواب نہیں ملا تھا۔ اس نے عالم وحشت میں اپنے ساتھ اسپتال جانے والے سرمد کو فوری طور پر گاؤں چلنے کا حکم دیا تھا اور پھر خود فون پر مصروف ہو گیا تھا۔ صداقت شاہ اور قربان شاہ سمیت اس نے ہر قابلِ ذکر شخص کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے معظم شاہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ اس کی تلاش کا کام شروع کروا دیا تھا۔ اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور صداقت شاہ نے خود اسے فون کر کے اطلاع دی تھی کہ معظم اور اس کے گارڈز کو زخمی حالت میں تلاش کر لیا گیا ہے اور تمام زخمی اس وقت اسپتال میں موجود ہیں۔ عالم شاہ نے ان سے تفصیل جاننا چاہی تھی کہ معظم کو کتنی گولیاں اور کہاں کہاں لگی ہیں، نیز یہ کہ اس کی حالت کیسی ہے لیکن صداقت شاہ نے اسے کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا اور یہی کہا تھا کہ معظم اسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر ابھی اسے دیکھ رہے ہیں اور حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ عالم شاہ نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ معظم شاہ کو ضروری طبی امداد دلوا کر شہر منتقل کر دیا جائے تاکہ وہاں اس کا زیادہ بہتر علاج ہو سکے لیکن صداقت شاہ نے یہ بات بھی ٹال دی تھی اور کہا تھا کہ وہ پہلے خود گاؤں پہنچ جائے پھر یہ سارے معاملات بھی طے کر لیے جائیں گے۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ خود بھی قربان شاہ کی حویلی پہنچ چکے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ قربان شاہ کو حوصلہ و ہمت دلا سکیں۔ اس گفتگو کے دوران ہی کہیں عالم شاہ نے انہیں سجل کے ہاں بیٹے کی پیدائش کی اطلاع بھی دے دی تھی۔ اس اطلاع کو سن کر وہ پل بھر کے لیے چپ ہو گئے تھے اور پھر آہستہ سے بولے تھے۔

''اللہ سائیں نصیب اچھے کرے اور میری بیٹی کا سہارا بنائے۔'' ان کا بجھا ہوا اور عجیب رکا رکا سا انداز عالم شاہ کے اندر گہرا اضطراب پیدا کر رہا تھا۔ دل میں واہمے سر اٹھا رہے تھے اور اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کسی طرح شہر سے گاؤں تک کا فاصلہ پلک جھپکتے میں طے ہو جائے۔ اس کا وفادار ملازم سرمد اس کی اس کیفیت کو محسوس کر رہا تھا اور حتی الامکان تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا لیکن بہرحال طویل فاصلے کو طے ہونے میں وقت تو لگنا ہی تھا۔ ان کی گاڑی گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی تو پو پھٹنے کا وقت تھا۔ گاؤں کے لوگوں کی سحر خیزی کوئی تعجب کی بات نہیں تھی لیکن مخصوص راستوں سے گزر کر قربان شاہ کی حویلی کی طرف جاتے ہوئے اسے ایسا لگا کہ آج رات شاید سارا گاؤں ہی جاگتا رہا ہے اور ہر شخص اپنے گھر سے باہر ہے۔ گاڑی حویلی تک پہنچی تو اسے لوگوں کا ایک جمِ غفیر نظر آیا۔ وہ سب لوگ کیا معظم شاہ کے زخمی ہونے کی اطلاع سن کر جمع ہوئے تھے؟ اس نے قدرے حیرت سے سوچا اور جواب میں اس کے اندر سے جو سوچ ابھری اس نے ہلا کر رکھ دیا۔

''نہیں...... مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ ادا معظم صرف زخمی ہیں۔ میں ڈاکٹر سے بات کر کے انہیں فوراً شہر لے جاؤں گا۔'' اس نے خود ہی اپنے آپ کو ڈپٹ دیا لیکن گاڑی حویلی کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بین کی آوازیں تھیں جنہوں نے اس کے دل کو بری طرح بھینچ لیا تھا۔ گاڑی رکی تو اس کے استقبال کے لیے دوڑ کر آنے والا ملازم اس کی شکل دیکھتے ہی دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

''کیا نحوست پھیلا رکھی ہے۔ خاموش ہو جاؤ۔ کچھ نہیں ہونے والا ادا معظم کو...... ٹھیک ہو جائیں گے وہ۔'' وہ ملازم پر اتنی زور سے چلّایا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

''سائیں!'' سب کچھ سمجھ جانے والے سرمد نے اسے یک لفظی دلاسا دینے کی کوشش کی اور پھر فوراً ہی اندر سے برآمد ہوتے صداقت شاہ کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''بابا سائیں۔'' وہ یوں ان کی طرف لپکا جیسے خوفزدہ بچہ باپ کی پناہ لینا چاہتا ہو۔

''صبر عالم شاہ...... حوصلے سے کام لو۔ یہ وقت اپنے دکھ رونے کا نہیں، ادا قربان شاہ کی ہمت بندھانے کا ہے۔'' صداقت شاہ کی اپنی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر زلزلے کے سے اثرات تھے پھر بھی انہوں نے ٹھہرے ہوئے گمبھیر لہجے میں بیٹے کو نصیحت کی۔ اس نصیحت

کے بعد اس کے دل میں جو موہوم سی امید باقی رہ گئی تھی، اس نے بھی دم توڑ دیا اور بے ساختہ ہی لاڈلی بہن کا چہرہ ذہن میں ابھرا۔ ابھی چند گھنٹے قبل ہی تو اس نے شدید تکلیف سے گزر کر دنیا کی سب سے بڑی نعمت پانے کی خوشی حاصل کی تھی اور ستم تھا کہ اس خوشی کے فوراً بعد وہ بیوگی کے صدمے میں مبتلا کر دی گئی تھی۔

''کچھ معلوم ہوا کہ یہ سب کیسے ہوا؟'' غم کے ساتھ ہی غصے نے یورش کی تو اس نے دہکتے ہوئے لہجے میں صداقت شاہ سے دریافت کیا۔

''ابھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ تمہاری کال ملتے ہی ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی گئی تھی۔ گاؤں سے بہت دور راستے کے ویران حصے میں گاڑی اور سوار مل گئے۔ پوری گاڑی چھلنی ہو چکی تھی اور اندر موجود افراد میں سے صرف جمن تھا جس کے سینے میں سانس باقی تھی۔ جمن اور لاشوں کو فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں ڈاکٹر نے معظم اور اس کے دو گارڈز کی موت کی تصدیق کر دی اور جمن کے بارے میں بتایا کہ یوں تو گولیاں زیادہ نازک مقامات پر نہیں لگی ہیں لیکن خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی حالت نازک ہے۔ جمن اب بھی اسپتال میں ہے۔ اس کے جسم میں لگنے والی گولیاں نکالی جا چکی ہیں اور اسے خون وغیرہ لگایا گیا ہے۔ اب آگے دیکھو کہ ڈاکٹر کیا بولتا ہے۔ جمن کی زندگی بچ گئی تو وہ ہمیں قاتلوں کے بارے میں کچھ بتا سکے گا۔ فی الحال تو مقامی پولیس اپنے حساب سے کارروائی کر رہی ہے۔'' صداقت شاہ نے اسے اپنے ساتھ اندر لے جاتے ہوئے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اندر پہنچتے ہی اس کا قربان شاہ سے سامنا ہو گیا۔ ایک رات میں ہی وہ کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ جوان بیٹے کی موت نے انہیں بالکل نڈھال کر دیا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ ایک رات میں ہی وہ عمر کے دس بیس سال طے کر چکے ہیں۔ عالم شاہ نے انہیں سینے سے لگایا تو وہ کسی بچے کی طرح ہچکیوں سے رونے لگے۔ وہ جو اپنی خاندانی آن بان کا بہت خیال رکھتے تھے، اس وقت سب کچھ بھول چکے تھے اور کچھ یاد تھا تو جوان بیٹے کی جدائی کا غم۔

''میرا سب کچھ لٹ گیا عالم پٹ! میرے دونوں ہاتھ خالی ہو گئے۔'' ہچکیوں کے درمیان ہی انہوں نے جس انداز میں یہ الفاظ ادا کیے، عالم کو لگا کہ اس کا دل کٹ رہا ہو۔ ایک باپ کے لیے بھلا اس سے بڑا غم ہو بھی کیا سکتا تھا کہ اس کا جوان ہنستا کھیلتا بیٹا موت نے جھپٹ لیا تھا۔

''حوصلے سے کام لیں ماموں سائیں! ہم حوصلے سے کام لیں گے تب ہی تو ادا معظم کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچا سکیں گے۔ اور ہاں...... اب آپ بالکل بھی خالی ہاتھ نہیں رہے ہیں۔ ادا معظم کا بیٹا آپ کا بازو بننے کے لیے دنیا میں آ چکا ہے۔'' اس نے انہیں حوصلہ دینے کے ساتھ ساتھ اطلاع بھی دی اور پھر خود ہی ملول ہو گیا۔ اتنی بڑی خوشخبری اس طرح سنانے کا کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر یہ عام حالات ہوتے تو اس وقت حویلی بقعۂ نور بنی ہوتی۔ وہ ڈھول تاشوں اور مٹھائی کے ٹوکروں کے ساتھ یہاں آتا۔ حویلی کے اندر باہر پرسہ دینے کے لیے آنے والوں کے بجائے بدھائیاں دینے آنے والوں کا ہجوم لگا ہوتا۔ کڑوی روٹی کے بجائے دعوت اور لنگر کا انتظام ہو رہا ہوتا۔

''معظم کا بیٹا......؟'' قربان شاہ اس اطلاع پر گنگ ہو گئے۔

''جی ادا معظم کا بیٹا...... آپ کا بازو۔'' عالم شاہ نے خود پر کڑا ضبط کرتے ہوئے اس اطلاع کے ذریعے گویا ان کے اندر ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔

''کتنا بدنصیب تھا میرا پٹ کہ اپنے بیٹے کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا۔'' قربان شاہ ایک بار پھر زار زار رونے لگے۔

''بس کرو قربان شاہ۔ بیٹے کا سارا غم آنسوؤں میں بہا دو گے تو اس کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کی آگ سینے میں سرد پڑ جائے گی۔'' اب تک ان کے قریب خاموشی سے کھڑے صداقت شاہ نے پُرتپش لہجے میں انہیں ٹوکا تو ان کے ساتھ ساتھ عالم بھی چونک گیا۔

''انتقام...... انتقام تو لینا ہوگا لیکن کس سے؟ کون ہے ادا معظم کا قاتل؟''

''قاتل جو بھی ہے وہ بچ نہیں سکے گا۔ ہم اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ لائیں گے۔'' صداقت شاہ کی آواز کی گونج اتنی بلند تھی کہ تعزیت کے لیے آنے والے لطیف سومرو نے بھی ان کا ایک ایک لفظ سنا۔ پل بھر کے لیے اس کے چہرے پر سایہ سا دوڑ گیا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا اور سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''بہت دکھ ہوا سائیں، معظم شاہ کے بارے میں سن کر۔ مجھے صبح اٹھتے ہی یہ خبر سننے کو ملی تو میں ناشتا کیے بغیر سیدھا ادھر دوڑا آیا۔ رات ہی تو میری ملاقات ہوئی تھی معظم شاہ سے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے پڑھے

لکھے اور مہذب نوجوان سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔'' ان تینوں سے باری باری معانقہ کرتے ہوئے وہ مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اسے ان تینوں ہی کے لیے دیے انداز سے کوئی غرض نہیں تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ یہاں بس اپنی سنانے آیا ہے اور سنا کر ہی واپس جائے گا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''کل میں پہلی بار معظم شاہ سے ملا اور مل کر مجھے افسوس ہوا کہ اتنے شاندار نوجوان سے میری پہلے کیوں ملاقات نہیں ہوسکی۔ وہ بہت سمجھ داری کی باتیں کر رہا تھا۔ جس معاملے پر آپ میری بات نہیں سمجھ رہے تھے، اس نے فوراً سمجھ لی تھی اور مان لیا تھا کہ قانوناً میں درست ہوں اور میرا موقف ایک اصولی موقف ہے۔ معظم شاہ کی اس کشادہ دلی نے مجھے اتنا متاثر کیا تھا کہ میں نے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ صرف اس کی خاطر میں اس معاملے پر نئے سرے سے غور کروں گا اور امید ہے کہ ایسا کوئی حل نکل آئے گا جس سے دونوں فریقین ہی مکمل طور پر مطمئن ہوجائیں گے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ذرا مجھے فرصت مل جائے تو میں جلد اس کے بعد آپ کے ساتھ ایک میٹنگ رکھوں گا لیکن افسوس کہ اس کی نوبت ہی نہیں آسکی اور میں اتنے شاندار جوان سے دوسری ملاقات کرنے سے ہمیشہ کے لیے محروم رہ گیا۔''

وہ بڑے نرم اور میٹھے لہجے میں بول رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں چھپی منافقت ان میں سے کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ ایک مانا ہوا مکار شخص تھا اور قربان شاہ کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس نے بہت چالاکی سے ان کی قیمتی زمین ہتھیالی تھی۔ زمین ہتھیانے کے بعد وہ معظم شاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود اس سے ملاقات کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا اور کل بڑی مشکل سے ملاقات کا وقت دیا تھا اور اس ملاقات سے واپسی میں ہی معظم شاہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت وہی ان کی نظروں میں سب سے مشکوک شخص تھا جو ان کا بڑا خیر خواہ اور ہمدرد بنا باتیں بنا رہا تھا۔ قربان شاہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس شخص کو دھکے دے کر اپنی حویلی سے باہر نکال دیں لیکن ابھی حتمی طور پر یہ طے نہیں ہوا تھا کہ معظم شاہ کے قتل میں اسی کا ہاتھ ہے۔ خاندانی وضع داری بھی انہیں گھر آئے شخص سے بدسلوکی کی اجازت نہیں دے رہی تھی چنانچہ کچھ اور بس نہ چلا تو یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ واقعی ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ کھڑے ہوتے ہی ان کے قدم بری طرح ڈگمگانے لگے تھے۔ عالم شاہ انہیں سہارا نہ دیتا تو وہ زمین پر گر جاتے۔

''عالم پٹ! اپنے ماموں کو ان کے کمرے تک لے جاؤ اور ڈاکٹر سے کہو کہ انہیں دیکھے۔ ڈاکٹر یہیں حویلی میں موجود ہوگا۔ میں نے واقعے کے فوراً بعد حیدر آباد سے ایمرجنسی میں چار ڈاکٹرز کو بلوالیا تھا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر مسلسل حویلی میں ڈیوٹی پر ہیں۔'' صداقت شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بیٹے کو ہدایات جاری کیں۔ وہ اس کا لحہ بہ لحہ غصے سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھ رہے تھے اور اب انہیں اسے یہاں سے ہٹانے کا مناسب موقع مل گیا تھا۔

''ان حالات میں آپ جیسے تجربہ کار شخص کی یہاں موجودگی غنیمت ہے۔ آپ کے آگے میری کچھ کہنے کی بساط کہاں، پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ہمارا آپس میں ہمسائیگی کا بھی رشتہ ہے اور میں اس علاقے کا نمائندہ بھی ہوں تو اس حق سے آپ جب اور جس معاملے میں چاہیں مجھ سے مدد طلب کرسکتے ہیں۔ میں آپ کی ایک پکار پر آدھی رات کو بھی خدمت کے لیے تیار رہوں گا۔'' بظاہر بہت نرم لہجے میں بولتے ہوئے اپنے علاقے کا نمائندہ ہونے کی بات جتا کر اس نے صداقت شاہ کو چرکا لگانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی متانت میں کوئی فرق نہیں آیا اور سنجیدگی سے بولے۔

''آپ کی پیشکش کا شکریہ سومرو صاحب! میں اس پیشکش کو یاد رکھوں گا۔ ویسے تو ان حالات میں آپ کی آمد ہی بہت بڑی بات ہے۔ آج کل یقیناً آپ بہت مصروف ہوں گے۔ آپ کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے کہ آپ رات پوری نیند نہیں لے سکے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اب آپ گھر جا کر آرام کریں۔ ہمیں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آپ کو ضرور زحمت دیں گے۔''

صداقت شاہ کے الفاظ پر لطیف سومرو کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا۔ انہوں نے بہت مہذب لہجے میں اسے وہاں سے دفع ہوجانے کا حکم دے دیا تھا اور وہ اپنی جگہ بل کھانے کے سوا کچھ نہیں کرسکا تھا۔ صداقت شاہ کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی بات کہہ کر اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور اسی وقت اندر داخل ہونے والے علاقے کے ایک دوسرے معزز زمیندار کی

طرف متوجہ ہوکر اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اپنی بے عزتی پر دل ہی دل میں بلبلاتا لطیف سومرو ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھ گیا حالانکہ اصولاً اسے خود بھی آنے والے شخص سے ملنا چاہیے تھا۔ اسے یوں وہاں سے جاتا دیکھ کر جہاں آنے والے زمیندار کے چہرے پر حیرت کے رنگ دوڑے، وہیں صداقت شاہ کے جلتے بلتے دل پر بھی اطمینان کے چند چھینٹے پڑ گئے۔ انہوں نے لطیف سومرو سے وہی سلوک کیا تھا جس کا وہ حقدار تھا۔

☆☆☆

''مڑ جاؤ۔'' وقاص کو رکنے کا حکم دینے والی آواز نے اسے دوسرا حکم دیا تو وہ اس حکم کی تعمیل میں آہستگی سے آواز کی سمت مڑ گیا۔ اس دوران اس کی گردن پر رکھا گیا ہتھیار ہٹا لیا گیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ہتھیار کا رخ اب بھی اسی کی طرف ہوگا اس لیے مڑتے ہوئے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مڑنے کے بعد اس نے جس شخص کو اپنے اوپر مشین پسٹل تانے کھڑا دیکھا، اس کی عمر تقریباً پینتیس سال تھی اور اس نے بھی سیکیورٹی گارڈز والی ویسی ہی یونیفارم پہن رکھی تھی جیسی یونیفارم اس نے باربی نامی رقاصہ کو اپنے حفاظتی حصار میں لے جانے والے گارڈز کے جسموں پر دیکھی تھی۔

''آپ یہاں کیا کررہے ہیں مسٹر؟'' گارڈ نے اس کے عمدہ لباس، قیمتی جوتوں، مہنگی رسٹ واچ اور اسٹائلش ہیرکٹ کا ایک نظر میں جائزہ لیا اور ہاتھ میں مشین پسٹل کی موجودگی کے باوجود خاصے مہذبانہ لہجے میں دریافت کیا۔

''کیا اس طرف آنا منع ہے؟'' وقاص کو کوئی جواب نہ سوجھا تو منہ بناتے ہوئے الٹا خود ہی بے پروائی سے سوال کر ڈالا۔

''جی ہاں۔ اس فلور پر بہت خاص خاص لوگوں کو کمرے الاٹ کیے جاتے ہیں اور ان افراد کے علاوہ ان کے صرف ان مہمانوں کو یہاں آنے کی اجازت دی جاتی ہے جنہیں خود انہوں نے بلایا ہو۔ ایسے افراد کو نیچے سے ہی کلیئرنس دی جاتی ہے اور ان کی آمد سے قبل یہاں اطلاع کردی جاتی ہے۔ آپ کے سلسلے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں دی گئی جس کا مطلب ہے کہ آپ ایک غیر متعلقہ شخص ہیں اور سیکیورٹی کے حوالے سے یہ ایک رسک ہے۔ اس لیے میری ڈیوٹی ہے کہ میں آپ کو روکوں اور آپ کی یہاں آمد کی وجہ معلوم کروں۔'' اس کے امیرانہ حلیے کی وجہ سے گارڈ اس سے مہذب لب و لہجے میں بات ضرور کررہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں بھی تھیں۔

''اوہ نو۔ اگر تم مجھ پر شک کررہے ہو تو یہ تمہارے اپنے ہوٹل کی ریپوٹیشن کے لیے کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ہوٹل کے ففتھ فلور پر کسی مشکوک شخص کا پایا جانا ہوٹل کے سیکیورٹی سسٹم پر بہت بڑا سوالیہ نشان ڈال دے گا۔''

''کیا تم کوئی جرنلسٹ ہو؟'' سیکیورٹی گارڈ الجھا۔

''میرے خیال میں ہم تمہارے آفس میں بیٹھ کر بات کرلیتے ہیں۔'' وہ کن انکھیوں سے دیکھ چکا تھا کہ طویل کوریڈور کے اختتام پر آخری کمرے کے دروازے پر باربی کو چھوڑنے کے بعد دونوں گارڈز واپس پلٹ چکے ہیں۔ وہ ان کا اور خصوصاً اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے پیچھے یہاں تک آیا تھا اس لیے فوراً ایک پیشکش کی جسے ذرا سے تذبذب کے بعد گارڈ نے منظور کرلیا اور اسے لے کر ایک دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا پسٹل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اب بھی وقاص کی طرف سے محتاط دکھائی دے رہا تھا۔ وقاص نے اسے ریلیکس کرنے کے لیے اپنے انداز میں مزید بے پروائی اور بے فکری نمایاں کردی اور یوں نظر آنے لگا جیسے وہ باقاعدہ دعوت ملنے پر وہاں کے جائزے کے لیے آیا ہو۔ گارڈ اسے جس چھوٹے سے سیکیورٹی روم میں لے کر آیا وہاں پہلے ہی سے ایک اور شخص گارڈ ہی کی یونیفارم میں موجود تھا اور ایک کرسی پر بیٹھا دیوار پر نصب اسکرین پر توجہ مبذول کیے ہوئے تھا۔ اسکرین پر ایک نظر ڈالتے ہی وقاص کو اندازہ ہوگیا کہ یہ سیکیورٹی روم صرف ففتھ فلور کی سیکیورٹی کے لیے ہی کام کررہا ہے اور اسکرین پر نظر آنے والے مختلف مناظر اسی فلور کے مختلف حصوں کے ہیں۔ اس نے اپنے مطلوبہ گارڈ اور اس کے ساتھی کو لفٹ میں سوار ہوکر وہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تو اپنی جگہ ہاتھ مسل کررہ گیا۔

''جی تو اب آپ بتائیے کہ آپ کون ہیں اور آپ کی یہاں موجودگی کا کیا سبب ہے؟'' وہ جائزے میں ہی مصروف تھا کہ اسے ساتھ لانے والے گارڈ نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''اوہ — سوری! میں ذرا آپ کے سیکیورٹی سسٹم کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ تو بہت اچھا اور جدید سیٹ اپ ہے۔ آپ یہاں بیٹھے بیٹھے آرام سے پورے فلور پر نظر رکھ سکتے ہیں۔ جدید سسٹم کے ساتھ کام کرنے کا یہ فائدہ ہے کہ زیادہ لوگوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میرے خیال میں اس فلور

کی سیکیورٹی کے لیے تو آپ دو افراد ہی کافی ہوتے ہوں گے؟'' اس نے اپنے لہجے میں ستائش کو نمایاں کیا۔

''ایسا ہی ہے۔ ایک وقت میں یہاں صرف دو گارڈ ہی موجود ہوتے ہیں۔ دو کے علاوہ یہاں کبھی تیسرے کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن کبھی ضرورت ہو تو ایمرجنسی میں ہم مزید گارڈز کو بھی کال کر سکتے ہیں۔''

''گڈ! اچھا سسٹم ہے۔'' اس نے یوں تعریف کی جیسے اس کی یہاں موجودگی کا یہی مقصد ہو۔

''پلیز اب آپ بھی اپنے بارے میں کچھ بتا دیں ورنہ میں آپ کے ساتھ سختی پر مجبور ہو جاؤں گا۔'' گارڈ کا لہجہ ایک بار پھر بدلنے لگا۔ اس کا ساتھی ان مذاکرات میں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا اور بظاہر مسلسل اسکرین کی طرف ہی متوجہ تھا لیکن وقاص کو اندازہ تھا کہ وہ ان کی گفتگو پر کان دھرے بیٹھا ہے۔

''میں یہاں اپنے ایک انکل کے ساتھ دعوت میں آیا ہوں۔ ڈنر کے دوران میں ایک کال سننے کے لیے ڈائننگ ہال سے باہر آیا تو میری نظر اپنے ایک ایسے شناسا پر پڑی جن سے میں بہت دنوں سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن میرا ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ دوسری طرف میں جس کال پر مصروف تھا، وہ بھی بہت اہم تھی اور میں اسے ڈراپ نہیں کر سکتا تھا۔ جلد از جلد بات سمیٹنے کی کوشش کے باوجود وہ صاحب مجھ سے خاصی دور چلے گئے اور جب میں کال نمٹا کر انہیں آواز دینے ہی والا تھا تو وہ عین اسی وقت لفٹ میں سوار ہو کر اوپر چلے گئے۔ میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ لفٹ پانچویں منزل پر گئی ہے اسی لیے میں خود بھی ان کی تلاش میں اس منزل پر آ پہنچا اور یہاں آپ نے مجھے دھر لیا۔'' وہ فوری طور پر جو کہانی گھڑ سکتا تھا، گھڑ کر سنا دی۔

''آپ کے ان شناسا کا نام کیا ہے؟'' سیکیورٹی گارڈ نے تحمل سے پوچھا۔

''داؤد...... داؤد خان۔'' اس نے ایک نام لیا۔

''اس فلور پر اس نام کے کوئی صاحب نہیں ٹھہرے ہوئے۔'' گارڈ نے سپاٹ لہجے میں اسے آگاہ کیا۔

''ممکن ہے مجھ سے فلور کا نمبر دیکھنے میں غلطی ہوئی ہو یا خان صاحب کسی اور نام سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ وہ ذرا شوقین مزاج آدمی ہیں اور اپنے شوق کو بیوی بچوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے نام بدل کر بھی ہوٹلوں میں قیام کر لیتے ہیں۔'' اس نے آنکھ کا ایک کونا دبایا اور لہجے کو معنی خیز بنا کر گارڈ کو ایک اور جھانسا دینے کی کوشش کی۔

''نہیں...... اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں اوریجنل این آئی سی چیک کیے بغیر کسی کو کمرا نہیں دیا جاتا۔ بہتر ہوگا کہ آپ مجھے اپنی یہاں موجودگی کا کوئی معقول جواز بتائیں ورنہ میں اپنے ہیڈ کو یہ معاملہ ٹرانسفر کر دوں گا۔'' سیکیورٹی گارڈ نے اس کی ساری داستان کو یکسر مسترد کر دیا اور سرد لہجے میں اس سے بولا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''

وقاص نے اپنا لہجہ تیز کر کے اس میں غصے کی آمیزش کی اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ وہ خان صاحب ہی تھے جو شاید کسی اور نام سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک منٹ رکو...... میں تمہیں کاغذ پر ان کی ناک بنا کر دکھاتا ہوں۔ ان کی ناک بہت عجیب وضع کی ہے۔ تم دیکھتے ہی پہچان لو گے کہ میں کن صاحب کی بات کر رہا ہوں۔'' بولتے بولتے اس نے ایک جھٹکے سے اپنی جیب میں اٹکا ہوا قلم باہر نکالا۔ یہ عام قلم نہیں تھا۔ اسے جیب سے باہر نکالتے ہی اس نے سیکیورٹی گارڈ کی طرف اس کا رخ کر کے ایک بٹن دبایا تو نب والی سائڈ سے سرعت سے ایک سوئی نکلی اور سیدھی جا کر گارڈ کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ ردعمل میں اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی سسکی نکلی اور وہ جھومتا ہوا اپنی جگہ سے گر گیا۔ اس دوران اسکرین پر نظر رکھا گارڈ ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا لیکن وقاص نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور قلم کا رخ اس کی طرف کر کے دوبارہ اس کا بٹن دبا دیا۔ ایک بار پھر قلم میں سے سوئی برآمد ہوئی اور اڑتی ہوئی دوسرے گارڈ کی کنپٹی سے ٹکرائی۔ اسے بے ہوش ہونے میں اپنے ساتھی سے بھی کم وقت لگا۔ وقاص نے ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑا اور خود پھرتی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس وقت اسے اپنے مطلوبہ شخص کی تلاش سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ اس سب سے اپنی جان چھڑا کر واپس پارٹی میں پہنچ جائے۔ وہاں سے کسی رکاوٹ کے بغیر واپسی اس لیے مشکل نہیں تھی کہ وہ لالہ عیسیٰ کے ساتھ ہوتا اور لالہ عیسیٰ کے کسی ساتھی پر ہاتھ ڈالنا آسان بات نہیں تھی لیکن اس بار بھی قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور جیسے ہی وہ سیکیورٹی روم سے باہر نکلا، لفٹ سے دو گارڈز برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی مشین پسٹلز تھے۔ اس سے قبل کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بائیں جانب کے کوریڈور کی طرف مڑ گیا۔ یہ وہی کوریڈور تھا جس کے آخری کمرے میں باربی کو لے جایا گیا تھا۔

''اسٹاپ۔'' اس کی پھرتی کے باوجود گارڈز نے اسے دیکھ لیا تھا اور ان میں سے ایک اسے روکنے کے لیے چلّایا تھا۔ وہ رکنے کے بجائے دوڑ پڑا لیکن دوڑ کر کہاں جاتا۔ آگے سے کوریڈور بند تھا۔ اس نے اضطراری طور پر باربی کے کمرے کے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا۔ حیرت انگیز طور پر دروازہ لاک نہیں تھا۔ وہ جھپٹ کر کمرے میں داخل ہوا اور لاک دبا دیا۔ لاک دبا کر وہ پلٹا تو اس نے باربی کو اپنے سامنے کھڑے حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس لباس میں اس نے اسے رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اب اس کے چہرے کا میک اپ کافی حد تک صاف ہو چکا تھا اور جیولری بھی غائب تھی۔ یعنی ابھی وہ چینج کرنے کے ابتدائی مراحل میں تھی کہ نازل ہونے والی ناگہانی نے اسے اپنا کام ادھورا چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا، وہ اصل میں ایک پورا سوئٹ تھا اور باربی اس کے بیڈ روم والے حصے سے نکل کر سامنے آئی تھی۔

''ہو آر یو؟'' حیرت سے سنبھلنے کے بعد اس نے وقاص سے سوال کیا لیکن اس کے کوئی جواب دینے سے قبل دروازے پر تیز دستک کی آواز ابھری۔ دستک دینے والے سیکیورٹی گارڈز کے علاوہ بھلا کون ہو سکتے تھے۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مس باربی میرے قبضے میں ہے۔ اگر کسی نے بھی کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو مس باربی اپنی جان سے چلی جائے گی۔'' اس نے بلند آواز میں بولتے ہوئے گارڈز کو دھمکایا۔

''تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے مسٹر! بہتر ہوگا کہ تم فوراً باہر آ جاؤ دوسری صورت میں ہم سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گے۔'' گارڈ نے جوابی دھمکی دی لیکن اس کی آواز بہت زیادہ بلند نہیں تھی۔ یقیناً ان کی کوشش تھی کہ یہ معاملہ خاموشی سے نمٹ جائے اور دیگر کمروں میں مقیم افراد کو اس تماشے کی خبر نہ ہوتا کہ ہوٹل کی ساکھ پر کوئی حرف نہ آسکے۔

''تم جو چاہے کرو مگر یہ بات یاد رکھنا کہ میری مرضی کے خلاف کچھ بھی کر کے تم مس باربی کی زندگی داؤ پر لگا دو گے۔'' اس نے گارڈ کی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر اطمینان سے جواب دیا۔ اس گفتگو کے دوران اس کی نظریں البتہ باربی پر ہی مرکوز رہی تھیں اور اس نے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ وہ اس صورتِ حال پر قطعی ہراساں نہیں ہے اور اپنی ابتدائی حیرت پر قابو پا لینے کے بعد اب اسے دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔

''مس باربی کو کوئی نقصان پہنچا کر تم اپنے بچاؤ کا ہر راستہ کھو دو گے۔'' باہر موجود گارڈ نے شاید دانت کچکچا کر یہ جملہ ادا کیا تھا۔

''تم لوگ مجھے یہاں سے نکلنے کا صاف راستہ دے دو۔ میں مس باربی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بس انہیں ہوٹل سے باہر کچھ دور تک میرے ساتھ چلنا ہوگا، پھر میں انہیں چھوڑ دوں گا۔'' اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''میں اس سلسلے میں تھوڑی دیر میں تمہیں جواب دیتا ہوں۔'' باہر سے گارڈ کی پریشان آواز سنائی دی اور محسوس ہوا کہ وہ وہاں سے جا رہا ہے لیکن وقاص کو معلوم تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی ابھی باہر موجود ہے۔

''انتظامیہ کے پاس ہوٹل کے ہر تالے کی چابی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ چابی سے لاک کھول کر اندر آ جائیں گے۔'' باربی نے ایک صوفے پر جگہ سنبھال لی اور مسکراتے ہوئے اس سے بولی تو وقاص چونک گیا اور جھٹ دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

''دروازہ توڑ کر اندر آنا بھی کوئی ایسی زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔'' اس نے جیسے حظ اٹھایا۔

''نہیں۔ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ ایسا کر کے وہ تمہاری زندگی کے لیے خطرہ نہیں مول لے سکتے۔'' وقاص نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے زیادہ خود کو یقین دلایا۔

''ضروری نہیں کہ وہ ایک رقاصہ کو اتنی اہمیت دیں۔ تم اگر انہیں بہت زیادہ مطلوب ہو تو وہ میری زندگی پر رسک لے سکتے ہیں۔ ویسے بائی دا وے...... مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ میری زندگی کو تم سے کس طرح کا خطرہ درپیش ہے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو دور کی بات، معمولی سا ناخن تراش بھی نظر نہیں آ رہا جس سے تم میری جان لے سکو۔'' وہ گویا اس کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔

''تم میرے ہاتھ میں یہ قلم دیکھ رہی ہو نا؟ یہ بہت کام کی چیز ہے۔ اس سے نکلی ہوئی دو سوئیوں نے دو ہٹے کٹے سیکیورٹی گارڈز کو لمبا لٹا دیا ہے تو تم کس کھیت کی مولی ہو اور میرے خیال میں مجھے تمہارے لیے اس ہتھیار کو استعمال کرنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ میرے دو چار ہاتھ ہی تمہاری نازک جان کے لیے کافی ہوں گے۔'' وقاص نے چڑ کر اسے جواب دیا۔

''واقعی......'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی

اور اسی لمحے کارنر پر رکھا ہوا شیشے کا ایک ڈیکوریشن پیس اڑتا ہوا وقاص کی طرف آیا۔ وقاص عین وقت پر جھکائی نہ دے دیتا تو اس کا سر پھٹ گیا ہوتا۔ اب بھی دائیں شانے پر خاصی زوردار ضرب لگی۔ ضرب کھاتے ہی وہ اپنی جگہ سے اچھل کر دوسری جگہ پر چلا گیا۔ اس دوران باربی بھی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کے نرم تاثرات تبدیل ہو کر سختی میں ڈھل چکے تھے۔

''ہماری اس سوسائٹی میں مرد، عورت کو کمزور جان کر کسی نہ کسی طرح اس کا استحصال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم نے بھی اس وقت یہی گھٹیا حرکت کی ہے اور سمجھتے ہو کہ ایک کمزور عورت کو ڈھال بنا کر یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ گے لیکن میں تمہیں بتاؤں گی کہ تم کتنی شدید غلطی پر ہو۔'' وہ پھنکارنے کے انداز میں بولی اور کسی شیرنی کی سی پھرتی سے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ ایک بار پھر پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا لیکن اس چکر میں ایک سائڈ ٹیبل الٹ گئی۔

''میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ نہ ہی میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھ سے مقابلے کی کوشش مت کرو۔'' اس نے تیز تیز بولتے ہوئے باربی کو سمجھانا چاہا لیکن وہ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی اور شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتی ہوئی ایک بار پھر حملے کے لیے پر تول رہی تھی۔ وقاص نے اپنی پوری توجہ اس پر مرکوز کر دی۔ نتیجتاً جب وہ ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوئی تو وہ اتنی آسانی سے ایک طرف ہو گیا جیسے چہل قدمی کر رہا ہو۔ باربی نے بھی ہار نہیں مانی اور فوراً ہی پلٹ کر اس پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وقاص نے اس وار کو اپنے بازو پر روکا اور اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اس بظاہر نرم و نازک نظر آنے والی لڑکی کے وار میں آہنی طاقت ہے۔ اس کے دوسرا وار کرنے سے قبل وہ ایک بار پھر اچک کر اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا چنانچہ باربی کی چلائی جانے والی ٹانگ ہوا میں ہی معلق رہ گئی۔

''پلیز! میری بات کو سمجھو۔ میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ میں نے صرف اس کمرے میں پناہ لی ہے اور میں تم سے تمہارا تھوڑا سا تعاون چاہتا ہوں۔'' وہ بڑے صوفے کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور باربی کو اس تک پہنچنے کے لیے تھوڑا وقت لگتا۔ اس نے اس مہلت کا فائدہ اٹھایا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیوں...... تم میری پھپھی کے پتر لگتے ہو جو میں تم

''اسٹاپ۔'' اس کی پھرتی کے باوجود گارڈز نے اسے دیکھ لیا تھا اور ان میں سے ایک اسے روکنے کے لیے چلّایا تھا۔ وہ رکنے کے بجائے دوڑ پڑا لیکن دوڑ کر کہاں جاتا۔ آگے سے کوریڈور بند تھا۔ اس نے اضطراری طور پر باربی کے کمرے کے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا۔ حیرت انگیز طور پر دروازہ لاک نہیں تھا۔ وہ جھپٹ کر کمرے میں داخل ہوا اور لاک دبا دیا۔ لاک دبا کر وہ پلٹا تو اس نے باربی کو اپنے سامنے کھڑے حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس لباس میں اس نے اسے رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اب اس کے چہرے کا میک اپ کافی حد تک صاف ہو چکا تھا اور جیولری بھی غائب تھی۔ یعنی ابھی وہ چینج کرنے کے ابتدائی مراحل میں تھی کہ نازل ہونے والی ناگہانی نے اسے اپنا کام ادھورا چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جس کمرے میں داخل ہوا تھا، وہ اصل میں ایک پورا سوئٹ تھا اور باربی اس کے بیڈ روم والے حصے سے نکل کر سامنے آئی تھی۔

''ہو آر یو؟'' حیرت سے سنبھلنے کے بعد اس نے وقاص سے سوال کیا لیکن اس کے کوئی جواب دینے سے قبل دروازے پر تیز دستک کی آواز ابھری۔ دستک دینے والے سیکیورٹی گارڈز کے علاوہ بھلا کون ہو سکتے تھے۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ مس باربی میرے قبضے میں ہے۔ اگر کسی نے بھی کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو مس باربی اپنی جان سے چلی جائے گی۔'' اس نے بلند آواز میں بولتے ہوئے گارڈز کو دھمکایا۔

''تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے مسٹر! بہتر ہوگا کہ تم فوراً باہر آ جاؤ دوسری صورت میں ہم سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گے۔'' گارڈ نے جوابی دھمکی دی لیکن اس کی آواز بہت زیادہ بلند نہیں تھی۔ یقیناً ان کی کوشش تھی کہ یہ معاملہ خاموشی سے نمٹ جائے اور دیگر کمروں میں مقیم افراد کو اس تماشے کی خبر نہ ہو تا کہ ہوٹل کی ساکھ پر کوئی حرف نہ آ سکے۔

''تم جو چاہے کرو مگر یہ بات یاد رکھنا کہ میری مرضی کے خلاف کچھ بھی کر کے تم مس باربی کی زندگی داؤ پر لگا دو گے۔'' اس نے گارڈ کی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر اطمینان سے جواب دیا۔ اس گفتگو کے دوران اس کی نظریں البتہ باربی پر ہی مرکوز رہی تھیں اور اس نے یہ بات نوٹ کر لی تھی کہ وہ اس صورتِ حال پر قطعی ہراساں نہیں ہے اور اپنی ابتدائی حیرت پر قابو پا لینے کے بعد اب اسے دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔

''مس باربی کو کوئی نقصان پہنچا کر تم اپنے بچاؤ کا ہر راستہ کھو دو گے۔'' باہر موجود گارڈ نے شاید دانت کچکچا کر یہ جملہ ادا کیا تھا۔

''تم لوگ مجھے یہاں سے نکلنے کا صاف راستہ دے دو۔ میں مس باربی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بس انہیں ہوٹل سے باہر کچھ دور تک میرے ساتھ چلنا ہوگا، پھر میں انہیں چھوڑ دوں گا۔'' اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

''میں اس سلسلے میں تھوڑی دیر میں تمہیں جواب دیتا ہوں۔'' باہر سے گارڈ کی پریشان آواز سنائی دی اور محسوس ہوا کہ وہ وہاں سے جا رہا ہے لیکن وقاص کو معلوم تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی بھی باہر موجود ہے۔

''انتظامیہ کے پاس ہوٹل کے ہر تالے کی چابی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ چابی سے لاک کھول کر اندر آ جائیں گے۔'' باربی نے ایک صوفے پر جگہ سنبھال لی اور مسکراتے ہوئے اس سے بولی تو وقاص چونک گیا اور جھٹ دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

''دروازہ توڑ کر اندر آنا بھی کوئی ایسی زیادہ مشکل بات نہیں ہے۔'' اس نے جیسے حظ اٹھایا۔

''نہیں۔ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ ایسا کر کے وہ تمہاری زندگی کے لیے خطرہ نہیں مول لے سکتے۔'' وقاص نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے زیادہ خود کو یقین دلایا۔

''ضروری نہیں کہ وہ ایک رقاصہ کو اتنی اہمیت دیں۔ تم اگر انہیں بہت زیادہ مطلوب ہو تو وہ میری زندگی پر رسک لے سکتے ہیں۔ ویسے بائی دا وے...... مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ میری زندگی کو تم سے کس طرح کا خطرہ درپیش ہے۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو دور کی بات، معمولی سا ناخن تراش بھی نظر نہیں آ رہا جس سے تم میری جان لے سکو۔'' وہ گویا اس کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔

''تم میرے ہاتھ میں یہ قلم دیکھ رہی ہو نا؟ یہ بہت کام کی چیز ہے۔ اس سے نکلی ہوئی دو سوئیوں نے دو ہٹے کٹے سیکیورٹی گارڈز کو لمبا لٹا دیا ہے تو تم کس کھیت کی مولی ہو اور میرے خیال میں مجھے تمہارے لیے اس ہتھیار کو استعمال کرنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ میرے دو چار ہاتھ ہی تمہاری نازک جان کے لیے کافی ہوں گے۔'' وقاص نے چڑ کر اسے جواب دیا۔

''واقعی......'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی

اور اسی لمحے کارنر پر رکھا ہوا شیشے کا ایک ڈیکوریشن پیس اڑتا ہوا وقاص کی طرف آیا۔ وقاص عین وقت پر جھکائی نہ دے دیتا تو اس کا سر پھٹ گیا ہوتا۔ اب بھی دائیں شانے پر خاصی زوردار ضرب لگی۔ ضرب کھاتے ہی وہ اپنی جگہ سے اچھل کر دوسری جگہ پر چلا گیا۔ اس دوران باربی بھی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے کے نرم تاثرات تبدیل ہو کر سختی میں ڈھل چکے تھے۔

''ہماری اس سوسائٹی میں مرد، عورت کو کمزور جان کر کسی نہ کسی طرح اس کا استحصال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم نے بھی اس وقت یہی گھٹیا حرکت کی ہے اور سمجھتے ہو کہ ایک کمزور عورت کو ڈھال بنا کر یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاؤ گے لیکن میں تمہیں بتاؤں گی کہ تم کتنی شدید غلطی پر ہو۔'' وہ پھنکارنے کے انداز میں بولی اور کسی شیرنی کی سی پھرتی سے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ ایک بار پھر پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا لیکن اس چکر میں ایک سائڈ ٹیبل الٹ گئی۔

''میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ نہ ہی میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھ سے مقابلے کی کوشش مت کرو۔'' اس نے تیز تیز بولتے ہوئے باربی کو سمجھانا چاہا لیکن وہ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی اور شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتی ہوئی ایک بار پھر حملے کے لیے پر تول رہی تھی۔ وقاص نے اپنی پوری توجہ اس پر مرکوز کر دی۔ نتیجتاً جب وہ ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوئی تو وہ اتنی آسانی سے ایک طرف ہو گیا جیسے چہل قدمی کر رہا ہو۔ باربی نے بھی ہار نہیں مانی اور فوراً ہی پلٹ کر اس پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وقاص نے اس وار کو اپنے بازو پر روکا اور اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اس بظاہر نرم و نازک نظر آنے والی لڑکی کے وار میں آہنی طاقت ہے۔ اس کے دوسرا وار کرنے سے قبل وہ ایک بار پھر اچک کر اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا چنانچہ باربی کی چلائی جانے والی ٹانگ ہوا میں ہی معلق رہ گئی۔

''پلیز! میری بات کو سمجھو۔ میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ میں نے صرف اس کمرے میں پناہ لی ہے اور میں تم سے تمہارا تھوڑا سا تعاون چاہتا ہوں۔'' وہ بڑے صوفے کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور باربی کو اس تک پہنچنے کے لیے تھوڑا وقت لگتا۔ اس نے اس مہلت کا فائدہ اٹھایا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیوں...... تم میری پھپی کے پتر لگتے ہو جو میں تم

سے تعاون کروں؟'' وہ ابھی تک اسے کوئی قابلِ ذکر ضرب نہیں لگا سکی تھی اس لیے تھوڑی سی جھنجلائی ہوئی تھی۔ وقاص اس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑا۔ شکل وصورت اور حلیے سے بالکل بدیسی دکھائی دینے والی وہ حسینہ ایسے دیسی انداز میں بات کرے گی، اسے امید نہیں تھی۔ اسے بھی اپنی حرکت کا اندازہ ہو گیا اس لیے پہلے ٹھٹکی پھر اسے انگریزی میں دو چار گالیاں دے ڈالیں۔

''گالی مت دو مس۔ یہ نہ ہو کہ میں تمہیں لڑکی ہونے کی رعایت دینا بھول جاؤں۔'' وقاص کے چہرے کا رنگ سرخ ہوا اور اس نے انگلی اٹھا کر باربی کو تنبیہہ کی۔ اس سے قبل کہ باربی جواب میں کچھ کہتی، دروازے پر زوردار دستک دی گئی۔ وہ دونوں ہی دستک کی آواز پر اس طرف متوجہ ہو گئے۔

''دروازہ کھولو وکی!'' دستک کے ساتھ ہی جو آواز سنائی دی، اس نے وقاص کے ہوش اڑا دیے۔ اب چاہے اس پر توپ ہی کیوں نہ داغ دی جاتی، وہ دروازہ کھولنے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر دروازہ کھول دیا۔ سامنے لالہ عیسیٰ کھڑا اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی طرح دار وحسین سونیا خان بھی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ ہی دو قدم پیچھے ہٹا لیکن لالہ عیسیٰ نے اندر آنے کے لیے قدم نہیں اٹھائے اور اپنی جگہ کھڑا اسے گھورتا رہا۔

''یہ سب کیا تھا مسٹر وقاص؟'' لالہ عیسیٰ کے بجائے سونیا خان نے ذرا درشت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''بس ایسے ہی، ذرا میں مس باربی کے پیچھے اوپر آ گیا تھا تو گارڈز میرے گلے پڑ گئے اور مجھ سے خوامخواہ الٹی سیدھی حرکتیں ہوتی چلی گئیں۔'' اس نے یوں جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا جیسے واقعی وہ کوئی ٹپوری بوائے ہو اور اب اپنی حرکت پر پکڑے جانے پر شرمندہ ہو رہا ہو۔

''یہ ذرا سی بات نہیں ہے مسٹر وقاص! آپ نے دو سیکیورٹی گارڈز کو بے ہوش کر دیا ہے جنہیں اسپتال لے جانا پڑا ہے۔ دوسری طرف آپ پر مس باربی کو یرغمال بنانے کا بھی الزام ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس صورتِ حال پر ہوٹل انتظامیہ کتنا سخت ایکشن لے سکتی تھی۔ وہ تو منیجر نے سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھ کر نوٹس کر لیا کہ آپ میری پارٹی کے مہمانوں میں شامل ہیں۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے فوٹیج دکھائی تو میں لالہ عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے کر اپنی ذمے داری پر آپ سے بات کرنے یہاں آ گئی۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا کیا جائے؟'' سونیا خان کے لہجے کی درشتگی قائم رہی۔

''میرے خیال میں ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے مسز خان! وکی سے جو بھی بات کرنی ہو گی۔ میں خود کر لوں گا۔'' لالہ عیسیٰ جواب تک خاموش کھڑا تھا، یکدم سپاٹ لہجے میں بولا تو سونیا خان نے اپنے خوبصورت بالوں والے سر کو دھیرے سے جھٹکا دیا اور بولی۔

''یہ صرف آپ کی خاطر ہے مسٹر عیسیٰ ورنہ اس سچویشن میں ہوٹل انتظامیہ جتنی خفا ہے، اس لڑکے کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''تھینکس فار دس۔'' لالہ عیسیٰ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور وقاص کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے پلٹ گیا۔ سونیا خان اس سے بھی پہلے مڑ چکی تھی اور کوریڈور میں ان سے کافی آگے اپنی ہیل کی ٹک ٹک کرتے ہوئے چل رہی تھی۔ وقاص کان دبائے لالہ عیسیٰ کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ لوگ سونیا خان کے ساتھ واپس پارٹی میں نہیں گئے اور سیدھے باہر کا رخ کیا۔

''اب بول، یہ کیا لفڑا تھا؟ لونڈیا کے پیچھے جانے والی بات اپن نہیں مان سکتا۔'' وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر ہوٹل سے روانہ ہوئے تو لالہ عیسیٰ نے سنجیدہ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ اس کا انداز اتنا دوٹوک تھا کہ وقاص کے لیے جھوٹ بولنا ممکن نہیں رہا۔ علینہ سے اپنی جذباتی وابستگی کے علاوہ وہ لالہ کو ہر بات بالکل سچ بتاتا چلا گیا۔

''تیری دوسروں کے لفڑوں میں اپنی ٹانگ اڑانے کی عادت بہت بری ہے۔'' سن کر لالہ نے تبصرہ کیا۔ وقاص خاموش رہا۔ لالہ نے بھی پھر کوئی دوسری بات نہیں کی۔ وقاص کے لیے لالہ کی یہ خاموشی غنیمت تھی لیکن وہ یہ نہیں جان سکا تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے کیا چھپا ہے۔ لالہ اسے کچھ بھی بتائے بغیر خود کو ملنے والے ایک پیغام پر غور کر رہا تھا۔ پیغام کے الفاظ تھے۔

''وکی کو ہمارے معاملات سے الگ رکھو ورنہ تم اسے کھو دو گے۔'' لالہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

کھانے سے بھری ٹرے خالی کر کے اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا تو حسبِ معمول مخصوص ملازم اندر آ کر خالی ٹرے واپس لے گیا۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے فارغ تھا۔ فراغت کے اس وقفے میں قیلولہ لے کے لیے لیٹنے کے

بجائے وہ دھیرے دھیرے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کر رکا اور اپنا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت اس نے گہرے نیلے رنگ کے سینڈو کے ساتھ سیاہ ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اس کی صحت واضح طور پر بہت اچھی ہو چکی تھی اور عریاں بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ماضی میں بھی فزیکل ایکٹیوٹیز میں حصہ لیتا رہا تھا لیکن یہاں اس پر بے حد و حساب توجہ دی جا رہی تھی۔ اس عرصے میں اس کی خوراک میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا اور یہ اچھی خوراک اور پابندی سے کی جانے والی مختلف ورزشوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اس کی جسامت میں اتنی واضح تبدیلی آ گئی تھی ورنہ کیرتھر سے لوٹنے کے بعد تو وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گیا تھا۔

یہاں رہ کر اس کی صرف صحت ہی اچھی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ دوسرے کئی فنون میں بھی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ یہاں اسے جدید ہتھیاروں کے استعمال سے لے کر تلوار بازی، خنجر زنی اور تیر اندازی تک ہر کام سکھایا گیا تھا۔ ہاتھ پیروں سے لڑنے کے فن میں اسے پہلے ہی کافی مہارت تھی۔ یہاں اس مہارت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے کئی جدید آلات کا استعمال بھی سکھایا جا رہا تھا اور یہ سب اس کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ وہ لوگ اسے کچھ ایسی تربیت دے رہے تھے جیسے وہ کوئی کمانڈو یا جاسوس وغیرہ بننے جا رہا ہو۔ یہ سارے کام سیکھنا اس کے لیے ایک دلچسپ عمل تھا اس لیے وہ تیزی سے ہر چیز سیکھ رہا تھا لیکن ساتھ ہی اسے الجھن اور فکر بھی تھی کہ اس ساری تربیت کا کیا مقصد ہے۔ اپنے قیدی ہونے کے احساس نے بھی اسے اندر سے جھنجلا کر رکھا ہوا تھا لیکن اپنے پیاروں کی خاطر وہ یہ سب برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ سعد کے جسم سے اس کا گردہ نکالے جانے کا منظر اسے ایک بار بھی نہیں بھولا تھا۔ سعد جتنے عرصے یہاں رہا تھا، ویڈیو لنک کے ذریعے دن میں ایک بار اسے سعد کو دکھایا جاتا تھا۔ ہر بار وہ اسے بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ہی نظر آیا تھا لیکن یہی غنیمت تھا کہ وہ زندہ تھا اور اسے مزید کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا رہا تھا۔ اپنے مکمل تعاون کے ساتھ وہ مسلسل سعد کو رہائی دینے کی استدعا کرتا رہا تھا۔ ایک دن اچانک اس کی یہ درخواست قبول کر لی گئی اور اسے مختلف نیوز کے کلپس دکھا کر یقین دلایا گیا کہ سعد کو سچ مچ رہا کر دیا گیا ہے۔
سعد کی رہائی اس کے لیے ایک بہت اچھی خبر تھی لیکن دو تین دن سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ عجیب کیا جا رہا ہے۔ ان دو تین دنوں میں اس کے معمولات میں یہ معمولی سی تبدیلی آئی تھی کہ رات کے کھانے کے بعد ایک سفید بالوں والا بوڑھا اس سے ملاقات کے لیے آنے لگا تھا۔ بوڑھے نے اسے اپنا نام وکٹر بتایا تھا۔ وکٹر دیکھنے میں نہایت نفیس شخصیت کا مالک تھا اور دھیمی آواز میں بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا تھا۔ اس کی گفتگو معاذ کی ذات کے اردگرد ہی گھومتی رہتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر وہ معاذ کی زندگی کے کئی واقعات سے آگاہ تھا پھر بھی کرید کرید کر اس سے اس کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ معاذ اسے محتاط انداز میں لیکن اپنے بارے میں بالکل سچ باتیں بتاتا تھا کیونکہ اس کا اندازہ تھا کہ اس کی سچائی جانچنے کے لیے ہی اس سے یہ سب پوچھا جاتا ہے۔ بوڑھے کی اپنی زندگی سے متعلق معلومات کے باعث اسے خدشہ تھا کہ کہیں اس کا کوئی غلط جواب اس کے لیے مسئلہ نہ بن جائے۔ اب تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ بوڑھا اس پر اپنے عدمِ اعتماد کا اظہار کرتا لیکن اس کی اپنی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔
بوڑھے وکٹر سے ملاقاتوں کے دوران اس نے دو خاص باتیں نوٹ کی تھیں۔ نمبر ایک یہ کہ گفتگو کے دوران وکٹر اپنی مقناطیسی آنکھیں مسلسل اس کی آنکھوں پر جمائے رکھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسے وکٹر کے اپنے کمرے سے واپس جانے کا کبھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ وہ وکٹر سے باتیں کرتے کرتے ہی نیند میں ڈوب جاتا ہے۔ وکٹر سے گفتگو کے دوران وہ ہمیشہ کرسی پر بیٹھا کرتا تھا لیکن صبح آنکھ کھلنے پر وہ خود کو بستر پر پاتا تھا۔ اس صورت حال نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے۔ کسی سے گفتگو کرتے کرتے اپنے یوں سو جانے کی بات اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی اور وہ شک میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اسے کھانے میں کوئی خواب آور دوا دی جا رہی ہے لیکن سوال یہی پیدا ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے کیا مقصد ہے؟ آئینے کے سامنے کھڑا خود کو دیکھتا ہوا وہ اس مقصد کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کے سامنے اپنی صورت میں ایک ایسا مضبوط و توانا شخص کھڑا تھا جو بیک وقت کئی لوگوں سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ جس کے اندر مشکل حالات سے نمٹنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ جو بند راستوں پر بھی سرنگ بنا سکتا تھا۔ جس میں سختیاں جھیلنے کی طاقت تھی اور جو کئی اعتبار سے ایک عام آدمی سے بہت آگے تھا۔ اس کی فطری صلاحیتوں اور رجحانات سے فائدہ اٹھا کر اسے

ایسا بنانے والے یقیناً اس سے کچھ امیدیں رکھتے تھے۔ اپنی ان امیدوں اور خواہشات کے بارے میں یقیناً انہیں معلوم ہوگا کہ معاذ جیسا نوجوان دلی رضامندی سے انہیں پورا نہیں کرسکتا اس لیے کافی حد تک انہوں نے اسے بلیک میلنگ کے ذریعے قابو میں کیا ہوا تھا لیکن بلیک میلنگ کا حربہ ہمیشہ کارگر ثابت نہیں ہوسکتا، اس بات کا بھی انہیں اندازہ ہوگا اسی لیے وہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ کیا......؟

سوچتے سوچتے معاذ چونکا اور اسے کیرتھر کی پہاڑیوں میں آباد فیغو کا ڈیرا یاد آیا۔ فیغو نے غیر روایتی طریقوں سے ہپناٹزم کی بے پناہ صلاحیت حاصل کررکھی تھی اور اپنی اس صلاحیت کا فائدہ اٹھا کر اس نے خمیسو جیسے خطرناک ڈاکو کا ذہن ایسے مسخر کیا تھا کہ وہ اس کے اشاروں پر چلنے لگا تھا۔ وکٹر نامی وہ بوڑھا بھی شاید اس کے ساتھ ایسی ہی کوئی کارروائی کررہا تھا۔ خواب آور دوا اور اپنی مقناطیسی آنکھوں کی کشش سے کام لے کر وہ اس کے دماغ میں نہ جانے کہاں کہاں تک رسائی حاصل کرچکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کوئی ہپناٹسٹ جب کسی کو اپنا معمول بناتا ہے تو معمول تنویمی حالت میں ایسی باتیں بھی بتا ڈالتا ہے جو اس کے تحت الشعور میں ہوتی ہیں۔ وکٹر اسے اس کی زندگی کے جو قصے سناتا تھا، وہ یقینی طور پر اس نے خود تنویمی حالت میں اسے سنائے تھے۔ یہ ایک خوفناک بات تھی لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ خوفناک بات اس کے لیے یہ تھی کہ اسی کیفیت میں اس کے دماغ میں کچھ ایسی باتیں فیڈ کردی جائیں جو درحقیقت اس کے مزاج، عقائد اور حب الوطنی سے متصادم ہوں لیکن وہ ذہنی طور پر مسخر ہونے کے باعث ان پر عمل کرتا چلا جائے۔ یہ خیال اتنا پریشان کن تھا کہ اس کے رگ و پے میں اضطراب کی لہریں دوڑنے لگیں اور اس نے بے چینی کی کیفیت میں ایک بار پھر ٹہلنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسے جس جگہ رکھا گیا تھا، وہاں وہ کھلے آسمان کے دیدار کے لیے ترس گیا تھا اور اس محرومی کے باعث فیغو کی سکھائی ستارہ بینی کی مشقیں بھی نہیں کرپارہا تھا۔ فیغو نے اسے بتایا تھا کہ جو لوگ یہ مشقیں کرتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ دوسروں کے ذہن کو مسخر کرلینے کی صلاحیت حاصل کرلیتے ہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ان کے ذہن تک رسائی ممکن نہیں ہوپاتی۔ وہ ان مشقوں سے محروم ہوگیا تھا جب ہی وکٹر اس کے دماغ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ رسائی کس حد تک تھی، اسے اندازہ نہیں تھا لیکن جس حد تک بھی تھی اس کے لیے باعثِ تشویش تھی۔

''ہیلو معاذ......!'' ابھی وہ اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا اس مسئلے کا حل سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں وہی آواز گونجی جس سے شاید اسے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت تھی۔

''آج بہت دنوں بعد تم سے بات ہورہی ہے۔ یقیناً تم خوش ہوگے کہ سعد گھر واپس چلا گیا ہے۔''

''ہاں۔ میں مطمئن ہوں کہ اب وہ یہاں تم لوگوں کی گرفت میں نہیں ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تو جواب میں اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔

''سعد کو اپنی گرفت سے آزاد کردینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہمارے لیے ناقابلِ رسائی ہوچکا ہے۔ ہم نے اسے تمہارے تعاون کے انعام کے طور پر آزاد کیا ہے لیکن ہم جب چاہیں اسے یا تمہاری فیملی کے کسی بھی شخص کو اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔'' اس کے انداز میں محسوس کیا جانے والا غرور تھا۔

''اتنا غرور مت کرو۔ اس کائنات میں سب سے سخت پکڑ اللہ کی ہے۔ جب تم اور تمہارے ساتھی اس پکڑ میں آؤ گے تو تمہیں بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔'' معاذ نے اسے جواب دیا تو وہ یوں ہنسی جیسے اس کی بات سے لطف لے رہی ہو، پھر بولی۔

''اب تم مولوی بن کر وعظ تو نہ کرو ڈارلنگ!''

''اللہ کسی پر اس وقت تک پکڑ نہیں کرتا جب تک اس کے پاس کوئی ڈرانے والا نہ بھیج دے۔ اللہ کے نبی اور رسول یہ کام بہت پہلے ہی انجام دے کر جاچکے ہیں لیکن اعادہ کروانے کے لیے کبھی کبھی اللہ مجھ جیسے حقیر بندوں سے بھی کام لے لیتا ہے۔'' معاذ نے اس کے مذاق اڑانے کی پروا نہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تم اس وقت کسی اور موڈ میں ہو اور میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتی اس لیے بہتر ہے کہ موضوع بدل دیا جائے۔ تمہارے لیے ایک اور اچھی اطلاع یہ ہے کہ وہ لڑکا وکی، جس نے تمہیں یزدانی کے ہاں سے فرار کروایا تھا، ملک سے باہر بھیج دیا گیا ہے۔ ہم نے تو یوں بھی اسے نظر انداز کردیا تھا لیکن وہ ذرا اوور اسمارٹ ہے۔ ہمارے نظر انداز کردینے کے باوجود ابھی تک پیچھے پڑا ہوا تھا۔ ہم نے اس کے گاڈ فادر کو پیغام بھجوا کر اسے زندہ رہنے کا ایک چانس اور دے دیا ہے۔ اب آگے اس پر ڈیپنڈ کرتا ہے

کہ وہ مزید زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں۔''

''تم لوگ واقعی بہت بگڑی ہوئی قوم ہو جب ہی تو خود فانی انسان ہونے کے باوجود دوسروں کی زندگی اور موت کے فیصلے یوں صادر کرتے ہو جیسے نعوذ باللہ تم ہی خدا ہو۔'' وقاص کے ملک سے باہر جانے کی خبر سن کر معاذ نے دل میں ایک اطمینان سا محسوس کیا۔ حالت مجبوری میں اس نے ان لوگوں کو وقاص کا نام تو بتادیا تھا لیکن اپنے دل پر مسلسل بوجھ سا محسوس کرتا تھا۔ اس اطلاع پر جہاں اس کے دل کا بوجھ کم ہوا، وہیں وہ ایک بار پھر اپنی نادیدہ مخاطب کو اس کی فرعونیت پر ٹوکے بنا نہ رہ سکا۔

''ہم جو بھی کرتے اور سمجھتے ہیں، تم ہمارے اعمال کو ہم پر چھوڑ دو۔ میرے لیے فی الحال یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ تم زندگی اور موت کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہی سمجھتے ہو اس لیے اپنے کسی نقصان کا ذمے دار ہمیں نہیں ٹھہراؤ گے۔'' معاذ کے ٹوکنے کا برا ماننے کے بجائے اس نے گمبھیر لہجے میں جو الفاظ ادا کیے، انہوں نے معاذ کو چونکا دیا۔

''کیا مطلب...... کیا کہنا چاہتی ہو تم؟''

''تمہارے لیے ایک بری اطلاع ہے۔ آئی ایم سوری کہ میں ذرا لیٹ تمہیں یہ اطلاع دے رہی ہوں لیکن تمہارے لیے یہی بہتر تھا۔ وقت پر اطلاع ملنے کی صورت میں تم خود بھی پریشان ہوتے اور ہمیں بھی پریشان کرتے۔ اس لیے میرے خیال میں اطلاع دینے کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔''

''باتیں بنانے سے بہتر ہے کہ تم مجھے اصل بات بتادو۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ سنجیدگی در آئی، ساتھ ہی اپنے وہ پریشان خواب بھی یاد آئے جو وہ سعد کی رہائی کے روز سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ خواب بہت واضح نہیں ہوتے تھے لیکن ان میں ایسی کوئی بات ضرور ہوتی تھی جس سے اسے لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے نقصان سے دوچار ہو چکا ہے۔

''مجھے تمہیں یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری امی سعیدہ بیگم اب اس دنیا میں نہیں رہی ہیں۔ وہ ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں بہت دنوں سے اسپتال میں ایڈمٹ تھیں اور ٹھیک اسی دن ان کی ڈیتھ ہوئی جس دن سعد کو یہاں سے رہائی دی گئی۔ ایکچو ئیلی ان کی ڈیتھ کی وجہ سے ہی سعد کو اچانک رہائی دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا تاکہ کم از کم ایک بیٹا تو ان کے جنازے میں شریک ہو جائے۔ تم بے شک ہمیں برا سمجھتے ہو لیکن ہم اتنے بھی برے لوگ نہیں ہیں۔'' وہ پتا نہیں کیا کیا بول رہی تھی۔ معاذ کا دماغ تو اس اطلاع پر ہی اٹک گیا تھا کہ اس کی امی ...... اس کی پیاری امی اب اس دنیا میں نہیں رہی ہیں۔ اس سے بہتر یہ بات کون جانتا تھا کہ اس کی امی سعیدہ بیگم اپنی اولاد پر جان چھڑکتی تھیں اور ان کا دم اپنے بچوں میں ہی اٹکا رہتا تھا۔ ان تینوں بہن بھائیوں میں سے کسی کی معمولی سی تکلیف بھی ان کے لیے شدید پریشانی کا باعث ہوتی تھی۔ ایسے میں پہلے اس کا اور پھر سعد کا غیاب ان کے لیے کیا قیامت خیز تجربہ ثابت ہوا ہوگا، یہ سمجھنا اس کے لیے دشوار نہیں تھا۔ وہ اپنی امی کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا جب ہی تو اس عرصے میں سب سے زیادہ ان کی طرف سے ہی فکر میں مبتلا رہتا تھا۔ وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی یہ فکر غلط نہیں تھی۔ اس کی امی ...... اس کی بے پناہ محبت کرنے والی امی...... اپنے بیٹوں کی جدائی کا دکھ نہیں سہہ سکی تھیں اور اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی تھیں اور وہ ایسا بدنصیب بیٹا تھا کہ وقتِ رخصت اپنی ماں کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔ اس نے ان کے جنازے کو کاندھا دیا تھا نہ ہی انہیں اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتار سکا تھا۔ یہ غم معمولی غم نہیں تھا کہ وہ آسانی سے سہہ جاتا۔ اس کا یہ ایمان اپنی جگہ کہ ہر ذی روح کے دنیا سے جانے کا ایک وقت مقرر ہے لیکن وہ اس حقیقت کو کیسے فراموش کر سکتا تھا کہ امی کے آخری دنوں کو تکلیف دہ بنانے اور انہیں بسترِ مرگ پر پہنچانے میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے جو جانے اپنے کن مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے کسی پالتو جانور کی طرح تربیت دینے میں مصروف تھے۔ امی کے آخری دنوں کی تکلیف اور اپنی محرومیوں کا سوچ کر اس کے وجود میں طیش کی اتنی زبردست لہر اٹھی کہ وہ خود پر قابو نہیں پاسکا اور سامنے کیا ہے یہ دیکھے اور سوچے بغیر اپنا آہنی مکا چلا ڈالا۔ یہ اتفاق تھا کہ مکا مارتے وقت ■ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ مکا اپنی پوری قوت سے آئینے سے ٹکرایا تو آئینے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کئی ٹکڑے اس کے ہاتھ کی پشت میں بھی پیوست ہو گئے اور تیزی سے خون بہنے لگا۔

''خود پر کنٹرول رکھو معاذ! یہ سب کر کے تم کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔'' اسپیکر سے اسے غراتی ہوئی آواز میں ٹوکا گیا۔

''میں کچھ حاصل نہیں کر سکا تو تم لوگ بھی مجھ سے کچھ حاصل نہیں کر سکو گے۔ میں خود اپنے آپ کو ہی ختم کر ڈالوں

گا۔'' اس نے عالمِ جنون میں آئینے کا ٹوٹ کر نیچے گر جانے والا ایک نکیلا ٹکڑا جھک کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''ہماری مرضی کے بغیر مرنا بھی تمہارے لیے آسان ثابت نہیں ہوگا۔'' اس نے دعویٰ کیا اور بکلام ہی جانے کن نادیدہ سوراخوں سے کمرے میں ہلکی نیلی گیس بھرنی شروع ہوگئی۔ معاذ زخمی بھی تھا اور شدید جذباتی کیفیت میں بھی اس لیے اسے بروقت اپنی سانس روکنے کا خیال نہ آسکا۔ گیس نے فوراً ہی اس کے پھیپھڑوں تک رسائی حاصل کرلی اور وہ بے ہوش ہوکر نیچے گر گیا۔

☆☆☆

بڑی سی سفید چادر میں خود کو مکمل طور پر ڈھانپے سجل شاہ نے گاڑی سے نیچے قدم رکھا تو اس کی ٹانگیں واضح طور پر کانپ رہی تھیں۔ عالم شاہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ بڑے بھائی کا سہارا پاتے ہی اس کے ہونٹوں سے ایک تیز سسکی نکلی۔ عالم شاہ کے سینے پر گویا کسی نے گھونسا دے مارا۔ سجل شاہ کی چادر کا پلو جسے اس نے نقاب کے طور پر چہرے کے آگے لپیٹا ہوا تھا، آنسوؤں سے تر تھا۔ یقینی طور پر وہ پورے راستے روتی ہوئی آئی تھی۔ عورت کتنے ہی مضبوط اعصاب کی مالک ہو، شوہر کی موت کا غم اسے نڈھال کر دیتا ہے۔ سجل شاہ جیسی نوجوان بیوہ کو دیکھ کر تو اوروں کا کلیجا منہ کو آتا تھا پھر وہ کیسے اپنے سر کے سائیں کو نہ روتی جو اپنے پہلے پہلے بچے کا منہ دیکھے بغیر ہی اس دنیا سے چلا گیا تھا۔ وہ جو بچے کو جنم دینے کے بعد اس کے باپ کی اسپتال آمد کی شدت سے منتظر تھی، اپنا سہاگ اجڑنے کی خبر سن کر صدمے سے ساکت ہوگئی تھی۔ وہ بچہ جس کے لیے اس کے باپ نے نہ جانے کتنے خواب دیکھے تھے، پیدا ہوتے ہی یتیم کر دیا گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اپنی بیوگی کے غم کو روئے یا اپنے بچے کی یتیمی کا ماتم کرے۔

معظم شاہ کے قتل کی اطلاع ملنے کے بعد بہت دیر تک تو وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہی تھی۔ اس کیفیت سے نکلنے کے بعد اس نے فیصلہ سنایا تھا کہ وہ معظم شاہ کے آخری دیدار کے لیے گاؤں جائے گی۔ زچگی کے چند گھنٹے بعد اتنے طویل سفر کے فیصلے پر سب ہی نے اختلاف کیا تھا لیکن وہ کسی کی بات ماننے کے لیے راضی نہیں تھی۔ اس کے اٹل فیصلے کو دیکھ کر سب کو ہار ماننا پڑی تھی اور جنازہ اگلے دن اٹھانے کا فیصلہ کرکے اسے سفر کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ ایک دن اس نے اسپتال میں ڈاکٹروں کی زیر نگرانی گزارا تھا۔ ایک امیرزادی کی حیثیت سے پہلے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا تھا۔ معظم کی موت کی خبر کے بعد انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بھی اس کا خصوصی خیال رکھا گیا۔ اگلے دن وہ علی الصباح گاؤں کے لیے روانہ ہوئی تو ڈاکٹر کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں ساری ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ بچہ نارمل ڈیلیوری کے ذریعے دنیا میں آیا تھا اس لیے اس کے لیے گاؤں تک کا طویل سفر بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت نہ ہوا۔ سفر میں چھوٹی بہن موحل اور اس کی والدہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ دونوں راستے میں اس کا بھرپور خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کو تسلی دلاسے بھی دیتی رہی تھیں۔ اس [illegible] وہ کر بھی کیا سکتی تھیں کہ ان کے اپنے دل [illegible] خصوصاً سجل شاہ کی ماں سکینہ شاہ کا بہت برا حال تھا [illegible] انہوں نے صرف داماد ہی نہیں، سگے بھتیجے کو بھی [illegible] ایک طرف بیٹی کا سہاگ لٹ جانے پر ماتم [illegible] دوسری طرف بھائی کا بازو کٹ جانے [illegible] تھا۔ ماں کی حالت کے پیشِ نظر سجل نے [illegible] سنبھالے رکھا تھا اور راستے بھر صرف موحل [illegible] رہی تھی لیکن اب جبکہ اپنے بھائی کے پاس [illegible] ہوئی تھی اس کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا [illegible] خود بخود ہی ہونٹوں سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔

اسے سہارا دینے والے عالم شاہ [illegible] بازو ماں کے گرد لپیٹنا پڑا تھا کہ بیٹے کی [illegible] بالکل ہی جواب دے گیا تھا اور وہ [illegible] رو رہی تھیں۔ ماں اور بہن کے آنسو عالم شاہ [illegible] آتشیں سیال کے مانند گر رہے تھے [illegible] آگ تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ وہ کس طرح ان [illegible] اپنے ساتھ لگائے حویلی کے زنان خانے [illegible] بڑھا، یہ کچھ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ پیچھے [illegible] دل بھی تھی جس نے ایک دن کے بچے کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ زنانان خانے کے دروازے پر ملازماؤں اور [illegible] دار خواتین نے ان غمزدہ عورتوں کو سنبھال لیا۔ جوان بیٹے کے جنازے کے پاس بیٹھی معظم شاہ کی ماں کے بین ان تینوں کو دیکھ کر مزید تیز ہوگئے۔ وہ ایک دوسرے سے گلے مل کر روتی رہیں اور باہر کھڑا ان آوازوں کو سنتا عالم شاہ ٹوٹتا بکھرتا رہا۔ معظم شاہ کا جنازہ بالکل تیار صرف سجل شاہ کی آمد کے انتظار میں ہی رکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سر کے سائیں کا آخری دیدار کرلیا تو آہوں اور سسکیوں کے

درمیان جنازہ اٹھالیا گیا۔ صداقت شاہ اور قربان شاہ بوڑھے تھے اس لیے عالم شاہ ہی کو زیادہ تر ذمے داریاں نبھانی تھیں۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ وہ خود موت کے منہ سے نکل کر آیا ہے اور ابھی کچھ دن مزید اسے احتیاط کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ خاندان کے چند دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مل کر معظم شاہ کو قبر میں اتارنے کا فریضہ بھی اس نے اپنے ہاتھ سے انجام دیا لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور قبر پر مٹی ڈالنے کا کام دوسروں پر چھوڑ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

''مظلوم کی آہ کبھی خالی نہیں جاتی۔ منشی عبدالحق کی دھی کے ساتھ جب سے حویلی میں ظلم ہوا ہے، تب سے حویلی والوں کو سکھ نصیب نہیں۔ پہلے سائیں عالم شاہ اتنی بری طرح زخمی ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے اور اب اس کی اپنی بہن بیوہ ہوگئی۔ سچ ہے بھئی دوسروں کی ماں بہن کی طرف بری نظر ڈالنے والے کو خود بھی سکھ نصیب نہیں ہوتا۔''

معظم شاہ کے جنازے میں پورا گاؤں ہی شریک تھا۔ جنازے کے شرکاء میں سے ہی کسی نے بہت دھیمی آواز میں یہ تبصرہ کیا تھا جو عالم شاہ کے کانوں میں پڑ گیا تھا۔ یقیناً تبصرہ کرنے والے کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ قریب ہی موجود ہے۔ سن کر اس کی مٹھیاں غصے سے بھنچ گئی تھیں لیکن اس نے پلٹ کر تبصرہ کرنے والے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ آسیہ نے بڑی چالاکی سے اس کے سر پر ایک سنگین الزام تھوپ دیا تھا جس پر یقیناً بہت سے لوگ حقیقت کا گمان کرتے تھے۔ وہ کس کس کا گریبان پکڑ کر اسے جھٹلاتا لیکن اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ اس کی بہن کا سہاگ اجڑ جانے کا سبب اس کی بداعمالیوں کو قرار دیا جائے اور قاتل آزاد گھومتے رہیں۔ وہ جو پہلے ہی غم اور غصے کی آگ میں جھلس رہا تھا اس تبصرے کو سننے کے بعد وہاں کھڑا نہ رہ سکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا قبرستان سے باہر کی طرف بڑھنے لگا۔ سرمد سائے کی طرح اس کے ساتھ تھا۔

''حکم کریں سائیں! کیا حویلی چلنا ہے؟'' وہ اپنی گاڑی کے قریب پہنچا تو سرمد نے ادب سے اس سے پوچھا۔

''نہیں۔ اسپتال چلو۔'' اس نے حکم دیا اور سرمد کے کھولے ہوئے دروازے سے گزر کر گاڑی کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ سرمد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ جلد ہی وہ گاؤں کے چھوٹے سے اسپتال کے باہر موجود تھے۔ اسپتال کی عمارت خاصی پرانی اور خستہ تھی البتہ صفائی کا انتظام رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ عملہ بھی محدود تھا اور سارا عملہ عالم شاہ سے واقف تھا۔ کل سے وہ کئی بار وہاں کا چکر لگا چکا تھا۔ معظم شاہ سمیت دیگر مقتولین کی لاشوں کی وصولی کے ساتھ ساتھ اسے جمن کی بھی فکر تھی۔ جمن ہی وہ واحد شخص تھا جو حملہ آوروں کے بارے میں کوئی معلومات فراہم کرسکتا تھا کہ وہ کون تھے؟ لیکن جمن کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے کچھ پوچھا جاسکتا۔ جسم سے بے تحاشا خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی اپنی جان خطرے میں تھی اور ڈاکٹرز اس کی جان بچانے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ رات ڈاکٹر نے اس کے بارے میں حوصلہ افزا رپورٹ دی تھی اور خیال ظاہر کیا تھا کہ آج وہ ہوش میں آسکتا ہے۔ کم سہولیات کے باوجود وہ جمن کے جسم میں پیوست گولیاں نکالنے میں کامیاب رہے تھے اور اس کے بارے میں یہ اچھی اطلاع دی تھی کہ کسی بھی گولی نے اس کے اندرونی اعضا کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ عالم شاہ اس وقت جمن سے ملنے کے لیے ہی وہاں آیا تھا اور سیدھا اس کمرے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا جہاں جمن کو رکھا گیا تھا۔ ابھی وہ اس کمرے سے دور ہی تھا کہ اس نے دو ڈاکٹروں کو وہاں سے باہر نکلتے دیکھا۔ ان میں سے ایک اسپتال کا مستقل ملازم تھا جبکہ دوسرا ڈاکٹروں کی اس ٹیم کا حصہ تھا جسے صداقت شاہ نے حیدر آباد سے بلوایا تھا۔ عالم شاہ نے ایک نظر میں ہی بھانپ لیا کہ دونوں ڈاکٹروں کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات ہیں۔ ڈاکٹروں کی نظر اس پر پڑی تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''خیریت؟'' اس نے ان کے قریب پہنچ کر سوالیہ نظروں سے انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے شاہ صاحب! جمن مرگیا ہے۔'' اسپتال کے مستقل ڈاکٹر نے اسے جواب دینے میں پہل کی۔

''مگر کیسے؟ آپ لوگوں کا تو یہی کہنا تھا کہ اس کی حالت کافی بہتر ہے اور آج وہ ہوش میں آجائے گا۔ آپ تو اتنے پُراعتماد تھے کہ آپ نے میری جمن کو شہر بھجوانے کی آفر بھی رد کردی تھی۔'' عالم شاہ کے لیے جمن کی موت کی خبر ایک اور صدمہ تھا چنانچہ اس کی آواز خود بخود ہی بلند ہوگئی اور اس نے تیز لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔

''ہم نے اپنے طور پر ایک بالکل درست فیصلہ کیا تھا۔ ہمیں اپنے ٹریٹمنٹ پر بھروسا تھا اور اس خدشے کی وجہ

سے پیشنٹ کو شہر لے جانے کی مخالفت کی تھی کہ راستے میں دھچکے وغیرہ لگنے سے اس کے زخموں سے دوبارہ خون کا رساؤ شروع ہو جاتا جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔'' ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''جان سے تو وہ اب بھی چلا گیا نا!'' عالم شاہ نے غصے میں اپنی ہی ہتھیلی پر گھونسا مارا۔

''وہ زخموں کی وجہ سے جان سے نہیں گیا ہے۔ اس کی جان جانے کا سبب ایک حادثہ ہے۔'' ڈاکٹر نے اس پر انکشاف کرنے کی کوشش کی۔

''کیسا حادثہ......؟'' عالم شاہ چونکا۔

''جمن کو سانپ نے کاٹا ہے۔ آج صبح ہی اسے ہوش آگیا تھا لیکن شدید تکلیف کے باعث ہمیں اسے ایسی میڈیسنز دینی پڑی تھیں کہ وہ تکلیف کو محسوس نہ کرے اور سکون سے سوتا رہے۔ نرس مسلسل اس کے کمرے میں ڈیوٹی دے رہی تھی۔ ابھی آدھا گھنٹا قبل نرس کی چیخ و پکار سن کر ہم اور دوسرا اسٹاف اس طرف گئے تو پتا چلا کہ کمرے میں ایک خطرناک سانپ موجود ہے۔ نرس تو بھاگ کر باہر آگئی لیکن بستر پر سوئے ہوئے جمن کو سانپ نے کاٹ لیا۔ دو آدمیوں نے مل کر سانپ کو ختم کیا تو میں اور ڈاکٹر صاحب کمرے میں جا کر جمن کو دیکھنے میں کامیاب ہو سکے لیکن ہمیں دیر ہو گئی تھی۔ سانپ بے حد زہریلا تھا اور جمن کے اندر قوت مدافعت نہ ہونے کے برابر ہی رہ گئی تھی اس لیے ہماری کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہیں ہو سکا۔'' ڈاکٹر نے اسے تفصیلی جواب دیا۔ حیدر آباد سے آنے والا ڈاکٹر خاموش کھڑا تائیدی انداز میں سر ہلاتا رہا۔

''اسپتال میں سانپ کہاں سے آیا؟ کیا کسی نے جمن کو قتل کرنے کے لیے یہ چال چلی ہے؟'' عالم شاہ کے شکوک اس کی زبان پر آگئے۔

''ہم کچھ نہیں کہہ سکتے شاہ صاحب! اسپتال میں سانپ آجانے کے واقعات اس سے پہلے بھی ہو چکے ہیں لیکن کبھی کوئی موت واقع نہیں ہوئی۔ اکثر مریضوں یا ان کے ساتھ آنے والوں نے خود ہی سانپ کو مار ڈالا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے کے لوگوں کے لیے سانپ ایک عام چیز ہے اور وہ بہ آسانی اس سے نمٹ لیتے ہیں۔ نرس مقامی نہ ہونے کی وجہ سے سانپ کو دیکھ کر زیادہ گھبرا گئی تھی۔'' ڈاکٹر نے شانے اچکا کر جواب دیا تو عالم شاہ کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ یہ بات بالکل درست تھی کہ سانپ کا نکلنا وہاں ایک عام سی بات تھی اور جمن کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کو اتفاق سمجھا جا سکتا تھا لیکن اس کا دل اس حادثے کو اتفاق ماننے کے لیے راضی نہیں ہو رہا تھا اور دل میں یہی شک تھا کہ جمن کی زبان بند رکھنے کے لیے اسے قتل کیا گیا ہے۔

''کسی سے کہہ کر جمن کی تدفین وغیرہ کے انتظامات کرواؤ سرمد!'' کچھ دیر خاموش کھڑے رہنے کے بعد اس نے اپنے پیچھے آکھڑے ہونے والے سرمد کو حکم دیا۔ معظم شاہ کے موقع پر ہی مر جانے والے دونوں گارڈز کی تدفین کل ہو چکی تھی اور ان کی آخری رسومات کی ساری ذمے داری بھی حویلی کی طرف سے اٹھائی گئی تھی۔ جمن بے چارہ تو ویسے بھی دنیا میں تنہا تھا اور اس کا جینا مرنا حویلی میں ہی تھا اس لیے اس کی آخری رسومات تو ہر حال میں حویلی والوں ہی کی ذمے داری بنتی تھی۔

''سوری شاہ صاحب! اس کیس کے تفتیشی افسر کو اطلاع دیے بغیر لاش کو اسپتال سے نہیں لے جایا جاسکے گا۔'' ڈاکٹر نے اسے ٹوکا۔

''دے دو اسے بھی اطلاع۔ اس نے پہلے کون سا تیر مارا ہے جو اب مارے گا۔'' عالم شاہ نے تلخ لہجے میں اسے جواب دیا اور واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ جمن کی موت کے بعد اب وہاں اس کے لیے کچھ باقی بھی نہیں رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''سعیدہ بیگم زوجہ خاور احمد۔'' معاذ نے گلاب کے تازہ پھولوں سے ڈھکی قبر پر لگے کتبے پر یہ الفاظ پڑھے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کی پیاری امی کتنی جلدی اس دنیا سے چلی گئی تھیں اور وہ مٹی کے اس ڈھیر کے نیچے چھپے ان کے وجود کو اب کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انہیں دیکھنا تو دور کی بات، اس کی رسائی میں تو مٹی کا یہ ڈھیر بھی نہیں تھا جسے قبر کہا جاتا ہے۔ وہ ان کی قبر پر چلا جاتا اور اس سے لپٹ کر رو لیتا تو بھی شاید اسے تھوڑا سا قرار آجاتا لیکن اس کے نصیب میں تو یہ بھی نہیں تھا اور وہ اپنے کسی ناکردہ گناہ کے بدلے اس قفس میں پھنس کر رہ گیا تھا جہاں اسے اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ ایسا بندر بن کر رہ گیا تھا جس کے پاس مداری کی ڈگڈگی پر ناچتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ اب بھی وہ اپنی مرضی یا خواہش کے بغیر اسکرین پر وہ تصویریں اور چند سیکنڈ پر مشتمل ایک ویڈیو دیکھ رہا تھا جس میں اس کی امی کی قبر کو مختلف زاویوں سے دکھایا جا رہا تھا۔

''ہیلو معاذ، کیسے ہو؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہوئی یا نہیں؟'' اسے امی کی قبر کی تصویریں اور ویڈیو دیکھنے سے تکلیف ہورہی تھی لیکن وہ انہیں دیکھنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ بار بار پلٹ کر دیکھنے میں یوں مگن تھا کہ اسپیکر سے ابھرنے والی جانی پہچانی آواز نے بھی اسے چونکا دیا تھا۔

''میں تم سے تمہاری طبیعت پوچھ رہی ہوں معاذ! تمہارے ہاتھ کا زخم اب کیسا ہے؟''

''تم لوگوں نے میرے دل پر جو زخم لگایا ہے اس کے مقابلے میں یہ معمولی زخم کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔'' معاذ نے اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھتے ہوئے تلخی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ مکا مار کر آئینہ توڑنے کے نتیجے میں اس کے ہاتھ پر اچھا خاصا زخم آ گیا تھا۔ دورانِ بے ہوشی اس کے زخم کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی لیکن اسے زخم کا ہوش ہی کہاں تھا۔ ابھی تو وہ اپنی ماں کی حسرت ناک موت کو ہی بیٹھا رو رہا تھا۔

''ہماری تم سے یا تمہاری فیملی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ نہ ہی ہم خوامخواہ کسی کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہتے ہیں۔ تمہاری امی کی موت پر مجھے ذاتی طور پر افسوس ہے لیکن اس کے لیے تم ہمیں الزام نہیں دے سکتے۔ وہ طبعی موت مری ہیں۔''

''میں تم سے کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تم جو چاہتی ہو وہ بولو۔'' معاذ کو اس کے مصنوعی افسوس کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ بیزاری سے جواب دیا۔

''ہمیں تم سے تمہارے تعاون کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ تم اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ تمہارا انسٹرکٹر تم سے مطمئن ہے اور اب تمہیں پروفیسر وکٹر کو مطمئن کرنا ہے۔ وکٹر کئی علوم پر مہارت رکھتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس کی قابلیت سے فائدہ اٹھاؤ۔ میرا ذاتی اندازہ بھی تھا اور وکٹر نے بھی تمہارا تجزیہ کر کے پیشگوئی کی ہے کہ تم ہپناٹزم کا علم سیکھنے کی فطری صلاحیت رکھتے ہو۔ میں اس ہپناٹزم کی بات نہیں کر رہی جو کلینیکل سائیکولوجی پڑھنے والے ڈاکٹرز جانتے ہیں۔ ہپناٹزم کی وہ قسم اتنی اہم نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے ڈاکٹر کو اپنے معمول کی اجازت درکار ہوتی ہے اور اس کی مدد سے وہ محدود کامیابیاں ہی حاصل کر سکتا ہے۔ میں تمہیں جو ہپناٹزم سکھانا چاہتی ہوں وہ بہت کم لوگ ہی سیکھ پاتے ہیں بلکہ یوں سمجھ لو کہ چند خاص لوگ جنہیں قدرت کی طرف سے خاص صلاحیتیں ملی ہوتی ہیں، وہی اس قسم کا ہپناٹزم سیکھ سکتے ہیں اور اتفاق سے تم ان خاص لوگوں میں سے ایک ہو۔ تم اگر ہپناٹزم کی اس صلاحیت میں مہارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو دنیا کا تقریباً ہر شخص تمہارا فرمانبردار بن جائے گا۔ تم جسے چاہے مسخر کر سکو گے اور جس کو چاہو گے اپنا غلام بنا کر اس سے اپنی مرضی کا کام لے سکو گے۔''

''اللہ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور مجھے دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' ہپناٹزم کے ذکر نے معاذ کو چونکا دیا تھا اور ایک بار پھر اسے یہ خیال آیا تھا کہ وکٹر اس پر اپنی یہ صلاحیت استعمال کرتا رہا ہے لیکن کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اس طرف سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔

''یہاں ہم تمہیں اس لیے نہیں لائے ہیں کہ تم سے تمہارے شوق، مرضی، پسند اور ناپسند پوچھتے رہیں۔ یہاں رہ کر تمہیں وہ کرنا ہوگا جو ہم تم سے چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ تم پروفیسر وکٹر سے ہپناٹزم سیکھو تو تمہیں سیکھنا پڑے گا۔'' معاذ کا جواب اسے پسند نہیں آیا چنانچہ تنک کر بولی۔

''میں نے تمہیں انکار تو نہیں کیا ہے۔ جیسے باقی سب کچھ سیکھ رہا ہوں، یہ بھی سیکھ لوں گا۔'' معاذ کے لہجے کی بیزاری برقرار رہی۔

''باقی چیزوں اور اس علم میں فرق ہے۔ اب تک تم نے جو کچھ سیکھا اس کے لیے تمہیں فزیکلی کوآپریٹ کرنا تھا لیکن اب تمہیں ذہنی تعاون کرنا ہے۔ تم پروفیسر وکٹر کو اپنے ذہن تک رسائی دو گے تو وہ تمہیں اس علم سے متعلق ضروری مشقیں کروانے کے ساتھ ساتھ تمہارے ذہن میں بھی سب کچھ فیڈ کرتے جائیں گے۔ اس طرح تم بہت جلد سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔'' اس نے معاذ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اکھڑ گیا اور ناراضگی سے بولا۔

''یہ کیا بکواس ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ شخص میرے ذہن تک رسائی حاصل کرنے کے بعد میرے بارے میں جو کچھ چاہے گا، جان لے گا اور جو چاہے میرے دماغ میں فیڈ کر دے گا۔ اس طرح تو میں ایک کٹھ پتلی بن کر رہ جاؤں گا۔''

''تمہیں اجازت دینی ہوگی معاذ! تم نہ مانے تو ہم کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی پوری کرنے کے معاملے میں بڑے ظالم لوگ ہیں۔ اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے ہم زندوں کو تو کیا مُردوں کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اب تم خود ہی سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں کیسا لگے گا

اگر تمہاری پیاری امی کی قبر کھود کر اس میں سے ان کی لاش نکال لی جائے اور اس لاش کو کتے بلیاں سڑکوں پر نوچتے کھسوٹتے پھریں یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لاش کسی ہوس کے مارے جانور نما انسان کے حوالے کردی جائے۔ تم نے میڈیا پر ایسی رپورٹس تو دیکھی ہوں گی کہ کیسے بعض لوگ مُردہ عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتے اور انہیں بھی زیادتی ......''

''اسٹاپ ...... اسٹاپ اٹ۔ میں تمہاری اتنی بے ہودہ باتیں نہیں سننا چاہتا۔'' معاذ نے چیخ کر بولتے ہوئے اس کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔

''ہم صرف باتیں کرنے والے لوگ نہیں ہیں معاذ! ہم عملی طور پر بھی یہ سب کچھ کرواسکتے ہیں۔'' معاذ کے غصے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے اپنا سر تھام لیا۔

''تمہارے پاس ہماری بات ماننے کے سوا کوئی چوائس نہیں ہے معاذ!'' وہ اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے، میں تمہاری بات مان لوں گا لیکن تمہیں بھی میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری کرنی ہوگی۔'' معاذ نے بالآخر اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

''کیا تم کوئی شرط عائد کرنا چاہتے ہو؟'' وہ اس کی بات پر چونکی۔

''شرط نہیں بس ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔ میں مسلسل بند کمروں میں رہتے ہوئے بیزار آگیا ہوں۔ تم میرے لیے کسی ایسے کمرے کا انتظام کردو جہاں سے میں تھوڑا سا ہی سہی، آسمان دیکھ سکوں۔'' اس نے اپنی خواہش بیان کی۔

''کیا یہاں سے فرار کی ترکیب سوچ رہے ہو؟'' وہ ہنسی۔

''میری ساری کمزوریاں تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ فرار کی تو گنجائش ہی نہیں ہے میرے پاس۔ پھر بھی اگر تمہیں مجھ سے کوئی ڈر ہے تو اتنا کرنا کہ میرے لیے کسی ایسی جگہ کا انتظام کردینا جہاں کوئی بہت ہی چھوٹی سی کھڑکی یا ہوادان وغیرہ موجود ہو جس میں سے میں نکل نہ سکوں۔ چاہو تو اپنی تسلی کے لیے اس میں مضبوط سلاخیں وغیرہ لگوا لینا۔'' اس نے اپنے لہجے کو عاجزانہ رکھا۔

''ٹھیک ہے۔ اس بارے میں غور کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے لیے یہ کوئی اتنی بڑی فرمائش نہیں ہے۔'' اس نے نیم رضامندی کا اظہار کیا اور خاموشی اختیار کرلی۔ اس کی مستقل خاموشی پر معاذ سمجھ گیا کہ اب وہ اس سے مزید بات نہیں کرسکتا۔ مزید بات کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جو چاہتا تھا اس سے کہہ چکا تھا۔ وکٹر کے عمل کا توڑ کرنے کے لیے اسے فیضو کے علم کو حاصل کرنا تھا۔ اپنے بچاؤ کے لیے اس کے پاس بس یہی ایک راہ تھی۔

☆☆☆

عالم شاہ عالمِ اضطراب میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا پھر رہا تھا۔ جمن کی موت کے بعد معظم شاہ کے قاتلوں تک پہنچنے کے سارے راستے بند ہوگئے تھے لیکن اچانک ہی ایک راہ نکل آئی تھی۔ یہ راہ اسے اس کے جاں نثار ملازم سرمد نے دکھائی تھی۔ سرمد نے اس پر انکشاف کیا تھا کہ وہ خدیجہ نامی ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہے جو لطیف سومرو کے ہاں ملازمت کرتی ہے اور اس کے کہنے پر وہاں کی بہت سی معلومات فراہم کرسکتی ہے۔ عالم شاہ کو ایک راہ دکھائی دی تو وہ خدیجہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوگیا اور سرمد سے مطالبہ کیا کہ کسی طرح جلد از جلد خدیجہ کو یہاں بلوایا جائے۔ سرمد اس کا حکم بجالایا تھا اور اس کی دی اطلاع کے مطابق آج خدیجہ ان کے گاؤں عالم شاہ میں موجود تھی۔ عالم شاہ کے گاؤں کا نام عالم شاہ ہی تھا۔ اصل میں گاؤں کا یہ نام اس کے پردادا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ وہ نہایت نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے جو زمینداری کی جھنجھٹوں سے بچ جانے والا وقت عبادت اور مخلوقِ خدا کی خدمت میں گزارتے تھے۔ بیٹوں کے بالغ ہونے کے بعد انہوں نے دنیاوی جھمیلوں سے مکمل کنارہ کشی اختیار کرکے خود کو اللہ اور اس کی مخلوق کے لیے وقف کردیا تھا۔ ان کی نیک نیتی کا اثر تھا کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے والے ہر حاجت مند کا مسئلہ حل ہوجاتا تھا، یوں لوگوں کو ان سے خاص عقیدت تھی اور اس عقیدت کے باعث ہی گاؤں کا نام عالم شاہ پڑگیا تھا۔ صداقت شاہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام اپنے ان ہی بزرگ کے نام پر رکھا تھا۔ یوں گاؤں اور بیٹے کا نام ایک ہی ہوگیا تھا۔

سرمد نے عالم شاہ کو اطلاع دی تھی کہ خدیجہ یہاں اپنی خالہ سے ملنے کے بہانے آئی ہوئی ہے۔ خدیجہ کے ساتھ اس کی ماں بھی آئی تھی اور خدیجہ ماں پر یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ سرمد کے کہنے پر عالم شاہ سے ملنے جارہی ہے۔ اس لیے منصوبہ یہ بنایا گیا تھا کہ خدیجہ اپنی ہم عمر خالہ زاد بہن کے ساتھ کسی بہانے گھر سے نکلے گی اور سرمد کچھ دیر کے لیے اسے حویلی لے آئے گا۔ خدیجہ نے کچھ دیر قبل موبائل فون پر سرمد کو اطلاع دی تھی کہ وہ خالہ

کے گھر سے نکل چکی ہے چنانچہ سرمد اسے لینے چلا گیا تھا اور عالم شاہ اس کی خدیجہ سمیت واپسی کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ انتظار کا یہ دورانیہ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور جلد ہی سرمد خدیجہ کو لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

خدیجہ بیس بائیس سال کی قبول صورت لڑکی تھی جو اس وقت ذرا گھبرائی ہوئی محسوس ہونے کے باوجود خود کو پُراعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عالم شاہ سے سامنا ہوتے ہی اس نے اسے ادب سے سلام کیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''زیادہ لمبی بات کرنا بے کار ہے۔ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے بتاؤ کہ جس روز ادا معظم لطیف سومرو سے ملنے اس کی حویلی گئے تھے، وہاں کیا ہوا تھا؟ کیا کوئی ایسی بات ہوئی تھی جس کی وجہ سے دونوں فریقین کے درمیان تلخی پیدا ہو گئی ہو؟'' عالم شاہ نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''میں سرمد کے کہنے پر آپ کو سب کچھ بتانے پر تیار تو ہوں سائیں، پر چاہتی ہوں کہ کسی کو پتا نہیں چلے کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا اور بات سائیں لطیف سومرو تک پہنچ گئی تو وہ میری کھال میں بھس بھروا دیں گے۔''

''تم بے فکر رہو۔ یہاں سے بات باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم رازداری کا بھی خیال رکھیں گے اور تمہیں انعام بھی دیں گے۔'' عالم شاہ ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا اور پورے کروفر سے اسے یقین دلایا۔

''مجھے انعام کا لالچ نہیں ہے سائیں۔ میں صرف سرمد کی خاطر آپ کو سب کچھ بتانے کے لیے راضی ہوئی ہوں۔'' اس نے بڑی بے ساختگی سے جواب دیا تو عالم شاہ کی نظریں خود بخود سرمد کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے یوں دیکھنے پر سرمد ذرا سا جھینپ گیا اور عالم شاہ کو اندازہ ہوا کہ اس کے اور خدیجہ کے درمیان خاص تعلقِ خاطر ہے۔ اعصاب زدہ ہونے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی جس پر سرمد مزید جھینپا ہوا نظر آنے لگا۔ عالم شاہ نے اس پر سے اپنی نظریں ہٹا کر خدیجہ پر مرکوز کر لیں۔ عام سے سوتی لباس میں ملبوس وہ قبول صورت لڑکی سرمد کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ جان کر اسے اچھا لگا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ جس روز ادا معظم، لطیف سومرو سے ملنے اس کی حویلی گئے تو وہاں کیا ہوا تھا؟''

خدیجہ سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ سنجیدہ تھا اور ہونٹوں کی مسکراہٹ ختم ہو گئی تھی۔

''سائیں معظم شاہ حویلی آئے تو میں ہی ان کی خاطر مدارات کے لیے ٹرالی سجا کر لے گئی تھی۔ انہیں کافی دیر تک انتظار میں بٹھانے کے بعد سائیں لطیف سومرو ان سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ چھوٹے سائیں شکیل سومرو بھی موجود تھے۔ ٹرالی اندر پہنچانے کے بعد میں باہر آ گئی تھی اس لیے اندر کیا باتیں ہوئیں، یہ تو میں نے اپنے کانوں سے نہیں سنیں لیکن بعد میں سائیں کے ایک خاص کارندے کی زبانی پتا چلا کہ سائیں نے سائیں معظم شاہ کی بات ماننے سے انکار کرتے ہوئے صاف کہہ دیا تھا کہ انہوں نے وہ زمین سائیں قربان شاہ سے قیمتاً لی ہے اور اب وہ قانونی طور پر اس زمین کے مالک ہیں اس لیے انہیں اس زمین کی واپسی کے سلسلے میں تنگ نہ کیا جائے۔ اس موقع پر جبکہ سائیں معظم شاہ ناکام ہو کر واپس جانے والے تھے، چھوٹے سائیں شکیل سومرو نے انہیں چرکا لگایا اور طنز کرتے ہوئے بولے کہ سنا ہے زمین مال سمان ہوتی ہے اور تمہارے باپ نے ضرورت پڑنے پر اسے ہی بیچ ڈالا۔ اس کا مطلب ہے کہ کبھی تم لوگوں کے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہیں ہوگا تو تم اپنی عورتوں کو بھی بیچ سکتے ہو۔ اگر ایسا ہو تو سیدھے میرے پاس آ جانا۔ سنا ہے تمہاری زال بہت خوبصورت ہے۔ میں اس کے اچھے دام دے دوں گا۔ ایسی بات سن کر ظاہر ہے کوئی بھی مرد برداشت نہیں کر سکتا۔ سائیں معظم شاہ بھی بپھر گئے۔ انہوں نے چھوٹے سائیں کا گریبان پکڑ لیا اور دو چار ہاتھ بھی مارنے میں کامیاب ہو گئے لیکن فوراً ہی ہمارے ہاں کے کارندوں نے انہیں جکڑ لیا اور پھر دونوں طرف سے اسلحہ نکل آیا۔ ایسے میں اگر بڑے سائیں لطیف سومرو دخل نہ دیتے تو جانے کیا ہوتا۔ انہوں نے چھوٹے سائیں کو ڈانٹا کہ انہیں ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ساتھ ہی سائیں معظم شاہ کو حکم دیا کہ وہ فوراً وہاں سے چلے جائیں۔ سائیں معظم شاہ نے ان کی بات مان لی اور حویلی سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جیسے ہی بڑے سائیں اپنے کمرے میں گئے، چھوٹے سائیں بھی حویلی سے روانہ ہو گئے۔ بڑے سائیں کو ان کے جانے کے کافی دیر بعد پتا چلا۔ انہوں نے کچھ لوگوں کو دوڑایا کہ چھوٹے سائیں کا معلوم کریں۔ خود بھی فون پر ان سے بات کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بات نہ ہوئی اور گھنٹا بھر بعد چھوٹے

سائیں خود ہی واپس آگئے۔ اس وقت ان کی صورت عجیب سی ہو رہی تھی۔ بڑے سائیں انہیں اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ وہاں دونوں کے بیچ کیا بات ہوئی، کسی کو نہیں معلوم۔ کمرے کا دروازہ دوبارہ کھلا تو ہم نے دیکھا کہ چھوٹے اور بڑے سائیں دونوں کا موڈ خراب تھا۔ بڑے سائیں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ اسی وقت چھوٹے سائیں کو لے کر شہر روانہ ہو جائے۔ روانگی کے وقت میں نے خود دیکھا تھا کہ چھوٹے سائیں کے قدم نشے سے لڑکھڑا رہے تھے اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے کہ وہ اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں ہیں اور سب سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چھوٹے سائیں کا نشے میں ہونا اور الٹی سیدھی باتیں کرنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن صبح صبح سائیں معظم شاہ کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ قتل ہو جانے کی اطلاع حویلی پہنچی تو میرا ماتھا ٹھنک گیا، پر میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کر سکتی سائیں۔ میں نے جتنا دیکھا اور سنا، وہ آپ کو سچ سچ بتا دیا۔ آگے آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔''

خدیجہ نے ایک سانس میں پوری داستان کہہ سنائی تھی جسے سن کر عالم شاہ کے چہرے پر غصے کی سرخی چھا گئی تھی۔ شکیل سومرو کی بدزبانی نے اسے سب سے زیادہ طیش دلایا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ اپنے گھر کی خواتین کے بارے میں الٹے سیدھے ریمارکس پر معظم کس کیفیت سے دوچار ہوا ہوگا۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ معظم کے قتل کا جرم شکیل پر ثابت ہوتا یا نہیں، وہ اسے اس کی بدزبانی کے جرم میں ہی زندہ گاڑ ڈالتا۔

''میں نے سب بتا دیا سائیں! اب مجھے اجازت دیں کہ میں جاؤں۔'' وہ بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کا غصہ اس کے چہرے پر واضح تھا اس لیے خدیجہ نے سہمی ہوئی آواز میں اس سے اجازت طلب کی۔

''جاؤ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کیا اس دن کے بعد سے شکیل سومرو دوبارہ گاؤں واپس آیا ہے؟''

''نہیں سائیں! وہ نہیں آئے۔ میں نے سنا تھا کہ بڑے سائیں ان پر ملک سے باہر جانے کے لیے زور ڈال رہے ہیں۔ شاید وہ چلے جائیں۔'' خدیجہ نے جواب دیا اور ایک بار پھر اس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

''جاؤ سرمد، اسے چھوڑ کر واپس آؤ۔'' اس بار عالم شاہ، خدیجہ کے بجائے براہِ راست سرمد سے مخاطب ہوا۔ سرمد نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی اور چند منٹوں میں ہی واپس آ گیا۔ یقیناً وہ خدیجہ کو حویلی کے دروازے پر ہی چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔

''شہر میں شکیل سومرو کا اتا پتا معلوم کرو سرمد! اس سے پہلے کہ وہ اڑ جائے، مجھے اس سے حساب کرنا ہے۔ لگتا ہے اس کی طرف ہمارا بہت لمبا چوڑا حساب کتاب نکلنے والا ہے جسے بے باق کرنا ضروری ہے اور وہ بھی جلدی۔'' سرمد کے آتے ہی اس نے اسے حکم دیا اور اس کا جواب سنے بغیر وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ جواب کی اسے ضرورت نہیں تھی کہ جانتا تھا سرمد ہر حال میں اس کے حکم کی تعمیل کرے گا۔

☆☆☆

''ہیلو ڈارلنگ! کیسی ہو؟'' وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی تیاری کا آخری جائزہ لے رہی تھی کہ موبائل کی گھنٹی پر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اسکرین پر سونیا خان کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر کے ہیلو کا لفظ کہا تھا، دوسری طرف سے سونیا نے بے تکلف انداز میں اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''کول...... آپ سنائیں۔ آپ نے کیسے مجھے یاد کیا؟'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دے کر فون کرنے کا سبب پوچھا۔

''تمہارے لیے ایک اچھا موقع نکل آیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق آج کامران یزدانی کو مال کی ڈیلیوری لینے کے لیے کہیں بھیجا جا رہا ہے۔ یزدانی خود بیمار ہے اس لیے بیٹے کو بھیج رہا ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ کامران تمہارے ہر شو میں شرکت کر رہا ہے اور تم سے مسلسل تنہائی میں ملاقات کا وقت مانگ رہا ہے تو آج کسی طرح اس کے ساتھ نتھی ہو جاؤ بلکہ ایسا کرو کہ اسے فون کر کے آج کے شو کے لیے خصوصی دعوت دو اور ساتھ ہی اشارہ بھی دے دو کہ آج تم فری ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری دعوت کو نظر انداز نہیں کر سکے گا اور وقت کی کمی کے باعث تمہیں اپنے ساتھ ہی لے جانے پر مجبور ہو جائے گا۔ وہ راضی ہو گیا تو آگے تم اپنے اور ہمارے لیے موقع کی مناسبت سے بہت کچھ کر سکتی ہو۔'' سونیا خان نے اپنے فون کرنے کا مقصد بتایا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی اور اپنے سابقہ لہجے میں بولی۔

''آپ فکر نہ کریں میڈم! میں سب ہینڈل کرلوں گی۔''

''او کے...... وش یو بیسٹ آف لک۔'' سونیا خان

نے کہہ کر فون بند کر دیا تو اس نے فوراً اپنے موبائل میں فیڈ کامران یزدانی کا نمبر نکال کر ڈائل کیا۔ دوسری گھنٹی پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

''مائی لک، مس باربی نے مجھے یاد کیا ہے۔'' دوسری طرف سے کامران کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''میں نے کنفرم کرنے کے لیے کال کی تھی کہ آپ آج آ رہے ہیں یا نہیں۔ آج آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔''

''میں آ رہا ہوں۔ آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ تم نے مجھے اپنا دیوانہ جو بنا لیا ہے۔'' اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسا، پھر بولا۔ ''سرپرائز والی بات کر کے تم نے میرا شوق مزید بھڑکا دیا ہے۔ اب تو میں اڑ کر تم تک پہنچوں گا۔''

''اڑ کر ہی آیئے۔ شو شروع ہونے میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔ شو سے پہلے تو ملاقات کا موقع مل نہیں سکتا لیکن شو کے بعد آپ ضرور مجھ سے ملیے گا۔ بھولیں گے تو نہیں نا؟'' اس نے لوچ دار آواز میں گفتگو کرتے ہوئے آخر میں ایسے ناز سے پوچھا کہ کامران یزدانی پھڑک اٹھا اور عاشقانہ لہجے میں بولا۔

''تم سے ملنا کون بھول سکتا ہے، مائی باربی ڈول! تم تو وہ ہو جو بندے کو اس کا اپنا آپ بھلا دو لیکن بندہ تمہیں نہ بھول سکے۔'' جواب میں اس نے کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور بولی۔

''آپ کا شدت سے انتظار رہے گا۔'' ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ کامران کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ وہ اس کی اتنی لگاوٹ کے مظاہرے پر ہی ایسا دوڑا ہوا آئے گا جیسے مکھیاں شیرے پر لپکتی ہیں۔ فون بند کرنے کے بعد وہ کامران یزدانی سے ملاقات کی تیاری کرنے لگی اور الماری کھول کر اس کی ایک خفیہ دراز میں رکھی شیشے کی چھوٹی سی ٹیوب نکالی۔ اس ٹیوب میں موجود ننھی شے ایسا خطرناک ہتھیار ثابت ہو سکتی تھی کہ وہ بغیر کسی اسلحے کو استعمال کیے کامران یزدانی کو زیر کر سکتی تھی۔ ٹیوب کو اپنے خوبصورت سے کلچ میں رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک شکاری کی سی چمک تھی۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ انٹرکام بج اٹھا۔ دوسری طرف حسبِ توقع انتظامیہ کا آدمی تھا جو اسے اطلاع دے رہا تھا کہ شو کا وقت ہو چکا ہے اور اسے لینے کے لیے دو سیکیورٹی گارڈز اس کے سوئٹ کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔ انٹرکام کا ریسیور رکھ کر اس نے آئینے پر ایک آخری نظر ڈالی اور اپنی تیاری سے مکمل طور پر مطمئن ہو کر دروازے کی طرف بڑھی۔

یونیفارم میں ملبوس گارڈز حسبِ اطلاع اس کے منتظر تھے۔ وہ ایک شانِ بے نیازی سے ان کے جلو میں آگے بڑھنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس ہوٹل کی انتظامیہ کی ناک کا بال بنی ہوئی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے وہ بے تحاشا کما رہے تھے۔ وہ جس شو میں پرفارم کرتی تھی وہ کوئی عام شو نہیں ہوتا تھا جہاں ہر ایرا غیرا منہ اٹھا کر چلا آئے۔ ایروں غیروں کو تو اس شو کی اطلاع بھی نہیں تھی اور صرف ہائی کلاس کے لوگوں کو بہت مہنگے ٹکٹ کے عوض وہاں مدعو کیا جاتا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق اس شو میں مقامی پرفارمر کو بہت کم موقع دیا جاتا تھا۔ گنتی کی چند ایک نامی گرامی ہیروئنیں جو فلم انڈسٹری کے ڈوبنے کے بعد گھروں میں بے کار بیٹھی تھیں اور کمانے کے لیے ایسے مواقعوں کی متلاشی رہتی تھیں، اس شو تک رسائی حاصل کر سکی تھیں ورنہ زیادہ تر غیر ملکی فنکاروں ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کا تعارف بھی غیر ملکی فنکارہ کے طور پر ہی کروایا گیا تھا اور اس کے بارے میں یہ گپ بازی کی گئی تھی کہ فی الحال وہ تھیٹر کی دنیا سے وابستہ ہے لیکن ہالی وڈ کی ایک فلم سائن کر چکی ہے جس کی شوٹنگ جلد شروع ہونے والی ہے۔ لوگوں کو اس گپ پر یقین تھا یا نہیں لیکن وہ اس کے حسن اور پرفارمنس کی کشش میں وہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ آج بھی وہ اسٹیج پر پہنچی تو اس کے مداحوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ ان میں سے کچھ نئے چہرے تھے جبکہ کئی ایسے تھے جو کئی بار اس کے شو میں شرکت کر چکے تھے۔ پھر بھی ہر نئے شو میں دوبارہ کھنچے چلے آتے تھے۔ کامران یزدانی عرف کامی بھی اس کے ایسے ہی متوالوں میں شامل تھا۔ اس نے حسبِ معمول دیوانوں کو مزید دیوانہ بنا ڈالنے والی پرفارمنس کا مظاہرہ کیا اور جب وہ بے قابو ہونے لگے تو اسٹیج سے غائب ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ ان دولت مندوں کے ہوش اڑانے میں اس کے حسن اور پرفارمنس کے علاوہ کچھ حصہ اس شراب کا بھی تھا جو ہوٹل کا اپنا خصوصی برانڈ تھی اور جسے لوگ بہت شوق سے نوش کرتے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے اس نے سیکیورٹی کو آگاہ کر دیا تھا کہ کامران یزدانی اس سے ملنے کے لیے آئے تو اسے روکا نہ جائے۔ ایسا ہی ہوا اور اس کے چند منٹ بعد ہی کامران بھی اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''میرے پاس ٹائم کم تھا لیکن تمہارے سرپرائز نے

شہ زور

مجھے یہاں سے جانے نہیں دیا۔'' اس کے موی ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کرتے ہوئے وہ فدویانہ لہجے میں بولا۔

مصافحہ کرنے کے بعد بھی اس نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا اور مسلسل اپنے ہاتھ سے دباتا گویا اس کے ہاتھ کے گداز سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے کامی کی یہ حرکت نظر انداز کر دی اور ہونٹوں پر قاتلانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔

''میرے سرپرائز سے پہلے ہی آپ نے وقت کی کمی کی بری خبر سنا دی ورنہ سرپرائز تو یہی تھا کہ آج میرے پاس آپ کے لیے وقت ہی وقت تھا اور میں اپنی پوری رات بھی آپ کے نام کر سکتی تھی۔''

''رئیلی......!'' اس کی بات سن کر کامران کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔

''میں آپ سے مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے خود افسوس تھا کہ ایک پُرکشش اور ہینڈسم نوجوان مسلسل مجھ سے وقت مانگ رہا ہے لیکن میں اسے مایوس کیے جا رہی ہوں اسی لیے آج جب ڈھنگ سے فرصت ملی تو آپ سے رابطہ کر لیا۔'' وہ بڑے ناز سے اور لوچ دار آواز میں اس سے مخاطب تھی۔

''یہ میری بیڈ لک ہے کہ مجھے آج ایک اہم بزنس ڈیل کے لیے شہر سے باہر جانا ہے۔'' کامران واقعی شدید مایوسی کا شکار نظر آ رہا تھا۔

''آج کے بعد میرا آپ کو ٹائم دینا مشکل ہوگا۔ جلد میں پاکستان سے واپس جانے والی ہوں۔ میرے پروڈیوسر کی کال آئی تھی۔ وہ میرے یہاں رہنے سے خوش نہیں ہے۔ دھمکی دے رہا تھا کہ اگر میں فوراً واپس نہیں آئی تو وہ فلم سے میرا نام ڈراپ کر دے گا۔ میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی اس لیے میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ویسے بھی کچھ عرصے بعد شوٹنگ کے لیے مجھے واپس جانا ہی تھا۔'' اس نے بھی اپنے چہرے پر افسردہ تاثرات سجا لیے۔

''اوہ نو...... اتنی جلدی تم کیسے واپس جا سکتی ہو۔'' کامران کو اس کی اطلاع سے جھٹکا لگا۔

''میں نے کہا نا کہ مجھے ہر حال میں جانا ہے۔ تم آج کے لیے کچھ ارینج کر سکتے ہو تو کر لو۔ میں تمہارے لیے اتنا کر سکتی ہوں کہ اگر تم چاہو تو تمہارے ساتھ چل لوں۔ تم اپنی بزنس ڈیل بھی دیکھ لینا، ساتھ ہم تفریح بھی کر لیں گے۔'' اس نے بہت چالاکی سے کامران کے آگے چارا ڈالا۔

''یہ تو بڑی زبردست آفر ہے لیکن سوچ لو کہ ہمیں ابھی کچھ دیر میں ہی نکلنا ہے اور سفر بھی تھوڑا طویل ہے، کہیں بعد میں تم شکایت نہ کرنا۔'' اس کی پیشکش پر کامران کی باچھیں کھل گئیں۔

''نو پرابلم۔ مجھے لانگ ڈرائیو پسند ہے، بس گاڑی آرام دہ ہونا چاہیے تاکہ ہم سفر کو انجوائے کر سکیں۔'' اس نے ایک ادا سے سر کو جھٹکتے ہوئے جواب دیا تو کامران خوش ہو گیا اور باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

''گاڑی کی فکر نہ کرو۔ گاڑی اتنی زبردست ہے کہ پاکستان میں گنتی کے چند لوگ ہی ایسی گاڑی استعمال کرتے ہیں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ بس ہوٹل مینجمنٹ کو اپنی روانگی کی اطلاع دے دوں۔'' اس نے کہا اور اپنا موبائل نکال کر سونیا کا نمبر ڈائل کیا۔

''میں کامران یزدانی کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ واپسی شاید کل تک ہو۔'' کال ریسیو ہوتے ہی اس نے یہ اطلاع دی اور رابطہ منقطع کر دیا۔ ہوٹل انتظامیہ کو وہ ایسی

تنبیہ

تین بچیوں اور دو بچوں کی بیوہ ماں چوتھی شادی کر رہی تھی۔ عین نکاح کے وقت بچے زور زور سے رونے لگے تو ماں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''چپ ہو جاؤ...... ورنہ آئندہ تمہیں ساتھ نہیں لاؤں گی۔''

قابل دید

ایک صاحب نے مصور سے پوچھا۔ ''آپ میری بیوی کی ہو بہو ایسی تصویر بنا دیں گے جس میں وہ اصل نظر آتی ہو؟''

''ارے جناب! آپ فکر ہی نہ کریں۔'' مصور نے انہیں تسلی دی۔ ''میں ان کی جو پورٹریٹ بناؤں گا، وہ اصل سے اتنی قریب ہوگی کہ جب بھی آپ کی نظر اس پر پڑے گی، آپ ڈر کے مارے اچھل پڑیں گے۔''

مرسلہ: محمد انور ندیم، اوکاڑہ

کوئی اطلاع دینے کی پابند نہیں تھی۔ اسے صرف شو کے وقت وہاں موجود ہونا ہوتا تھا۔ انتظامیہ بھی اسے صرف ہوٹل کے اندر سیکیورٹی دینے کی پابند تھی، باہر یہ ذمے داری سونیا نے اٹھا رکھی تھی اس لیے اس نے اسے اطلاع دی تھی۔ اطلاع دینے کے بعد اس نے موبائل کو بھی اپنے پرس میں رکھا اور کامران کو ایک منٹ رکنے کا کہہ کر سوئٹ کے دوسرے حصے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے ایک لمبا گاؤن پہن رکھا تھا اور سر پر ایک جالی دار ہیٹ تھا۔ جالی اس نے اپنے چہرے پر گرالی اور بولی۔

''لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لیے یہ انتظام ضروری تھا۔'' کامران نے اس کی بات سن کر تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ چلتے ہوئے اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ محسوس ہوئی تھی۔ یہ لنگڑاہٹ اس گولی کا نتیجہ تھی جو یزدانی ہاؤسنگ اسکیم کے قریب بشریٰ کو اس سے محفوظ رکھنے کے لیے معاذ نے اس پر چلائی تھی۔ اچھے علاج معالجے کے باعث اس کی ٹانگ ٹھیک تو ہوگئی تھی لیکن چال میں بہت معمولی سی لنگڑاہٹ باقی تھی۔ باربی نے اس کی چال کی یہ معمولی سی لنگڑاہٹ بھی محسوس کرلی تھی اور جانے کیا کچھ یاد آنے کے باعث اس کے ماتھے پر ایک بل سا پڑ گیا تھا۔ کامران یزدانی اس بل سے بے خبر اس خوشی میں مگن تھا کہ باربی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور آگے وہ اس کے پورے وجود پر تصرف حاصل کرنے جارہا تھا۔ باربی کے روپ میں اس کے اتنے قریب کون تھا، وہ قطعی نہیں پہچان سکا تھا کہ ایک تو وہ مکمل بدلے ہوئے روپ میں تھی، دوسرے اس کا تعارف ایک غیر ملکی رقاصہ کا تھا جو صرف انگریزی زبان بولتی تھی۔ ایسے میں کامران کا ذہن اس کے اصل کی طرف جاتا تو کیسے؟ لیکن وہ اپنے اصل کو نہیں بھول سکتی تھی کہ اس نے بہت کرب اور اذیت سہہ کر اپنے اصل کو چھوڑا تھا اور وہ بن گئی تھی جس کا اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔

☆☆☆

''سب ٹھیک ہے؟ شکیل سومرو کی اندر موجودگی کنفرم ہے؟'' سرمد نے کسی سے بات کر کے اپنا موبائل بند کیا تو گاڑی کی پچھلی نشست پر موجود عالم شاہ نے اس سے دریافت کیا۔

''جی سائیں! میں نے کنفرم کرلیا ہے۔ ہمارے بندے اس وقت شکیل سومرو کے گھر کے آس پاس ہی موجود ہیں۔ جیسے ہی ہماری طرف سے اشارہ ملے گا وہ ایکشن میں آجائیں گے۔'' حسب عادت سرمد نے اسے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ یہ وہی تھا جس نے عالم شاہ کے حکم پر نہ صرف شکیل سومرو کا گھر ڈھونڈ نکالا تھا بلکہ گھر کی سیکیورٹی کے بارے میں بھی ساری معلومات حاصل کرلی تھیں۔ اس کے بندے مسلسل شکیل سومرو کے گھر کی نگرانی کررہے تھے اور اب رات گئے وہ لوگ شکیل سومرو کی گھر میں موجودگی کے یقین کے ساتھ اس سے دو دو ہاتھ کرنے جارہے تھے۔ مزید چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اس کے گھر تک پہنچ گئے۔ یہ بہت بڑا اور عالیشان گھر تھا۔ گاؤں میں بھی سومرو خاندان بہت بڑے حویلی نما گھر میں رہتا تھا حالانکہ چند سال قبل لطیف سومرو اتنا بڑا زمیندار نہیں تھا۔ گزشتہ چند سالوں میں ہی اس نے سازشوں اور چالوں کی مدد سے اپنی زمینوں میں اضافہ کیا تھا، پھر بھی وہ اتنا بڑا زمیندار نہیں تھا جتنا اس کے پاس روپیہ نظر آنے لگا تھا۔ اس کی رہائش گاہیں، زیر استعمال گاڑیاں اور انتخابی مہم میں فیاضی سب کچھ اس کی حیثیت سے بڑھ کر ہی نظر آتے تھے اور یہ ایک نہ سمجھ آنے والی بات تھی۔

''ہمارے آدمی لائن کلیئر کر کے اندر آنے کا اشارہ دیں گے۔'' سرمد گاڑی گھر کے سامنے روکے بغیر آگے نکال کر لیتا چلا گیا اور اسے وجہ سے آگاہ کیا۔ وہ لوگ گھروں کی قطار سے تھوڑا آگے نکل گئے تو اس نے گاڑی روک لی۔

''یہاں سے ہم پیدل شکیل سومرو کے گھر تک جائیں گے۔ ہماری گاڑی کا اس کے گھر کے قریب موجود ہونا بعد میں ہمارے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔'' گاڑی روک کر باہر نکلتے ہوئے سرمد نے اسے اپنے آگے کے لائحہ عمل سے آگاہ کیا تو وہ سر کو تفہیمی جنبش دے کر خود بھی باہر آگیا۔

''میری مانیں سائیں تو آپ اس معاملے سے الگ رہیں۔ میں اور میرے ساتھی مل کر شکیل سومرو کو دیکھ لیں گے۔'' گاڑی لاک کرتے ہوئے سرمد نے مؤدبانہ لہجے میں ایک بار پھر اس سے وہی درخواست کی جو وہ پہلے بھی کرچکا تھا۔

''نہیں سرمد! یہ میری جنگ ہے۔ میں اس معاملے کو دوسروں پر چھوڑ کر خود الگ نہیں ہوسکتا۔ میں شکیل سومرو کی جان نکلنے سے پہلے اس کے حلق سے سارے سچ اگلوانا چاہتا ہوں۔'' عالم شاہ نے بھی حسبِ سابق اس کی بات

ماننے سے انکار کر دیا تو سرمد کو بالآخر بات ماننا پڑی اور جیسے ہی اس کے موبائل پر لائن کلیئر ہونے کا اشارہ ملا، وہ دونوں پیدل شکیل سومرو کے گھر کی ... طرف چل پڑے۔ پوش علاقوں میں یوں بھی لوگوں کی زیادہ چہل پہل نظر نہیں آتی اور یہ تو تھا بھی آدھی رات کے بعد کا وقت اس لیے راستے میں ان کا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔

"اس علاقے میں رات بھر دو واچ مین یا سیکیورٹی گارڈ جو رات بھر گردش کرتے رہتے ہیں، ہمارے ساتھیوں نے سب سے پہلے انہیں ہی خاموش کیا ہے۔ چار پانچ گھنٹوں سے پہلے انہیں ہوش نہیں آئے گا۔ ان آدمیوں کی اتنی زیادہ اہمیت بھی نہیں ہے کیونکہ یہاں کے ہر مکین نے اپنے ذاتی سیکیورٹی گارڈز رکھے ہوئے ہیں اور وہ ان ہی پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔" سرمد نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے دھیمی آواز میں آگاہ کیا۔ تین چار منٹ کے بعد ہی وہ دوبارہ اس عالیشان مکان کے سامنے پہنچ گئے جس پر نمایاں طور پر نہایت خوب صورتی سے سومرو ہاؤس لکھا ہوا تھا۔ مکان کی بیرونی روشنیاں جل رہی تھیں اس لیے سارا منظر بالکل نمایاں تھا۔ انہوں نے چند قدم کے فاصلے سے ہی دیکھ لیا تھا کہ مکان کا ذیلی گیٹ نیم وا ہے۔ ان کے قریب پہنچتے ہی گیٹ پورا کھل گیا اور عالم شاہ کو اپنے سجل نامی کارندے کی شکل دکھائی دی۔ وہ سرمد کی معیت میں اندر داخل ہوا تو سجل نے گیٹ بند کر دیا۔

"کیا رپورٹ ہے؟" سرمد نے اس سے دریافت کیا۔

"دو گارڈز اور دو ملازم تھے۔ چاروں پر نہایت خاموشی سے قابو پا کر بے بس کر دیا گیا ہے۔ چاروں ایک کمرے میں بندھے پڑے ہیں۔"

"اور شکیل سومرو......؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہی ہے اور وہاں بیٹھا پینے پلانے میں مصروف ہے۔ ٹی وی پر کوئی بے ہودہ سی انگریزی فلم بھی تیز آواز میں لگا رکھی ہے اس لیے ہر طرف سے بے خبر ہے۔ میں نے ایک آدمی اوپر اس کے کمرے کے روشن دان پر بٹھا دیا ہے جو اس پر پوری نظر رکھے ہوئے ہے۔" سجل نے مکمل رپورٹ دی۔

"میں بھی پہلے اوپر جا کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" عالم شاہ نے خواہش ظاہر کی تو سجل اپنی راہنمائی میں انہیں چھت پر جانے والے زینے کی طرف لے گیا۔ اوپر ڈیوٹی دینے والے بندے نے عالم شاہ کو دیکھ کر میکانکی انداز میں ہاتھ ماتھے پر رکھا۔ عالم شاہ نے اسے اشارہ کیا کہ وہ روشن دان سے ہٹ جائے۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے وہ آدمی پیچھے ہٹ گیا تو عالم شاہ روشن دان سے اندر جھانکنے لگا۔ اندر کا منظر وہی تھا جس کے بارے میں سجل اسے بتا چکا تھا۔ بس واحد فرق یہ آیا تھا کہ شکیل سومرو بیٹھ کر پینے کے بجائے بستر پر نیم دراز لیٹ کر پی رہا تھا اور اس کا اسمارٹ فون اس کی ابھری ہوئی توند پر دھرا تھا۔ دیکھنے دکھانے کے معاملے میں وہ بالکل اپنے باپ کی کاپی تھا۔ وہی گہری سیاہ رنگت، ٹھگنا قد اور بے ڈھب و بے ڈول جسم جو شب خوابی کے لباس میں کچھ اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ اس شخص کو اتنے اطمینان سے لیٹ کر عیش کرتے ہوئے دیکھ کر عالم شاہ کے پورے وجود میں طیش کی لہر اٹھی اور دل چاہا کہ ابھی کے ابھی اس شخص پر اپنا پورا پسٹل خالی کر دے لیکن مصلحت نے روک لیا۔ شکیل سومرو پر شک کتنا ہی مضبوط سہی، اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے اس کا جرم قبولوانا ضروری تھا۔ وہ سرمد کو شکیل سومرو کے کمرے میں داخل ہونے کے سلسلے میں گرین سگنل دینے کے لیے پلٹنے ہی لگا تھا کہ موبائل فون کی دھیمی سی گھنٹی سن کر رک گیا۔ شکیل سومرو کی توند پر دھرا اس کا موبائل یقیناً بہت بلند آواز میں بج رہا تھا جو ٹی وی کے شور میں بھی اس کی آواز عالم شاہ کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کال کے دوران کوئی کارروائی کرنا مناسب نہیں تھا چنانچہ وہ اپنی جگہ پر رک گیا اور محض تجسس کے تحت کان لگا دیے کہ رات کے اس پہر اسے کون کال کر رہا ہے۔ شکیل سومرو نے موبائل اٹھا کر پہلے اسکرین پر کال کرنے والے کا نام دیکھا، پھر منہ بنا کر ٹی وی کا والیوم بند کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"ہیلو ڈیڈ! اتنی رات کو بھی آپ نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔" اس کے لہجے میں شراب کی وجہ سے پیدا ہونے والی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ کے علاوہ بیزاری بھی موجود تھی۔ دوسری طرف سے لطیف سومرو نے شاید اس کے الفاظ پر غصے کا اظہار کیا جو وہ مزید بیزاری سے بولا۔

"میں نے دن بھر اس لیے آپ کی کال ریسیو نہیں کی کہ میں جانتا تھا آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی ایک ہی ڈیمانڈ سن سن کر تھک چکا ہوں میں۔ جب میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے تو آپ کیوں مجھے ملک سے باہر بھیجنے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں میرے بہت سے کام ہیں، انہیں چھوڑ کر میں کہیں نہیں جانا چاہتا۔"

"آپ مجھے ایک احمق بچہ سمجھنا کب چھوڑیں گے آخر......" اس کے جواب پر لطیف سومرو نے یقیناً اسے مزید کچھ اور کہا تھا جو اس نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی آواز کو مزید بلند کر دیا اور اس ٹون کو برقرار رکھتے ہوئے مزید بولا۔

"میں آپ پر ثابت کر چکا ہوں کہ میں آپ سے بہتر پلاننگ کر سکتا ہوں۔ میری وجہ سے قربان شاہ کی کروڑوں کی زمین آپ کے ہاتھ لگی ہے۔ یہ میں تھا جس نے ہر حربہ آزما کر آپ کو الیکشن میں کامیاب کروایا پھر بھی آپ اپنے آگے مجھے کچھ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ آپ کو مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے اور اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میرے لیے یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے میں بالکل محفوظ ہوں اور مجھے ملک سے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"اگر میں کوئی غلطی کر رہا ہوں تو کرنے دیں۔ نتیجہ بھی میں ہی بھگتوں گا۔" اپنی بات کہنے کے بعد اس نے ایک منٹ تک لطیف سومرو کی بات سنی، پھر نہایت بدتمیزی سے کہتے ہوئے سلسلہ منقطع کر کے موبائل بستر پر ہی ایک طرف اچھال کر دوبارہ سے ٹی وی کی آواز تیز کر لی۔ عالم شاہ، جس کا چہرہ اس گفتگو کو سن کر مزید تن گیا تھا، روشن دان سے پیچھے ہٹا اور جو آدمی پہلے وہاں گن لیے موجود تھا، اسے دوبارہ اپنی جگہ سنبھالنے کا اشارہ کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ سرمد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ عالم شاہ نے سیدھا شکیل سومرو کی خواب گاہ کا رخ کیا اور ہاتھ سے دباؤ ڈال کر دروازے کا ہینڈل نیچے کرنے کے بعد ٹانگ کی ایک زوردار ضرب سے دروازہ کھولا۔ شکیل سومرو کو اپنی راجدھانی میں کسی کی آمد کا اندیشہ نہیں ہوگا اس لیے ■ دروازے کو اندر سے لاک کیے بغیر ہی وہاں موجود تھا۔ دروازہ اس انداز سے کھلا تو اسے نشے میں ہونے کے باوجود خطرے کا احساس ہو گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے تکیے کے نیچے سے اپنا پسٹل نکالنا چاہا لیکن اتنے سے وقفے میں ہی سرمد اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنی گن شکیل سومرو کے سر پر رکھی اور غرایا۔

"بالکل سیدھا بیٹھ جا ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

شکیل سومرو اپنی جگہ ساکت ہو گیا اور خوف زدہ نظروں سے عالم شاہ کو دیکھنے لگا۔ ■ جو ابھی کچھ دیر پہلے باپ کے ساتھ اکڑ رہا تھا، اس قدر ہراساں ہو چکا تھا کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہا ہے، سور کی اولاد! میں تیری موت ہوں۔ تیرا باپ تجھے مجھ سے ہی ڈرا رہا تھا۔ تو باپ کی بات مان لیتا تو شاید کچھ دن اور جی لیتا لیکن تو خود کو زیادہ ہی عقل مند سمجھ رہا تھا۔ اب بھگت اپنی کرنی کا نتیجہ۔" عالم شاہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں کہا اور ایک زوردار مکّا اس کے منہ پر دے مارا۔ مکے کی شدت ایسی تھی کہ شکیل سومرو کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ اگر سرمد اس کے بال مٹھی میں نہ جکڑ لیتا تو وہ مکّا کھا کر بستر پر پیچھے الٹ جاتا۔ اب بھی اس کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی اور پھر وہ چیختا چلا گیا۔ سرمد نے تکیے کا غلاف کھینچ کر اتارا اور اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

"چیخنے چلّانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا شکیل سومرو! تیرے گارڈز اور ملازم بے ہوش پڑے ہیں اور اس گھر سے آواز باہر نکل کر کسی دوسرے گھر تک جانا بہت مشکل ہے۔" عالم شاہ نے تمسخر اڑانے والے انداز میں اسے اس کی پوزیشن کا احساس دلایا اور سرمد کو اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے سرمد نے شکیل سومرو کے ہاتھ پیر باندھ ڈالے اور اس کے منہ میں ٹھنسا تکیے کا غلاف باہر نکالا۔ غلاف پر بھی خون کے دھبے لگ گئے تھے لیکن اب اس کے منہ سے خون نکل کر بہنا بند ہو گیا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم اور یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" وہ سمجھ رہا تھا کہ اکڑ کر کام نہیں چل سکتا اس لیے مسکینی صورت بنا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرے بہنوئی کو قتل کر کے پوچھتا ہے کہ میں تیرے ساتھ یہ سب کیوں کر رہا ہوں؟ میں تو تیرے جسم کا ریشہ ریشہ بھی الگ کر دوں تو تیرے جرم کا حساب پورا نہ ہو۔" عالم شاہ نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوکا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمہارے بہنوئی کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔" وہ فوراً انجان اور معصوم بن گیا۔

"تیرا ہاتھ نہیں تو تیرا باپ کیوں تجھے ملک سے باہر بھگانے پر تلا ہوا ہے۔ باپ کے آگے تو تُو بڑی شیخیاں مار رہا تھا۔ اب تجھ میں اتنا بھی دم نہیں کہ اپنا جرم قبول کر لے۔ اب اس بات سے بھی انکار کر دے کہ تو نے ماما سائیں کی زمین ہتھیانے کے لیے ادا معظم اور میری بہن کو اغوا کروایا تھا اور یہ تو تھا جس نے دھاندلی کے ذریعے میرے بابا کو الیکشن میں شکست دی تھی۔" عالم شاہ اس کے جبڑے پر ایک اور مکّا رسید کرتے ہوئے بولا لیکن اس کے

کی شدت پہلے کے سے تھوڑی کم تھی اس لیے شکیل سومرو کا جبڑا سلامت رہا البتہ چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ وہ چہرہ ایک ایسے مجرم کا چہرہ تھا جو جانتا تھا کہ سامنے والے پر اس کا ہر جرم کھل چکا ہے اور وہ لاکھ انکار کرے اس کی بات پر یقین نہیں کیا جائے گا۔

''تجھے اور تیرے باپ کو ماما سائیں کی زمین اور بابا سائیں کی سیٹ چاہیے تھی نا اور اس لیے تم لوگ ہر حد سے گزر گئے۔ بتا کیسے کیا تو نے یہ سب اور کون کون تیرے ساتھ اس جرم میں شامل تھا؟'' عالم شاہ نے قہر بار لہجے میں اس سے دریافت کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس پر پل پڑا۔ وہ مضبوط ہاتھ پیروں کا مالک تھا اور شوق ہی شوق میں لڑائی بھڑائی کا فن سیکھنے کے ساتھ ساتھ بدرو پہلوان کے اکھاڑے پر بھی مشقیں کرتا رہا تھا اس لیے اس کی ہر ضرب نپی تلی اور قوت سے بھرپور تھی۔ چند منٹوں میں ہی اس نے خالی ہاتھ سے شکیل سومرو کا بھرکس نکال کر رکھ دیا۔ سرمد نے پہلے سے ہی تیز آواز میں چلتے ٹی وی کا والیوم مزید تیز کر دیا تھا اس لیے شکیل سومرو کے حلق سے نکلنے والی چیخیں ٹی وی کی آوازوں میں مدغم ہوتی رہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ ان بڑے بڑے گھروں سے کسی آواز کا باہر جانا اور اس کے بعد کسی دوسرے گھر تک پہنچنا ایک مشکل امر تھا۔ اوپر موجود آدمی نے سرمد کا اشارہ پا کر روشن دان کا شیشہ تک بند کر دیا تھا اس لیے آواز کے اخراج کا راستہ بھی بند ہو گیا تھا اور شکیل سومرو مکمل طور پر عالم شاہ کے رحم و کرم پر تھا۔ عالم شاہ اسے غصے اور جنون کی حالت میں ضرور مار رہا تھا لیکن اس کی مہارت اس کی حرکات پر حاوی تھی اور شکیل سومرو کو مخصوص پوائنٹس پر ایسی چوٹیں لگا رہا تھا کہ وہ تڑپے تو ضرور لیکن جان سے نہ جائے۔

عیش و عشرت میں پلے شکیل سومرو کا شراب سے کھوکھلا ہو جانے والا جسم بہت دیر تک اس مار کو برداشت نہیں کر سکا اور آخر کار اس نے ہار مان کر زبان کھولنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ عالم شاہ کے سوالات کے جواب میں اس نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق اس کا باپ لطیف سومرو بڑے عرصے سے اپنی زمینوں سے ملحق قربان شاہ کی زمینیں ہتھیانے کی فکر میں تھا لیکن قربان شاہ اور صداقت شاہ ایک طرف اس سے بڑے زمیندار تھے تو دوسری طرف صداقت شاہ کی اسمبلی میں رکنیت اس کے راستے کی رکاوٹ بنی ہوئی تھی اس لیے وہ طاقت کے بل پر ان زمینوں کو نہیں ہتھیا سکتا تھا۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ کہیں سے

پیار کی حقیقت

ایک لڑکی ایک بزرگ کے پاس گئی اور پوچھا۔ ''پیار کی حقیقت کیا ہے؟''

بزرگ نے کہا۔ ''باغ میں جاؤ اور جو پھول سب سے خوبصورت ہو، لے آؤ۔''

لڑکی ایک دن بعد واپس آئی اور کہا۔ ''میں پھول دیکھتی رہی۔ ایک پھول سب سے خوبصورت تھا مگر میں اس سے بہتر کی تلاش میں چل پڑی مگر کوئی اور پیارا نہ لگا۔ جب لوٹ کر آئی تو دیکھا کہ اسے کوئی اور توڑ چکا تھا۔''

بزرگ نے کہا۔ ''یہی پیار کی حقیقت ہے۔ جو سامنے ہو اس کی قدر نہیں کی جاتی اور جب واپس لوٹو تو وہ بھی ہاتھ نہیں آتا۔''

☆☆☆

آہستہ روی

ایک نوجوان اپنے والد کے ساتھ کار میں کہیں جا رہا تھا۔ والد ڈرائیو کر رہے تھے اس لیے کار بالکل آہستہ چل رہی تھی۔ والد اپنے بیٹے کو آج کل کے نوجوانوں کی خامیوں اور بے پروائیوں سے آگاہ کر رہے تھے کہ وہ کس قدر تیز رفتاری سے موٹر سائیکل اور کاریں چلاتے ہیں۔ اتنے میں اچانک ایک بچہ سائیکل چلاتے ہوئے کار کے سامنے آ گیا۔ کار چونکہ آہستہ، کم رفتار تھی اس لیے والد نے آسانی سے بریک لگا دیے اور بچہ کار کی زد میں آنے سے بچ گیا۔

والد نے اپنی نصیحتوں کے ثبوت میں بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا تم نے...... یہ تو میں کار چلا رہا تھا اور وہ آہستہ تھی لہٰذا حادثہ نہیں ہوا۔ اگر میری جگہ تم کار چلا رہے ہوتے تو یقیناً بچے کو روندتے ہوئے گزر جاتے۔''

''ڈیڈی! اگر میں گاڑی چلا رہا ہوتا تو ایک گھنٹا پہلے اس جگہ سے گزر چکا ہوتا۔'' بیٹے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ

اڑتی پڑتی یہ خبر اس کے کانوں میں پہنچ گئی تھی کہ قربان شاہ آج کل خسارے میں جارہے ہیں اور پہلے کی طرح مالی طور پر مستحکم نہیں رہے ہیں اس لیے اس نے زمین خریدنے کی اپنی سی کوشش کرکے دیکھ لی تھی لیکن قربان شاہ اس پر راضی نہیں ہوئے تھے۔ شکیل سومرو جو باپ کا شریکِ راز تھا، اس موقع پر میدان میں اترا اور بہت چالاکی سے اپنا جال بچھایا۔ اس نے اپنے شناسا تنویر نامی ایک چلتا پرزہ ٹائپ کے بندے کو منشی عبدالحق کی حیدرآباد شہر میں زیرِ تعلیم بیٹی آسیہ کے پیچھے لگا دیا۔ تنویر اپنی چرب زبانی کی مدد سے جلد آسیہ کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہوگیا اور اس کے ذریعے قربان شاہ کی حویلی کے راز حاصل کرنے لگا۔ آسیہ کے ذریعے انہیں پتا چلا کہ قربان شاہ کے مالی معاملات ان کو حاصل شدہ معلومات کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ خراب ہیں۔ شکیل سومرو کو ایک طرف زمین ہتھیانے کا لالچ تھا تو دوسری طرف وہ سجل شاہ کے لیے دیوانہ تھا۔ ایک زمیندار کے گھر شادی کے موقع پر اس نے اتفاقاً سجل شاہ کو دیکھ لیا تھا اور اس سے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر بیٹھا تھا لیکن سجل شاہ نے اسے لفٹ نہیں کروائی اور وہیں جھاڑ کر رکھ دیا۔ اپنی اس بے عزتی کے بعد وہ سجل شاہ کے حصول کے لیے کوئی ترکیب لڑاتا اس سے قبل ہی اس کی شادی معظم شاہ سے ہوگئی اور شکیل سومرو کے سینے پر سانپ لوٹتے رہے۔ آخرکار اس کے شاطر ذہن نے ایک ایسا منصوبہ سوچ لیا کہ زمین ہتھیانے کا موقع بھی مل جائے اور سجل شاہ کو بھی حاصل کیا جاسکے۔

اس کے باپ کے علاقے کے ڈاکوؤں کے ساتھ مراسم تھے۔ اس نے ان مراسم سے فائدہ اٹھایا اور معظم شاہ اور سجل کے اغوا برائے تاوان کی واردات کر ڈالی۔ اس واردات میں ایک طرف انہیں آسیہ کا تعاون حاصل رہا تو دوسری طرف انہوں نے صداقت شاہ کی حویلی میں کام کرنے والے مالی کے بھانجے کو استعمال کیا۔ وہ لڑکا ماموں سے ملنے کے بہانے حویلی آیا اور موقع دیکھ کر معظم شاہ کے گارڈز کی گاڑی میں ایسی خرابی پیدا کردی کہ وہ حفاظت کے لیے پیچھے نہ آسکے۔ آگے سب کچھ ان کے منصوبے کے مطابق ہوا۔ مالی طور پر قلاش قربان شاہ کو تاوان کی بھاری رقم کی ادائیگی کے لیے منطقی طور پر زمین بیچنے کا خیال آیا۔ لطیف سومرو کی صورت میں گاہک پہلے ہی سامنے موجود تھا، سو اسی سے رابطہ کیا گیا اور مجبوراً مارکیٹ ویلیو سے کم زمین کی قیمت وصول کرلی گئی۔ رقم کی باپ بیٹے کو فکر نہیں تھی کہ تاوان کی صورت رقم نہ صرف دوبارہ ان کے پاس واپس آجاتی بلکہ وہ اس رقم سے زیادہ ہی ہوتی جو انہوں نے زمین کے لیے ادا کی تھی۔

سب کچھ ان کے منصوبے کے عین مطابق چل رہا تھا۔ شکیل سومرو اپنی اصل شخصیت کو ظاہر کیے بغیر سجل شاہ کو قید میں حاصل کرنے کی ایک کوشش بھی کر چکا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کو رہائی دینے سے پہلے ایک بار تو ضرور اپنے دل کے ارمان نکالے گا لیکن یہاں ان کا منصوبہ تلپٹ ہوگیا اور معظم اور سجل ان کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس صورت میں بھی ان لوگوں کو بہرحال نقصان نہیں ہوا کہ ادا کی گئی قیمت کے مقابلے میں کئی گنا قیمتی زمین تو ہاتھ لگ ہی چکی تھی۔ معظم اور سجل کے فرار کا ذکر آیا تو عالم شاہ نے اس سے معاذ کے بارے میں دریافت کیا کہ اس کا کیا ہوا؟ اس سوال کے جواب میں شکیل سومرو نے بتایا کہ وہ معاذ کو پہچان گیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ دو بڑی دولت مند شخصیات حیات یزدانی اور عرفان اللہ معاذ کے پیچھے ہیں اس لیے اس نے اس کا ان لوگوں کے ساتھ بھاری رقم کے عوض سودا کرلیا۔ معاذ کو ان لوگوں کی تحویل میں دینے کے بعد وہ نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے معاذ کا کیا کیا۔ وہ اس کام میں اپنا ساتھ دینے والے ڈاکوؤں کو ان کا حصہ دینے کے بعد واپس گاؤں آگیا تھا جہاں اس نے انتخابی مہم میں اپنے باپ کا بھرپور ساتھ دے کر اسے سیٹ جتوائی۔ عالم شاہ نے اس سے آسیہ اور منشی عبدالحق کے خاندان کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ عالم شاہ پر حملہ کرنے والا منشی کا نوعمر بیٹا ہی تھا جسے بچانے کے لیے منشی کو خاندان سمیت فرار ہونا پڑا اور آسیہ کو بھی اسپتال سے نکال کر منظر سے ہٹا لیا گیا۔ اس سارے کام میں تنویر نے ان لوگوں کا ساتھ دیا تھا اور وہی جانتا تھا کہ وہ لوگ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

عالم شاہ نے تنویر کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور معظم شاہ کے قتل کے معاملے کے بارے میں جانکاری کرنے لگا۔ اس موقع پر شکیل سومرو کی زبان پھر سچ اگلنے سے رک گئی اور اس نے الٹے سیدھے بہانے بنانے کی کوشش کی تو عالم شاہ کو دوبارہ اپنے ہاتھوں کو حرکت دینی پڑی۔ تھوڑی سی مزید ٹھکائی کے بعد اس نے اعتراف کرلیا کہ زمین کے سلسلے میں بات چیت کرنے کے لیے آنے والے معظم شاہ کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ سجل شاہ کے حوالے سے وہ یوں بھی

معظم شاہ کو اپنا رقیب تصور کرتا تھا اس لیے اس موقع پر برداشت نہیں کر سکا اور اپنے باپ کو آگاہ کیے بغیر ڈاکوؤں سے رابطہ کر کے انہیں ہدایت کر دی کہ راستے میں ہی معظم شاہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے۔ وہ خود بھی معظم شاہ کے پیچھے ہی گھر سے نکل پڑا تھا اور اس نے ڈاکوؤں کے معظم شاہ کی گاڑی کو گھیر کر اسے اور اس کے گارڈز کو ہلاک کرنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی رہائش گاہ پر واپس آگیا تھا اور لطیف سومرو کی باز پرس پر اس کے سامنے معظم شاہ کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔ اس کے باپ کو اس کی یہ حرکت پسند نہیں آئی تھی اور اس نے اسے سخت سرزنش کی تھی کہ اس نے معظم شاہ کا قتل کر کے ایک بڑی حماقت کی ہے اور اس کے لیے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ معظم شاہ کا خاندان اس کے قتل کا شک سومرو خاندان پر ہی کرے گا چنانچہ اس نے اسی رات شکیل سومرو کو شہر روانہ کر دیا تھا اور اس پر مسلسل زور دے رہا تھا کہ وہ فوری طور پر بیرون ملک منتقل ہو جائے، بعد میں وہ حالات کا رخ دیکھ کر اسے واپس بلا لے گا لیکن شکیل سومرو نے اس کی بات نہیں مانی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ غیر ضروری احتیاط پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے ورنہ معظم شاہ کے خاندان کے پاس ایسا کوئی گواہ یا ثبوت نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ انہیں قاتل قرار دے سکتے۔

اس نے اس بات کا بھی اعتراف کر لیا کہ حملے میں بچ جانے والے معظم شاہ کے گارڈ جمن کو بھی لطیف سومرو نے قتل کروایا تھا اور اس مقصد کے لیے زہریلے ناگ کو اس لیے استعمال کیا گیا تھا کہ جمن کا قتل محض ایک حادثہ محسوس ہو۔ اتنے سارے اعترافات کے بعد عالم شاہ کے پاس اسے سزائے موت دینے کے سوا کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ شکیل سومرو بھی اس بات کو بھانپ گیا تھا چنانچہ آہ و زاری کرتے ہوئے اس کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ اس کی جان بخش دے، بدلے میں وہ قربان شاہ کی زمینیں واپس کرنے کے علاوہ معظم شاہ کے قتل کی منہ مانگی دیت بھی ادا کر دے گا اور اپنے باپ کو اس بات پر بھی راضی کر لے گا کہ وہ اسمبلی کی نشست سے دستبردار ہو جائے۔ عالم شاہ نے اس کی یہ ساری باتیں سنیں اور نفرت سے اسے ٹھوکر لگاتے ہوئے بولا۔

''تُو اور تیرا باپ اپنے آپ کو بیچ کر بھی ادا معظم کے قتل کی دیت ادا نہیں کر سکتے۔ میری بہن کا سہاگ اتنا سستا نہیں تھا جتنی تو اس کی قیمت لگا رہا ہے اور تجھ پر تو اس کے علاوہ بھی بہت قرض ہیں۔ میری بہن پر بری نظر ڈالنے اور میرے پیارے دوست کو موت کے منہ میں دینے کے جرائم کو معمولی سمجھتا ہے تُو......؟ تیرا تو ہر جرم اتنا سنگین ہے کہ اس کے بدلے میں تجھے ایک بار نہیں، دس بار قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے قتل کر کے تم بھی سکون سے نہیں رہ سکو گے۔ میرا باپ سمجھ جائے گا کہ یہ تم لوگوں کی حرکت ہے۔ میرے خون کا بدلہ وہ تمہارے خاندان کے بچے بچے سے لے گا۔ میرے باپ کو معمولی آدمی نہیں سمجھنا۔ وہ تمہاری حویلیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دے گا۔'' شکیل سومرو نے دیکھا کہ منت سماجت سے بات نہیں بن رہی تو دھمکیوں پر اتر آیا۔

''تجھ کو جہنم میں پہنچا دوں، پھر تیرے باپ کو بھی دیکھ لوں گا۔'' عالم شاہ طیش کے عالم میں بولا اور خاموش کھڑے سرمد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے سرمد نے اپنی گن اسے تھما دی۔ ایک دوسری گن اس کے بغلی ہولسٹر میں اب بھی لٹکی ہوئی تھی۔ عالم شاہ کو گن تھامتے دیکھ کر شکیل سومرو پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اسے گندی گندی گالیاں دینے لگا۔

''مرتے ہوئے گالیاں نہیں دیتے، کلمہ پڑھتے ہیں لیکن تُو کتے کا تخم اس بات کو کیسے سمجھے گا۔ تیری تو فطرت میں ہی بھونکنا اور بھونکتے رہنا ہے۔'' عالم شاہ نے اس کی گالیوں کے جواب میں استہزائیہ لہجے میں کہا اور ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالا۔ ابھی پورا دباؤ نہیں پڑا تھا کہ باہر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور ایک شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ وہ ان ہی کا بندہ تھا۔ عالم شاہ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی اسی طرف آرہی ہے۔ لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔'' اس شخص نے اطلاع دی تو عالم شاہ کو بھی تشویش ہوئی اور خیال آیا کہ شاید اس کے اندازوں کے برعکس شکیل سومرو کے چیخنے چلانے کی آوازیں آس پڑوس کے کسی گھر میں سن لی گئی ہے اور انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے اس لیے پولیس کی گاڑی اس طرف آرہی ہے لیکن حقیقت اس سے ذرا مختلف تھی۔ علاقے کی نگرانی پر مامور نائٹ ڈیوٹی کرنے والے سیکیورٹی کمپنی کے افراد کمپنی کی طرف سے اس بات کے پابند تھے کہ ہر دو گھنٹے بعد رپورٹ کریں۔ بے ہوش پڑے

ہونے کی وجہ سے وہ افراد اس معمول پر عمل نہیں کر سکے تو کمپنی والوں نے پہلے خود ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی اور جب ناکام رہے تو علاقے کے تھانے کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے کسی گڑبڑ کا اندیشہ ظاہر کر دیا۔ کمپنی اچھی ساکھ کی مالک تھی اور اس کا مالک پانچ والا بندہ تھا اس لیے پولیس والوں کو حرکت میں آنا پڑا اور صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک گاڑی روانہ کر دی گئی۔

''سب لوگ فوراً یہاں سے نکلنے کی کرو۔ ہم بھی نکلتے ہیں۔'' عالم شاہ خود یا اپنے ساتھیوں کا پولیس کی گرفت میں جانا قطعی افورڈ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ تیز لہجے میں حکم دیا اور ایک بار پھر شکیل سومرو کی طرف متوجہ ہوا۔ پولیس کی آمد کی اطلاع سن کر اس کے چہرے پر امید کی ایک کرن سی روشن ہو گئی تھی۔

''تجھے میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔'' عالم شاہ بڑبڑایا اور ہونٹ بھینچتے ہوئے لگاتار کئی فائر اس کی طرف جھونک دیے۔ اس کی چلائی ہوئی گولیوں میں سے ایک شکیل سومرو کی آنکھ میں لگی، دوسری جبڑے میں اور تیسری شانے میں گھس گئی۔ بندھی ہوئی حالت میں پڑا شکیل سومرو گولیاں کھا کر ٹھیک سے تڑپ بھی نہ سکا۔ ان لوگوں کے پاس بھی اس کو تڑپتے دیکھنے کا وقت نہیں تھا چنانچہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر کی طرف بھاگے۔ سرمد بغلی ہولسٹر سے گن نکال کر اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا اور ساتھ ہی اپنے بندوں کے ساتھ بھی رابطے میں تھا۔ پولیس موبائل کے سائرن کی آوازیں اب خود انہیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

''پولیس علاقے کو گھیر رہی ہے۔ اگر ہمیں ذرا سی بھی دیر ہوئی تو بری طرح پھنس جائیں گے۔ سائیں کو لے کر فوراً یہاں سے نکلو۔ ہم لوگ کور دینے کے لیے آس پاس رہیں گے۔'' سرمد نے اپنے کان کے ساتھ لگے ائرپیس میں سچل کی گمبھیر آواز سنی۔

''ٹھیک ہے، ہم نکل رہے ہیں لیکن تم میں سے بھی کسی کو پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہیے۔ جیسے بھی ہو سکے ہر حال میں یہاں سے نکل بھاگو۔'' سرمد نے تیز لہجے میں اسے ہدایت دی اور عالم شاہ کو لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اس بار انہوں نے عقبی دروازے کا استعمال کیا تھا کیونکہ سامنے تو اطلاع کے مطابق پولیس پہنچ ہی چکی تھی۔ باہر نکل کر وہ لوگ محتاط انداز میں لیکن تیزی سے اس سمت بڑھنے لگے جہاں ان کی گاڑی کھڑی تھی۔ سرمد نے بڑی ذہانت سے اور ہر بات کا خیال رکھ کر اس مہم کی تیاری کی تھی اس لیے کپڑوں اور جوتوں سے لے کر زیرِ استعمال گاڑیوں، اسلحے اور موبائل فونز کی طرف سے بھی پوری احتیاط برتی گئی تھی۔ اسلحہ غیر قانونی تھا، گاڑیوں پر جعلی نمبر پلیٹیں لگی تھیں اور موبائل فونز اور ان کی سمیں ان میں سے کسی کے نام پر رجسٹرڈ نہیں تھیں۔ ان میں سے ہر شخص ربر کے دستانے استعمال کر رہا تھا اس لیے کہیں فنگر پرنٹس رہ جانے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا...... لیکن کہتے ہیں ناکہ نہایت چالاکی سے کی گئی منصوبہ بندی میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی سقم رہ جاتا ہے تو سرمد کی منصوبہ بندی میں بھی یہ سقم رہ گیا تھا [illegible] وہ سیکیورٹی کمپنی کے ہر دو گھنٹے بعد اپنے آدمیوں [illegible] رپورٹ حاصل کرنے کے اصول کو نہیں جان سکا تھا اور [illegible] وہ پولیس کے خطرے سے دوچار ہو گئے تھے۔ اس [illegible] کر نکلنے کے لیے وہ پوری مستعدی [illegible] ان کے پیروں میں موجود ربر سول [illegible] رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ گاڑی [illegible] کا فاصلہ تھا بھی کتنا۔ قدموں کی تیزی [illegible] میں طے ہو گیا۔ سرمد جاں نثاری اور فرض [illegible] سے چور عالم شاہ سے چند قدم آگے نکل [illegible] گاڑی تک پہلے پہنچ گیا اور گاڑی کے دروازے ان لاک کر [illegible] تو عالم شاہ نے دیکھا کہ گاڑی کی دوسری طرف سے ایک پولیس والا نکل کر سرمد کی طرف آ رہا ہے اور اس کی رائفل کا رخ سرمد ہی کی طرف ہے۔ اس نے اپنے قدموں کو روک لیا اور اپنی گن کو پولیس والے کی طرف سیدھا کیا لیکن فوری طور پر گولی نہیں چلا سکا۔ وہ کوئی عادی قاتل نہیں تھا جو ہر شخص پر بے رحمی سے گولی چلا سکتا۔ اس وقت اس کے سامنے شکیل سومرو جیسا خبیث شخص نہیں بلکہ ایک بے گناہ شخص کھڑا تھا جو اپنے فرض کی بجا آوری کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھے آدھی رات کو اپنے گھر کا سکون چھوڑ کر یہاں موجود تھا۔ ایسے شخص پر گولی چلانے سے اس کا ہاتھ رک گیا تھا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن اس کے رکنے سے کیا ہوتا تھا۔ یکدم ہی اس کے عقب سے ایک گولی چلی اور وہ بری طرح تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے حلق سے چیخ بھی بلند ہوئی لیکن پہلی گولی چلنے کے فوراً بعد ہی شروع ہو جانے والی بے تحاشا فائرنگ نے اس کی چیخ کی آواز کو اپنے شور میں دبا لیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تنہا باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

اسّی کی دہائی میں دنیا تبدیل تو ہو رہی تھی مگر اتنی تیزی سے نہیں جتنی تیزی سے آج کے دور میں ہوتی ہے۔ٹرائے،او ہائیو کے پولیس اسٹیشن میں بیٹھا میں یہی سوچ رہا تھا کہ آخر اتنے پرانے دور کے اس کیس میں لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو آج بھی اخبار کے پہلے صفحے پر اس کی خبر دکھائی دے رہی ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو میتھیو؟'' تھامسن میرے پاس آیا۔''ویسے میں نے غور کیا ہے سوچتے ہوئے تم اتنے عجیب لگتے ہو کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم صدیوں سے یہیں موجود ہو، اسی طرح سوچتے ہوئے......'' اس نے تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ میرے انداز کی نقل اتاری۔تھامسن سے میری اچھی دوستی تھی کیونکہ وہ میرے دادا روبنسن کو اپنا استاد مانتا تھا۔اس کے خیال میں، میں اور وہ ایک ہی شخص کے شاگرد تھے۔اس لیے آفیسر اور ماتحت سے زیادہ ہمارا دوستی کا رشتہ تھا۔

''کچھ نہیں سر!یہ اخبار دیکھ کر دماغ میں مختلف خیالات آ رہے ہیں......'' میں نے تبصرے کو نظر انداز کر کے سوال کا جواب دیا۔

''کیا خاص شائع ہو گیا اخبار میں......؟'' اس نے

ناحق بہنے والے لہو کی پکار......جس کا مکافاتِ عمل انتہائی عبرت اثر تھا۔

اللہ نے دنیا میں بہت کچھ حیرت انگیز اور فکر انگیز بنایا ہے ... جیسے کہ انسانی خون ... جس کے بہنے سے پہلے بھی بہت کچھ حیرت انگیز ہو جاتا ہے اور بہہ جانے کے بعد بھی بہت سے واقعات فکر انگیز رونما ہوتے رہتے ہیں۔یہ بھی ایک ایسے ہی قتل کی روداد ہے جسے کئی سال بیت چکے تھے ... ایک نسل جوان ہو چکی تھی مگر ... اس کے لہو کی رائگانی قدرت کو شاید منظور نہ تھی اور پھر ایک روز اچانک وہ بند فائل کُھلی اور اس نے ایک حشر بپا کر ڈالا۔

انتظار

اعتزاز سلیم وصلی



میرے ہاتھ سے اخبار پکڑ کر خبر پڑھی۔ ''ارے ہاں...... یہ لڑکی جس کی لاش کی کبھی پہچان نہیں ہوئی، شاید اس کو اس کی جیکٹ کے نام سے پہچانتے تھے۔'' اس نے دماغ پر زور دیا۔

''ہاں، چھتیس سال پرانا کیس ہے...... اب اخبارات میں لکھ رہے ہیں کہ اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کر کے اس کی پہچان دوبارہ کی جائے گی۔'' میں نے بتایا۔

''مجھے تو ابھی تک اطلاع نہیں دی کسی نے حالانکہ یہ پولیس کا کام ہے۔'' اس نے کہا اور پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ''کیا فائدہ اب پہچان کا، چھتیس سال بعد نہ تو اس کا قاتل ملے گا اور نہ ہی شاید خاندان ملے۔''

''تب کیوں پہچان نہیں ہوسکی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈی این اے ٹیسٹ تب دستیاب نہیں تھا، جہاں تک میرا خیال ہے باقی خدا بہتر جانے......'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''2008ء میں منظوری ہوئی تھی ڈی این اے کی...... کئی کیس حل ہوئے ہیں اس کی مدد سے مگر اب اتنے پرانے کیس کو کھنگالنا بہت مشکل ہے اور بہت عجیب بھی......'' اس نے کرسی پر بیٹھ کر سستی سے اپنی ٹانگیں پھیلائیں۔ اسی دوران فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔

''لگتا ہے کوئی واردات ہوگئی۔'' میں ہنسا۔

''نہیں دوست...... واردات کی وجہ سے منہ لٹکانا میرے جیسے پولیس چیف کی شان نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ جو صبح صبح تم منحوس خبر پڑھ رہے ہو، اسی کی دوبارہ تفتیش کا حکم دیا گیا ہے۔'' اس نے جھنجلا کر میز پر ہاتھ مارا۔ ''پتا نہیں کیا ملتا ہے ان کو گڑے مُردے اکھاڑ کر......'' میں ہنس پڑا۔ وہ مجھے گھورنے لگا۔

''ایک کام کریں، یہ کیس میرے حوالے کر دیں۔'' اب کی بار ہنسنے کی باری اس کی تھی۔

''چھتیس سال سے حل نہ ہونے والے کیس کو ایک ایسے آفیسر کے ذمے لگا دوں جسے ابھی صرف دو سال ہوئے ہیں پولیس جوائن کیے۔'' اس نے طنز کیا۔ ''میڈیا کی توجہ ہے اس کیس پر، مجھ سے نہیں برداشت ہوگی ان کی تنقید۔''

''آپ کے خیال میں اس کیس پر کام کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ظاہر ہے، ایک ایسا کیس جو اس دور میں تھا جب ہم پیمپر میں گھومتے تھے، اس کیس پر کام کرنا وقت ضائع کرنا ہی ہے۔ اب کیا جرائم کم ہیں جو ہم پرانے نامعلوم مجرم کو ڈھونڈیں گے اور وہ بھی ایسی لڑکی کا قاتل جس کی پہچان ہی نہیں...... جس کا شاید ہی کوئی رشتے دار زندہ ہو اور شاید ہی کسی کو اب لڑکی کی تلاش ہو۔'' میں اس تقریر کے دوران خاموش بیٹھا رہا۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے اپنی بات مکمل کی۔

''تو پھر ایسا کریں اس کیس پر مجھے یعنی ایک جونیئر آفیسر کو وقت ضائع کرنے دیں...... باقی آپ لوگ نئے کیسز پر کام کریں۔'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے تم کرلو کام، کوشش کرو حل کرنے کی۔ میڈیا کی توجہ اس کیس پر ہے، مشہور ہو سکتے ہو تم۔'' وہ مسکرا دیا۔

''شکریہ۔'' مجھے خوشی ہوئی۔ ایسے پرانے کیسز جو معما بنے ہوئے تھے اور جن کو حل کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے، ان پر کام کرنا میرا شوق تھا۔ اس کی ایک وجہ دادا کی صحبت تھی۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور ڈیٹیکٹو تھے اور بڑے اعزاز سے پولیس سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہیں یہ جان کر ضرور خوشی ہوتی کہ میں نے ان کے زمانے کا ایک کیس چنا ہے۔ رات آٹھ بجے جب میں گھر پہنچا تو وہ حسب معمول ایک مشہور سچے کیس کی کتاب پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنی پسندیدہ کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''آؤ آؤ میتھیو! تمہیں دیکھ کر تمہارا باپ یاد آجاتا ہے۔'' یہ بات ہمیشہ ان کی زبان پر رہتی تھی کیونکہ انہیں میرے باپ اور اپنے بیٹے سے بے حد محبت تھی۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد دادا کو ہی بس انہیں دیکھا تھا۔ ماں باپ کے بارے میں یہی معلوم ہوا کہ وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر چکے ہیں۔ دادا ہمیشہ کہتے تھے۔ ''اگر تمہارا سہارا نہ ہوتا تو میں اب تک ان دونوں کے ساتھ دفن ہو چکا ہوتا۔''

''کیسا رہا دن؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بہت اچھا۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔ ''کیا پڑھ رہے ہیں؟'' میں نے کتاب کے ٹائٹل پر نگاہ دوڑائی۔

''ڈیول ان وائٹ سٹی۔'' انہوں نے کتاب کا نام بتایا پھر میرے چہرے کے تاثرات پر نظر جمائی۔

''تمہارے چہرے پر بڑا جوش ہے، کوئی خاص خبر ہے؟''

''ہاں، ایک کیس ملا ہے پسند کا۔''

''رکو...... کافی منگواتا ہوں تمہارے لیے پھر سنتا ہوں تفصیل۔'' انہوں نے کہا۔ ''مادام روبیکا۔'' روبیکا ہماری سیاہ فام ملازمہ تھی۔ دادا اسے جان بوجھ کر مادام کہتے

تھے۔ کچھ دیر بعد میرے سامنے بھاپ اڑاتی کافی کا مگ رکھا تھا۔ میں نے انہیں تھامسن اور اپنی گفتگو کے بعد کیس کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے تفصیل سن کر سر ہلایا۔

''میں نے وہ خبر پڑھی تھی، بہت مشکل کیس ہے ناممکن حد تک...... لیکن تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

''کیا؟''

''اس کیس پر کام کرنے والے چند پہلے لوگوں میں سے ایک میں تھا۔''

''ارے واہ۔'' میں اچھل پڑا۔ ''یعنی تفصیل مل جائے گی۔''

''بالکل۔'' وہ اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ واپسی پر ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس میں ان تمام کیسز کی تفصیل تھی جن پر انہوں نے کام کیا تھا۔ اس کا ایک حصہ ان کیسز پر مشتمل تھا جو کبھی حل نہیں ہوئے۔ نامعلوم لڑکی کا کیس تیسرے نمبر پر تھا۔

''ڈنر کے بعد یہ پڑھ لینا...... ہر بات لکھی ہے، بس اس خبر کی تفصیل نہیں جو آج شائع ہوئی۔'' میں نے فائل ان کے ہاتھ سے لے لی۔ ان کے ساتھ ہی ڈنر کرنے کے بعد جب میں بستر پر پہنچا تو میری بے چینی عروج پر تھی۔ فائل کھولنے کے بعد میں اس کیس کی گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

گریگ، ہوگارڈ اور ان کا تیسرا دوست ٹیری رات کے کھانے کے بعد ہوٹل سے باہر نکلے۔ انہیں ایسے ہی سستے ہوٹل کی تلاش تھی جس کے ڈنر کا بل وہ آسانی سے ادا کر سکیں۔ تینوں دوست ہر ہفتے کی رات اسی طرح گھر سے باہر گزارتے تھے۔ آج وہ آئی پچھتر ہائی وے کی طرف نکلے تھے جو ٹرائے سے گزرتا ہوا اوہائیو کو اگلی کاؤنٹی سے جوڑتا ہے۔ ہائی وے سے تقریباً آٹھ کلومیٹر دور تینوں دوست پیدل چلتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔

''گریگ...... بہت ڈنر کر لیے، اب مل کر ایک فلیٹ لیتے ہیں جس میں ہر ویک اینڈ کی رات عیاشی کریں گے۔'' ٹیری کے خیالات ایسے ہی ہوتے تھے جن پر عمل کرنے کی اجازت انہیں جیب نہیں دیتی تھی۔

''ہاں، اس کو باپ کی طرف سے ورثے میں ایک بہت بڑی کمپنی مل گئی ہے اس لیے یہ فلیٹ لینے کا سوچ رہا ہے۔'' ہوگارڈ نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

''بکواس بند کرو۔'' ٹیری غرایا۔ ''اور باپ کے بارے میں بکواس کیوں کی؟'' ٹیری کا باپ ایک سخت مزاج شخص تھا جو اسے جیب خرچ کے نام پر چند ڈالرز دیتا تھا جس سے وہ ڈنر کے بعد بہ مشکل سستی بیئر کا گلاس خرید سکتا تھا۔ اس لیے وہ اس کے ذکر سے ہمیشہ چڑ جاتا تھا۔ گریگ نے درمیان میں پڑ کر دونوں کو اس روز کی بک بک سے منع کیا اور دونوں حسبِ معمول اس پر چڑھ دوڑے۔ ٹیری اور ہوگارڈ نے مل کر اسے دھکا دیا۔ ان کا قہقہہ گونجا۔ گریگ سڑک سے ہٹ کر درختوں میں گر گیا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلا۔ وہ دونوں اس کی حالت سے لطف اٹھا رہے تھے۔ گریگ نے اٹھنا چاہا مگر اس کا پیر ایک گڑھے میں پھنس گیا۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر زور لگایا۔ نتیجے میں دونوں پیروں کا توازن اکھڑ گیا اور وہ گڑھے میں گر گیا۔ ہوگارڈ اور ٹیری ہنستے ہوئے اس کی مدد کے لیے آگے بڑھے۔ اسی دوران گریگ کی حیرت سے بھری آواز سنائی دی۔

''ارے — یہ کیا ہے؟''

''کیا ہوا گریگ؟'' ٹیری نے جلدی سے جیب میں موجود چھوٹی ٹارچ نکالی۔ اس کی روشنی سے گڑھا روشن ہو گیا۔ یہاں ایک کپڑے میں لپٹا ہوا جسم موجود تھا۔ گریگ نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ کپڑے کو ایک طرف کیا...... یہ کسی لڑکی کی لاش تھی۔ وہ اچھل کر باہر آیا۔ تینوں خوفزدہ تھے۔

''یہ تو مر چکی ہے...... اب کیا کریں؟'' ٹیری نے کہا۔ تینوں کے دماغ میں یہی سوال تھا۔

''میرا خیال ہے پولیس کو بتانا چاہیے۔'' گریگ کی بات سے اتفاق کرنا دونوں کی مجبوری تھی کیونکہ گریگ عقل مند تھا اور پہلے کئی مرتبہ چھوٹی چھوٹی مشکلات حل کر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ قریبی پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ گریگ نے اعتماد سے ڈیوٹی پر موجود آفیسر کو ساری بات بتائی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد پولیس اور میڈیکل کا عملہ نامعلوم لڑکی کی لاش کے پاس موجود تھا۔

آفیسر فلپ اینڈریاس نے پوری توجہ سے جگہ کا معائنہ کیا۔ رات کے اندھیرے میں اسے ٹارچ کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ لڑکی کے جسم پر ہرن کی کھال کی جیکٹ موجود تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ چھ انچ اور عمر بائیس سے پچیس سال کے درمیان تھی۔ جسم کے کسی حصے سے خون بہنے کے نشانات نہ ملے۔ اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے۔ فلپ نے آس پاس کا معائنہ کیا مگر جوتے نہ ملے۔

''اسے کہیں اور قتل کر کے یہاں پھینکا گیا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے کے بعد اس نے ان تینوں لڑکوں کا بیان ریکارڈ کیا۔ وہ پہلی نظر میں اسے بے

قصور لگے تھے۔

اگلے دن اس نے اپنے بہترین سراغ رساں روبنسن جونسن کو بلایا۔ ”یہ کیس میں تمہارے حوالے کر رہا ہوں...... امید ہے حل نکل آئے گا۔“ روبنسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے سب سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کی۔ لڑکی کی گردن اور سر پر کسی سخت شے سے وار کیے گئے تھے مگر موت کی وجہ کچھ اور تھی۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ اس کی موت دو سے تین دن پہلے ہوئی تھی جبکہ اسے کسی قسم کی زیادتی کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔

روبنسن جونسن نے تحقیق کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے اس نے لڑکی کے دانت اور بلڈ سیمپل لیے۔ پولیس ریکارڈ میں دونوں موجود نہیں تھے۔ اس کے بعد اس نے فنگر پرنٹ کی مدد سے تلاش شروع کی مگر یہ بھی بے کار رہا۔ پولیس کے پاس لڑکی کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ نہیں تھا۔ اس کی لاش کے آس پاس سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جس سے اس کی پہچان ممکن ہوسکتی۔ قتل کی وجہ یا قاتل کی تلاش بعد میں کی جاتی، لڑکی کی شناخت ہی سب سے بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ روبنسن نے دس دن مسلسل کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ فلپ اینڈریاس کے سامنے بیٹھ کر اس نے رپورٹ پیش کی۔

”لڑکی کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ نہیں، وہ اس علاقے کی بھی نہیں ہے۔ اخبار اور ٹیلی ویژن میں اس کی تصاویر دی ہیں، کوئی رسپانس نہیں ملا۔ صرف دو کالز موصول ہوئی تھیں، ایک پچھتر سال کا بوڑھا شخص جس نے صرف میڈیا میں آنے کے لیے من گھڑت قصہ سنایا جبکہ دوسرے شخص کو غلط فہمی ہوئی تھی اور بعد میں اس نے معذرت کر لی۔“

”اب کیا ارادہ ہے؟“

”میرے خیال میں اس لڑکی کی موت کی وجہ ان تین وجوہات میں سے ایک ہے۔“ روبنسن نے اپنی بنائی گئی لسٹ سامنے کی۔ ”نمبر ایک، کیلیفورنیا کا سیریل کلر اب یہاں بھی آ گیا ہے...... وہ دو سال پہلے تین لڑکیوں کو اسی طرح گلا گھونٹ کر مار چکا ہے۔“

”ایک اندازے کے مطابق وہ مر چکا ہے۔“ فلپ نے تبصرہ کیا۔

”ممکن ہے — دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنی بیوی کو گلا گھونٹ کر مارنے والا نفسیاتی شوہر جو پولیس سے چھپ رہا ہے...... اس نے لڑکی کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی اور ناکام ہو کر اسے مار دیا۔“

”ایسا ممکن نہیں، لڑکی کے جسم پر کوئی نشان نہیں...... سر اور گردن پر جو وار کیے گئے ہیں وہ بھی کسی ٹھوس شے کے ہیں۔ ریپ کیس میں ایسے نشانات نہیں ملتے۔ زیادتی کی کوشش کی جاتی تو نشان سامنے ہوتے، چھپتے نہیں۔“

”گریگ، ٹیری اور ہوگارڈ نے اسے قتل کیا اور مارنے کے بعد پولیس کو اطلاع دی۔ تیسرا اور آخری حل......“ فلپ نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

”تم ناکام رہے ہو روبنسن...... یہ تینوں وجوہات نہیں ہیں۔ سیریل کلر مار کر لاش دور نہیں پھینکتا۔ جوتے غائب کرنے والا سیریل کلر ابھی تک ریکارڈ میں نہیں ہے۔ نفسیاتی شوہر نے بیوی کو شک کی بنا پر مارا تھا اور اب وہ اوہائیو میں ہے بھی نہیں۔ تینوں لڑکے بے قصور ہیں، وہ اتنی لمبی پلاننگ نہیں کر سکتے۔“ روبنسن کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

”یہ تو طے ہے کہ وہ لڑکی لمبا سفر کر کے آئی ہے کہیں سے۔ وہ آوارہ گرد نہیں ہے مگر اس کی جلد پر جو داغ ہیں وہ زیادہ دھوپ میں رہنے کی وجہ سے ہیں۔ یعنی وہ کچھ عرصہ کسی شدید گرم علاقے میں گزار چکی ہے۔“

”متفق۔“ اس نے اتفاق کیا۔ ”اس کے علاوہ وہ ایک صاف ستھری لڑکی ہے...... کوئی جسم بیچنے والی نہیں ہے بلکہ پوری لاش کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا ہے کہ صفائی پسند ہے، دانت بالکل صاف تھے اس کے......“ کئی اندازے لگانے کے بعد فلپ نے روبنسن سے کیس واپس لے لیا۔

اگلے تین سال تک مختلف پولیس آفیسرز اس پر کام کرتے رہے مگر لڑکی کی پہچان ممکن نہ ہو سکی۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے پر میری ملاقات دادا سے ہوئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ ”کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟“

”ہاں، کئی باتوں کا اندازہ ہوا ہے مگر اس کیس کی تفصیل آپ نے زیادہ نہیں لکھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شاید آپ ناکام رہے تھے اس وجہ سے......“ وہ دوبارہ مسکرائے۔

”نہیں میتھیو مائی سن! ایسا نہیں ہے۔ اصل میں زیادہ تفصیل تمہیں بور کر دیتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے بعد کام کرنے والے آفیسرز نے بھی یہی لکھا تھا رپورٹ میں کہ یہ کسی سیریل کلر کا شکار ہوئی ہے۔“

”اصل معما اس کے قاتل کی تلاش نہیں، اس کیس میں وہ کامیاب ہوگا جس نے لڑکی کا خاندان ڈھونڈ لیا۔“ میں نے خیال پیش کیا۔ انہوں نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''بالکل...... یہ بات درست ہے۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''مگر میرا خیال تھا پہلے تین یا چار ماہ تک اگر شناخت ہو جاتی تو کیس حل ہوسکتا تھا مگر اب تو چھتیس سال گزر چکے ہیں۔''

''ڈی این اے ٹیسٹ کیا گیا ہے لڑکی کا...... جلد اس کی شناخت ممکن ہو جائے گی۔''

''بیسٹ آف لک۔'' وہ مسکرائے۔ پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اتنا عرصہ ایک لڑکی کے دانت، بلڈ سیمپل اور دیگر ایسی چیزیں سنبھال کر رکھنے کی بڑی وجہ شاید یہی تھی کہ یہ کیس شروع سے میڈیا کی توجہ حاصل کرتا رہا ہے۔ اس لیے لوگ مسلسل اسے حل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر میں نے تھامسن سے اجازت نامہ لیا اور ریکارڈ روم کی طرف چل دیا۔ یہاں مجھے تقریباً ایک گھنٹے بعد پوری تفصیل ملی۔ یہاں بھی وہی باتیں لکھی تھیں جو دادا کے ریکارڈ میں درج تھیں۔ یہاں باقی آفیسرز نے جو کام کیے تھے وہ بھی لکھے ہوئے تھے۔ میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ایک بار پھر غور سے پڑھی۔ گردن پر تین چار وار کسی ٹھوس چیز کے تھے۔ ایک آفیسر کے خیال میں وہ قاتل سے لفٹ لے کر ہائی وے پر سفر کر رہی تھی جب راستے میں اسے قتل کر کے ہائی وے سے آٹھ کلومیٹر دور پھینکا گیا۔ کچھ دیر بعد میں باہر آیا اور تھامسن سے کہا۔

''مجھے تین لوگوں کی تفصیل لینی ہے کہ اب زندہ ہیں یا نہیں...... اگر زندہ ہیں تو ان کے فون نمبرز اور پتا بھی معلوم کرنا ہے۔'' اس نے سر ہلا کر مجھ سے نام پوچھے۔ میں نے ٹیری، ہوگارڈ اور گریگ کے نام اسے لکھوائے۔ ایک گھنٹے بعد اس نے مجھے لسٹ پکڑائی۔

''ہوگارڈ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر چکا ہے تقریباً تین سال پہلے...... ٹیری کینیڈا میں رہتا ہے البتہ گریگ تمہیں آسانی سے مل جائے گا۔ وہ ٹرائے میں ہی ہے۔ فوڈ اسٹریٹ کے بائیں جانب اس کا بار ہے۔'' اس نے مجھے ایڈریس سمجھایا۔ میں اس سے اجازت لے کر روانہ ہو گیا۔ دوپہر کے وقت بار ویران پڑا تھا۔ پچاس کے لگ بھگ عمر کا شخص دو کرسیوں پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اسے جگایا۔ اس نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

''شام پانچ بجے کے بعد ملے گی...... جو بھی شراب چاہیے۔''

''میتھیو روبنسن...... ٹرائے پولیس اسٹیشن۔'' میں نے تعارف کروایا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے امید تھی جلد ایک عدد تفتیشی آفیسر سے ملاقات ہونے والی ہے۔''

ماں پیاری ماں

☆ میں نے ثابت قدمی کا درس زندگی میں ماں سے سیکھا ہے۔ (کانٹ)

☆ ماں وہ ہستی ہے جس کے خلاف کچھ کہنا گناہ ہے۔ (نامعلوم)

☆ اس وقت کو یاد رکھو جب تم مجبور جسم کے مانند تھے اور تمہاری ماں کی نگاہیں تمہیں پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ (شیلر)

☆ ہر تکلیف اور غم کے وقت جب میں اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ جاتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے گویا میری ماں (مرحومہ) میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی ہو۔ بس اتنی سی بات اور تم پریشان ہو گئے بیٹے۔ مرد ہو، ہمت سے کام لو، میں کہتی ہوں اٹھو...... میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور طوفان سے جا ٹکراتا ہوں۔ پھر اس تکلیف اور غم میں شدت باقی نہیں رہتی۔

☆ ماں کی اصل خوب صورتی اس کی محبت ہے۔ میری ماں دنیا کی سب سے خوبصورت ماں ہے۔ (ابو منان)

☆ میں نے سب سے پہلے ماں کی آنکھوں میں محبت کا رنگ دیکھا ہے۔ (لانگ)

☆ بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے۔ خواہ بچے کی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ (شیکسپیئر)

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

''کیوں؟'' میں حیران ہوا۔

''کل خبر پڑھی تھی، ہرن کی کھال کی جیکٹ والی نامعلوم لڑکی کی تلاش ڈی این اے سے کی جائے گی۔'' اس نے ہیڈ لائن یاد کر رکھی تھی۔ ''اس کیس کا ایک حصہ میں بھی تھا...... اس لیے تمہاری آمد کی توقع تھی۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''نہ جانے کون تھی اور کس نے مارا اسے مگر مجھے مشہور کر گئی۔ بیس انٹرویو دے چکا ہوں اب تک۔'' اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''مجھے تم سے کچھ ضروری سوالات پوچھنے ہیں۔'' وہ باتونی معلوم ہوتا تھا۔ ویسے بھی گریگ عمر کے اس حصے میں تھا جب لوگ پاس بیٹھ کر باتیں کم سنتے ہیں۔ اس لیے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگلے ایک گھنٹے میں مجھے بہت کچھ سننا ہے۔

''ضروری سوالات......'' وہ ہنسا۔ ''یہی پوچھنا ہو گا کہ ہم اس رات کیا کر رہے تھے، کیوں وہاں گئے تھے، لاش کیسے دریافت کی اور ارد گرد کیا دیکھا؟''

''ان سوالات کے جوابات تم پہلے دے چکے ہو اور

میں پڑھ چکا ہوں۔'' میں مسکرایا۔ ''معاف کرنا، میں ذرا روایتی سوالات سے ہٹ کر کچھ پوچھنا چاہوں گا۔ اتنے سال مسلسل تم اس کیس سے جڑے رہے، کئی مرتبہ اپنی یادیں دوسروں کو بتاتے رہے...... تو مجھے بتاؤ، اس لڑکی کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے؟'' اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات دکھائی دیے۔

''تم پہلے پولیس والے ہو جس نے مجھ سے یہ سوال کیا۔'' اس نے تعریفی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''لڑکی کو دھوکے میں مارا گیا ہے، اس بات کا مجھے یقین ہے۔''

''کیسے؟''

''اس زمانے میں اکثر لڑکے لڑکیاں ہائی وے سے لفٹ لے کر سفر کرتے تھے اس لیے پولیس والوں کا خیال ہے وہ اسی طرح قاتل کے ہاتھ لگی ہے مگر ایسی بات نہیں ہے، اس طرح اسے اگر کوئی سیریل کلر مارتا تو وہ اسے اذیت دیتا جبکہ میرا خیال ہے جیکٹ والی لڑکی نے مرنے سے پہلے کوئی مزاحمت نہیں کی......''

''اس کے سر پر وار کیا گیا تھا، ممکن ہے وہ بے ہوش ہو۔'' میرے اعتراض کے جواب میں اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کوئی ایسا مجرم نہیں ہوسکتا جو اتنی خوبصورت لڑکی کو صرف قتل کرے...... اس کے ساتھ جسمانی زیادتی نہ کرے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کا قاتل اس کا جاننے والا نہ ہو، وہ کسی اپنے کے ہاتھوں دھوکے میں ماری گئی تھی۔'' مجھے بوریت ہونے لگی۔ وہ فلسفہ بیان کر رہا تھا۔

''اس کیس پر تم نے کبھی خود سے تحقیق کی کوشش کی؟'' میں نے اس سے ایک اور سوال کیا۔

''ہاں...... میں نے کی، وہ لڑکی کسی اچھے گھر سے تھی مگر اسے گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔''

''اس کے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے تو کیا وہ ننگے پیر سفر کر رہی تھی؟'' اس نے طنز کیا۔ ''ظاہر ہے جس نے جوتے اتارے...... قتل کیا وہی سامان بھی لے گیا۔ میرا اندازہ درست ہے، ایک منٹ رکو۔'' وہ اندر چلا گیا۔ گریگ مجھے خبطی لگ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری تھی۔ اس میں مختلف تصویریں موجود تھیں۔ اس نے پرانے زمانے کی ایک مشہور اداکارہ کی تصویر دکھائی۔

''یہ جیکٹ دیکھو...... ہرن کی کھال کی جیکٹ، کافی مہنگی ہوتی تھی اس زمانے میں...... فیشن تھا اس کا۔ اس کے پیروں میں جو جوتے ہیں وہ اسی جیکٹ کے رنگ کے ہیں۔ لڑکی کے جوتے بھی یقیناً ایسے ہوں گے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی دلیل مضبوط تھی۔ ''اس لیے یہ مت سمجھو کہ وہ غریب گھر سے ہے...... ہاں مگر وہ دور سے تھی۔ اس کے چہرے پر نشانات تھے یعنی وہ کافی عرصہ گھر سے باہر رہی تھی، گھومنے پھرنے میں دلچسپی رکھتی تھی وہ۔'' باہر موسم سرد ہو رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے جلد برف باری ہونے والی ہے۔ میں نے اس سے اجازت مانگنی چاہی مگر اسی دوران اس کی ایک بات نے مجھے چونکا دیا۔ ''ایسی لڑکیاں اکثر نرم مزاج اور محبت کرنے والی ہوتی ہیں۔ میرے دوست ٹیری کی ایک گرل فرینڈ بھی اسی طرح گھومنے آئی ہوئی تھی۔ ٹیری اکثر اس سے ملنے جاتا تھا۔''

''تم نے اسے دیکھا تھا؟ ٹیری کی گرل فرینڈ کو؟''

''نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''ٹیری کہتا تھا وہ بہت خوبصورت ہے اور محبت کرتی ہے اس سے۔ شاید دو تین بار ٹرائے آئی تھی۔ میں اور ہوگارڈ ہمیشہ جھوٹ سمجھتے تھے اس کی بات کو۔''

''جن دنوں اس لڑکی کی لاش ملی، ان دنوں وہ آئی تھی؟''

''ہاں...... تین دن پہلے......'' اس کا جواب سن کر میں اچھل پڑا۔

''یہ بات تم نے کسی تفتیشی آفیسر کو بتائی تھی پہلے؟''

''ہاں...... سب سے پہلے جس نے پوچھا تھا اسے بتانے کی کوشش کی مگر اس نے دلچسپی نہیں لی، اس کے بعد بس تم ہو جس نے ذاتی رائے پوچھی ہے مجھ سے۔'' گریگ نے جواب دیا۔ میں اس سے اجازت لے کر باہر آ گیا۔ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ میں نے ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے اور بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ واپس پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے میرے دماغ میں بہت سے سوالات گھوم رہے تھے۔

☆☆☆

ٹرائے سے تقریباً اسّی کلومیٹر دور جہاں سے میں گزر رہا تھا، وہاں موسم بہتر تھا۔ برف باری نہیں ہو رہی تھی البتہ آسمان صاف نہیں تھا۔ صبح کے نو بج چکے تھے۔ مجھے آج سارا دن سفر کر کے دوسری ریاست میں پہنچنا تھا۔ میرے پاس جس علاقے کا پتا تھا وہ جنوب میں واقع آرکنساس کا علاقہ تھا۔ گیارہ گھنٹوں کا یہ سفر میری اسپیڈ کے حساب سے دس گھنٹے میں طے ہونا چاہیے تھا۔

اس دن جب میں واپس پولیس اسٹیشن پہنچا تو تھامسن

نے مجھے خبر سنائی۔
"جیکٹ والی لڑکی کا نام مارشیا کنگ ہے...... وہ آرکنساس سے ہے۔"
"زبردست......" مجھے خوشی ہوئی۔" کیسے معلوم ہوا؟"
"اس کا ڈی این اے کافی عرصہ پہلے سے آرکنساس کی لیبارٹری میں موجود ہے، اس لیے شناخت کرلی گئی ہے۔ تم کل روانہ ہو رہے ہو وہاں، کوئی رشتے دار ڈھونڈنا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ رات کو جب دادا جان کو خبر سنائی تو ان کا ردعمل میری توقع کے خلاف تھا۔ انہوں نے بس کندھے اچکائے۔
"مجھے نہیں لگتا کسی کو مارشیا کنگ کا انتظار ہوگا۔"
"ممکن ہے کوئی زندہ ہو۔" میں نے جواب دیا۔ اگلی صبح میں ان سے ملے بغیر پولیس اسٹیشن سے ہوتا ہوا سفر پر نکل پڑا۔ تقریباً رات آٹھ بجے میں اپنے پاس موجود ایڈریس تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے بیل بجائی۔ گیٹ ایک بیس بائیس سال کی لڑکی نے کھولا۔
"ٹرائے، اوہائیو سے آفیسر میتھیو۔" میں نے اپنا کارڈ دکھایا۔" مجھے تمہارے پاپا سے ملنا ہے...... آرتھر کنگ سے۔"
"پاپا آنے والے ہیں، آپ اندر آجائیں۔" میں گیٹ سے داخل ہو رہا تھا کہ پیچھے سے ایک اور گاڑی کی آمد ہوئی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ آرتھر کنگ ہے۔ کچھ دیر بعد میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے پوری بات کی تفصیل بتائی۔ اس نے کسی قسم کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ بولا تو اس کے الفاظ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔
"مارشیا کو ہم نے بہت ڈھونڈا مگر وہ نہیں ملی...... ہم اسے مُردہ تصور کر چکے تھے...... اب بھی اطلاع آئی تو اس کی موت کی، انتظار ختم ہو چکا ہے اب تو۔" اس نے گہری سانس لی۔" ہاں مگر...... اس ایڈریس پر چلے جاؤ۔" اس نے کاپی پر ایک ایڈریس لکھ کر مجھے دیا۔" پوری دنیا ترقی کر چکی ہے...... مگر جس گاؤں میں ہمارا تب گھر تھا وہ گاؤں ویسے کا ویسا ہے۔ ہمارا گھر بھی کھنڈر بننے والا ہے۔"
"میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"وہاں ایک بوڑھی عورت رہتی ہے...... میری ماں ہے وہ۔ اسے مارشیا کا اب بھی انتظار ہے، ہم سب وہ علاقہ چھوڑ چکے ہیں مگر ان کے پاس اب بھی وہی فون نمبر ہے...... وہی پتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں مارشیا جب واپس آئی تو اسی ایڈریس پر آئے گی۔" اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔
میں اٹھ کر باہر آگیا۔ واپس گاڑی میں بیٹھ کر میں نے دوبارہ سفر شروع کیا۔ گاؤں تقریباً دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے وہ گھر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی جس کی حالت اس کی عمر بتا رہی تھی۔ وہ سالوں پرانا گھر تھا جس کا ایک حصہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ فون کی تار دکھائی دے رہی تھی۔ میری دستک کے جواب میں جس عورت نے لکڑی کے پرانے ڈیزائن کا دروازہ کھولا، وہ کم سے کم نوّے سال کی تھی۔ اس کے چہرے پر لاتعداد جھریاں تھیں۔
"جی بیٹا؟" اس کی آواز جسامت کے برعکس بہتر تھی۔
"میں مارشیا کی خبر لے کر آیا ہوں۔" پولیس کی ڈیوٹی میں مجھے کئی کیس حل کرنے تھے...... کئی مشکلوں سے گزرنا تھا مگر اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اس طرح کی خبر سنانا بہت مشکل کام ہے۔
"کک...... کہاں ہے وہ؟ کیا وہ زندہ ہے؟" بوڑھی عورت کی آواز میں ایک امید تھی۔ لرزتی آواز نے میرا دل ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ بمشکل یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے۔
"وہ مر چکی ہے...... اس کی لاش کی اب شناخت ممکن ہوئی ہے۔" بوڑھی عورت نیچے گر گئی۔ میں اسے سہارا دے کر اندر لے آیا۔ مجھے اس کے پاس کافی وقت گزارنا پڑا۔

☆☆☆

واپسی پر میری ملاقات ایک بار پھر آرتھر سے ہوئی۔ اس نے کچھ اہم باتیں بتائیں۔" مارشیا اکثر اوہائیو کی طرف سفر کرتی رہتی تھی...... اسے گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ میں تب چودہ پندرہ سال کا تھا اور وہ مجھ سے بڑی تھی۔ چھٹیوں میں وہ بہت لمبا سفر کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران کچھ مذہبی لوگوں کے ہاتھ لگ گئی وہ...... بڑی مشہور تنظیم تھی تب، حق کا راستہ نام تھا اس کا۔ سارے پادری تھے۔ ان کا چرچ تھا ٹرائے میں، وہاں مارشیا کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ بڑا ذکر کیا کرتی تھی اس کا۔ میرے پاس کچھ پرانی تصویریں ہیں، میں دکھاتا ہوں۔" وہ اندر گیا اور تصویریں اٹھا لایا۔ میں نے تصویروں میں غور سے دیکھا۔ مجھے ٹیری کو پہچاننے میں کوئی مشکل نہ ہوئی۔ بلاشبہ مارشیا کے ساتھ وہی تھا۔ اس کی تصاویر میں پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔
"گمشدگی کے بعد اس لڑکے سے رابطہ ہوا؟"
"نہیں...... میرا کزن گیا تھا ٹرائے، اسے بھی کچھ حاصل نہ ہوا......"
آرتھر نے کئی کام کی باتیں بتائیں۔ واپسی پر مجھے

یقین تھا کہ یہ کیس میں حل کر چکا ہوں۔ٹیری کا مارشیا سے تعلق چھپانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ جھوٹا ہے۔یقیناً اسی نے مارشیا کو قتل کیا تھا۔میں نے واپس پہنچ کر تھامسن کو پوری بات بتائی۔

''کینیڈا سے قاتل پکڑنا بہت مشکل ہے......ٹیری آخری اطلاعات کے مطابق کینیڈا میں ہے۔اس بات کی تصدیق کرنی ہوگی کہ وہ ابھی وہاں ہے یا نہیں۔''

''مجھے تصدیق کر کے بتائیں جلدی۔'' میں نے کہا اور واپس گھر آ گیا۔دادا کو ساری بات بتا کر میں نے سونے کی اجازت مانگی۔رات کے تقریباً ایک بجے کا وقت تھا جب میری آنکھ کھلی۔کوئی باہر گھوم رہا تھا۔قدموں کی آہٹ سنائی دی۔میں چونک گیا۔آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا میں باہر چل دیا۔دادا کے کمرے میں کوئی موجود تھا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' مجھے دادا کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مجھے رقم کی ضرورت ہے......'' دوسرے شخص کی آواز میرے لیے اجنبی تھی۔

''تمہیں معلوم نہیں......تمہارا راز فاش ہو چکا ہے۔'' دادا غرائے۔''جلد پولیس تم تک پہنچ جائے گی......پکڑے جاؤ گے۔''

''میں بھی تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے......بڑھاپے کے دن آسٹریلیا میں گزاروں گا، پیسے دیتے رہو۔''

میں نے دروازے سے جھانکا۔سامنے موجود شخص کے چہرے کے نقوش مجھے یاد تھے۔وہ ٹیری تھا......

''تم باقی کی زندگی جیل میں گزارو گے ٹیری۔'' میں سامنے آ گیا۔''خبردار......حرکت مت کرنا۔'' ٹیری ساکت کھڑا تھا۔میں اس کو دیکھ رہا تھا۔اسی دوران میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔میں نیچے گر گیا......چند سیکنڈ بعد میں ہوش کی دنیا سے غافل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بیڈ پر پڑا تھا۔بیڈ کے ساتھ صوفے پر دادا بیٹھے تھے۔ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی نہیں تھا۔میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر سر میں اٹھنے والی درد کی لہر نے مجھے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا۔''آپ نے مجھے بے ہوش کیوں کیا دادا جی......آپ نے ایک مجرم کا ساتھ دیا ہے۔'' وہ چپ رہے۔میں جھنجلا گیا۔''وہ قاتل آپ کو کیوں بلیک میل کر رہا تھا......یہ کیا چکر ہے؟''

''ٹیری تمہارا باپ ہے میتھیو۔'' مجھے جھٹکا لگا۔میں نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''یہ سچ ہے۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔''ٹیری میرا بیٹا ہے۔مجھے اس سے بہت پیار تھا اس لیے میں چاہتا تھا کہ وہ پولیس میں جائے۔اس پر سختی کی......اس کا خرچہ بند کیا، بہت کم جیب خرچ ملتا تھا اسے۔میں چاہتا تھا وہ اچھا انسان بن جائے مگر وہ آوارہ مزاج لڑکا تھا۔نہ جانے کب اس کی دوستی مارشیا سے ہوگئی۔مارشیا اس سے محبت کرتی تھی جبکہ ٹیری وقت گزار رہا تھا پھر ایک دن......اس نے شراب کے لیے مارشیا سے پیسے مانگے۔ان دنوں وہ ٹرائے میں رکی ہوئی تھی۔مارشیا نے انکار کیا تو ٹیری نے اسے قتل کر دیا اور اس کا سارا سامان لے جا کر بیچ دیا۔جوتے تک بیچ دیے، پیسے بھی حاصل کر لیے۔اس کی لاش جہاں اس نے پھینکی تھی وہاں سے مل گئی اور گریگ کے بیان کے بعد مجھے قاتل کا علم ہو گیا تھا مگر میں نے اپنی ناکامی تسلیم کر کے کیس کو الجھا دیا۔مارشیا کون ہے، یہ مجھے علم تھا۔ٹیری کو تفتیش اور سوال جواب کے دوران اس لیے بھی سہولت مل گئی کیونکہ وہ میرا بیٹا تھا......دو تین سال بعد جب لوگ کیس کو بھولنے لگے تو میں نے ٹیری کو کینیڈا بھیج دیا۔وہاں اس نے شادی کر لی مگر اپنی روٹین نہ بدلی۔جب تم پیدا ہوئے تو میں تمہیں اس کی صحبت سے دور لے آیا......تمہاری ماں اسے چھوڑ کر جا چکی ہے، وہ تم سے محبت کرتا ہے مگر میرے سامنے مجبور ہے......''

''آپ نے غلط کیا، ایک قاتل کا ساتھ دیا۔'' میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔''وہ آپ کا بیٹا تھا......آپ کو علم ہے مارشیا کی ماں اس کا اب تک انتظار کر رہی تھی۔''

''میں نے بھی ٹیری کو سزا دی ہے میتھیو۔'' وہ اداس لہجے میں بولے۔

''وہ کیسے؟''

''جب کیس ختم ہو چکا تھا......کوئی نہیں جانتا تھا کہ مارشیا کون ہے اور اس کا قاتل کون......تو ٹیری محفوظ تھا مگر میں نے اسے خود سے دور رکھا اور مارشیا کی ماں کی طرح اسے بھی تمہارے لوٹ آنے کا انتظار کرنا ہے......وہ بھی اکیلا رہے گا ساری عمر......'' سرد ہوا اور بارش کے شور نے ماحول کی اداسی میں اضافہ کر دیا تھا......

دوسرے دن جب تھامسن نے اطلاع دی کہ ٹیری غائب ہے تو میں خاموش ہو گیا۔مجھے بھی انتظار ہے کب ہمارا راز فاش ہوگا اور کب وہ پکڑا جائے گا۔

⌘⌘⌘



عشق بلاخیز

ظفر اقبال ظفر

قانون سے محبت کرنے والوں کو بعض اوقات حالات انتہائی آزمائش میں مبتلا کردیتے ہیں... اور محبت تو چاہے جس سے بھی کرلی جائے... ہر حال میں آزماتی ہے۔ وہ بھی قانون اور... محبت کے مابین کچھ اس طرح پھنس چکا تھا کہ محبت کو بچاتا تو قانون شکن کہلاتا اور اگر قانون کا ساتھ دیتا تو بے وفا... ایسے میں اس نے تھوڑی سی بے ایمانی کا سہارا لے لیا۔

ٹوٹے دل اور بکھرتے حوصلوں کی عبرت اثر کہانی

میں پوری محویت کے ساتھ مدیحہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ چاند کے مانند لگ رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں بھی نہایت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔

مدیحہ کے ساتھ میری شادی ہوئے چوتھا سال تھا۔ ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے لیکن اس محرومی سے ہم دونوں میاں بیوی ذرہ برابر پریشان نہیں تھے کیونکہ پچھلے ہی سال ہم نے اپنے بعض بے تکلف اور مہربان دوستوں کے اصرار پر اپنا اپنا میڈیکل چیک اپ کرایا تھا جس کی مثبت رپورٹس نے ہمیں بالکل مطمئن کر دیا تھا کہ کسی قسم کا نقص یا خرابی دونوں طرف موجود نہ تھی۔ ویسے بھی میں ابھی مدیحہ

کے ساتھ تنہائی کے ایک ایک پل کی محبت پوری طرح سمیٹنا چاہتا تھا۔ میری اور مدیحہ کی محبت یونیورسٹی میں پروان چڑھی تھی۔ چونکہ یونیورسٹی میں ہمارا افیئر کسی سے مخفی نہیں تھا اس لیے ہمارے اکثر کلاس فیلوز ہمیں رشک بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ ویسے تو ہم دونوں ہی سائیکالوجی کے اسٹوڈنٹ تھے تاہم میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا مستقبل کا راستہ چنا جا چکا ہے۔ میرے والد پولیس کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے، انہوں نے محکمۂ پولیس میں ساری زندگی دیانت داری سے فرائض ادا کرتے ہوئے نیک نامی اور اپنے کریڈٹ پر کئی کارنامے جمع کیے تھے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا، وہ مجھے بھی پولیس کا اعلیٰ افسر بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں سائیکالوجی کی ذیلی برانچ کرمنالوجی کا مطالعہ پوری سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ کر رہا تھا۔

مدیحہ سے میرا تعلق یونیورسٹی کے ابتدائی دنوں میں جڑ گیا تھا۔ کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری کیمسٹری بھی ایک دوسرے سے بہت ملتی تھی۔ ہم دونوں کے مزاج میں دھیما پن اور متاثر کن سنجیدگی تھی۔

کچھ تو ہم فطری طور پر کم گو اور حساس طبع تھے، رہی سہی کسر نفسیات کے مضمون نے پوری کر دی تھی۔ بعض بے تکلف کلاس فیلو عشقیہ شعر اور فلمی ڈائیلاگ سنا سنا کر مجھے اور مدیحہ کو کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کرتے رہتے تھے لیکن ہم دونوں کی ہنسی مسکراہٹ تک آ کر دم توڑ جاتی تھی۔ ویسے بھی مدیحہ کا سنجیدہ چہرہ مجھے بھلا لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلا نامعلوم سا کرب اور خوابیدہ خوابیدہ آنکھوں میں چکراتا ہوا سناٹا میرے لیے لحظہ لحظہ کشش کا باعث بنتا تھا۔ مدیحہ کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ ہاسٹل میں اپنی ایک کزن کی روم میٹ ہے۔ میں اس کا بیک گراؤنڈ اور گھریلو حالات جانے بغیر دل ہی دل میں اسے اپنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ابو میرے اس فیصلے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔

پھر ہوا بھی یہی...... یونیورسٹی سے فراغت ملتے ہی ابو نے ایک دن میرے سر پر سہرا سجانے کا ذکر چھیڑ ڈالا اور میں نے بڑی سادگی کے ساتھ مدیحہ کا ذکر کر کے اگلے دن مدیحہ کو ابو کے سامنے لا بٹھایا۔ تب معلوم ہوا کہ مدیحہ کے والدین ایک حادثے میں وفات پا چکے ہیں، میری طرح وہ بھی والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ مدیحہ کی پرورش اس کے ماموں نے کی تھی اور اس کا ماموں اوسط درجے کا ایک پڑھا لکھا زمیندار تھا، جس نے اپنی بیٹی کے ساتھ ساتھ مدیحہ کی تعلیم و تربیت بھی نیک نیتی سے کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھائی اور یوں مدیحہ تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے اپنے ذاتی شوق کی بنا پر یونیورسٹی کے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ تک آ پہنچی تھی۔

میرے ابو کوئی معمولی شخص نہ تھے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا وہ اعلیٰ سرکاری عہدہ ان کی پہچان تھا جس سے وہ ریٹائر ہوئے تھے چنانچہ ایک پُروقار سادگی کے ساتھ ابو مدیحہ کو بہو بنا کر گھر لے آئے۔ امی تو مجھے جنم دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں چنانچہ ابو مدیحہ کے لیے سسر اور ساس کے روپ میں موجود تھے۔ محکمۂ پولیس میں میری جاب کا بندوبست شاید ابو پہلے ہی کر چکے تھے کہ شادی کے صرف ایک ہفتے بعد ہی ایک ماہ کی بنیادی ٹریننگ کے بعد میں نے کرائم برانچ میں ایک بڑے عہدے پر ملازمت جوائن کر لی۔ مجھے ملازمت کا پہلا دن اچھی طرح یاد ہے کہ ابو نے میری شرٹ کا کالر درست کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کاشر بیٹے! وعدہ کرو میری نیک نامی پر آنچ نہیں آنے دو گے، اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتو گے، اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کرو گے اور ہمیشہ رزقِ حلال پر قناعت کرو گے۔''

میں ابو کی شفاف زندگی اور بے داغ کردار سے خوب واقف تھا، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنے کسی عمل سے ان کی نیک نامی کو نیلام کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں لاتا، میں نے فوراً جواب دیا۔ ''ابو! آپ کی نصیحت ہمیشہ میرے لیے مشعلِ راہ بنی رہے گی۔'' میرے لہجے میں عزم و اعتماد کی سنگلاخی محسوس کرتے ہوئے ابو کے لبوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ آ گئی تھی مگر...... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابو کی یہ نصیحت ان کی عجلت آمیز وصیت ثابت ہو گی۔

اگلے ہی دن دل کا تیسرا دورہ جان لیوا ثابت ہوا، اب ایک بڑے اور پُرآسائش گھر میں مدیحہ اور میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے تنہا ہو گئے تھے۔

مدیحہ بھرپور نیند لینے کی عادی تھی اور مجھے اس کی نیند میں خلل ڈالنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں دیر تک پوری محویت سے اسے دیکھتا رہا اور پھر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

آفس پہنچ کر ناشتے کے بعد کافی کی پہلی ہی چسکی لی تھی کہ میرا ہم منصب آفیسر اعجاز داخل ہوا۔

''لگتا ہے جناب نے ناشتا آج بھی آفس میں کیا ہے......'' اعجاز کے لبوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔

''ہاں یار! آج بھی میں اپنی پُرسکون زندگی کو مضطرب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے دبے پاؤں نکل کر آفس آ گیا۔''

میں نے محبت بھرے اطمینان سے اعجاز کی مسکراہٹ کا جواب دیا۔

''ایسی محبت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں یا کبھی کبھار فلموں میں دیکھ لیتے ہیں۔'' اعجاز نے خالی مگ میں تھرماس سے کافی انڈیلتے ہوئے ایک بار پھر میری طرف مسکراہٹ اچھالی۔

''کتابوں اور فلموں تک محبت ہماری زندگی سے ہی ٹریول کرتی ہے اعجاز! کاش تمہیں کسی سے محبت ہوتی۔'' میری نگاہوں میں مدیحہ کا خوابیدہ سراپا آن ٹھہرا۔

''سنا ہے میڈم قیصرہ کے بنگلے سے ویجی لینس فورس واپس بلائی جارہی ہے۔'' اعجاز نے خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے خبر سنائی۔

''کیا مطلب! اتنی جلدی کیوں؟ کس کے آرڈر سے؟'' میں نے سٹپٹا کر ایک ہی سانس میں تین سوال کرڈالے۔

''برانچ ہیڈ جعفری صاحب کی میل آ گئی ہے کہ آج رات آٹھ بجے تک فورس میڈم قیصرہ کے بنگلے سے واپس بلالی جائے۔'' اعجاز نے وضاحت کی۔

میرے دل ودماغ میں سنسناہٹ شروع ہوگئی اور لہجے میں کشمکش عود کرآئی۔ ''نہیں، بالکل نہیں۔ بات صرف میڈم قیصرہ تک محدود نہیں، یہ پورے کالج ہاسٹل کا مسئلہ ہے۔ یہ بات میڈیکل رپورٹ سے ثابت ہو چکی ہے کہ میڈم قیصرہ نارکوٹک ڈرگز اور ہیروئن کی عادی ہے اور ہماری ویجی لینس فورس کی کڑی نگرانی کے باوجود میڈم قیصرہ کے بنگلے تک ہیروئن کی سپلائی ہوتی رہی ہے۔ اس معاملے کی تہ تک پہنچے بغیر کیسے ممکن ہے کہ فورس واپس بلائی جائے۔'' میرے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''یار کاشر! یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری فورس کے بہترین آدمیوں کی کڑی نگرانی کے باوجود میڈم قیصرہ تک ہیروئن پہنچتی رہی ہو؟'' اعجاز نے کہا

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ کہیں نہ کہیں سے مسلسل حاصل کررہی ہے اپنی یومیہ مقدار۔'' میں نے پُریقین لہجے میں جواب دیا۔

''شاید پہلے سے کچھ مقدار اس کے پاس جمع ہو جسے وہ نگرانی کے دوران استعمال کرتی رہی ہو..... کیا تم نے اس بات پر غور کیا؟'' اعجاز نے پُرخیال انداز میں استفسار کیا۔

''ہاں! میں نے اس پہلو پر غور کیا ہے لیکن کچھ بھی ہو، میں ان ذرائع تک پہنچنا چاہتا ہوں جہاں سے میڈم قیصرہ کو ہیروئن کا کوٹا ملتا رہا ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا اور آفس سے باہر آ گیا۔ اعجاز نے آواز دے کر مجھے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے سر پر معاملے کی تہ تک پہنچنے کا جنون سوار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

چالیس منٹ کی مسافت کے بعد مجھے ویمن کالج کے وسیع وعریض احاطے میں داخل ہونے کے لیے مین گیٹ کی چیک پوسٹ پر گاڑی روکنی پڑی۔ اپنے محکمے کا کارڈ دکھانے پر سکیورٹی گارڈز نے مین گیٹ کھول کر مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔

اب میں اپنی کار میں کالج کی عقبی جانب جارہا تھا جہاں طالبات کے ہاسٹل اور ان سے متصل اسٹاف کے لیے رہائشی بنگلے تھے۔ انہی میں سے ایک وہ بنگلا تھا جہاں میڈم قیصرہ کی نگرانی کے لیے محکمے نے ذہین ترین افراد کو متعین کیا ہوا تھا۔

میڈم قیصرہ اس ویمن کالج کی ہاسٹل وارڈن تھی۔ چھ ماہ پہلے اچانک اس کالج کی خفیہ رپورٹ سامنے آئی جس نے حساس اداروں کو یکدم الرٹ کر دیا۔ رپورٹ کے مطابق گرلز ہاسٹل میں متعدد طالبات ہیروئن کی عادی ہو چکی تھیں۔ رپورٹ کا خوفناک پہلو یہ تھا کہ ہاسٹل وارڈن میڈم قیصرہ گزشتہ آٹھ سال سے ہیروئن اور نارکوٹکس ڈرگز کی عادی چلی آ رہی تھی اور ہاسٹل میں طالبات کو ہیروئن کی سپلائی بھی میڈم قیصرہ کے ذریعے ہورہی تھی۔ ابھی تک اس سارے معاملے کو میڈیا سے چھپایا گیا تھا۔ حساس ادارے کے فوری اقدامات کے تحت منشیات کی عادی طالبات کے والدین سے خفیہ میٹنگ کر کے مکمل رازداری کا عہد لیا گیا اور متاثرہ طالبات کو غیر محسوس انداز میں بحالی سینٹرز منتقل کر دیا گیا۔ حساس اداروں نے یہ ٹاسک کرائم برانچ کے سپرد کر دیا تھا اور یوں اعجاز اور میں پچھلے چار ماہ سے اس کیس پر کام کر رہے تھے۔ اب نہ جانے کون سے سیاسی دباؤ یا مصلحت کے تحت برانچ ہیڈ جعفری صاحب کے ذریعے میڈم قیصرہ کی نگرانی پر مامور خفیہ فورس ہٹا کر کیس کی فائل بند کی جارہی تھی لیکن میں ہر قیمت پر میڈم قیصرہ تک پہنچ کر ان ذرائع کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا جنہوں نے ویمن کالج تک منشیات کے پھیلاؤ کے لیے رسائی حاصل کی تھی۔

دھیمے انداز سے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بالآخر میں اس بنگلے تک جا پہنچا جہاں میڈم قیصرہ کو محصور رکھا گیا تھا۔

میں نے اپنی کار کو بنگلے سے چند گز کی دوری پر روکا اور سوئچ آف کر کے کار سے باہر نکل آیا۔ آہستگی سے گیٹ

لاک کر کے میں بنگلے کی طرف بڑھا۔ ابھی گیٹ سے چند قدم پیچھے ہی تھا کہ اچانک خفیہ فورس کا ایک آدمی نہ جانے کہاں سے نکل کر میرے راستے میں دیوار بن گیا۔ میں نے اطمینان کے ساتھ جیب سے اپنا محکمانہ شناختی کارڈ برآمد کیا اور اس پتھریلے اعصاب کے مالک کے سامنے لہرایا۔ اس شخص نے کارڈ میرے ہاتھوں سے لے کر اچھی طرح معائنہ کیا اور مجھے واپس کر کے خاموشی کے ساتھ ایک طرف ہو گیا۔ میں نے قدم آگے بڑھا کر مین گیٹ کو دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ میں معمول کے انداز میں اندر داخل ہوا اور میں نے اپنے عقب میں گیٹ بند ہو جانے کی آواز سنی۔ لان عبور کر کے میں راہداری میں پہنچا تو اوپر جاتے......

زینے سے نیچے اترتے ہوئے خفیہ ادارے کے ایک اور شخص نے مجھے اوپر جانے کا اشارہ کیا اور خود نہایت خاموشی اور اجنبیت کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ شاید میرا شناختی کارڈ چیک کرنے والے شخص نے اپنے تمام ساتھیوں کو اپنے خاص ذریعے سے مطلع کر دیا تھا۔ میں زینے کی سیڑھیاں عبور کر کے اوپر پہنچا تو دائیں جانب ایک کمرے کا دروازہ قدرے کھلا ہوا تھا جس سے میڈم قیصرہ کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے دروازے کا پٹ جوتے کی نوک سے دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی بیڈ پر میڈم قیصرہ دراز تھی۔ جونہی میں آگے بڑھا وہ کسلمندی کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ منشیات استعمال کرنے سے پہلے وہ یقیناً خوبصورت رہی ہو گی لیکن اب اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے اور اس کا حسن گہنا گیا تھا۔

''کیا ابھی تک تم لوگوں کی تفتیش مکمل نہیں ہوئی؟ میں اعتراف جرم بھی کر چکی ہوں اور..... کھانے پینے کی تمام چیزیں بھی میں نے چھوڑ دی ہیں۔'' میڈم قیصرہ نے بیزاری کے ساتھ کہا اور جواب کی توقع کرتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے قریب رکھی کرسی گھسیٹ لی اور اس پر بیٹھ گیا۔

''تفتیش کرنا میری ذمے داری نہیں اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ تفتیش کس مرحلے میں ہے۔ میں تو یہاں کسی اور چیز کا کھوج لگانے آیا ہوں۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''اگر تمہیں یہاں ہیروئن کی تلاش ہے تو تم اپنا وقت ضائع کرو گے۔ یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔'' میڈم قیصرہ نے یقین دلانے والے انداز میں دوٹوک لہجے میں کہا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''تم جیسی ہیروئن کی عادی بہت پُرسکون ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم ریگولر اپنا کوٹا استعمال کر رہی ہو۔'' میں نے بھی دوٹوک لہجے میں اپنا یقین بھرا اندازہ اس کی طرف اچھال دیا۔

''تمہارے ڈیپارٹمنٹ کو اس بھرے شہر میں صرف میں ہی نظر آئی ہوں ہاتھ ڈالنے کے لیے۔ کیا ملے گا مجھے برباد کر کے؟'' میڈم قیصرہ نے اپنے اندر بھڑکتی آگ کا پہلا شعلہ منہ سے نکالا۔

''حیرت ہے، تمہیں اپنے جرم کی سنگینی کا بالکل احساس اور ملال نہیں۔ جانتی ہو تم کب سے اس زہر کے پھیلاؤ کا سبب رہی تھیں؟ کتنی طالبات کو تم نے اس زہر کا عادی بنا دیا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں اسے جواب دیا تو اس نے مجھ سے نظریں چرا کر ایک طرف منہ پھیر لیا۔

''دیکھو میڈم قیصرہ! مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں، مجھے اس شخص کا نام اور پتا بتا دو جو تمہیں پاؤڈر سپلائی کرتا رہا ہے۔'' میں نے اپنی آمد کا مقصد واضح کیا۔

''مجھے پاگل سمجھا ہے کیا.....؟ تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں اس کا نام بتا کر خود اپنے ہاتھوں وہ راستہ بند کر دوں جو.....''

''دیکھو میڈم قیصرہ! اس بات کو بالکل بھول جاؤ کہ اب کہیں سے کوئی خفیہ ہاتھ تمہاری ضرورت پوری کرنے آسکے گا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا..... اب کوئی سپلائر تم تک پہنچ جائے یہ ناممکن ہے۔ .....اور یہ سو فیصد ممکن ہے کہ اب بھی تمہارے پاس اتنا کوٹا یہاں موجود ہو گا جس کے سہارے تم چند دن سکون سے گزار سکو۔ میں چاہوں تو اس کمرے کی دیواریں اور فرش ادھیڑ کر بھی وہ کوٹا ڈھونڈ سکتا ہوں۔ لیکن میری طرف سے اسے رعایت سمجھو کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے صرف سپلائر کا نام پتا بتا دو..... ورنہ میں.....'' میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑی اور میڈم قیصرہ کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہراتے ہوئے محسوس کیے اور وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''میں نے تمہیں اس کا نام بتا دیا تو پھر مجھے کون...''

میڈم قیصرہ کی کانپتی ہوئی آواز جیسے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

''تم پرانی کھلاڑی ہو، تم پر ایک دروازہ بند ہو گا تو کوئی دوسرا دروازہ کھول لو گی..... فی الحال یہ ضروری ہے کہ تم اپنے سپلائر کا نام بتا دو۔ ورنہ میں اپنی تلاش جاری رکھتا ہوں اور تم آج ہی سے سسکنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے میں فیصلہ کن انداز میں کرسی سے اٹھنے لگا۔

"ٹھہرو! کرسی پر بیٹھے رہو۔" میڈم قیصرہ اب ٹوٹ کر بکھر رہی تھی اس نے سپلائر کا نام اور پتا مجھے بتا دیا۔

☆☆☆

میری کار تیز رفتاری سے شہر کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد میں شہر کے شمالی حصے میں آن پہنچا تھا۔ شہر کی نو آبادیات میں یہ نسبتاً گنجان آباد تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنی کار مین روڈ سے پہلی ذیلی سڑک پر موڑی، مجھے دور ہی سے الکریم رئیل اسٹیٹ ایجنسی کا بورڈ دکھائی دیا۔ یہی میری مطلوبہ جگہ تھی۔

وہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ انگریزی کے حرف L کی شکل میں تین اطراف میں دکانیں اور اوپر رہائشی فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ غالباً یہ منی پلازا نو تعمیر شدہ تھا اس لیے اس کی بیشتر دکانوں کے شٹر بند تھے۔ شاید دکانیں ابھی کرائے پر نہیں چڑھی تھیں۔ الکریم رئیل اسٹیٹ ایجنسی کا دفتر کھلا ہوا تھا۔ میں نے اپنی کار ایک جانب پارک کی اور گاڑی لاک کر کے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ دفتر کا گلاس ڈور کھول کر میں اندر داخل ہوا تو سامنے ریسپشن پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی بیٹھی دکھائی دی جس نے کاروباری مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ اس دوران میں اندازہ لگا چکا تھا کہ دفتر میں اس کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "مجھے پراپرٹی نہیں چاہیے، پراپرٹی ڈیلر خانزادہ سے ملنا ہے۔"

نہ جانے میری آواز اور لہجے میں ایسی کون سی نادرا فرمائش تھی کہ لڑکی کے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا ہو گئے اور اس نے اپنا ہاتھ ساتھ رکھے انٹرکام کی طرف بڑھایا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ روکا اور اس کی کلائی مروڑ کر اس کی کمر سے لگا دی۔

"لگتا ہے تمہیں بھی ہیروئن کی مجبوری نے اس خدمت پر مامور کر رکھا ہے۔ اب اچھے بچوں کی طرح تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ شاباش۔" میں نے اس کی کنپٹی کی مخصوص رگ پر اپنے انگوٹھے کا پورا دباؤ ڈالا تو وہ فوراً بے ہوش ہو کر میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے جلدی سے ریسپشن کاؤنٹر کے پیچھے پڑے ہوئے کاؤچ پر اسے لٹایا اور میڈم قیصرہ کی دی ہوئی تفصیلی معلومات کے سہارے آگے بڑھ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ گراؤنڈ فلور کے بعد بقیہ تمام فلورز تک جانے کے لیے زینہ دفتر کے اندرونی حصے میں موجود ہے۔ میں برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے مجھے زینہ نظر آ گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ زینے پر کوئی گرل یا دروازہ نہیں تھا۔ میں زینے کو پھلانگنے کے انداز میں عبور کرتے ہوئے اوپر جا پہنچا۔ اس فلور پر چاروں طرف فلیٹس کے دروازے تھے۔ ان میں سے میرا مطلوبہ دروازہ کون سا تھا، اس کی نشانی میڈم قیصرہ نے مجھے بتا دی تھی۔ دروازہ میری توقع کے عین مطابق لاک تھا۔ میں نے اپنی کارآمد چابیوں میں سے ایک خاص چابی نکالی اور دروازہ کھول کر بہ آسانی کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ تین کمروں کا مناسب سا فلیٹ تھا۔ آرائش اور ماحول سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ خانزادہ کے ذاتی استعمال میں ہے۔ اب میں نے اپارٹمنٹ کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد بالآخر میری مطلوبہ چیز مجھے مل گئی۔ حالانکہ مجھے بہت زیادہ کی توقع تھی لیکن وہاں صرف سات پیکٹ تھے۔ ایک پیکٹ میں پچاس گرام پاؤڈر ضرور ہوگا۔ میں نے وہ ساری تھیلیاں اپنے کوٹ کی جیبوں میں رکھیں۔ کمرے میں اندھیرا کیا اور ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

پورے دو گھنٹے بعد میں نے فلیٹ کا بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ میں خاموشی سے اٹھا اور اپنا ہاتھ جیب میں ڈال کر ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اندر آنے والا شخص اندھیرے میں بڑبڑاتے ہوئے لائٹ کا سوئچ تلاش کر رہا تھا، جبکہ دو گھنٹے اندھیرے میں بیٹھے رہنے کے سبب میری آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں۔ اس لیے میں خانزادہ کے ہیولے سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ایک لمبی چوڑی جسامت والا شخص ہے۔

جب اس نے لائٹ جلا دی تو میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "بالکل آرام سے کھڑے رہنا خانزادہ! کسی قسم کی کوئی حرکت تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"تم پولیس والے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، سامنے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ اپنی جگہ کھڑا حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھتا رہا۔

"تم کب سے یہاں موجود ہو؟" بالآخر اس نے متعجب لہجے میں سوال کیا۔

"اتنی دیر سے کہ...... میں نے یہاں سے پاؤڈر کے سات پیکٹ ڈھونڈ لیے ہیں......" میں نے کہا۔

"اوہ...... یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" اس کا دایاں ہاتھ اوپر سرکا، وہ بظاہر اپنے کوٹ کے بٹن سے کھیل رہا تھا۔

"میں نے تم سے کہا ہے کہ سامنے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔" میں نے پُرسکون لہجے میں اسے تنبیہ کی۔

''کیا ہم آپس میں ڈیل نہیں کر سکتے؟ یقین کرو تمہاری کارروائی بھی پوری ہو جائے گی اور تمہیں تمہاری سوچ سے زیادہ فائدہ ہوگا۔'' خانزادہ نے اپنی دانست میں معقول تجویز پیش کی۔

''نہیں خانزادہ! کوئی سودے بازی نہیں ہوگی۔'' میں نے قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔

وہ آہستہ آہستہ سر ہلانے لگا جیسے اس معاملے پر غور کر رہا ہو پھر انتہائی سرعت کے ساتھ اس کا ہاتھ اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں پہنچ گیا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ ریوالور نکالا اور پوری مشاقی کے ساتھ اسے نشانہ بنایا۔ گولی سیدھی دل کے مقام پر جا کر پیوست ہوگئی تھی۔ میڈم قیصرہ نے مجھے بتایا تھا کہ خانزادہ اپنی بھاری بھرکم جسامت کے برعکس بہت پھرتیلا ہے، لیکن وہ مجھ سے بہتر نشانے باز نہیں ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ مدیحہ جس بیڈ پر سوئی ہوئی تھی اس کی سائڈ ٹیبل پر رکھے ایش ٹرے سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اچھی طرح بند کیا اور اپنا کوٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

مدیحہ کچن سے باہر آگئی۔ میں نے دانستہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا کیونکہ معلوم تھا کہ وہاں دیکھنے کو کیا ملے گا۔

''بتاؤ کاشر! کچھ کام بنا۔'' مدیحہ نے میرا بازو پکڑ کر بے تابی سے پوچھا۔ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہیجانی انداز میں بولی۔ ''مجھ سے اب برداشت نہیں ہورہا کاشر...... میں پاگل ہوجاؤں گی۔''

''میرے کوٹ کی جیب میں......'' میں نے آہستگی سے کہا اور سامنے ہی کارنس پر رکھے والد صاحب کی تصویر کے فوٹو فریم کو الٹا کر کے رکھ دیا۔

مدیحہ نے میرا کوٹ اٹھایا اور ہیجانی انداز میں جیبیں ٹٹولنے لگی۔ وہ اس قدر بے تاب ہو رہی تھی کہ دو مرتبہ کوٹ اس کے ہاتھوں سے نیچے گرا۔ اس نے کوٹ اٹھایا اور پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالنے لگی۔ میں نے انتہائی کرب کے ساتھ اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مجھ سے اس کی یہ حالت کیونکر دیکھی جاسکتی تھی۔

''کاشر! بس صرف یہی...... صرف دو؟''

مدیحہ نے اطمینان اور مایوسی کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

''مجھے وہاں سے صرف سات پیکٹ ملے تھے۔'' میں نے مدیحہ کو بتایا۔ ''ان میں سے مجھے پانچ پیکٹ بطور ثبوت اپنی برانچ میں جمع کرانے پڑے۔''

کاشر! تم نے پورے پانچ پیکٹ وہاں جمع کرا دیے، آخر کیوں؟'' مدیحہ صدمے سے بولی۔

''اس ہیروئن کی خاطر ایک شخص میرے ہاتھوں مارا گیا، آخر مجھے اس کے قتل کا کوئی جواز تو پیش کرنا تھا!''

مدیحہ شاید میری بات نہیں سن رہی تھی، وہ تو انتہائی بے تابی کے ساتھ ایک پیکٹ کھولنے میں مصروف تھی۔ میں اپنی ڈبڈباتی آنکھوں سے محبت اور تاسف کے ساتھ مدیحہ کو دیکھ رہا تھا۔ مدیحہ میری محبت، میری زندگی...... یونیورسٹی کے زمانے سے ہیروئن کا استعمال کر رہی تھی۔ شادی کے بعد جب تک مجھے اس بات کا یقین ہوا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ وہ اس زہر کی عادی ہوچکی تھی۔ میرے لیے یہ انکشاف انتہائی صدمے اور تکلیف کا باعث تھا مگر میں مدیحہ کو سسکتے اور تڑپتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''سنو مدیحہ!'' میں نے پیکٹ اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے میں نے ابو کی نصیحت کا خون کیا اور آج ایک انسان کا خون بھی کر چکا ہوں۔ اچھی طرح سمجھ لو، یہ آخری سپلائی ہے۔ اب تمہیں زندہ رہنے کے لیے مزید زہر کا سہارا نہیں لینے دوں گا۔ صرف یہ دو پیکٹ تمہارا آخری سہارا اور سرمایہ ہیں۔ اس کے بعد تمہیں علاج کے لیے بحالی سینٹر جانا ہوگا۔'' میں نے پیکٹ واپس مدیحہ کو تھما دیا۔

مدیحہ نے انہی نگاہوں سے میری طرف دیکھا جن نگاہوں سے وہ یونیورسٹی میں دیکھا کرتی تھی...... خالی خالی نگاہیں جن میں سناٹے کا راج تھا۔

''کاشر! تم نے میری ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک انسان کا خون کر دیا!'' پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔

میں نے جلدی سے اپنا کوٹ اٹھا کر پہنا اور باہر نکل آیا۔ اب میں گاڑی میں بیٹھ کر ویمن کالج کی طرف جا رہا تھا۔ کوٹ کی خفیہ جیب میں رکھا ہوا ایک پیکٹ مجھے میڈم قیصرہ کو پہنچانا تھا۔ سپلائر کا نام پتا بتانے کے سلسلے میں میڈم قیصرہ سے میں نے اسی شرط پر ڈیل کی تھی — برانچ آفس میں جمع کرانے کے لیے چار پیکٹ کافی تھے...اور میرے لیے اتنی ہی بات کافی تھی کہ مجبوریِ دل نے مجھے قانون شکن بنا دیا تھا!

⌘⌘⌘

ایک شام جب وہ رات کے کھانے سے پہلے ڈرنک کر رہے تھے، اس کے شوہر نے بتایا کہ وہ کسی ریسرچ کے سلسلے میں کہیں باہر جا رہا ہے۔ ”موسم گرما کے وسط میں یہ کتنا اکتا دینے والا کام ہے۔“ اس کے شوہر نے کہا۔

اس نے اپنا گلاس کافی کی میز پر رکھتے ہوئے شوہر سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ اس پر آندرے نے جواب دیا کہ اسے مشہور ماہر تعلیم اور اسکالر کوئین ملیان پر کچھ ریسرچ کرنے کے لیے روم جانا ہے۔ وہ نیوجرسی کی ایک ممتاز

دل سے گھر بسانے والی مغربی حسینہ کے دل کا گھاؤ اور عجیب فیصلہ

حسد کی آگ

تنویر ریاض

مشرقی اور مغربی ماحول کی ایک بات میں یکسانیت خاص طور پر پائی جاتی ہے ... اور وہ ہے رقابت ... محبت میں شراکت کسی طور قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس نے بھی نہیں کی ... اس کا رقیب بھی بہت عجیب تھا اور شوہر کی محبت اس سے زیادہ عجیب تر ... پھر وہ کیسے شوہر کی گرویدہ اور رقیب کی دوست بن جاتی۔ بالآخر ایک دن اسے اپنی بے چینی ختم کرنے کا رستہ دکھائی دے گیا۔



یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور اکثر ریسرچ کے سلسلے میں روم جاتا رہتا تھا۔

''تم کتنے عرصے کے لیے جارہے ہو؟'' بیوی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں کہہ سکتا۔ امید ہے کہ ایک ہفتے میں کام ختم ہوجائے گا لیکن اس میں دیر بھی لگ سکتی ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ مجھے جس مواد کی تلاش ہے وہ کتنی جلدی ملتا ہے۔''

''اچھا۔'' بیوی نے کہا اور قالین کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے بہت افسوس ہے ڈارلنگ، لیکن میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' آندرے نے کہا۔

''کیا تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے؟'' بیوی نے پوچھا۔

''وہاں تمہارے لیے تفریح کا کوئی موقع نہیں ہوگا۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں رہوں گا جس میں باتھ روم نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ ان دنوں روم میں بہت گرمی ہے اور سال کے اس حصے میں وہاں سیاحوں کا بہت رش ہوتا ہے اور میں بھی سارا دن لائبریری میں ہی رہوں گا۔''

''اوہ! میں سمجھ گئی۔'' بیوی نے دوبارہ کہا۔

''بہتر ہے کہ میری غیر موجودگی میں تم سمندر پر چلی جاؤ۔ ویسے بھی گرمی بہت ہے اور شہر میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے لیے باہر جانا ٹھیک رہے گا۔ تم سمندر میں تیراکی کرسکتی ہو۔ شاید تمہاری دوست سیلی بھی وہاں آجائے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم تنہائی محسوس کرو۔ اپنے ساتھ بہت سی کتابیں بھی لے جانا۔''

''کتابیں؟'' اس نے کہا، جیسے پہلی بار یہ لفظ سن رہی ہو، پھر اٹھ کر اس کی لائبریری کی طرف چل دی۔ اس کے شوہر کے پاس کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔

''وینیٹی فیئر، جیسی کوئی دلچسپ کتاب لینا۔ تم نے ابھی تک اسے نہیں پڑھا۔'' آندرے نے لیونگ روم سے آواز لگائی۔

''ہوسکتا ہے کہ میں جرم و سزا یا کوئی جاسوسی کتاب لوں۔'' اس نے کہا اور اس کی میز کی دراز کھول کر دیکھی۔ اسے اطمینان ہوگیا کہ اس میں سب چیزیں موجود تھیں۔

کھانے کے بعد بیوی نے تجویز پیش کی کہ اس کے اسٹڈی روم میں کافی پی جائے۔ ''وہ کمرا نسبتاً ٹھنڈا ہے۔'' اس نے کہا۔ آندرے کو ائرکنڈیشنر پسند نہیں تھا اور وہ رات بہت گرم تھی۔

وہ کافی ختم کرنے کے بعد اپنی بیوی کے پاس آگیا جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ''کتنی خوبصورت رات ہے۔'' اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بہت افسوس ہے کہ تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ میں تمہیں بہت یاد کروں گا۔'' اس نے جینی کے سیاہ بال ماتھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی زندگی کا بڑا حصہ کام کی نذر کیوں کردیتے ہیں۔ کیا تم بتاسکتی ہو؟''

''بالکل۔'' جینی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہماری غلطی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ مجھے جلدی سوجانا چاہیے کیونکہ صبح سویرے اٹھنا ہوگا۔'' آندرے نے کہا۔ ''اور تمہیں بھی پہلی ٹرین سے جانا چاہیے۔''

''اچھا خیال ہے۔'' جینی نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ تم ابھی پیکنگ کرلو جب تک میں برتن دھوتی ہوں۔''

اس نے پلیٹیں دھونے کے بعد برتن اور فرائنگ پین بھی صاف کیے کیونکہ میڈ ہفتے میں صرف ایک بار آتی تھی اور اکثر وہ لوگ گھر پر نہیں ہوتے تھے اس لیے وہ خود ہی سارا کام نمٹاتی تھی۔ برتن دھونے کے بعد اس نے سنک پر لگی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھا اور وہاں کی لائٹ بجھادی۔ پھر وہ آندرے کے اسٹڈی روم میں گئی اور شیلف سے کچھ کتابیں نکال کر اپنے بیگ میں کمپیوٹر کے ساتھ رکھ دیں اور اس بیگ کو ہال میں چھوڑ آئی۔ پھر وہ واپس اسٹڈی روم میں آئی۔ اس کی کھڑکیاں بند کیں اور میز کی دراز سے وہ چیز نکالی جس کی اسے ضرورت تھی۔

وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر گئی اور ماسٹر بیڈروم کے دروازے میں کھڑے ہوکر آندرے کو دیکھنے لگی۔ وہ ابھی تک پیکنگ کررہا تھا۔ اس نے سلیقے سے اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھے اور بیڈ پر جھک کر چند رنگین قمیصوں کا انتخاب کرنے لگا۔ وہ نرم قالین پر دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے عقب میں گئی اور ریوالور کی نال اس کی گردن کے پچھلے حصے پر رکھ کر گولی چلادی۔ پھر اس نے ریوالور پر سے اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے اور اسے بیڈ پر پھینک دیا جہاں آندرے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے گئی، ہال سے اپنا بیگ اٹھایا، جوتے پہنے اور الماری سے دستانے، سلک کا اسکارف اور رین کوٹ نکال کر دروازے سے باہر چلی گئی اور اسے مقفل کردیا۔ وہ کچھ دیر رک کر تاریکی میں ڈوبے ہوئے مکانوں کو دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی نے گولی کی آواز تو نہیں سنی۔ بہت سے مکانوں میں روشنی نہیں تھی اور ان کے مکین گرمیاں گزارنے کہیں .... باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے مکان کی سیڑھیاں اتری اور سڑک پار کرکے سب

وے کی طرف چل دی۔ وہاں سے پین اسٹیشن جانے کے لیے ٹرین مل گئی۔
اسٹیشن پہنچ کر اس نے ٹکٹ خریدا۔ ایک اسٹال پر کھڑے ہوکر کافی پی اور ہیمپٹن جانے والی ٹرین پر سوار ہوگئی۔ اسے بہ آسانی بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ رات کے اس پہر کمپارٹمنٹ تقریباً خالی تھا۔ یہاں تک کہ کنڈیکٹر بھی سویا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے رین کوٹ اپنے اوپر پھیلا لیا اور اسکارف سے کندھوں کو ڈھانک کر کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ اس نے سونے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے دماغ میں بار بار آندرے کی موت کا منظر گھوم رہا تھا۔ بالآخر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور پولیس کو فون کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔
اس نے تصور میں اپنے آپ کو ایک چھوٹے کمرے میں کسی اجنبی شخص کے سامنے بیٹھے دیکھا۔ وہ اسے بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اسے شروع سے بتانا ہوگا جب اس نے پہلی بار آندرے کو دیکھا اور یاد کرنے لگی کہ وہ کیسے اس کے نزدیک آیا جب وہ ایک پُرہجوم بک اسٹور پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔
وہ اس وقت گریجویٹ اسٹوڈنٹ تھی اور چار دوسرے نوجوان رائٹرز کے ساتھ پڑھ رہی تھی جن کا سارا کام شائع ہوچکا تھا جبکہ یہ اس کا سب سے پہلا کام تھا جس پر اسے انعام بھی ملا تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ سب سے پہلے وہ پڑھے گی۔ اس تقریب کے لیے اس نے خاص طور پر تیاری کی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے پرل کی بالیاں پہنی تھیں جو ماں نے اس کی اکیسویں سالگرہ پر دی تھیں اور سیاہ لباس میں وہ کوئی شہزادی لگ رہی تھی۔
ہر رائٹر کو دس منٹ دیے گئے تھے۔ اس نے اپنی کہانی شروع کی جس میں ایک پرانی مل کا ذکر کیا تھا جہاں وہ پیدا ہوئی۔ وہ قصبہ پیرس سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ اس نے بڑے مؤثر انداز میں اس جگہ کی منظر کشی کی تھی۔
آندرے اس کی کہانی ختم ہونے پر اس کے پاس آیا۔ وہ اس سے عمر میں کم از کم بیس سال بڑا تھا۔ طویل قامت، اس کے بال تیزی سے غائب ہو رہے تھے۔ خم دار ناک، چھوٹا چہرہ اور نیم وا آنکھیں۔ اس نے تھری پیس سوٹ اور سیاہ چمک دار جوتے پہن رکھے تھے۔
جین نے کبھی عمر رسیدہ مردوں کی پروا نہیں کی گو کہ وہ جانتی تھی کہ بہت سی جوان عورتیں ایسا کرتی ہیں۔ اس کا باپ بھی ماں سے بیس سال بڑا تھا اور وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کا انتقال ہوگیا۔
آندرے نے وہ کہانی پڑھنے پر بڑے خلوص سے اس کا شکریہ ادا کیا جیسے وہ اس کے لیے بہت اہم ہو۔ ”میں اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہوں اور تم نے اس کی بالکل درست منظر کشی کی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے جین کو ڈنر کی دعوت دی۔ جین نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ دوسرے ریڈرز کے ساتھ ڈنر پر جانے کا وعدہ کرچکی ہے۔
”تو پھر کل؟“ آندرے نے اتنے اشتیاق سے کہا کہ وہ ہاں کہنے پر مجبور ہوگئی اور وعدہ کرلیا کہ وہ اگلے روز اسے فرنچ ریسٹورنٹ میں ملے۔ آندرے نے ہی وہ جگہ تجویز کی تھی۔ جین نے اس کا فون نمبر لے لیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کوئی مناسب بہانہ کر کے اسے انکار کردے گی۔
”یہ کون تھا؟“ اس کی ایک ساتھی ریڈر سیلی نے پوچھا۔
”ایک بوڑھا شخص۔“ جین نے کہا۔
اگلے روز وہ اس سے ملنے چلی گئی۔ اسے انکار کرنا اچھا نہیں لگا۔ وہ اس کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بڑے اشتیاق سے اسے مدعو کیا تھا۔ ویسے بھی اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے اچھا ریستوران تھا۔ وہ کئی مرتبہ.... اس کے سامنے سے گزری تھی لیکن اس کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہاں ڈنر کرسکے۔ وہ آٹھ بجے تک کام کرتی رہی اس لیے اسے وہاں پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ اسے کپڑے بدلنے کا موقع بھی نہیں ملا اور وہ اسی نیلے رنگ کی جینز میں ملبوس تھی۔ وہ ایک کونے کی میز پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔
کھانے کے دوران اور اس کے بعد جب وہ سڑکوں پر چہل قدمی کر رہے تھے، دوسرے مردوں کے برعکس اس نے اپنے بارے میں بہت کم بات کی اور نہ ہی اس نے ہاتھ پکڑنے یا اسے شب بخیر کہتے وقت بوسہ لینے کی کوشش کی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ مردوں کے لیے اس میں بڑی کشش ہے۔ اس کے بجائے وہ جین سے اس کے بارے میں پوچھتا رہا اور اس سے فرانس میں گزرے بچپن کے دنوں کے قصے سنتا رہا۔ وہ فرانسیسی میں بات کر رہے تھے جس میں اسے مہارت تھی۔ جین کو بھی اپنی مادری زبان میں بات کر کے سکون محسوس ہوا۔ گو کہ وہ بہت اچھی انگریزی بھی بول لیتی تھی۔ اس نے یونیورسٹی کالج لندن سے انڈر گریجویٹ ڈگری حاصل کی تھی اور اس کے بعد نیویارک میں گریجویٹ

پروگرام کے لیے درخواست دے دی جو منظور ہوگئی اور اسے اسکالرشپ بھی مل گئی۔

جین نے اسے اپنے باپ کے بارے میں بتایا جو کنٹری ڈاکٹر تھا اور اس نے آپ کو مریضوں کے لیے وقف کررکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مستحق مریضوں کا علاج کرتا تھا اور نصف شب کو بھی اپنی پرانی کار میں بیٹھ کر انہیں دیکھنے چلا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو بھی زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا جو محدود بجٹ میں بچوں کی پرورش کے علاوہ کھانا بنانے، گھر کی صفائی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے گارڈن کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ جین کو بھی بہت کم وقت دیتا تھا جو اس کی سب سے بڑی اولاد تھی۔

اس شام وہ اس سے باتیں کرکے بہت محظوظ ہوئی۔ آندرے نے بھی اس کی طرح فرانسیسی مصنفین کو پڑھ رکھا تھا۔ وہ دونوں اپنی پسندیدہ کتابوں کے بارے میں گفتگو اور تبصرے کرتے رہے۔ اس شام کے بعد وہ جین کو وقتاً فوقتاً فون کرنے لگا۔ وہ اسے ایسی جگہوں پر لے جانے لگا جہاں ■ کبھی نہیں جاسکتی تھی۔ وہ اسے تھیٹر، کنسرٹ اور اچھے ہوٹلوں میں ڈنر کے لیے لے گیا جہاں وہ کبھی نہیں گئی تھی۔

وہ اس کے بارے میں بہت کم جانتی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے یہ پسند نہیں اور وہ زیادہ تر اس موضوع پر بات کرنے سے کتراتا تھا۔ اس کا پورا نام آندرے ڈی لاویل تھا اور اس کے آباؤ اجداد فرانس سے آئے تھے۔ وہ اب بھی بروکلین کے ایک مکان میں زیادہ وقت اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ گزارتا تھا جو دمے کی مریضہ تھی اور اسے دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ گوکہ وہ نیوجرسی میں کام کرتا تھا اور اس نے وہاں بھی ایک کمرا کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس نے کبھی اپنی ماں سے نہیں ملوایا اور نہ ہی اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

اس نے اپنے کام کے بارے میں بھی زیادہ نہیں بتایا۔ گوکہ وہ جان چکی تھی کہ آندرے نے کئی ممتاز یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ آکسفورڈ سے کلاسیکی ادب میں پی ایچ ڈی کی ہے۔ وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر تھا جہاں بہت کم طالب علم کلاسیکی ادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔

لگتا تھا کہ وہ اس کی کمپنی سے لطف اندوز ہورہا ہے۔ وہ دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا اور اس کے لطیفوں پر قہقہے لگاتا۔ وہ ایک اچھا نقاد تھا اور اس کے کام کے بارے میں مشورہ دیتا کہ اسے کس طرح بہتر کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات وہ اس کے لیے چھوٹے موٹے تحفے مثلاً کتابیں، پھول، چاکلیٹ یا پھل وغیرہ لے کر آتا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بہت دبلی ہے اور اسے اپنا وزن بڑھانے کی ضرورت ہے۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھ جاتا اور اسے خاموشی سے دیکھتا رہتا۔ جین سمجھی کہ ■ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی ایسی بات کہنے کی جسارت نہیں کرے گا جس سے اس کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہو۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ اسے کھو نہ دے، وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے اظہارِ محبت کیا تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا یا جنسی تعلق قائم کرنے کی کوشش کی تو اسے انکار کرنا پڑے گا۔ ■ یقیناً اس کے جوڑ کا نہیں تھا۔ وہ بڑی عمر کا گنجا اور خوش وضع۔ جین کو شوخ، نڈر لڑکے پسند تھے جو جینز پہنتے اور ان کے سر کے بال بڑھے ہوتے تھے۔ اس نے اس طرح کے کئی مردوں سے تعلق قائم کیا لیکن ان میں سے کوئی بھی رفاقت دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔

جین کو یونیورسٹی سے وظیفہ ملتا تھا لیکن اسے اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے کام کرنا پڑرہا تھا۔ اسے یونیورسٹی میں ہی جزوقتی ملازمت مل گئی تھی۔ اس کا کام یونیورسٹی کے سابق طالب علموں کو ٹیلی فون کرکے یونیورسٹی کی مالی مدد کے لیے قائل کرنا تھا۔ اسے اس کام میں کافی مہارت حاصل ہوگئی تھی۔ اس کے نرم لہجے اور طرزِ گفتگو سے متاثر ہوکر سابق طالب علم اچھی خاصی مدد فراہم کررہے تھے۔ اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یونیورسٹی نے بھی اس کا معاوضہ بڑھادیا تھا تاہم وہ مطمئن نہیں تھی۔ اسے کئی گھنٹے کام کرنا پڑرہا تھا جس سے اس کی پڑھائی متاثر ہورہی تھی۔ دوسرے طالب علموں کے برعکس وہ صبح جلدی اٹھتی اور رات دیر تک ایک تاریخی ناول پر کام کرتی۔ یہ ایک سچی کہانی تھی جو اس کے باپ نے سنائی تھی۔

وہ ایمسٹرڈم ایونیو کی ایک پُرہجوم رہائش گاہ میں رہتی تھی جو اسے یونیورسٹی کی طرف سے ملی تھی۔ اس کے سوئٹ میں تین لڑکیاں اور بھی تھیں جو نشے میں وحشت رات کو دیر سے آتیں، اونچی آواز میں میوزک سنتیں اور دیر تک ٹیلی ویژن دیکھتی رہتیں۔ ان کے جوتے کافی کی میز پر اور میلے کپڑے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہوتے۔ وہ کبھی کمرے کی صفائی کرتیں اور نہ ہی گندی پلیٹیں دھوتیں۔ وہاں ایک ہی باتھ روم تھا جو زیادہ تر انہی کے استعمال میں رہتا۔

اس ماحول میں رہ کر اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا اور وہ ایک ایسے مکان کا خواب دیکھنے لگی جو اس کا اپنا ہو، جہاں وہ سکون سے بیٹھ کر اپنا کام کرسکے۔ وہ ایک ایسے شخص سے شادی کا خواب دیکھنے لگی جس سے وہ آندرے کے توسط سے ملی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ اس کا سر بالوں سے بھرا ہوا اور

گہری نیلی آنکھیں تھیں .... وہ اسے شادی کر کے اپنے بڑے سے گھر میں لے جاتا جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دے سکتی۔ آندرے ہفتے میں ایک بار ڈنر کے لیے آئے گا تو وہ اس کے لیے خوش ذائقہ لورین کی ڈش تیار کرے گی جس کی ترکیب اس نے اپنی ماں سے سیکھی تھی اور وہ کھانے کے دوران اسے اپنی اداس سرمئی آنکھوں سے دیکھتا رہے گا۔

رفتہ رفتہ ■■ بے چینی کے ساتھ اس کی ٹیلی فون کالز کا انتظار کرنے لگی۔ گو کہ وہ اس میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتی تھی تاہم اس نے اسے خوش کرنے کے لیے کچھ کوششیں کیں۔ اس نے چست اسکرٹ اور کھلے گلے کا بلاؤز پہننا شروع کر دیا جس میں اس کے جسمانی خطوط پوری طرح نمایاں ہو جاتے۔ اب وہ پلکوں پر مسکارا اور ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک لگاتی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی تبدیل کر لیا۔

موسم گرما میں اسے اپنی رہائش گاہ چھوڑنی تھی۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ آندرے اس کے ساتھ کہیں باہر جانے کا پروگرام بنائے گا لیکن اس نے شہر چھوڑنے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ جب جین نے اس سے پوچھا کہ وہ موسم گرما کی چھٹیاں کہاں گزارے گا تو اس نے کہا کہ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

بالآخر جین کو اپنا کمرا خالی کر کے ماں کے پاس فرانس جانا پڑا جو اب بھی اسی پرانے مکان میں رہ رہی تھی۔ آندرے اسے جانے سے ایک رات پہلے ڈنر پر لے گیا۔ جین نے اسے تاکید کی کہ وہ ٹیلی فون یا ای میل کے ذریعے اپنی خیریت سے مطلع کرتا رہے۔ ڈنر ختم ہونے کے بعد وہ باہر سڑک پر آئے اور رخصت ہونے سے پہلے جین نے اچانک اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اس کا بوسہ لے لیا۔

فرانس پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کی ماں پرانے گھر میں تنہا رہ رہی ہے۔ اس کے سب بہن بھائی مختلف جگہوں پر جا چکے تھے تاہم ماں نے اس گھر کو پہلے کی طرح رکھا ہوا تھا۔ ساٹھ سال کی عمر میں بھی وہ سخت جان عورت اپنی توانائی اور مہارت کا استعمال کر رہی تھی۔ اس نے یونیورسٹی سے نفسیات میں ڈگری لینے کے بعد ایک کلینک میں کام کیا۔ جین کو یاد تھا کہ اس کے گھر میں پھولوں کی کیاریاں اور مختلف قسم کی سبزیاں مثلاً ٹماٹر، سلاد کے پتے، گاجر اور پھلیاں لگی ہوتی تھیں۔ بڑھی ہوئی گھاس کی کٹائی کی گئی تھی اور اوپر کے کمروں میں وال پیپر تبدیل کر دیے گئے تھے۔

جین کی ماں نے اس کے لیے بھی بہت سے کام سوچ رکھے تھے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں مصروف رکھنے کے لیے پلان بنایا ہوا ہے۔ تمہیں اپنی الماریاں صاف کرنی ہیں، بازار جا کر کچھ خریداری کرنی ہے، دوستوں کے لیے کھانا بنانا ہے اور اتوار کے دن میرے ساتھ چرچ جانا ہے۔''

ان سب کاموں سے بچنے کے لیے جین نے بس پکڑی اور اپنے ایک بھائی سے ملنے پیرس چلی گئی جو وکیل بن چکا تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ... اپنا مکان بیچ کر ماں کے لیے شہر میں ایک اپارٹمنٹ خرید لیتے ہیں۔ ''یہ مکان بہت بڑا ہے اور اس کی دیکھ بھال بہت مشکل ہے۔'' اس کے بھائی لوئیس نے کہا لیکن ماں نے وہ گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اسی گھر میں رہے گی۔ وہ وہاں بہت خوش ہے۔

جین نے موسم گرما کی تعطیلات کے دوران اپنے آپ کو پوری طرح مصروف رکھا۔ وہ ہر ویک اینڈ پر اپنی ماں کے ساتھ گھر کا سودا سلف خریدنے مارکیٹ جاتی۔ اسے عمر رسیدہ پڑوسیوں سے ملوانے لے جاتی، کتابوں کی دکان پر جا کر ان کے مالکان سے باتیں کرتی، پرانے ٹیچرز سے ملنے جاتی اور دوپہر میں اپنی کتاب کا کام کرتی لیکن ان تمام مصروفیات کے باوجود اسے آندرے کے فون کا انتظار رہتا۔ وہ بڑی پابندی سے اپنی ای میل اور ٹیلی فون پر پیغامات چیک کرتی لیکن اسے آندرے کا کوئی ٹیلی فون یا پیغام نہیں ملا۔ موسم گرما کے اختتام پر اسے دوبارہ یونیورسٹی جانا تھا اور وہاں اس کا قیام دوبارہ انہی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا جنہیں وہ جانتی بھی نہیں تھی۔

بالآخر اس نے آندرے کو فون کیا۔ وہ اس کی آواز سن کر خوش ہو گیا۔ ''اوہ جین!'' اس نے کہا۔ ''تمہاری آواز سن کر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے بتایا کہ ان گرمیوں میں وہ بے حد مصروف رہا جس کی وجہ سے وہ اس سے رابطہ نہ کر سکا۔ اس کی ماں شدید بیمار تھی اور وہ مستقل اس کے پاس رہا۔ اب اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ صدمے کی کیفیت میں تھا۔ انہوں نے ملنے کا پروگرام بنایا لیکن وہ نہیں آیا۔ بالآخر مایوس ہو کر جین نے بروکلین جانے والی ٹرین پکڑی اور اس کے گھر ملنے چلی گئی۔

☆☆☆

وہ ہمیپٹن جانے والی آخری ٹرین کے خالی کمپارٹمنٹ میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا کسی پڑوسی نے فائر کی آواز سنی ہوگی؟ ان کا مکان آخری سرے پر تھا۔ اس قطار میں سب مکانوں کی موٹی دیواریں اور عقبی لان تھے جبکہ زیادہ تر رہائشی اس سیزن میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی

کہ اس کی لاش کب دیکھی جائے گی۔ اسے معلوم تھا کہ صفائی کرنے والی عورت چند روز تک نہیں آئے گی۔ وہ گارڈن میں کھلنے والا دروازہ بند کرکے آئی تھی اور لاش دیکھنے کے بعد پولیس یہی سمجھے گی کہ کوئی شخص دیوار پر چڑھ کر گارڈن میں کودا، اور گھر میں داخل ہوگیا۔

وہ آندرے کی ماں کے مرنے کے بعد پہلی بار وہاں گئی تھی۔ جب وہ بن بلائے مہمان کی طرح وہاں پہنچی تو گھنٹی بجانے پر ایک خادمہ باہر آئی اور اسے ہال میں لے گئی۔ ''وہ کہاں ہے؟'' جین نے پوچھا تو خادمہ نے سر اٹھا کر اوپر کی جانب اشارہ کردیا۔ وہ اپنے بیڈ پر پاجامہ پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بالوں میں کنگھی کی اور نہ ہی شیو بنایا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ جیسے کئی دنوں سے باہر نہیں گیا۔ اس نے خالی نظروں سے جین کو دیکھا اور بتایا کہ جب وہ صبح سویرے یہاں پہنچا تو اس کی ماں اپنے بستر پر مردہ پڑی ہوئی تھی۔

''اس کا یقیناً سوتے میں انتقال ہوگیا تھا۔'' آندرے نے کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جین قریب آئی اور اس کے برابر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگا، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنا چار منزلہ مکان دکھانے لے گیا۔ جین نے دیکھا کہ ہر کمرے میں جگہ جگہ اس کی ماں کی تصویریں رکھی ہوئی تھیں جو اس کی زندگی کے مختلف ادوار کی عکاسی کرتی تھیں۔ ان میں اس کی سالگرہ پارٹی، گریجویشن اور شادی کی تصاویر بھی تھیں۔ کئی تصویروں میں وہ آندرے کو گود میں لیے یا اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔

آندرے نے کہا کہ اسے ماں کے مرنے کا یقین نہیں آرہا اور یہ کہ اب وہ کبھی اسے کسی کام کے لیے نہیں پکارے گی۔ ''اب میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا؟'' اس نے جین سے کہا۔ اس وقت بھی وہ اسٹڈی میں اپنی ماں کی تصویر دیکھ رہا تھا۔

تبھی اس نے میز کی دراز میں رکھا ہوا ریوالور اسے دکھایا اور اعتراف کیا کہ کئی بار اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کے بارے میں سوچا جو اب بے مصرف معلوم ہوتی ہے۔ ''میرا زیادہ وقت اس کی خدمت کرتے گزرا اور اب وہ جاچکی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب میری زندگی کا کیا مقصد ہے۔ میرے طالب علموں کو بھی کلاسیکی ادب پڑھنے سے دلچسپی نہیں ہے۔''

''اور میرے بارے میں کیا کہو گے؟'' جین نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ میں تمہیں اس گھر کا باغ دکھاتا ہوں۔'' آندرے نے کہا اور اسے باغ میں لے گیا جو اس کی ماں کو بہت پسند تھا۔ اس نے وہاں سفید گلاب اور کئی دوسری جھاڑیاں لگائی تھیں جس میں نیلے، گلابی اور سفید رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔

وہ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی ایک چھوٹی میز پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ ملازمہ ایک ٹرے میں شراب کی بوتل اور کچھ خشک میوے لے کر آئی۔ اس دوران بھی آندرے اپنی ماں کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ بچپن میں ماں اسے کتابیں پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ اس طرح اسے بھی مطالعے کا شوق ہوگیا۔

''اس وقت میں چھ یا سات سال کا تھا۔ شروع میں تو مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن مجھے ماں کی آواز میں سننا اچھا لگتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت طریقے سے لفظوں کی ادائیگی کرتی تھی۔'' آندرے نے کہا۔

آندرے کی باتیں سن کر جین بھی اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگی جس کے پاس اس کے لیے بہت کم وقت تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ جب بھی ماں کے پاس جاتی تو اس کی گود میں کوئی بچہ ہوتا۔ کثرتِ اولاد کی وجہ سے اس کی ماں بدمزاج ہوگئی تھی اور اسے بات بات پر غصہ آجاتا تھا، اسی لیے وہ گھبرا کر قصبے کی لائبریری چلی جاتی اور اس کی واپسی شام کو ہوتی۔

بالآخر جین اپنے دل کی بات زبان پر لے آئی۔ اس نے آندرے کے سامنے اعتراف کیا کہ وہ شروع میں اس سے متاثر نہیں ہوئی تھی لیکن اب وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ وہ اس کی ذہانت اور فراخ دلی کو پسند کرتی ہے اور جانتی ہے کہ وہ اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ محبت کرنے والا شخص ہے اور اس سے پہلے کسی نے اس سے اتنی محبت نہیں کی۔ اس نے کہا کہ وہ چھٹیوں کے دوران صرف اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس نے اسے بہت یاد کیا اور اس کے بغیر وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کررہی تھی۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنے الفاظ کا ردعمل جاننے کے لیے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ توقع کررہی تھی کہ وہ خوشی سے چمک اٹھیں گی لیکن ان میں پہلے سے زیادہ اداسی نظر آئی۔ پہلے تو وہ یہی سمجھی کہ وہ ابھی تک اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہا ہے اور شاید اسے یہ افسوس ہورہا ہو کہ اس نے جین کو ماں سے نہیں ملوایا لیکن بالآخر اس نے محسوس کیا کہ اسے شروع میں ہی جان لینا چاہیے تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا اور جین کی باتوں نے اسے اداس کردیا۔

اس کی بات ختم ہونے کے بعد کچھ دیر خاموشی چھائی

رہی، پھر وہ بولا کہ وہ یہ سوچ کر اداس ہو گیا تھا کہ اس کی وجہ سے اسے استاد کھ ہوا۔ وہ اس سے اس طرح محبت نہیں کر سکتا۔ وہ اسے اپنی بیٹی کے برابر سمجھتا ہے۔ اس میں بہت خوبیاں ہیں۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے لیکن جسمانی طور پر نہیں بلکہ وہ کسی بھی عورت سے ایسی محبت نہیں کر سکتا۔

''کیا تم صرف مردوں سے محبت کر سکتے ہو؟'' جین نے پوچھا۔ وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی۔

آندرے نے کہا کہ وہ صرف ایک مرد سے محبت کرتا ہے۔ وہ اطالوی، شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ تھا آندرے سے اس کی ملاقات روم میں ہوئی تھی تاہم وہ جواب میں اظہارِ محبت کرتے ہوئے اپنے آپ کو گناہ گار محسوس کرتا ہے۔

''لیکن تم اس وجہ سے اپنے آپ کو تنہا محسوس مت کرو۔'' اس نے جین کے گال پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم صرف دوست نہیں بلکہ بہت اچھے دوست رہیں گے۔''

وہ کرسی سے اٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ اس نے کہا کہ اسے بہت دکھ ہوا ہے۔ وہ اس سے دوبارہ نہ ملنے کو ترجیح دے گی۔ وہ باغ سے نکل کر گھر سے باہر آگئی۔ اسے بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی سڑک پر آگئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ بھی اس گھر میں واپس نہیں آئے گی اور دوبارہ اس شخص سے نہیں ملے گی۔

☆☆☆

وہ جب مشرقی ہیمپٹن پہنچی تو صبح کے تین بج رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے گھر کی طرف جانے لگی جو اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ملازمہ جو ہفتے میں ایک بار ہی آتی تھی، اس نے ہال کی روشنیاں بند نہیں کی تھیں۔ جین خالی مکان میں اس طرح داخل ہوئی جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کیا کر دیا ہے اور آندرے اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

وہ مختلف کمروں سے ہوتی ہوئی اپنے بڑے بیڈ روم میں گئی اور لباس تبدیل کر کے سو گئی۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اس نے فون کر کے اپنی دوست سیلی سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اس کے پاس آجائے۔ وہ فوری طور پر کسی سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سیلی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ایک بڑے پبلشنگ ہاؤس میں ایڈیٹر کے طور پر کام کر رہی تھی۔ سیلی نے کہا کہ وہ شام میں آنے کی کوشش کرے گی۔

''کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''تمہارا لہجہ کچھ عجیب لگ رہا ہے۔''

''میں تمہیں فون پر نہیں بتا سکتی۔'' جین نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اسے آندرے کے الفاظ یاد آگئے۔ وہ اسے بار بار فون کر رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے فون اٹھا لیا۔ ''مجھے تم سے فوری طور پر ایک بات کرنی ہے۔'' آندرے نے کہا۔ ''وہ بات میں فون پر نہیں بتا سکتا۔''

وہ اس سے یونیورسٹی کے نزدیک ایک کیفے میں مختصر ملاقات کے لیے تیار ہو گئی۔

☆☆☆

اس روز سہ پہر میں بارش ہو رہی تھی۔ وہ رین کوٹ.... پہنے اس پُرہجوم کیفے پہنچا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جبکہ گال زرد اور پچکے ہوئے تھے۔ وہ کھڑکی کے ساتھ والی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر خاموشی سے بارش کا نظارہ کرنے لگے۔

''وہ کون سی بات ہے جو تم مجھ سے کرنا چاہ رہے ہو؟'' جین نے پوچھا اور وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا، پھر بولا کہ وہ بہت غم زدہ ہے اور مرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ماں کی شادی کی انگوٹھی بھی ساتھ لایا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی، بس اسے دیکھتی رہی۔ آندرے نے جیب سے وہ انگوٹھی نکالی اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دکھائی۔

''ہم کیسے شادی کر سکتے ہیں؟'' جین نے کہا۔

''میری نظر میں جذبات، خواہشات اور جنس کی کوئی اہمیت نہیں۔'' آندرے نے کہا۔ ''بلکہ وہ اس سے سچی محبت کرتا ہے۔ خواہشات زیادہ عرصہ ساتھ نہیں دیتیں جبکہ دوستی ہمیشہ رہتی ہے۔ ایسے کئی جوڑے ہیں جو جنسی خواہش کے بغیر بھی خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

''کیا تم ایسا سوچتے ہو؟'' جین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگی جو ہر سال بچہ پیدا کرتی تھی۔ یقیناً یہ اس کے باپ کی خواہش ہو گی لیکن اس سے اس کی ماں کو کتنی خوشی ملی۔ وہ بہت چڑچڑی اور بدمزاج ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ کھانا مانگنے پر بچوں کو تھپڑ مار دیتی۔

''اور اس شخص کے بارے میں کیا کہو گے جسے تم چاہتے ہو؟ اگر تم نے مجھ سے شادی کر لی تو اس کا کیا ہو گا؟''

''الفریڈو کو خوشی ہو گی۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے اور اسے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ خود بھی شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہے۔ یہ ہم سب کے لیے بہتر ہو گا۔ بہرحال میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا

یا بہت کم۔ وہ مجھ سے دور نہیں ہوسکتا۔ تم میرے بروکلین والے مکان میں رہ سکتی ہو۔ وہاں تمہیں اپنا ناول مکمل کرنے کے لیے پُرسکون ماحول ملے گا۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک ملازمہ بھی رکھ سکتے ہیں۔ میرے پاس بہت پیسا ہے جو ماں کے مرنے کے بعد مجھے ملا۔''

یہ کہہ کر اس نے جین کا ہاتھ پکڑا اور اسے انگوٹھی پہنادی۔ جین نے وہ انگوٹھی اتاری اور واپس کرتے ہوئے بولی کہ اسے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ وہ اپنی بہترین دوست سیلی سے بھی مشورہ کرے گی۔ یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کیفے سے باہر چلی گئی۔

سیلی ایک پبلشنگ ہاؤس میں ملازمت کررہی تھی تاکہ اپنی تعلیم کے اخراجات برداشت کرسکے۔ اس کے پاس لکھنے کے لیے وقت نہیں تھا اور وہ دوسرے طالب علموں کے ساتھ ایک تنگ جگہ میں رہ رہی تھی۔ اس نے جین کو یہ پیشکش قبول کرنے کا مشورہ دیا۔

''وہ بہت سمجھ دار معلوم ہوتا ہے اور تم اس سے محبت کرتی ہو۔ اگر تمہارے درمیان جسمانی تعلق قائم نہ ہوسکے تب بھی وہ تمہارا محبوب رہے گا۔ کم از کم تمہیں ایک ساتھی اور کام کرنے کے لیے پُرسکون جگہ مل جائے گی۔'' سیلی نے اسے سمجھایا۔

☆☆☆

جب سیلی اس شام مشرقی ہیمپٹن کے اسٹیشن پہنچی تو جین اس کا انتظار کررہی تھی۔ انہوں نے مکان کے ٹیرس پر بیٹھ کر ڈنر کیا، پھر جین نے اسے بتایا کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ سیلی نے اس کی جانب دیکھا اور بولی کہ کیا کسی نے لاش دیکھی ہے؟

''میرا خیال ہے کہ ابھی تک نہیں۔'' جین نے کہا۔ ''ورنہ کوئی مجھے ضرور فون کرتا۔ ملازمہ پرسوں سے پہلے وہاں نہیں جائے گی۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ کسی نے فائر کی آواز نہیں سنی یا پولیس کو اس کی اطلاع دی۔''

''تین دن گزر جانے کے بعد یہ بتانا بہت مشکل ہوگا کہ درحقیقت کیا واقعہ پیش آیا۔'' سیلی نے کہا۔

''میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔'' جین نے کہا۔

''کیا تم کہہ سکتی ہو کہ جب اس کا قتل ہوا تو تم یہاں پر تھیں؟'' سیلی نے پوچھا۔ ''کیا کسی نے تمہیں اسٹیشن، ٹرین یا یہاں آتے ہوئے دیکھا؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔ اس وقت ٹرین تقریباً خالی تھی اور جب کنڈیکٹر نے میرا ٹکٹ چیک کیا تو اس وقت بھی میں نے ماسک لگایا ہوا تھا۔''

''دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہو اور کسی سے کچھ نہ کہو۔'' سیلی نے مشورہ دیا۔ ''یہ سب میری غلطی ہے۔ میں نے ہی تمہیں اس سے شادی کرنے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ اس وقت سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایک اچھا گھر اور سمجھ دار شوہر جس سے تم بہت محبت کرتی تھیں۔''

''یہی تو مسئلہ تھا کہ میں اس کی محبت میں پاگل ہوگئی تھی۔'' جین نے کہا۔

☆☆☆

جیسے ہی جین نے گریجویشن کیا، ان دونوں کی شادی فرانس میں ہوگئی۔ یہ ایک پرائیویٹ تقریب تھی۔ آندرے نے ہوٹل میں قیام کیا۔ جین کی ماں نے اسے دیکھتے ہی پسند کرلیا۔ وہ بھی اس سے بہت متاثر ہوا۔ ان دونوں کی عمروں میں بہت کم فرق تھا۔ وہ کتابوں اور کلاسیکی ادب کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ جین کی ماں چونسٹھ سال کی عمر میں بھی بہت ذہین اور توانا تھی جس سے آندرے بہت متاثر ہوا۔

جین کا بھائی لوئیس شادی میں شریک ہونے کے لیے پیرس سے آیا۔ سیلی کو گریجویشن کرنے کے بعد نیویارک کے ایک پبلشنگ ہاؤس میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ بھی اس کی شادی میں شریک ہوئی۔ وہ شادی سے چند روز پہلے آگئی تھی۔ اس نے نہ صرف تیاری میں مدد دی بلکہ شادی کا لباس بھی منتخب کیا۔

شادی سے ایک رات پہلے جین کی ماں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ آندرے سے محبت کرتی ہے؟

''بہت زیادہ۔'' جین نے کہا۔ ''کیا وہ قابلِ تعریف نہیں ہے؟ بہت مہربان اور محبت کرنے والا۔''

ماں اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''وہ تمہارے باپ جیسا بھی ہوسکتا ہے۔''

جین اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اس کی ماں نے خود ہی اپنے سے بڑی عمر کے مرد سے شادی کی تھی تب اس کی ماں نے پہلی بار اسے بتایا کہ وہ شادی سے پہلے حاملہ ہوگئی تھی۔

''میں اس سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے بعد کئی سال تک ایک کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوتا رہا۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن میرا خواب پورا نہ ہوسکا۔ خوش قسمتی سے بعد میں مجھے نفسیات میں گریجویشن کرنے کا موقع مل گیا۔''

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ تم دونوں میں پہلے ہی جنسی تعلق قائم ہوچکا ہے لیکن اب تمہیں مانع حمل گولیوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

جین اس کی تردید کرنا چاہ رہی تھی لیکن خاموش بیٹھی مسکراتی رہی۔ اس کی ماں نے کہا۔ ”بہرحال ان کا استعمال تمہاری کیریئر کے لیے اچھا ہوگا۔ تمہارے لیے بیک وقت رائٹر بننا اور بچے پیدا کرنا مشکل ہوگا۔“

شادی کی تقریب کے بعد جین کی ماں نے ایک چھوٹا سا استقبالیہ دیا جس میں قصبے کے معززین اور اس کے کلینک کے دوستوں نے شرکت کی۔ آندرے نے جین کی ماں کی تعریف کی کہ اس نے اتنے کم وقت میں ایک بہترین پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ وہ ایک معزز فرانسیسی خاندان سے تعلق قائم ہونے پر بہت خوش ہے اور یہ کہ اسے اتنی اچھی ساس ملی۔

شادی کے بعد وہ ہنی مون پر چلے گئے۔ پہلی رات آندرے نے اس کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اس کے ساتھ ہمیشہ شرافت اور محبت سے پیش آتا تھا۔

جب آندرے نے روم کی امریکن اکیڈمی میں درخواست دی تو اسے ریسرچ کے سلسلے میں روم جانا پڑ گیا۔ ان دنوں جین حاملہ تھی۔ آندرے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے لیے کلاسک رائٹرز کا تعارف لکھ رہا تھا۔ وہ سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ اکیڈمی کی جانب سے انہیں ایک شاندار اسٹوڈیو اپارٹمنٹ ملا جس میں ایک بیڈ روم اور باتھ روم تھا اور اس کی اونچی کھڑکیوں سے پورا شہر نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پام فیلی گارڈن کی سیر کرتے اور روم کے مشہور مقامات دیکھنے نکل جاتے۔

جین کو روم بہت پسند تھا۔ اونچے صنوبر کے درخت، امریکن اکیڈمی کی شاندار عمارتیں، خوبصورت باغ، سبزیوں سے بنے ہوئے صحت بخش کھانے اور لائبریری جہاں وہ اپنی دوسری کتاب پر کام کر سکتی تھی۔

اس روز سہ پہر میں آندرے نے اس سے کہا کہ وہ ریسرچ کے سلسلے میں لائبریری جا رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کرے۔ وہ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے گرمی لگ رہی تھی۔ بے چین ہو کر وہ اٹھی اور پام فیلی گارڈن چلی گئی۔ وہاں اس نے کچھ فاصلے سے دو آدمیوں کو گلاب کے تختوں کے درمیان کھڑے ہوئے دیکھا۔ ان میں ایک جوان رومن نیلی جینز میں ملبوس تھا۔ اس کے کاندھے چوڑے اور سر پر گھنے سیاہ بال تھے۔ دوسرا ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ گوکہ وہ دونوں کوئی بات نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی انہوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ لگایا تھا۔ اس کے باوجود وہ ان کے تعلق اور قربت کو محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے آندرے کو پہچان لیا۔ وہ جوان شخص یقیناً اس کا محبوب تھا۔ ان دونوں کو اس حال میں دیکھ کر اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ زمین پر گر پڑی اور جب اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی اور آندرے اس کے پاس بیٹھا رو رہا تھا۔ اس نے ایک مردہ بچی کو جنم دیا تھا۔

انہوں نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی، بس اپنا سامان باندھا اور گھر واپس آ گئے۔ جین دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی لیکن اس کے بعد یہ بار بار ہونے لگا۔ آندرے کبھی میٹنگ اور کبھی روم کی لائبریری میں جانے کا بہانہ بنا کر گھر سے چلا جاتا۔ جین نے کوشش کی کہ اس بارے میں نہ سوچے لیکن یہ ناممکن تھا۔ یہ خیال اس کے ذہن پر مسلط ہو چکا تھا۔

سیلی نے اسے سمجھایا کہ وہ آندرے کے ساتھ ایسا رویہ رکھے جیسے اسے چھوت کی بیماری ہوگئی ہو۔ ”تم اس بارے میں پہلے سے جانتی تھیں۔“ اس نے کہا۔ ”اب تمہیں اسی کے ساتھ رہنا ہے۔ بہتر ہے کہ تم کوئی اور محبوب دیکھ لو۔“

جین نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے کئی مردوں سے دوستی کی۔ اپنے کام میں زیادہ مصروف ہوگئی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کے دماغ پر الفریڈو حاوی ہوگیا تھا۔ جیسے وہ پہلے کبھی آندرے کے بارے میں سوچتی تھی، اسی طرح الفریڈو کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ سڑک، تھیٹر یا کسی ریستوران میں جاتی تو اسے ہر جگہ الفریڈو نظر آتا۔

ایک دفعہ وہ روم گئی تو اس نے الفریڈو کو خط لکھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ ان کی ملاقات ایک کیفے میں ہوئی۔ وہ واقعی ایک چارمنگ شخص تھا۔ اس نے جین کو بتایا کہ وہ آندرے سے محبت کرتا تھا۔ ”اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ تم سے اتنی محبت کیوں کرتا ہے۔“ الفریڈو نے کہا اور مسکرانے لگا۔ جین نے اس کی نیلی آنکھوں میں دیکھا اور سوچنے لگی کہ اگر وہ کسی اور شخص سے محبت کر سکتی تو وہ یہی ہوتا۔ اس کے بجائے جین نے کتابیں لکھیں جنہیں پسند بھی کیا گیا لیکن ان کی سب کتابوں میں آندرے سے اس کی محبت، بڑھتا ہوا حسد اور غصہ نمایاں تھا۔

اب وہ اپنے مشرقی ہیمپٹن والے گھر میں کمپیوٹر پر بیٹھی ایک نئی کہانی شروع کر رہی تھی۔ اس عورت کی کہانی جس نے غصے اور حسد سے مجبور ہو کر اپنے شوہر کو گولی ماردی جس سے بے حد محبت کرتی تھی۔

⌘⌘⌘

مارِ آستین

مرزا امجد بیگ

آستین میں جب سانپ چھپے بیٹھے ہوں تو باہر کے دشمنوں کی ضرورت نہیں رہتی... اور جب کوئی شاطر مجرم کسی جرم کا ارادہ کرتا ہے تو اسے بڑا گھمنڈ ہوتا ہے کہ اس کے منصوبے میں کہیں بھی کوئی سقم نہیں ہے مگر... وہ بھول جاتا ہے کہ قدرت نے ہمیشہ سیر کے لیے سوا سیر ضرور پیدا کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج دنیا صرف ایک اکھاڑے کے مانند ہوتی... بہرحال صد شکر کہ قدرت نے طاقتور کے اوپر ایک اور طاقتور کو مسلط کرکے انسان کو اس کے کمزور ہونے کا احساس دلایا ہے تاکہ ظالم کو بھی ایک حد پر آکر اپنے کیے پر ندامت ہونے لگے... وہ جو خونی رشتوں کو اپنا دشمن سمجھ بیٹھا تھا جب باہر کے لوگوں کی ریاکاری سہی تو اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر غلط سمت میں چل پڑا تھا۔

خونی رشتوں کو بے مایا سمجھنے والے ایک نا سمجھ •

مجرم کی ہوشیاریاں

گلابی جاڑے کی آمد کراچی والوں کے لیے راحت اور سکون کی پیامبر ثابت ہوئی تھی۔ اس موسم کی بوقلمونی کی اپنی ایک شان ہے۔ گزشتہ آٹھ ماہ سے گرمی میں تپنے، جلنے اور سلگنے والوں نے سکھ کی سانس لی تھی۔ چوبیس گھنٹے ائرکنڈیشنر میں زیست کرنے والے افراد کو موسمی تبدیلیوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا مگر جو اس غیر فطری نعمت سے محروم ہیں، ان کے لیے جاڑا بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔

ایسی ہی ایک خوشگوار اور دل بہار صبح میں عدالت جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس وقت عموماً کوئی فون نہیں آیا کرتا تھا اور اگر آتا تھا تو اپنے ساتھ کوئی آؤٹ آف روٹین معاملہ بھی لے کر آتا تھا۔

''ہیلو......!'' میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔

''بیگ صاحب! السلام علیکم۔'' دوسری جانب بولنے والے نے کہا۔

میں آواز سنتے ہی پہچان گیا۔ ''وعلیکم السلام، انصاری صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''حکم کریں جناب......!''

کلیم انصاری سے میری دیرینہ شناسائی تھی۔ وہ ایک چھوٹا موٹا اخبار نکالتا تھا۔ اس کا اخبار اگرچہ صفِ اول کے اخبارات میں تو شمار نہیں ہوتا تھا تاہم اس کی مانگ تھی اور وہ انصاری صاحب کی آمدنی کا ایک مناسب ذریعہ بھی تھا۔ عزت، شان اور ٹھسکا اس کے علاوہ تھا۔

''حکم نہیں، عرض ہے بیگ صاحب......!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرے ایک دوست کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ناصر حسین نے قتل نہیں کیا۔ اسے کسی سازش کے تحت اس



معاملے میں الجھایا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ اس کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیں۔''

''انصاری صاحب! ٹو بی ویری فرینک ...... جب تک مجھے کیس کی نوعیت اور حالات و واقعات کی تفصیل کا علم نہ ہو، میں آپ سے کوئی ہوائی وعدہ نہیں کرسکتا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔'' اور اس وقت تو میں بس گھر سے نکلنے ہی والا ہوں۔ آپ سے زیادہ بات نہیں کرسکوں گا۔ آپ ایسا کریں کہ سہ پہر میں میرے آفس آجائیں۔ اسی بہانے آپ سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔''

''میرا آج کا اسکیجوئل بہت ٹائٹ ہے۔'' معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔'' میں ناصر حسین کی صاحب زادی کو آپ کے دفتر بھیج دیتا ہوں۔ وہ آپ کو اس معاملے کی تفصیلات سے آگاہ کردے گی۔ ہم بعد میں کسی وقت مل لیں گے۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

الوداعی کلمات کے بعد ہمارے ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنی گاڑی میں سوار ہوکر عدالت کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

میں اپنے آفس میں بیٹھا کلائنٹس کو ڈیل کررہا تھا کہ میری سیکریٹری ثوبیہ نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی۔

''سر! دو لڑکیاں آپ سے ملنے آئی ہیں......!''

''کیا انہوں نے اپائنٹمنٹ لے رکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں سر!'' ثوبیہ نے بتایا۔'' وہ کہتی ہیں انہیں انصاری صاحب نے بھیجا ہے۔''

مجھے یاد آگیا۔ آج جب میں عدالت آنے کے لیے تیار ہورہا تھا تو کلیم انصاری نے فون کرکے مجھے بتایا تھا کہ وہ سہ پہر میں کسی ناصر حسین کی بیٹی کو میرے آفس بھیجے گا مگر ثوبیہ دو لڑکیوں کی آمد کا بتارہی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ممکن ہے ناصر حسین کی صاحبزادی اپنی کسی دوست کو بھی ہمراہ لے آئی ہوگی، میں نے ثوبیہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ دس منٹ کے بعد انہیں میرے چیمبر میں بھیج دیں۔''

اس وقت میرے پاس ایک ملاقاتی موجود تھا جو بس رخصت ہونے ہی والا تھا۔ اسی لیے میں نے ثوبیہ سے انہیں دس منٹ بعد اندر بھیجنے کے لیے کہا تھا۔

ملاقاتی کے جاتے ہی وہ اندر آگئیں۔ انہیں دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ وہ دونوں قد و قامت اور شکل و صورت میں کم و بیش ایک جیسی نظر آتی تھیں۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق ان کی عمریں اٹھارہ اور بیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ ان میں سے ایک انیس اور دوسری بیس سال کی تھی۔

''السلام علیکم وکیل صاحب......!'' وہ بہ یک زبان ہوکر بولیں۔

میں نے شائستہ لہجے میں ان کے سلام کا جواب دیا اور انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ میری میز کی دوسری جانب رکھی کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔'' کیا آپ دونوں جڑواں ہیں؟''

''نہیں!'' ان میں سے ایک نے نفی میں گردن ہلائی پھر دوسری کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔'' نازیہ مجھ سے ایک سال بڑی ہے مگر ہم دونوں میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ جو اس حقیقت سے واقف نہیں، وہ یہی سمجھتا ہے کہ ہم جڑواں بہنیں ہیں۔''

اس نے گہری سنجیدگی سے نپے تلے الفاظ میں جواب دیا تھا۔ میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''اور آپ کا نام کیا ہے؟''

''شازیہ'' اس نے بتایا۔

اب تک حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق چھوٹی بہن شازیہ انیس سال کی اور بڑی بہن نازیہ بیس سال کی تھی۔

''صبح انصاری صاحب سے فون پر میری مختصر بات ہوئی تھی اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ناصر حسین صاحب کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' وہ اس معاملے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے...... انہوں نے کہا تھا کہ وہ ناصر صاحب کی صاحبزادی کو میرے پاس بھیجیں گے جو مجھے معلومات فراہم کرے گی......!''

''انصاری انکل، ابو کے ایک مخلص اور قابلِ اعتماد دوست ہیں۔'' نازیہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔'' انہوں نے مجھے آپ سے ملنے کے لیے کہا تھا لیکن میں نے شازیہ کو گھر میں اکیلا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اس لیے ساتھ لے آئی ہوں۔''

''مطلب یہ کہ آپ دونوں کے سوا گھر میں اور کوئی بندہ بشر نہیں ہوتا......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل۔ اس کا یہی مطلب ہے!'' وہ ٹھوس انداز میں بولی۔ ''پرسوں تک ابو بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے اور اب وہ تھانے کی حوالات میں بند ہیں۔''

''اور آپ کی والدہ......؟''

''چودہ سال پہلے کینسر نے امی کی جان لے لی تھی۔'' نازیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''کبھی ہمارا گھر بھرا پُرا ہوا کرتا تھا پھر کسی بدبخت کی نظر لگ گئی۔ ہمارے گھر کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ پچھلے تین سال سے میں، شازیہ اور ابو......بس، ہماری فیملی کے یہی تین ممبرز ہیں اور پرسوں......''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر ثوبیہ سے کہا۔ ''عامر کہاں ہے؟''

عامر میرا آفس بوائے تھا۔ اس کی عمر تو چالیس سال تھی لیکن اس کا عہدہ اپنے اندر ''بوائے'' کی رعایت رکھتا تھا۔ ثوبیہ نے جواب دیا۔ ''اِدھر ہی ہے سر!''

''تین اچھی سی چائے اور بسکٹس بھجوادیں۔'' میں نے کہا۔

''وکیل صاحب! اس تکلف کی ضرورت نہیں۔'' نازیہ نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''ہم لوگ گھر سے سب کچھ کھا پی کر آئے ہیں۔''

''یہ تکلف نہیں، اخلاقیات کا تقاضا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں آفس میں آنے والے کلائنٹس کو اپنا مہمان سمجھتا ہوں اور مہمان کی خاطر داری کرنا کارِثواب ہے۔ کیا آپ مجھے اس ثواب سے استفادہ نہیں کرنے دیں گی......؟''

''مگر...... ہم یہاں آپ کو اپنی داستانِ غم سنانے آئے ہیں۔'' نازیہ نے گھائل لہجے میں کہا۔ ''آپ کو اندازہ نہیں کہ ہم کس بلائے بے درماں میں گرفتار ہیں...... کوئی شے حلق سے نہیں اتر رہی......''

''ان حالات میں تو مہمان نوازی اور بھی ناگزیر ہوجاتی ہے۔'' میں نے رف پیڈ اور پین سنبھال لیا۔ ''چائے بسکٹس کے دوران میں، میں آپ کی بپتا زیادہ توجہ سے سن سکوں گا۔ باقی جہاں تک کسی لاعلاج مصیبت کی بات ہے تو......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ لوگوں کی داستانِ غم نے میرے دل کو چھولیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس بے درماں بلا کی گردن میں خود اپنے ہاتھوں سے توڑوں گا۔''

ان کے پژمردہ چہروں پر اطمینان کی چمک نمودار ہوئی۔ شازیہ نے کہا۔ ''وکیل صاحب! ہمارے ابو بے گناہ ہیں۔ انہیں کسی چال کے ذریعے قتل کے اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ اگر آپ عدالت میں ابو کو بے قصور ثابت کردیں گے تو ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھیں گے......''

''دیکھو شازیہ......'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''وکیل صفائی کا کام اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنا ہی ہوتا ہے لیکن ایک بات آپ دونوں اپنے ذہن پر نقش کرلو کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔ ہماری دنیا میں اس کے لیے ''جسٹس از بلائنڈ'' کی ٹرم استعمال کی جاتی ہے۔ کرسیِ انصاف پر بیٹھا ہوا جج دونوں فریقین اور ان کے وکلاء کو سنتا ہے۔ وہ حالات وواقعات، گواہوں کے بیانات، پیش کیے جانے والے ثبوت اور وکلاء کے دلائل کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ عدالت میں اپنے مؤکل کو محض بے گناہ اور بے قصور کہہ دینے سے بات نہیں بنتی بلکہ مؤکل کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے بہت زیادہ قانونی اور منطقی زور آزمائی کرنا پڑتی ہے اور یہ ساری محنت ومشقت اسی وقت ممکن ہے جب کوئی وکیل اپنے مؤکل کی زندگی کے ایک ایک گوشے سے پوری طرح آگاہ ہو، لہٰذا......'' میں نے دانستہ رک کر باری باری نازیہ اور شازیہ کی آنکھوں میں دیکھا، پھر اضافہ کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔

''آپ دونوں مجھے اس کیس کے بارے میں سب کچھ سچ سچ اور پوری تفصیل کے ساتھ بتائیں گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کریں گی۔ آپ کا ایسا کوئی بھی عمل مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا البتہ...... یہ آپ کے والد صاحب کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوسکتا ہے......!''

اسی وقت عامر چائے اور بسکٹس لے کر آگیا۔ جب وہ واپس چلا گیا تو نازیہ نے کہا۔

''وکیل صاحب! انصاری انکل نے آپ کی بہت تعریف کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کو غلط بیانی بالکل پسند نہیں۔ ہم بھی ایسے ہی سچے اور کھرے لوگ ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم آپ سے کسی قسم کی کوئی بھی دروغ گوئی نہیں کریں گے۔''

''ویری گڈ......!'' میں نے ستائشی نظر سے نازیہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تو پھر بسم اللہ کریں، اور ہاں......اس دوران میں چائے اور بسکٹس کو ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کرنا......!''

میرے اس مشفق اور ہمدردی بھرے رویّے نے

ان کی ڈھارس بندھائی۔ پہلی مرتبہ مجھے ان کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکان دکھائی دی۔ مصیبت زدہ انسان، گہری تاریکی میں کھڑے کسی بے منزل مسافر کے مانند ہوتا ہے۔ امید آمیز الفاظ اس کی بے یار و مددگار زندگی میں کسی کرمک کا کردار ادا کرتے ہیں......!

اس روز ان دونوں بہنوں نے اپنے باپ ناصر حسین کے حالات و مشکلات کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

☆☆☆

باقر حسین کی صرف دو اولادیں تھیں۔ ملزم ناصر حسین اور مقتول جابر حسین۔ مقتول، ملزم سے چار سال چھوٹا تھا۔ دونوں بھائیوں کی عادات، مزاج اور فطرت میں بعد المشرقین حائل تھا۔ ناصر حسین متحمل مزاج، شائستہ کلام اور ایک بردبار شخص تھا۔ اس کی سوچ تعمیری اور مثبت تھی جبکہ جابر حسین ایک خود غرض، لالچی اور مفاد پرست انسان تھا۔ دونوں بھائیوں میں کبھی بن کر نہیں دی تھی۔

باقر حسین کی پیپر مارکیٹ میں اپنی دکان تھی جو اس کے باپ کے زمانے سے چلی آرہی تھی، گویا کاغذ کی خرید و فروخت ان کا خاندانی پیشہ تھا۔ ناصر حسین اس کاروبار میں باپ کی بھرپور مدد کیا کرتا تھا لیکن جابر حسین کو دکان کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اسی وقت پیپر مارکیٹ کا رخ کرتا جب اسے فوری طور پر کچھ رقم کی ضرورت ہوتی تھی ورنہ وہ سارا دن گھر سے غائب رہتا تھا اور رات گئے لوٹتا تھا۔ جابر حسین کے ان حد درجہ واہیات روز و شب کے حوالے سے باقر حسین نے جب بھی اس سے پوچھا تو اس کے پاس ایک ریڈی میڈ جواب ہوا کرتا تھا۔

''ابو...... آج کل اسٹیٹ کا بزنس خاصا ڈاؤن جارہا ہے لیکن میں اپنی سی کوشش کررہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ محنت ایک دن ضرور رنگ لائے گی اور میں اس شہر کا ایک کامیاب اور نمایاں رئیل اسٹیٹ کنسلٹنٹ بن کر ابھروں گا۔''

جابر نے گھر میں یہی بتا رکھا تھا کہ وہ پراپرٹی کے بزنس میں جان مار رہا ہے۔

''پتا نہیں وہ دن کب آئے گا......!'' باقر حسین بیٹے کی وضاحت کے جواب میں ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا۔ ''میں تو تمہیں سالہا سال سے ایسا ہی دیکھ رہا ہوں۔ افسوس کہ تم اپنے بھائی سے بھی کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ دیکھ لو، ناصر کس طرح پورا دن دکان میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے......؟''

''ابو! آپ بھائی کا نام لے کر مجھے طعنے نہ ماریں۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں کہتا۔ ''آپ کو کچھ اندازہ نہیں کہ میں جس راہ پر چل رہا ہوں وہ کتنی سودمند ہے۔''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا جابر! مجھے واقعی کچھ اندازہ نہیں......'' باقر حسین نے شاکی نظر سے بیٹے کی جانب دیکھا پھر ایک مضمحل سانس خارج کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''میں تو بس یہی چاہتا ہوں کہ میری آنکھ بند ہونے سے پہلے تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ۔ مجھے ناصر کی طرف سے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں مگر تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر میرا دماغ دکھنے لگتا ہے۔''

ایک سمجھدار باپ کو اپنی اولاد کے مستقبل کے بارے میں ایسی ہی سنجیدگی سے سوچنا چاہیے مگر جابر حسین بھی چیز دیگر است کی تفسیر تھا۔ اس نے باپ کی تشویش کے جواب میں بے پروائی سے کہا۔

''ابو! آپ کو میرے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے۔''

اس قسم کی باتیں ان باپ بیٹے میں اکثر ہوتی رہتی تھیں لیکن جابر نے کبھی بھی باپ کی نصیحت کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا، اس پر عمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے مگر ایک باپ ہونے کے ناتے باقر حسین کو جب بھی موقع ملتا، وہ اپنا فرض ادا کرنا نہیں بھولتا تھا۔

کسی تجربہ کار سیانے نے باقر حسین کو مشورہ دیا۔ ''جابر کی شادی کرادو، یہ سدھر جائے گا۔''

''بڑی عجیب بات کی ہے تم نے۔'' باقر نے مشورہ دینے والے ہمدرد سے کہا۔ ''جابر کوئی کام کاج نہیں کرتا۔ ابھی تو میں اسے پال رہا ہوں۔ اگر میں نے ان حالات میں اس کی شادی کردی تو اس کے ساتھ اس کی بیوی کو بھی پالنا پڑے گا۔ پھر ایک اور مشکل بھی ہے......!''

''شادی کے بعد کمان کے مانند بڑے بڑے ٹیڑھے، تیر کی طرح سیدھے ہو جاتے ہیں۔'' اس شخص نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ جابر بھی راہِ راست پر آجائے گا۔ مجھے بتاؤ، وہ ایک اور مشکل کون سی ہے؟''

''ناصر......!'' باقر نے اپنے خیر خواہ کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......!'' وہ حیرت بھرے لہجے

میں مستفسر ہوا۔ ”ناصر تو بہت ہی محنتی اور فرماں بردار ہے۔ اس کی طرف سے تمہیں کون سی مشکل ہے باقر حسین؟“

”مجھے ناصر سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ باقر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرے لیے کسی ہیرے سے کم نہیں۔ اللہ ہر باپ کو ناصر جیسا لائق بیٹا عطا کرے۔ میں نے جس مشکل کا ذکر کیا ہے وہ ان کی عمروں سے متعلق ہے۔ ناصر، جابر سے چار سال بڑا ہے۔ اصولی طور پر پہلے ناصر کی شادی ہونا چاہیے۔“

”دیکھو باقر! اس قسم کے سارے اصول انسانوں ہی کے بنائے ہوئے ہیں اور میں انہیں بالکل نہیں مانتا۔“ اسی خیرخواہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”میں نے تمہاری پریشانی کو دیکھ کر مشورہ دیا ہے۔ اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ باقر نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ”میں تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔“

آئندہ روز باقر نے ناصر سے بات کی۔ استصواب رائے کے لیے وہ ناصر کو ایک موزوں انسان سمجھتا تھا۔ ناصر نے پوری توجہ سے باپ کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ابا جی! میں تو آپ کے حکم کو ہر شے سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں۔ جابر کے ساتھ بھی میرا کوئی مناقشہ نہیں ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں گے، مجھے منظور ہوگا۔ اگر شادی کے بعد جابر کی زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی آسکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس مشن میں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔ باقی جہاں تک میری شادی کا معاملہ ہے تو......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے شادی کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ایک دو سال بعد میں بھی کرلوں گا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔“

”تم نے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا کردیا ہے ناصر۔“ باقر نے ایک مطمئن سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”اس مہم کو آگے بڑھانے سے پہلے آپ جابر سے کھل کر بات کرلیجیے گا۔“ ناصر نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اس کی رضامندی بہت ضروری ہے۔ اگر وہ ’ہاں‘ بولے تو پھر اس سلسلے میں اپنی کوشش کا آغاز کرنا مناسب ہوگا۔“

”ہاں، ہاں ...... کیوں نہیں۔“ باقر حسین نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”میں جابر کو اعتماد میں لینے کے بعد ہی کوئی عملی قدم اٹھاؤں گا۔“

ناصر اپنے چھوٹے بھائی جابر کو جس حد تک جانتا تھا، اسے بالکل یقین نہیں تھا کہ جابر جیسا لاابالی اور غیرذمے دار شخص شادی کے لیے ہامی بھردے گا لیکن وقت نے ثابت کردیا کہ ناصر، جابر کے بارے میں خاک بھی نہیں جانتا تھا۔

دو روز بعد باقر نے شادی کے موضوع پر جابر سے تفصیلی بات کی اور وہ حیرت انگیز طور پر بے چون وچرا مان گیا......!

آئندہ تین ماہ میں جابر کے لیے لڑکی تلاش کرلی گئی۔ فرحانہ، جابر سے محض ایک سال چھوٹی تھی۔ جب رشتے کی بات آگے بڑھی تو فرحانہ کے گھر والوں نے ایک جینوئن اعتراض کھڑا کردیا۔ فرحانہ کے باپ نے باقر حسین سے کہا۔

”باقر صاحب! میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ آپ کی اولاد بھی یقیناً بہت اچھی ہوگی لیکن جابر کے حوالے سے میرے کچھ تحفظات ہیں......“

”کیسے تحفظات جناب؟“ باقر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہم نے آپ کے بیٹے کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے مطابق جابر کا کوئی کام دھندا نہیں ہے۔“ فرحانہ کا باپ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ اپنے خاندانی کام میں دلچسپی لیتا ہے اور نہ ہی اپنے طور پر وہ باقاعدہ کوئی روزگار سیٹ کرسکا ہے۔ یہ صورت حال تسلی بخش نہیں ہے......“

”ہم جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔“ باقر حسین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کے اعتراض کا جواب دیا۔ ”اگر جابر کے آگے پیچھے کوئی اپنا موجود نہ ہوتا تو یہ صورت حال یقیناً تشویشناک ہوتی۔ آپ اس بات کا اطمینان رکھیں کہ آپ کی بیٹی کو ہمارے گھر میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ باقی جہاں تک جابر کے ذریعۂ آمدنی کا معاملہ ہے تو......“ لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

”ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے فارغ بیٹھا ہو۔ آپ نے اس کے بارے میں تحقیق کی ہے تو آپ کو پتا چلا ہوگا کہ وہ پراپرٹی کا کام کررہا ہے۔ اس کا کاروبار ابھی جما نہیں لیکن امید ہے وہ بہت جلد اس میدان میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوجائے گا۔“

”باقر صاحب! فرحانہ ہماری اکلوتی اولاد ہے......“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ہم امیدوں اور آسروں کے سہارے پر اس کے مستقبل کا فیصلہ نہیں کرسکتے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میرے پاس آپ کے

لیے ایک تجویز ہے......!"

"جی بتائیں — آپ کس تجویز کی بات کر رہے ہیں؟" باقر حسین ہمہ تن گوش ہوگیا۔

"ناصر آپ کا بڑا بیٹا ہے اور برسرِ روزگار بھی ہے۔" اس نے معتدل انداز میں کہا۔ "اصولی طور پر بھی آپ کو پہلے ناصر کی شادی کرنا چاہیے۔ اگر آپ فرحانہ کے لیے ناصر کا رشتہ ڈالتے ہیں تو ہمیں دل و جان سے منظور ہے۔"

"آپ کی بات اپنی جگہ انتہائی موزوں اور درست ہے بھائی صاحب!" باقر نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن ناصر کا ابھی دو چار سال شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہمیں پہلے جابر ہی کی شادی کرنا ہے۔"

فرحانہ کا باپ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحات کے غور و فکر کے بعد اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، آپ ہمیں سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دیں، میں فرحانہ کی ماں سے مشورہ کرنے کے بعد آپ کو جواب دوں گا۔"

"یہ تو آپ کا حق ہے جناب۔" باقر حسین نے خوش دلی سے کہا۔ "ہم بڑی بے چینی سے آپ کی مشاورت کے مثبت نتائج کا انتظار کریں گے۔"

یہ تمام تر گفتگو فرحانہ کے باپ اور باقر حسین کے درمیان ہوئی تھی۔ رات کو اس موضوع پر کچہری لگی جس میں ناصر اور جابر کے علاوہ ان کی والدہ قدسیہ بیگم بھی موجود تھیں۔ باقر حسین نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"اس کی بات معقول ہے۔" قدسیہ بیگم نے کہا۔ "ہر ماں باپ کو اپنی اولاد کے مستقبل کے بارے میں اسی انداز میں سوچنا چاہیے۔"

ناصر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہمیں اپنی سوچ کو ہر حال میں مثبت رکھنا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ فرحانہ کا باپ جابر کے حق میں فیصلہ سنائے گا۔"

اس سنجیدہ بات چیت کے دوران میں جابر گردن جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ باقر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"جابر بیٹا! تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میری رائے کے لیے گنجائش ہی کہاں بچی ہے؟" جابر نے خفگی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "سب کچھ تو واضح ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" باقر حسین نے تیز آواز میں دریافت کیا۔

"ناصر بھائی سہرا باندھنے کی تیاری کریں......" جابر معنی خیز لہجے میں بولا۔

"یہ تم کس قسم کی فضول باتیں کر رہے ہو۔" باقر حسین نے پلکیں جھپکاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "ہم ناصر کی نہیں، تمہاری شادی کے معاملے کو ڈسکس کر رہے ہیں۔"

"میری شادی کا فیصلہ تو ہو چکا......" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "فرحانہ کے باپ نے واشگاف الفاظ میں مجھے مسترد کر دیا ہے۔ اتنی موٹی بات آپ لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی؟"

"اس نے تمہیں مسترد نہیں کیا بیٹا بلکہ سوچنے کے لیے تھوڑا وقت مانگا ہے۔" قدسیہ بیگم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تم دل چھوٹا نہ کرو، انشاء اللہ فیصلہ تمہارے ہی حق میں ہوگا۔"

"امی! میں بے وقوف ہوں اور نہ ہی احمقوں کی جنت میں بسیرا کرنے کا مجھے کوئی شوق ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "میں دل سے نہیں، دماغ سے سوچتا ہوں۔ فرحانہ کا باپ چند روز کے بعد کیا جواب دے گا، مجھے اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں ہے کیونکہ میں نے ایک حتمی فیصلہ کر لیا ہے......!"

"کیسا فیصلہ؟" باقر حسین نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کبھی بھی اور کسی بھی قیمت پر......" وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ "فرحانہ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ!"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا......؟" ناصر نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "ہم جس معاملے کو بنانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں، تم اسے بگاڑنے پر تل گئے ہو۔ یہ کیا حماقت ہے؟"

"میں نے جو کہنا تھا، وہ کہہ دیا اور یہ میرا فل اینڈ فائنل فیصلہ ہے۔" وہ ناصر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اٹل لہجے میں بولا۔ "آپ کو میرے کسی معاملے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فرحانہ کا باپ آپ کو پسند کر گیا ہے۔ آپ فرحانہ سے شادی کر لو۔ جب میرا بزنس سیٹ ہو جائے گا تو فرحانہ سے کہیں اچھی لڑکیاں اور ان کے باپ میرے تملّق میں مصروف دکھائی دیں گے۔"

ناصر اور جابر طبعاً اور عادتاً ایک دوسرے کا تناقض تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ناصر، جابر سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا، مبادا کسی جدال کا راستہ کھل جائے۔ ابھی جابر نے اپنے جن فیصلہ کن جذبات کا اظہار کیا تھا اس پر ناصر نے لب کشائی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی البتہ باقر حسین اور قدسیہ بیگم نے جابر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی اڑیل ٹٹو کی طرح اپنی ضد پر قائم رہا۔ نتیجتاً اس سنجیدہ اور حساس محفل کو

برخاست کرنا پڑا۔

اگلے روز باقر حسین نے دکان پر ناصر سے کہا۔ ''جابر کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے تو لگتا ہے یہ لڑکا پاگل ہو گیا ہے۔ ایک نارمل انسان تو اس قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کرتا......!''

''ابو! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' ناصر نے محتاط انداز میں کہا۔ ''مجھے خود حیرت ہے۔ جابر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''کہیں یہ کوئی نشہ وشہ تو نہیں کرنے لگا......؟''

''ابو! مجھے نہیں معلوم۔'' ناصر نے جلدی سے کہا۔

''تم نے کل اس کے نامعقول انداز پر خاموشی اختیار کرلی تھی۔'' باقر حسین نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''وہ تم سے چھوٹا ہے۔ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانا تمہارا فرض ہے بیٹا۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں ابو! لیکن ہر انسان کو اپنی عزت عزیز ہوتی ہے۔'' ناصر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ جابر عمر میں مجھ سے چار سال چھوٹا ہے مگر اس نے کبھی مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھا ہی نہیں۔ میری سیدھی اور مثبت بات بھی اسے تیر کی طرح لگتی ہے، اسی لیے میں نے اس کے معاملات سے احتراز برتنا شروع کر دیا ہے اور آپ اس بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''جانتا ہوں، اسی لیے تو فکرمند ہوں بیٹا۔'' باقر حسین کے لہجے سے بے بسی جھلکتی تھی۔ ''جاننا بہت بڑا عذاب ہے۔ میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ چند روز کے بعد جب فرحانہ کا باپ مجھے اپنے جواب سے مطلع کرے گا تو پھر کیا ہوگا۔ جابر نے تو اپنی جانب سے بات ہی ختم کر دی ہے......!''

''آپ قبل از وقت اس بارے میں سوچ کر خود کو خوامخواہ ہلکان نہ کریں ابو۔'' ناصر نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''جو حالات آپ نے بتائے ہیں ان کے پیشِ نظر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ فرحانہ کے والدین جابر کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' باقر حسین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ننانوے فیصد امکان انکار کا ہے لیکن اگر باقی ماندہ ایک فیصد نے کوئی حرکت کر دی تو......تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی ابو! میں سمجھ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا، پھر برا سا منہ بنا کر اضافہ کیا۔ ''جب اپنا انڈا ہی گندا ہو تو پھر سوائے افسوس کے اور کیا کیا جا سکتا ہے......!''

''افسوس بہت چھوٹا لفظ ہے ناصر......!'' باقر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اگر معاملہ ماقبل الذکر نکلا تو مجھے بے حد شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ کیا تم مجھے شرمندہ ہوتے دیکھ پاؤ گے؟''

''ابو! یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں......'' ناصر تڑپ کر بولا۔ ''میں بھلا آپ کو پشیمان ہوتا کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ آپ کی ناموس کے لیے تو میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔''

''بس تو پھر اس ندامت سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔'' باقر حسین نے چٹانی لہجے میں کہا۔

ناصر نے الجھن زدہ انداز میں اپنے باپ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''ابو! آپ کس راستے کی بات کر رہے ہیں؟''

''اس سے پہلے کہ فرحانہ کا باپ مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرے، مجھے خود جا کر اس سے ملنا ہوگا۔'' باقر نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

''کس سلسلے میں......؟'' ناصر نے حیرت بھری نظر سے اپنے باپ کو دیکھا۔

''فرحانہ سے تمہاری شادی کے سلسلے میں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''بس، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''اوہ......!'' ناصر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''کیا ہوا......؟'' باقر نے گھور کر بیٹے کو دیکھا۔ ''کیا تمہیں میرا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا؟''

''میں نے آج تک کبھی آپ کے فیصلوں کے سامنے گردن اٹھائی ہے ابو......؟'' ناصر کے سوال سے انتہا درجے کی معصومیت اور فرماں برداری جھلکتی تھی۔

''شاباش......!'' باقر نے فرطِ جذبات سے کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی، میرے بچے۔''

قصہ مختصر، انیس سو اٹھاون عیسوی میں ناصر اور فرحانہ کی شادی ہو گئی۔ انیس سو ساٹھ میں نازیہ اور انیس سو اکسٹھ میں شازیہ نے فرحانہ کے بطن سے جنم لیا۔ شازیہ کی پیدائش کے بعد فرحانہ کی طبیعت گری گری رہنے لگی تھی۔ جب عمومی علاج معالجے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو انیس سو باسٹھ میں اسپیشلسٹ کو دکھایا گیا۔ مختلف نوعیت کے درجن بھر ٹیسٹ کروانے کے بعد پتا چلا کہ فرحانہ کو کینسر نامی موذی مرض نے جکڑ لیا ہے۔

باقر حسین کی فیملی کے لیے یہ ایک روح فرسا خبر تھی۔ وہ لوگ سرطان کا مہنگا علاج کرانے کی طاقت رکھتے تھے لہٰذا اس سلسلے میں کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا مگر شدنی کا کیا کیا جائے۔ جب جب جس چیز کو جہاں جہاں ہونا ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتی ہے۔ چار سال کے مسلسل علاج کے بعد

انیس سو چھیاسٹھ عیسوی میں فرحانہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ موت کے وقت اس کی عمر محض تینتیس سال تھی...... موت سے بھلا کس کو رستگاری ہے!

فرحانہ کے وصال نے ناصر حسین کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ محض آٹھ سال کی ازدواجی زندگی، جس میں چار سال بیماری کے۔ کہتے ہیں وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔ ناصر نے نازیہ اور شازیہ کو زیادہ وقت دینا شروع کر دیا۔ اب وہی ان بچیوں کا باپ بھی تھا اور ماں بھی۔ بہت جلد اس نے خود کو سنبھال لیا لیکن فلکِ ناانصاف کو اس کا سنبھلنا پسند نہیں آیا تھا۔ انیس سو ستر میں اس کی والدہ قدسیہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔

بیوی کی موت نے باقر حسین کو گہرے صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ اسے گویا ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ ایک ہی جگہ پر گھنٹوں خاموش بیٹھا خلا میں گھورتا رہتا۔ قدسیہ بیگم کے انتقال کا یقیناً سب کو دکھ تھا لیکن اس واقعے نے سب سے زیادہ باقر حسین کو متاثر کیا تھا۔ قدسیہ بیگم سے اس کی رفاقت کم و بیش چوالیس سال پر محیط تھی۔ وہ بیوی کی جدائی کو صرف چھ سال تک جھیل سکا اور پھر انیس سو چھہتر میں وہ بھی دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اب اس گھر میں صرف چار افراد بچے تھے۔ جابر، ناصر اور ناصر کی دو بیٹیاں نازیہ اور شازیہ۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زندگی دراصل موت کی امانت ہے اور موت کسی بھی وقت اپنی یہ امانت وصول کرنے آ جاتی ہے لہٰذا موت سے فرار ممکن نہیں ہے۔ اس بھرے پُرے گھر میں، دس سال کے عرصے میں تین افراد راہیِ ملکِ عدم ہو گئے تھے۔ یہ ٹریجڈی اپنی جگہ ایک اذیت ناک اہمیت کی حامل تھی مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کے لیے کرب اور اذیت بہت چھوٹے الفاظ تھے۔

باقر حسین کے انتقال کے بعد جابر حسین کھل کر ناصر حسین کے سامنے آ گیا۔ ایک روز اس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔

”ناصر حسین! میری طرح تم بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارا ایک ساتھ گزارہ ممکن نہیں ہے۔“

جابر ”آپ“ سے ”تم“ پر اتر آیا تھا۔ ناصر نے اس کے خطرناک تیور دیکھ کر بہ آسانی یہ بھانپ لیا تھا کہ اس کی نیت میں فتور نے جگہ بنالی ہے لہٰذا اس کے ساتھ بحث و مباحثے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

”تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟“ ناصر نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

”بٹوارا۔“ وہ حتمی لہجے میں بولا۔

”کس چیز کا بٹوارا؟“ ناصر نے سوال کیا۔

”سب سے پہلے اس آبائی گھر کی تقسیم۔“ جابر نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ”باقی باتیں بعد میں سوچیں گے۔“

وہ لوگ ناظم آباد کے صاف ستھرے علاقے میں دو سو گز کے ایک کشادہ گھر میں رہائش پذیر تھے جو ان کے دادا کے وقتوں سے تھا۔ ناصر اپنے چھوٹے بھائی کی بات کو جس حد تک سمجھ پایا، اس کی روشنی میں اس نے جابر سے استفسار کیا۔

”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اس گھر کے سینٹر میں ایک دیوار کھڑی کر کے اسے سو، سو گز کے دو پورشنز میں تبدیل کر لیں اور ایک دوسرے سے الگ اپنی اپنی زندگی گزاریں؟“

”ہرگز نہیں۔“ جابر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

ناصر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”پھر بٹوارے سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”اس گھر کو فروخت کر کے جو رقم حاصل ہو، اسے ہم آپس میں برابر بانٹ لیں گے۔ اس کے علاوہ پیپر مارکیٹ والی دکان کے بارے میں بھی میرے پاس ایک آئیڈیا ہے جو یقیناً تمہیں بہت پسند آئے گا۔“ جابر نے بڑی ہوشیاری سے جواب دیا۔

جابر جیسے شاطر انسان کی زبان سے پیپر مارکیٹ والی دکان کا ذکر سن کر ناصر کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے بٹوارے والے معاملے کو آگے بڑھانے سے پہلے پوچھ لیا۔

”تم کس آئیڈیا کی بات کر رہے ہو، جابر؟“

”تمہیں پتا ہی ہے کہ مجھے اس کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے......“ جابر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لہٰذا وہ دکان تم اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔ میں اس اِرث سے دستبرداری کا ڈاکیومنٹ سائن کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس سلسلے میں میری ایک شرط ہوگی۔“

دکان ناصر کے پاس رہنے کی پیشکش میں خاصی کشش پائی جاتی تھی کیونکہ وہ ایک مضبوط اور پھلتا پھولتا ذریعۂ آمدنی تھا۔ اس کے حصول کے لیے ناصر، جابر کی کوئی بھی شرط مان سکتا تھا۔ اس نے جابر کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔

”اور تمہاری شرط کیا ہے؟“

”ہم مکان کی قیمت لگواتے ہیں۔“ جابر نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”جو بھی مارکیٹ ویلیو ہوگی اس کا نصف میں آپ کو دے دوں گا اور آپ یہ مکان مکمل طور پر میرے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بدلے میں، میں دکان کو آپ کے حوالے کرنے کے سلسلے

میں آپ سے ہر قسم کا تعاون کروں گا۔ ہر چیز کے لیگل ڈاکیومینٹس تیار کیے جائیں گے۔ جب یہ سارے معاملات نمٹ جائیں گے تو ہم اپنی راہیں الگ کرلیں گے۔ میرا خیال ہے، ہم دونوں کے لیے اس سے بہتر اور کوئی راستہ ہو ہی نہیں سکتا......!''

ناصر نے تحمل سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر دریافت کیا۔ ''اور اگر اس معاملے کو ریورس کردیں تو......؟''

''ریورس کرنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' جابر نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''مطلب یہ کہ......'' ناصر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اس مکان کی کل قیمت کا نصف تمہیں دے کر یہ مکان اپنے نام کروالیتا ہوں......!''

''بہ صد شوق......!'' جابر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس صورت میں، میں بھی اپنی شرط کو بھول جاؤں گا اور نہ صرف یہ کہ کاروبار کے بٹوارے کی بات کروں گا بلکہ اس بزنس کا تخمینہ لگوا کر اس کا نصف تمہاری ہتھیلی پر رکھ کر دکان پر قابض ہوجاؤں گا اور تم مجھے ایسا کرنے سے روک نہیں سکو گے......!''

جابر، ناصر کی توقع سے کہیں زیادہ عیار ثابت ہورہا تھا۔ وہ جابر کی ضد اور کمینے پن سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ باقر حسین کے انتقال کے بعد سے اس نے ناصر کے خلاف درپردہ باقاعدہ لابنگ شروع کردی تھی۔ وہ ان کے مشترکہ سرکل میں یہ بات عام کررہا تھا کہ بڑا بھائی یعنی ناصر، ابو کے انتقال کے بعد اس کے ساتھ سوتیلے بھائی جیسا سلوک کررہا ہے اور اسے کاروباری معاملات میں سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کرنے کی مہم میں لگا ہوا ہے۔ اس قسم کی باتیں ادھر اُدھر سے ناصر تک پہنچتی رہتی تھیں۔ اس کی مجبوری یہ بھی کہ وہ بڑا بھائی تھا۔ اس نوعیت کے معاملات میں لوگوں کی ہمدردیاں عموماً چھوٹے بھائی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ سب یہ کہہ کر بڑے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''اب تم ہی اس کی ماں ہو اور تم ہی باپ۔ وہ تم سے نہیں مانگے گا تو کس سے مانگے گا۔ چھوٹا ہے...... بچہ ہے...... جو مانگتا ہے، دے دو۔''

بڑے بھائی کی بے بسی اور لاچاری کو وہی شخص بہ خوبی سمجھ سکتا ہے جو اس نازک اور حساس عہدے پر فائز رہا ہو......!

ناصر کسی بھی حال میں پیپر مارکیٹ والی دکان کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ دکان درحقیقت منی جنریٹنگ مشین تھی۔ اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے تھوڑا بہت نقصان اٹھانے میں کوئی حرج نہیں تھا لہٰذا اس نے مکان کے معاملے میں سرنڈر ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

آئندہ روز سے جابر نے مختلف پارٹیوں کو گھر کا وزٹ کرانا شروع کردیا۔ ایک ہفتے کے ہوم ورک کے بعد جابر نے ناصر سے کہا۔

''میں نے ہر زاویے سے کوشش کرکے دیکھ لی ہے۔ سولہ لاکھ سے زیادہ کی کوئی پارٹی نہیں لگ رہی۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو خود ٹرائی کرکے دیکھ لو......''

جابر کے علم میں لائے بغیر ناصر نے اپنے طور پر بھی مکان کی مارکیٹ ویلیو معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے پتا چلا تھا کہ ان کا مکان پندرہ سے اٹھارہ لاکھ کے بیچ کی مالیت کا ہے۔ اس حساب سے جابر کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ویسے بھی پراپرٹی کی خرید و فروخت کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جب آپ کو کچھ سیل کرنا ہو تو مارکیٹ گری ہوئی ہوتی ہے اور جب آپ کچھ پرچیز کرنے نکلیں تو مارکیٹ چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ناصر ان بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اس نے کہا۔

''اگر تم اس ویلیو سے مطمئن ہو تو میں چیک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔''

''میں نے اپنا اطمینان کرلیا ہے، اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں۔'' جابر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''اگر سولہ لاکھ سے زیادہ مل جائیں تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ اماؤنٹ جتنا بڑا ہوگا، اس میں ہم دونوں ہی کا فائدہ ہے۔''

دو سو گز پر بنے ہوئے عالیشان مکان کی مارکیٹ ویلیو سولہ لاکھ سن کر آپ حیران نہیں ہوئیے گا۔ یہ واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے۔ آج کل اس کیٹیگری کے مکان کی قیمت پانچ کروڑ کے آس پاس ہوگی۔

''ٹھیک ہے......'' ناصر نے عندیہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے آٹھ لاکھ روپے دے دو۔ میں اس مکان کے حقوق سے دستبردار ہوجاتا ہوں۔ تم یہ مکان اپنے نام کروالو لیکن اس سے پہلے تمہیں پیپر مارکیٹ والی دکان سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی اور یہ تمام قانونی معاملات ایک تجربہ کار وکیل کی مدد سے کیے جائیں گے تاکہ بعد میں کوئی دستاویزی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔''

''مجھے منظور ہے۔'' جابر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں بھی یہی چاہوں گا کہ کوئی کام کچا نہ ہو اور ہاں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی، پھر

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''وکیل کی آدھی فیس تم دو گے اور آدھی میں۔''
''ٹھیک ہے!'' ناصر نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
آئندہ ایک ہفتے میں پیپر مارکیٹ کی دکان ناصر کے نام رجسٹر ہوگئی۔ جب مکان کی رجسٹریشن کا معاملہ سامنے آیا تو اس موقع پر بھی جابر نے چھوٹا بھائی ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔
''بھائی......!'' اس نے مبلغ چھ لاکھ روپے ناصر کو دیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ رکھ لیں۔ میں نے ایک رہائشی اسکیم کے لیے تین ایکڑ زمین کا سودا کیا ہوا ہے جس پر میرا کمیشن لگ بھگ دو لاکھ بنتا ہے جو دو سے تین ماہ میں مجھے مل جائے گا۔ آپ بڑے بھائی ہو، اگر آپ مجھ پر بھروسا کرلو تو میں تین ماہ کے بعد یعنی جون میں آپ کو باقی کے دو لاکھ دے دوں گا۔''
آج جابر بڑے آپ جناب سے بات کر رہا تھا۔ ناصر کا دل پسیج گیا۔ اس نے چھوٹے بھائی کی بات مان لی۔ جابر چاہے جیسا بھی تھا، ناصر اسے کسی پریشانی میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے چھ لاکھ لے کر آبائی مکان جابر کے نام رجسٹر کروادیا۔
ناصر دل سے جابر کا خیر خواہ تھا اور یہ دل بھی عجب شے ہے۔ چالاک اور ہوشیار لوگ اپنے دماغ کا استعمال کر کے معصوم افراد کے دل کو لعبت بنا لیتے ہیں اور پھر اس سے اپنا من پسند کھیل کھیلتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ گداز دل انسان کو قدم قدم پر جذباتی صدمات اور مالی خسارے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
ناصر اور جابر کے مابین یہ تمام دستاویزاتی معاملات فروری، انیس سو ستتر میں طے پائے تھے۔ اسی ماہ ناصر نے حیدری کے علاقے میں اپنے لیے ساڑھے پانچ لاکھ میں دو بیڈ، ایک ڈرائنگ، ایک ڈائننگ کا لگژری اپارٹمنٹ خرید لیا اور باقی کے پچاس ہزار روپے کاروبار میں ڈال دیے۔
وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا......
جابر نے تین ماہ بعد یعنی جون، ستتر میں دو لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کی ایفائے عہد کی نیت ہی نہیں تھی۔ ناصر نے تین ماہ تک اس سے رقم کا مطالبہ نہیں کیا اور جابر کی جانب سے بھی مکمل خاموشی چھائی رہی۔ پھر جون کے وسط میں ایک سنسنی خیز خبر نے ناصر کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسے پتا چلا کہ جابر نے آبائی گھر بیس لاکھ روپے میں فروخت کر دیا ہے۔
ناصر کو اس بات سے کوئی تکلیف نہیں تھی کہ جابر کو آبائی گھر کی فروخت سے خاصا مالی فائدہ ہوا تھا۔ اس کی توجہ اپنے دو لاکھ پر تھی اور جابر اس رقم کی ادائیگی میں لیت ولعل سے کام لے رہا تھا۔ وہ ہر بار کوئی ایسا بہانہ بناتا کہ ناصر اسے چند روز کا وقت دینے پر مجبور ہو جاتا۔ بڑے بھائی کو بہرحال یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔
جولائی ستتر میں جابر نے اپنے لیے دس لاکھ مالیت کا ایک سپر لگژری اپارٹمنٹ گلشن اقبال میں خرید لیا۔ علاوہ ازیں اس نے حسن اسکوائر کے نزدیک، مین یونیورسٹی روڈ پر اپنا ایک شاندار آفس بھی بنالیا۔ یہ آفس دو چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا جو جابر نے چار لاکھ میں خریدے تھے اور لاکھ، ڈیڑھ لاکھ روپیا اس نے آفس کی تزئین و آرائش پر لگا دیا تھا۔ اس حوالے سے وہ خاصا کشادہ دل بہ الفاظِ دیگر مسرف ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنے آفس ''جابر ایسوسی ایٹس'' کو شاندار بنانے میں کسی کنجوسی سے کام نہیں لیا تھا۔ اگست، ستتر میں جابر نے ایک ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس توفیق مرزا کی صاحبزادی فریدہ سے شادی کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ خبر بھی اڑی کہ فریدہ اور جابر کے درمیان انیس سو چھہتر سے معاملات چل رہے تھے اور جابر نے ہر ہر قدم فریدہ کی مشاورت سے اٹھایا اور رکھا تھا۔
ناصر کو جابر کی شادی یا اس کی کاروباری ترقی سے کسی قسم کی کوئی جلن یا حسد نہیں تھا۔ اسے بس اس بات کا افسوس تھا کہ جابر نے ابھی تک اس کے دو لاکھ روپے ادا نہیں کیے تھے اور اسے رقم کی اشد ضرورت تھی کیونکہ اس نے اپنی بیٹیوں کی شادی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ انیس سو اٹھہتر کا سال بھی جابر نے لارالپا میں گزار دیا۔ انیس سو اناسی میں جابر کے سسر توفیق مرزا کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ چل بسا۔ اسی سال نازیہ نے گریجویشن کر لیا۔ آئندہ سال یعنی انیس سو اسّی میں شازیہ کا بھی گریجویشن مکمل ہو جانا تھا لہٰذا اسی کی ابتدا ہی سے ناصر نے جابر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کیونکہ اس نے سوچ رکھا تھا کہ شازیہ کا گریجویشن ہوتے ہی وہ دونوں بہنوں کی ایک ساتھ شادی کر دے گا مگر جابر کا معاملہ وہی تھا کہ......زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد!
جابر کے لیے دو لاکھ کی ادائیگی کرنا چنداں مشکل نہیں تھا لیکن جب انسان کی نیت میں موچ آجائے تو پھر دو روپے کی ادائیگی بھی بھاری محسوس ہوتی ہے۔ کتے کی دُم کی مثال عموماً ٹیڑھے اور ہٹ دھرم لوگوں کے لیے دی جاتی ہے

لیکن یہ دُم بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ نمبر ایک، وہ دُم جسے سو سال تک شیشے کی نلکی میں ڈال کر رکھا جائے اور نکالنے پر وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہے۔ نمبر دو، وہ دُم جسے سو سال تک شیشے کی نلکی میں ڈال کر رکھا جائے اور اس دوران میں وہ نلکی کو بھی ٹیڑھا کر دے۔ جابر آخر الذکر کتے کی دُم تھا۔

جب انیس سو اسّی کا سال بھی پر لگا کر اڑنے لگا اور شرم وحیا جابر کو چھو کر نہ گزری تو ناصر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اکیس نومبر انیس سو اسّی کی شام اس نے جابر کو فون کیا۔ اس وقت وہ خاصے جارحانہ موڈ میں تھا۔

''ہیلو......!'' جابر نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''کیا میری غلطی یہی ہے کہ میں نے تم پر اعتبار کر کے آبائی گھر کو تمہارے نام پر رجسٹر ہونے دیا۔'' ناصر نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''تم صاحب حیثیت ہو، تمہارا بزنس ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے پھر میرے دو لاکھ روپے دینے میں حیل و حجت کیوں؟ ساڑھے تین سال سے زیادہ وقت گزر گیا مگر تم عجیب بے حسی کا مظاہرہ کر رہے ہو...... آخر کیوں؟''

''میں نے پیسے دینے سے انکار تو نہیں کیا......!'' جابر نے کہا۔

ناصر جھلا کر بولا۔ ''انکار نہیں کیا لیکن دے بھی نہیں رہے ہو......''

''بہت جلد میں......'' جابر نے کچھ کہنا چاہا۔

''بس، بس......!'' ناصر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت ہو گیا تمہارا یہ ''بہت جلد''...... میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ میں نے جنوری میں نازیہ اور شازیہ کی شادی کی تاریخ پکی کرنا ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ مجھے پیسوں کی کس قدر ضرورت ہے۔''

''بس، آخری وعدہ......'' جابر نے مکاری سے کہا۔ ''میں جنوری سے پہلے تمہارے دو لاکھ ادا کر دوں گا۔''

''میں جنوری تک تمہارا انتظار نہیں کر سکتا۔'' ناصر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''مجھے بہت ساری تیاریاں کرنا ہیں جس کے لیے قدم قدم پر پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں کل شام میں چھ بجے تمہارے آفس آ رہا ہوں۔ دو لاکھ کا بندوبست کر کے رکھنا۔ میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔''

''اوکے...... تم آجاؤ۔'' جابر نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں۔''

''کوشش محض نہیں۔'' ناصر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ہر صورت میں یہ کام کرنا ہے۔''

''دیکھتا ہوں......'' جابر نے گول مول جواب دیا۔

ناصر نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں ریسیور کریڈل کر دیا۔

آئندہ روز یعنی بائیس نومبر کی شام جابر کے آفس پہنچ کر ناصر کو کس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لیے آپ کو عدالتی کارروائی تک انتظار کرنا ہوگا۔ ہاں، یہ بتاتا چلوں کہ پچیس نومبر کی سہ پہر میں نے نازیہ اور شازیہ کو تسلی دے کر اپنے دفتر سے رخصت کر دیا تھا اور...... اسی روز دفتر سے واپسی پر میں نے متعلقہ تھانے جا کر ملزم ناصر حسین سے ملاقات بھی کر لی تھی جس سے مجھے کافی مفید معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ چارج شیٹ یعنی مقدمے کے چالان کو خاصا بھاری بھرکم بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواستِ ضمانت بھی عدالت میں دائر کر دی تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی کئی بار بتایا جا چکا ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے۔ میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے لیے بھرپور کوشش کی مگر مجھے اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ ملزم ناصر حسین پولیس کسٹڈی سے نکل کر جیل کسٹڈی میں چلا گیا۔ جب تک اس کیس کا فیصلہ نہ ہو جاتا، اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل ہی میں رہنا تھا۔

اُس پیشی پر میری کلیم انصاری سے بھی ملاقات ہوئی اور دونوں بہنیں نازیہ وشازیہ بھی عدالت میں موجود تھیں۔ وہ کلیم انصاری کے ساتھ ہی عدالت آئی تھیں۔ ان کی امید بھری نظریں مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں۔

''بیگ صاحب! آپ نے کیس کی اچھی طرح اسٹڈی کر لی ہے۔'' کلیم انصاری نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے۔ کیا اس کیس میں جان ہے؟''

''انصاری صاحب! جس طرح ایک ڈاکٹر اس وقت تک مریض کا علاج جاری رکھتا ہے جب تک مریض کی نبض چل رہی ہوتی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہمارا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ہم بھی کسی کیس سے تب تک ہاتھ نہیں کھینچتے جب تک اس کے اندر سے امید کی ایک کرن بھی پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ باقی جہاں تک ناصر حسین کے کیس کی بات ہے تو میں اس حوالے سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ اس کیس کی نبض بھی چل رہی ہے اور یہ بڑی

ہموار سانس بھی لے رہا ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بالآخر جیت ہماری ہی ہوگی۔''

''زبردست!'' اس نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔''میں آپ سے اسی قسم کی توقع رکھتا ہوں بیگ صاحب!''

میرے پُراعتماد اور تشفی بخش انداز نے نازیہ اور شازیہ کے چہروں کو دمکا دیا تھا۔

اسی وقت ناصر حسین ایک کانسٹیبل کے ہمراہ جیل وین کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ کلیم انصاری نے اضطراری انداز میں کہا۔

''بیگ صاحب! میں اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے ذرا اس پولیس والے کو رام کرتا ہوں تا کہ ان بچیوں کو اپنے باپ سے چند منٹ بات کرنے کا موقع مل سکے۔ آپ سے میں بعد میں آفس آ کر ملتا ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ کلیم انصاری جیل وین کی جانب بڑھا تو میں نے دوسری عدالت کا رخ کیا جہاں تھوڑی دیر بعد میرے ایک کیس کی سماعت شروع ہونے والی تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے کچھ ذکر پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ہو جائے۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق مقتول جابر حسین کی موت بائیس نومبر انیس سو اسّی کی شام چھ اور آٹھ بجے کے درمیان اس کے اپارٹمنٹ واقع گلشن اقبال میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر مردہ حالت میں پڑا پایا گیا تھا۔ مقتول کی لاش کو سب سے پہلے اس کی بیوی فریدہ نے دیکھا تھا اور اسی نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔

مقتول کے جسمانی معائنے سے پتا چلا تھا کہ اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مقتول کی گردن پر کسی طاقتور شخص کی انگلیوں کے نشانات بڑے واضح طور پر ملے تھے۔ کوئی ایسا شخص جس کے ہاتھ نارمل سائز سے بڑے ہوں۔ استغاثہ کے مطابق ملزم ناصر حسین نے گلا گھونٹ کر اپنے چھوٹے بھائی جابر حسین کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

میڈیکولیگل آفیسر کی رپورٹ میں مقتول کی موت کا سبب اچانک دماغ کا بے جان ہو جانا لکھا ہوا تھا۔ مقتول کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں اس کا دماغ مردہ ہو گیا تھا یعنی دماغ نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ ایسا عموماً اس صورت میں ہوتا ہے جب دماغ کو آکسیجن کی سپلائی مکمل طور پر روک دی جائے۔ استغاثہ کا دعویٰ تھا کہ یہ مقتول کا گلا گھونٹنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ سانس کی آمد و شد منقطع ہوتے ہی مقتول کی موت واقع ہو گئی تھی۔

اسی رپورٹ کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ مُردہ جابر حسین کے جسم میں گلوکوز کی مقدار نہایت ہی کم پائی گئی تھی یعنی اس کا بلڈ گلوکوز لیول خطرناک حد تک گرا ہوا تھا۔ اس نوعیت کی صورتِ حال میں بھی انسان یا تو گہری بے ہوشی کی حالت میں چلا جاتا ہے یا کوما میں اور یا پھر اس کی فوری موت واقع ہو جاتی ہے۔

آئندہ پیشی سے پہلے میں نے کلیم انصاری سے ایک بھرپور ملاقات کی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے کہا۔

''انصاری صاحب! ایک اخبار کا ایڈیٹر اینڈ پبلشر ہونے کے ناتے آپ وسیع اثر رسوخ کے مالک ہیں۔ اس کیس کے سلسلے میں مجھے آپ کی مدد بھی درکار ہوگی۔''

''ترکِ مُوالات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بیگ صاحب!'' وہ خاصے توانا لہجے میں بولا۔''آپ جو چاہیں گے وہ ہو جائے گا۔ جائز اور ناجائز کی تخصیص کے بغیر......''

''میں ناجائز کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''میں آپ کا مثبت تعاون ہی چاہوں گا مگر ایک دو پیشی کے بعد جب اس کیس کی کوئی باقاعدہ شکل نکل آئے گی۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ بڑی رسان سے بولا۔''آپ کو جب جب بھی میری ضرورت ہوگی، میں حاضر ہوں۔''

''شکریہ!'' میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ''نازیہ اور شازیہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''آئندہ سال جنوری میں ناصر اپنی دونوں بچیوں کی شادی کا خواہاں تھا مگر اب تو جو بھی ہونا ہے، اس کیس کے فیصلے کے بعد ہی ہوگا۔'' اس نے جواب دیا، پھر اُلجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔''آپ کس حوالے سے پوچھ رہے ہیں؟''

''ان کی سیفٹی اینڈ سیکیورٹی کے حوالے سے......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''اب انہیں اپنے باپ کا ساتھ میسر نہیں ہے۔ کیا حیدری والا وہ اپارٹمنٹ ان کے لیے سیف ہے؟''

''وہ اپارٹمنٹ ایک دم مامون ہے۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔''میں وہاں ناصر سے ملنے جاتا رہتا ہوں اور اس کے آس پڑوس سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ سب بہت زیادہ مہذب اور خیال رکھنے والے لوگ ہیں۔ میرے حساب سے نازیہ اور شازیہ کے لیے وہ اپارٹمنٹ ایک پُرامن جائے پناہ ہے۔''

''یہ اچھی بات ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے

انداز میں کہا۔ ”مجھے ان دونوں بہنوں کی بڑی فکر تھی۔ بیٹھے بٹھائے مشکل میں آگئی ہیں۔“

”بیگ صاحب! انسان کے نصیب میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ ہر حال میں اسے بھگتنا پڑتا ہے۔“ کلیم انصاری نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

”جو لوگ اپنی قسمت پر صابر وشاکر رہتے ہیں اور درست سمت میں اپنا سفر جاری رکھتے ہیں، فوز ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔“

”میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں انصاری صاحب......!“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔

”کامیابی اور فتح کے حصول کے لیے جان توڑ کوشش کرنا پڑتی ہے۔ جو لوگ آج آپ کو کسی فوقانی مقام پر فائز دکھائی دیتے ہیں، اگر ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ پانے کے لیے انسان کو بہت کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ مقصد کا حصول قربانی مانگتا ہے اور یہ قربانی کسی بھی نوعیت کی ہو سکتی ہے۔ مال...... وقت...... جذبات...... صحت...... عزت اور...... جان کی قربانی!“

کلیم انصاری مجھے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلانے کے بعد رخصت ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ناصر حسین کے معاملے کو لے کر کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو رہا تھا۔ یہ ناصر سے اس کی دوستی کا اعجاز تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ناصر جلد از جلد اس جھمیلے سے باعزت بری ہو جائے اور میں بھی ظاہر ہے اسی امر کے لیے کوشاں تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ذیل میں ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا۔ مقتول جابر حسین کے بائیں بازو کے بالائی حصے پر انجکشن کا ایک نشان بھی دیکھنے کو ملا تھا جس پر ورم بھی موجود تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتول نے اپنے مذکورہ بازو میں کوئی انٹرا مسکولر (Intra Muscular) انجکشن لگوایا تھا۔

میڈیکولیگل آفیسر کی جاری کردہ رپورٹ میں مقتول کے بازو پر انجکشن کا نشان نظر آنے کا کوئی ذکر موجود نہیں تھا۔ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ڈاکٹر اس کا ذکر کرنا بھول گیا تھا یا اس نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی......!

☆☆☆

کیس کی باقاعدہ سماعت میں دو ماہ لگ گئے۔ یوں سمجھ لیں کہ صحیح معنوں میں ماہ جنوری میں یہ مقدمہ پٹری پر آ گیا تھا۔ اس روز میں پوری تیاری کے ساتھ عدالت پہنچا تھا۔ منصف نے اپنی کرسی سنبھالی تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔

حسب دستور جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اُس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ عدالت میں دیے گئے ملزم کے بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میں نے اپنے مؤکل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے کس بات کا ذکر کرنا ہے اور کس معاملے کو یکسر نظر انداز کر دینا ہے۔ ناصر حسین نے میری ہدایات پر من وعن عمل کیا تھا۔ وہ ایک سمجھ دار اور بالغ النظر شخص تھا۔ اگر آپ کا مؤکل معقول اور متعاون ہو تو کام میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

جب ملزم کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا اور بڑے جارحانہ انداز میں سوال وجواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔ وکیل استغاثہ عدالت کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ملزم اپنے چھوٹے بھائی کے لیے دل میں عناد اور بغض رکھتا تھا۔ وہ مقتول کی دن دگنی اور رات چوگنی ترقی سے جلتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے مقتول پر دباؤ ڈالتا رہتا تھا۔ دو لاکھ روپے والی کہانی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ملزم نے بڑے تحمل سے وکیل استغاثہ کے ہر سوال کا جواب دیا مگر جب دو لاکھ روپے والے معاملے کو وکیل مخالف نے بوگس قرار دے دیا تو ملزم کی آواز میں آپوں آپ ترشی گھل گئی۔

”یہ ایک حقیقت ہے کہ جابر کی طرف میرے دو لاکھ روپے نکلتے تھے۔“ ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر جابر کی مالی حالت دگرگوں ہوتی تو میں اپنی اشد ضرورت کے باوجود بھی اس سے اپنی رقم کا مطالبہ نہ کرتا لیکن جب وہ لاکھوں اور کروڑوں میں کھیل رہا تھا تو میں اپنی رقم مانگنے کا حق رکھتا تھا۔ جنوری میں، میں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کا پروگرام بنایا تھا اور اسی مقصد کے لیے مجھے پیسوں کی ضرورت تھی......“

بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔ جنوری کا مہینا شروع ہو چکا تھا اور وہ ملزموں والے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ بیٹیوں کی شادی کے فرض سے سبکدوشی تو رہی ایک طرف، وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ قتل کے الزام سے وہ کب تک بری ہو جائے گا۔

”کیا تم معزز عدالت کو بتا سکتے ہو کہ تم نے مقتول سے کس مد میں دو لاکھ روپے لینا تھے؟“ وکیلِ استغاثہ نے

چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
میرے مؤکل نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ناظم آباد والے آبائی گھر کے بٹوارے کا احوال سنایا اور کہا۔ ''لگ بھگ چار ماہ کا عرصہ گزر گیا لیکن جابر نے میری رقم واپس نہیں کی تھی۔ میں جب بھی رقم کا ذکر کرتا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ بالآخر وقوعہ کے روز میں اپنی رقم کی وصولی کے لیے اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔''
''تم بار بار جن دو لاکھ روپوں کا تذکرہ کر رہے ہو، ان کا کوئی ثبوت بھی ہے تمہارے پاس؟''
''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' ملزم نے الجھن زدہ نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ ''آپ کس ثبوت کی بات کر رہے ہیں......؟''
''کوئی ایسا شخص بطور گواہ جس کے سامنے مقتول نے تمہیں چھ لاکھ روپے دینے کے بعد یہ وعدہ کیا ہو کہ باقی کے دو لاکھ وہ بعد میں تمہیں دے گا؟'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہریلے انداز میں استفسار کیا۔ ''یا تم دونوں بھائیوں کے درمیان کوئی ایسی تحریر تیار کی گئی ہو جس سے ثابت ہوتا ہو کہ مقتول نے تمہارے دو لاکھ روپے دینا تھے؟''
''میں نے ایسی کوئی دستاویز بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔'' ملزم نے برہمی بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے جابر پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر لیا تھا لیکن اس نے میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ مجھے جابر سے ایسی توقع نہیں تھی......''
''کون شرافت کا پیکر ہے اور کون فتنہ پرداز، اس کا فیصلہ تو معزز عدالت نے کرنا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے ملزم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تم صرف اتنا بتاؤ کہ تم نے آنکھیں بند کر کے اس وقت مقتول پر بھروسا کیوں نہیں کر لیا تھا جب پیپر مارکیٹ والی دکان کا معاملہ سامنے آیا تھا؟ مقتول اس دکان سے دستبردار ہونے کا اعلان کر چکا تھا مگر تم نے اس کی زبانی کلامی باتوں پر یقین نہیں کیا تھا اور اس وقت تک تم نے اس کی جان نہیں چھوڑی جب تک مذکورہ دکان سے دستبرداری کا لیگل ڈاکیومنٹ تیار نہیں ہو گیا۔ کیا تمہارا بھروسا صرف تمہیں ہی فائدہ پہنچاتا ہے......؟''
''ہم بھائیوں کے بیچ ہونے والی یہ معاملہ داری آپ تک کیسے پہنچی؟'' ملزم نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''آپ کی بھابی فریدہ کے توسط سے۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''فریدہ صاحبہ کا نام استغاثہ کے گواہان کی فہرست میں شامل ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مقتول نے تمہیں چھ نہیں بلکہ پورے آٹھ لاکھ روپے ادا کر دیے تھے۔ اُس نے نہیں بلکہ تم نے اس کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور کمال ڈھٹائی کے ساتھ گاہے بگاہے تم مقتول سے دو لاکھ کا مطالبہ کرتے رہے۔ تنگ آ کر مقتول نے تمہیں اپنے گھر پر بلا لیا تاکہ تمہارے ساتھ فائنل بات کر سکے۔ اُس معصوم شخص نے تو تمہیں دو لاکھ روپے دینے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا، یہ سوچتے ہوئے کہ یہ رقم اس کی بھتیجیوں کی شادی میں خرچ ہو جائے گی مگر تم نے اس نیک دل انسان کا خون کر ڈالا اور دو لاکھ روپے لے کر چلتے بنے۔ اس سے بڑی خود غرضی کی اور کیا مثال ہو گی......!''
''یہ جھوٹ ہے...... مجھ پر الزام ہے......'' ملزم نے غصیلے لہجے میں بہ آوازِ بلند کہا۔ ''مجھے جابر کے قتل کے الزام میں پھانسنے کے لیے بڑی گہری سازش بنی گئی ہے۔ وقوعہ کی شام تو جابر مجھے آفس میں ملا تھا اور نہ ہی گھر پر......!''
''چلّاؤ مت......'' وکیل استغاثہ نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ کمرائے عدالت ہے، تمہارے گھر کا ڈرائنگ روم نہیں۔''
''میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا......'' ملزم نے سینہ تان کر کہا۔ ''اور سچ کی آواز کو دبایا نہیں جا سکتا۔''
''یہ مت بھولو کہ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ تم نے نہیں، معزز عدالت نے کرنا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''جب مقتول کی بیوہ اس عدالت میں حاضر ہو گی تو تمہارے خود ساختہ سچ کی آواز ہوا میں تحلیل ہو جائے گی۔ وہ پچھلے پانچ سال سے مقتول کی زندگی میں شامل رہی ہے۔ وہ تم دونوں بھائیوں کو اچھی طرح جانتی ہے۔ جب وہ بیان دے گی تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ نظر آنے لگے گا......''
جابر اور فریدہ نے اگست انیس سو ستتر میں شادی کی تھی لیکن یہ بات ناصر کے علم میں آ چکی تھی کہ جابر شادی سے ایک سال پہلے سے فریدہ کو جانتا تھا اور ان میں باقاعدہ میل ملاقات بھی تھی۔
یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں ناصر کے ذہن سے گزرے اور اس نے آواز کا والیوم بدستور ہائی رکھتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔
''جو ہو گا، دیکھا جائے گا......!''
عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ملزم اکیوزڈ باکس

میں گردن جھکائے چپ چاپ کھڑا رہتا ہے۔ اس حوالے سے ناصر حسین نے خاصی ہمت دکھا ڈالی تھی جس پر کرسیِ انصاف پر براجمان شخص کو اپنا حق استعمال کرنا پڑا۔

''آرڈر ان مائی کورٹ پلیز.....'' جج نے چوبی ہتھوڑے کی ضربات لگاتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''آرڈر.....آرڈر.....!''

''سوری سر.....!'' ناصر حسین نے مسکین سی شکل بنا کر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب!'' جج نے وکیلِ سرکار کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ ملزم سے اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں اضافہ کیا۔ ''یور ٹرن پلیز.....!''

میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد ایکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا اور اپنے موکل یعنی اس کیس کے ملزم ناصر حسین کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

''مسٹر ناصر! مقتول سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟''

''فروری، انیس سو ستتر میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی جب تم دونوں بھائیوں کے بیچ آبائی گھر کا بٹوارا ہوا تھا؟''

''جی بالکل.....'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بعد فون پر بات ہوتی تھی، وہ بھی جب میں اپنے پیسوں کے لیے فون کروں تو، اور..... وہ ہر بار مجھے ایک نئی لولی پاپ دے کر ٹرخا دیا کرتا تھا۔ اس نے میرے دو لاکھ دینے سے کبھی انکار نہیں کیا تھا مگر دیے بھی نہیں۔ کاش! میں جابر کی فون کالز کو کسی طرح ٹیپ کر لیتا۔ اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا کہ وہ میرا دو لاکھ کا دین دار ہے۔ اس وقت استغاثہ نے مجھ پر جو مقدمہ ٹھوک رکھا ہے، اس میں میری دو لاکھ کی رقم کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ہے.....!''

''انسان کی یہ مجبوری ہے کہ قدرت نے اسے آنے والے وقت سے بے خبر رکھا ہوا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ''فون پر آپ کی اپنے چھوٹے بھائی سے آخری بار کب بات ہوئی تھی.....؟''

''وقوعہ سے ایک روز پہلے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے اکیس نومبر انیس سو اسّی بروز جمعہ اسے فون کر کے بتایا تھا کہ میں کل یعنی بائیس نومبر شام چھ بجے اس کے آفس آرہا ہوں، وہ رقم کا انتظام کر کے رکھے، میں خالی ہاتھ واپس نہیں جاؤں گا۔''

''مقتول نے کیا جواب دیا تھا؟''

''اس نے ''اوکے'' کا سگنل دیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''پھر.....؟''

''میں بائیس نومبر کی شام ٹھیک چھ بجے جابر کے آفس پہنچ گیا تھا۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''لیکن جابر اپنے آفس میں موجود نہیں تھا۔ وہاں پر جابر کے اسسٹنٹ نواز علی سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ نواز علی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جابر کے لیے کام کرتا ہے۔ جب میں نے اس سے جابر کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے جواب دیا جابر تھوڑی دیر پہلے ہی گھر چلا گیا ہے.....''

''اس صورتِ حال میں آپ نے کیا فیصلہ لیا تھا؟''

''میں اپنی رقم وصول کیے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے نواز علی سے جابر کے اپارٹمنٹ کا ایڈریس سمجھا جو اس کے آفس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے جابر کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔''

''تو کیا جابر یعنی مقتول اپنے اپارٹمنٹ میں موجود تھا.....؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''آپ کی اس سے ملاقات ہوئی؟''

''نہیں!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''میرے ڈور بیل بجانے پر ایک ملازمہ صورت عورت دروازے پر آئی اور سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں جابر کا بڑا بھائی ناصر ہوں اور اس سے ملنے آیا ہوں۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر دروازہ بند کر کے اندر غائب ہو گئی۔ اس کی واپسی لگ بھگ ایک منٹ بعد ہوئی اور اس نے مجھے اندر آنے کو کہا۔ میں اس کی معیت میں اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ ملازمہ نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ایک مرتبہ پھر غائب ہو گئی۔ اب کی بار وہ کم و بیش چار منٹ کے بعد لوٹی اور وہ بھی ایک ٹرے کے ساتھ جس میں دو کپ چائے اور ایک بسکٹس والی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔ ملازمہ نے چائے کو سینٹر ٹیبل پر سجا دیا اور قبل اس کے کہ میں اس سے جابر کے بارے میں کوئی سوال کرتا، وہ ڈرائنگ روم سے جا چکی تھی.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں یہی سمجھا کہ ملازمہ نے جابر کو میری آمد کے بارے میں بتادیا ہے اور اسی کے کہنے پر ملازمہ نے مجھے چائے پانی کا پوچھا ہے۔ چائے کے دو کپ اور پانی کے دو گلاس کا سیدھا سادہ مطلب یہی تھا کہ میرے علاوہ بھی کسی نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے پانی سے شغل کرنا تھا اور یقیناً وہ ''کسی'' جابر ہی ہوسکتا تھا لیکن میں اس کے انتظار میں بیٹھا سوکھتا رہا۔ اس وقت مجھے پیاس بھی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی گیا۔ چائے کو ٹھنڈا ہوتے پایا تو مجھے یہ رزق کی ناقدری بلکہ بے حرمتی محسوس ہوئی۔ چنانچہ آئندہ پانچ منٹ میں چائے اور چند بسکٹس بھی میرے معدے میں اتر چکے تھے......''

''اور جابر؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔

''جابر کا کوئی اتا پتا نہیں تھا......!'' وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

''کیا اس وقت جابر کی بیوی فریدہ گھر پر موجود نہیں تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے تو دکھائی نہیں دی تھی......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''بلکہ مجھے تو اس بات کا بھی یقین نہیں کہ جابر بھی گھر میں تھا یا نہیں۔ ملازمہ کے سوا مجھے اس اپارٹمنٹ میں کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا تھا۔ پھر وہ ملازمہ بھی اچانک کہیں غائب ہوگئی تھی......''

''کیا مطلب......؟'' میں نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔ ''ملازمہ کہاں چلی گئی تھی......؟''

''مجھے کیا معلوم!'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''چائے ختم کرنے کے بعد مجھ پر ایک وحشت سی سوار ہوگئی تھی۔ جابر یا اس کی بیوی سے تو ملاقات ہو نہیں سکی تھی۔ میں نے ملازمہ کی تلاش میں کچن میں جھانکا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سوائے میرے اس گھر میں اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس احساس نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا کہ مجھے فوراً وہاں سے نکل جانا چاہیے، مبادا کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ اس خطرناک خیال کے ساتھ ہی میں وہاں سے چلا آیا تھا۔''

''آپ کی چھٹی حس کو کسی ٹانک کی اشد ضرورت ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس کی بیٹری لو ہوچکی ہے جس کی وجہ سے سگنلز کافی ویک ہیں، اسی لیے اس نے آپ کو خاصی تاخیر سے خبردار کیا تھا۔ اس دوران میں آپ اس اپارٹمنٹ میں اپنی آمد کو رجسٹر کرچکے تھے۔ چائے کے کپ، پانی کے گلاس، بسکٹس والی پلیٹ، صوفے کے ہتھوں اور دیگر کئی مقامات پر آپ کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ آپ مقتول کے اپارٹمنٹ پر گئے تھے اور آپ نے اس کے ڈرائنگ روم میں کچھ وقت گزارا تھا......''

''یہ تو ایک حقیقت ہے......'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟''

''پریشانی والی بات یہ ہے کہ وقوعہ کے روز آپ کی مقتول سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی لیکن استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ اس شام آپ مقتول سے ملے تھے۔ آپ نے مقتول سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا تو اس نے دوٹوک الفاظ میں آپ سے کہا کہ اس کی طرف آپ کی کوئی رقم نہیں ہے لیکن آپ کی بیٹیوں کی شادی کے لیے دو لاکھ روپے بہ طور مدد آپ کو دینے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دو لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ بھی آپ کے سامنے میز پر رکھ دیے تھے۔ اس کی بات سن کر آپ آگ بگولا ہوگئے اور آپ نے طیش کے عالم میں کہا کہ آپ وہاں اپنی رقم لینے آئے ہیں، بھیک یا خیرات اٹھانے نہیں۔ پھر آپ دونوں بھائیوں میں شدید نوعیت کی تلخ کلامی ہوئی جس کے نتیجے میں آپ نے جذبات سے بے قابو ہوکر مقتول کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور دو لاکھ روپے اٹھا کر اپارٹمنٹ سے نکل گئے......!'' سانس ہموار کرنے کے لیے میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کی چھٹی حس پوری توانائی کے ساتھ کام کررہی ہوتی تو اس امر کی تصدیق کیے بغیر آپ کو اس اپارٹمنٹ میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے تھا کہ اس وقت جابر گھر میں موجود ہے یا نہیں......!''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب......'' وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔ ''واقعی مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔''

''انسان غلطیوں ہی سے سیکھتا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز آپ مقتول کے اپارٹمنٹ سے کتنے بجے نکل گئے تھے؟''

''لگ بھگ سات بجے شام۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جائے وقوعہ پر کم و بیش تیس منٹ تک موجود رہے تھے؟''

''جی ہاں......'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''آپ نے اپنی زندگی کے چوالیس، پینتالیس سال مقتول کے ساتھ گزارے ہیں، یعنی مقتول کی پیدائش انیس

سو بتیس سے لے کر بٹوارے یعنی انیس سو ستر تک......؟''
میں نے ملزم کے چہرے پر نگاہ جما کر پوچھا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ مقتول کی صحت اس دوران میں کیسی رہی تھی؟''
''دیکھیں جناب! نزلہ، زکام، کھانسی، بخار تو کسی گنتی میں نہیں آتے۔'' وہ رسان بھرے لہجے میں بولا۔ ''باقی میں نے کبھی جابر کو کسی سنجیدہ بیماری میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاں، البتہ یہ ضرور ہے کہ جابر کا بلڈ گلوکوز لیول ہمیشہ کم ہی رہتا تھا جس کو کور کرنے کے لیے وہ میٹھی چیزوں کا زیادہ استعمال کیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے چند علامات رٹوا دی تھیں اور ہدایت کی تھی کہ اگر ان میں سے کوئی علامت نمودار ہو تو وہ تھوڑا میٹھا کھا لیا کرے۔ اللہ اللہ، خیر سلا......!''

میں نے دو چار ضمنی سوالات پوچھنے کے بعد اپنے مؤکل کو فارغ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اگلے روز میں نے کلیم انصاری سے ایک اور ملاقات کی اور اس سے درخواست کی کہ وہ مقتول کی بیوہ فریدہ، مقتول کے اسسٹنٹ نواز علی، گھریلو ملازمہ سلمیٰ اور دیگر چند افراد کے بارے میں مجھے میری مطلوبہ معلومات فراہم کرے۔ اس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

بیچ میں وقت نکال کر میں اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے بھی جا کر ملا اور اس سے میڈیکل کی دنیا کے چند شعبوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ یہ ساری بھاگ دوڑ میں اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کر رہا تھا اور یہ میری ہمیشہ سے عادت رہی ہے۔ میں عدالت اور آفس کے علاوہ فیلڈ ورک پر بھی دھیان دیتا ہوں۔ اس سے ایک طرف مجھے اپنے کیس کے حوالے سے مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اور دوسری جانب ''حرکت میں برکت'' کے طفیل جسم چاق و چوبند اور دماغ تر و تازہ و چوکنا ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہان کا تذکرہ کروں گا جن کے بیانات میں کوئی اہم بات ہوگی۔ قبل اس کے کہ استغاثہ کا کوئی گواہ وٹنس باکس تک رسائی حاصل کرتا، میں نے جج سے ایک فرمائش کر دی۔

''جناب عالی!'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

کسی بھی تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ جج کے حکم پر ہمارے کیس کا آئی او (انکوائری آفیسر) گواہوں والے کٹہرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں وٹنس باکس کے نزدیک پہنچا اور تفتیشی افسر کے چہرے پر نگاہ جما کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ''سب انسپکٹر جاوید احمد صاحب! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''
''اللہ کا کرم ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔
''اس اندوہ ناک واقعے کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟'' میں نے سوالات کا سلسلہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''اور کتنے بجے......؟''
''مقتول کی اہلیہ فریدہ صاحبہ نے تھانے فون کر کے اپنے شوہر کی موت کی اطلاع دی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''ہمارے روزنامچے کے مطابق یہ اطلاع بائیس نومبر کی رات آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر دی گئی تھی۔''
''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''
''ساڑھے آٹھ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مقتول کا اپارٹمنٹ تھانے کے بہت نزدیک ہے اس لیے ہمیں وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔''
''جب آپ مقتول کے اپارٹمنٹ پر پہنچے تو وہاں کتنے افراد موجود تھے؟''
''صرف مقتول کی بیوی یا پھر...... خود مقتول، ایک لاش کی صورت میں...... ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر موجود تھا۔''
''اور گھریلو ملازمہ سلمیٰ؟''
''میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا۔''
''آپ نے جائے وقوعہ پر کیا دیکھا تھا؟''
''جیسا کہ میں نے بتایا، مقتول ایک صوفے پر مردہ حالت میں پڑا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''سینٹر ٹیبل پر چائے کے برتن اور پانی کے دو گلاس رکھے تھے جن میں سے ایک کپ اور گلاس پر مقتول کی انگلیوں کے نشانات اور ایک کپ اور گلاس پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وقوعہ سے چند منٹ پہلے مقتول اور ملزم نے آمنے سامنے بیٹھ کر چائے پی تھی۔ اس کے علاوہ بھی صوفے کے ہتھوں اور ڈرائنگ روم کے مختلف مقامات سے بھی ہم نے ملزم کے فنگر پرنٹس اٹھائے تھے۔''
''اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ وقوعہ کی شام میرے مؤکل نے ساڑھے چھ بجے سے سات بجے تک کا وقت مقتول کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گزارا تھا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس دوران میں اس نے چائے بسکٹس بھی اڑائے اور پانی بھی پیا تھا لہٰذا برتنوں اور صوفے وغیرہ پر اس کے فنگر پرنٹس کا ملنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں، البتہ...... '' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے کرائم سین (جائے وقوعہ) کے سلسلے میں جو رپورٹ تیار کی ہے، اس میں بہت سی چیزیں ناقابلِ ہضم بلکہ ناقابلِ فہم ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قتل کی اس واردات کے وقت آپ جائے وقوعہ پر موجود تھے۔ آپ نے مقتول کے ڈرائنگ روم میں کہیں کھڑے ہو کر مقتول کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ آپ کی رپورٹ انتہائی غیر منطقی ہے۔ یہ رپورٹ کم اور آنکھوں دیکھا احوال زیادہ محسوس ہوتا ہے......!''

''مثلاً...... وہ خاصے کڑوے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو میری کس بات یعنی میری رپورٹ کے کس حصے سے ایسا لگا ہے؟''

''میں زیادہ تفصیل میں جا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔'' میں نے زیرِ سماعت مقدمے کے چالان کی کاپی پر نظر دوڑاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''چند موٹی موٹی باتیں بتا رہا ہوں۔ توجہ سے سنیے گا......'' میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ''آپ کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق مقتول نے ملزم کا ٹیڈی پیسا بھی نہیں دینا تھا لیکن اس نے روز روز کی کِل کِل سے نجات پانے کے لیے ملزم کو دو لاکھ دینے کا فیصلہ کر لیا کہ چلو بھتیجیوں کی شادی کے سلسلے میں بھائی کی مدد ہو جائے گی۔ مقتول نے وقوعہ کی شام ملزم کو اپنے اپارٹمنٹ پر بلا لیا اور دو لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ اس کے حوالے کر دیے۔ ملزم نے مقتول کی امداد لینے سے صاف انکار کر دیا اور اوپر سے اسے خوب کھری کھری بھی سنا دیں۔ دونوں بھائیوں میں تلخ کلامی عروج کو پہنچ گئی جس کے نتیجے میں ملزم کو اپنے غصے پر کنٹرول نہ رہا اور اس نے طیش کے عالم میں مقتول کا گلا گھونٹ ڈالا اور دو لاکھ کی رقم اٹھا کر وہ اپارٹمنٹ سے چلا گیا۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر آپ جائے واردات پر موجود نہیں تھے تو آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس روز دونوں بھائیوں کے درمیان کیا مکالمت ہوئی تھی؟''

''لگتا ہے آپ نے میری رپورٹ کو آنکھیں بند کر کے پڑھا ہے۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

میں نے اس کے بھونڈے مذاق پر کوئی سخت قسم کا ردعمل دینے کے بجائے نہایت ہی سادگی سے کہا۔ ''آئی او صاحب! آپ کا اندازہ صد فیصد درست ہے۔ میں نے آپ کی مرتب کردہ رپورٹ کو سوتے میں پڑھا تھا اور ظاہر ہے، سوتے وقت انسان کی آنکھیں بند ہی ہوتی ہیں لیکن......'' میں نے دانستہ تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات کو پورا کر دیا۔

''لیکن اس وقت میں کھلی آنکھوں اور بیدار مغز کے ساتھ آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ مجھے بتائیے یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ کیا آپ کو کسی قسم کی اِن پٹ ملتی ہے۔ میرا مطلب ہے وجدان ٹائپ کوئی شے یا پھر...... یہ سارا تکا لوجی کا اعجاز ہے؟''

''میں نے اپنی رپورٹ میں کوئی تکا نہیں لگایا اور نہ ہی میرے ساتھ ان پٹ جیسا کوئی الہامی معاملہ ہے......!'' وہ خفگی آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس کیس کے حوالے سے جو رپورٹ تیار کی ہے وہ صد فیصد مبنی بر حقائق ہے۔ باقی جہاں تک میری جائے وقوعہ پر موجودگی کی بات ہے تو......'' اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں ایک کانسٹیبل کے ہمراہ کرائم سین پر ساڑھے آٹھ بجے ہی پہنچا تھا اور اس وقت تک مقتول اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ میری آمد سے قبل وہاں کیا کیا کچھ ہوتا رہا اس کے بارے میں مجھے مقتول کی اہلیہ نے بتایا تھا۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتول کی موت کے وقت فریدہ صاحبہ اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے آئی او کو گھورا۔

''ہرگز نہیں!'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''وقوعہ کے وقت میری معلومات کے مطابق فریدہ صاحبہ اپنے اپارٹمنٹ پر موجود نہیں تھیں۔ وہ کم و بیش آٹھ بجے لوٹی تھیں اور انہوں نے ڈرائنگ روم کے صوفے پر مقتول کو مُردہ حالت میں پڑے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے تھانے فون کر کے اس سانحے کی اطلاع دی تھی۔ اب رہا آپ کے سوال کا جواب تو......'' وہ لمحے بھر کو رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''مقتول اور ملزم کی میٹنگ کے بارے میں فریدہ صاحبہ جانتی تھیں اسی لیے وہ دانستہ اپارٹمنٹ پر موجود نہیں رہی تھیں تاکہ دونوں بھائی کھل کر بات کر لیں۔ مجھے فریدہ صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ مقتول نے ملزم کو دو لاکھ روپے دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر ملزم کی فرضی رقم کی واپسی

کے ذیل میں نہیں بلکہ نازیہ اور شازیہ کی شادی کے اخراجات کی مد میں امداد کے طور پر۔ گھریلو ملازمہ سلمٰی اس امر کی گواہ ہے کہ وقوعہ کی شام ملزم ساڑھے چھ بجے مقتول سے ملنے اس کے گھر پہنچا تھا۔ سلمٰی نے اس کی آمد کے بارے میں مقتول کو اطلاع دی تھی اور مقتول کے حکم پر اس نے ملزم کو نہ صرف ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا تھا بلکہ چائے پانی اور بسکٹس سے اس کی تواضع بھی کی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اب آجائیں ذرا میری مرتب کردہ رپورٹ کی طرف......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''فریدہ صاحبہ کی فراہم کردہ معلومات سولہ آنے صحیح تھیں۔ واقعات و شواہد کے مطابق ملزم، مقتول سے ملنے اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا۔ چائے کی پیالیوں اور پانی کے گلاسوں پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس اس امر کا ثبوت ہیں کہ دونوں بھائیوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر چائے پی تھی۔ ظاہر ہے، اس دوران میں وہ خاموش نہیں بیٹھے ہوں گے۔ ان کے بیچ لازمی گفتگو بھی ہوئی ہوگی اور مقتول کی موت سے پتا چلتا ہے کہ ان کے درمیان خوشگوار بات چیت نہیں ہوئی ہوگی۔ دو لاکھ روپے کی عدم موجودگی کا بھی ایک ہی مطلب ہے کہ مذاکرات کی ناکامی کے نتیجے میں ملزم نے اپنے کنگ سائز ہاتھوں کی مدد سے مقتول کا گلا گھونٹ کر اسے فنا کے گھاٹ اتارا اور دو لاکھ روپے اٹھا کر اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ میری رپورٹ کا ایک ایک زاویہ مبنی بر منطق ہے۔ اس میں کہیں بھی تک بندی نہیں کی گئی......''

''میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں، جاوید صاحب......!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''مطلب...... آپ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کے مؤکل نے اپنے چھوٹے بھائی کی جان لی ہے......؟'' وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے ایسا کب کہا......؟''

''تو پھر ''مکمل اتفاق'' سے آپ کی کیا مراد ہے......؟'' اس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ نے فرمایا کہ آپ کی رپورٹ کا ایک ایک زاویہ مبنی بر منطق ہے۔ میں آپ کے اس بیان سے پوری طرح متفق ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کی چارج شیٹ مبنی بر حقیقت ہوتی۔ اس میں یا تو ملزم اور مقتول کی ملاقات کا ذکر ہی نہ ہوتا اور یا پھر اس تلخی بھری ملاقات کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی فراہم کیا جاتا۔ میری نظر میں یہ رپورٹ میرے مؤکل کے خلاف بنی گئی ایک گہری سازش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔''

''ملزم وقوعہ کی شام ساڑھے چھ بجے سے سات بجے تک مقتول کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا......''

''یس!'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''یہ ایک اٹل حقیقت ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔''

''دونوں بھائیوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر......''

''دونوں نے نہیں، صرف میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم ناصر حسین نے چائے پانی اور بسکٹس لیے تھے۔'' میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''وقوعہ کے روز ان دونوں بھائیوں کی آپس میں ملاقات ہی نہیں ہو پائی تھی۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب......'' وہ استہزائیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سینٹر ٹیبل پر دو چائے کے کپ اور دو پانی کے گلاس موجود تھے جن میں سے ایک کپ اور گلاس پر ملزم کے فنگر پرنٹس اور دوسرے کپ و گلاس پر مقتول کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے اور یہ صرف اسی صورت ممکن ہے جب دونوں بھائیوں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے پانی پیا ہو اور...... آپ کہہ رہے ہیں کہ وقوعہ کی شام ان کی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی!''

''اسے ممکن بنانے کی ایک اور بھی صورت ہے آئی او صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''کون سی صورت؟'' اس کے لہجے سے بے یقینی جھلکتی تھی۔

''ملزم کے جائے وقوعہ سے چلے جانے کے بعد کسی نے ڈرائنگ روم کی سینٹر ٹیبل پر ایک ایسا چائے کا کپ اور پانی کا گلاس رکھ دیا ہو جس پر پہلے سے مقتول کے فنگر پرنٹس موجود ہوں یا نظریۂ ضرورت کے تحت اسی وقت مذکورہ کپ اور گلاس پر مقتول کی انگلیوں کے نشانات ثبت کر دیے گئے ہوں تاکہ سند رہے اور بہ وقتِ ضرورت کام آئے......'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا اور آخر میں انکوائری آفیسر سے پوچھا۔ ''کیا ایسا ہونا ناممکنات میں ہے؟''

وہ میرے سوال کا سیدھا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ ہی سے مستفسر ہوا۔ ''مگر ایسا کون کرے گا؟ اس وقت جائے وقوعہ پر ملزم اور مقتول کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا......!''

''یہ استغاثہ کی تھیوری ہے جو میرے مؤکل کو قاتل ثابت کرنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے

میں کہا۔ ''میں اس تھیوری کو غلط ثابت کر دوں گا......''
''تو آپ کا دعویٰ ہے کہ وقوعہ کے وقت مقتول کے اپارٹمنٹ میں کوئی تیسرا شخص بھی موجود تھا......؟'' اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے گھورا۔
''یس!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اور اسی نامعلوم شخص نے مقتول کی جان لی تھی۔''
''لیکن مقتول کا گلا گھونٹنے والے شخص کے ہاتھ غیر معمولی طور پر بڑے تھے۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا، پھر ملزم کے ہاتھوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''آپ خود دیکھ لیں، اپنے مؤکل کے ہاتھوں کو......''
یہ ایک حقیقت ہے کہ ملزم ناصر حسین کے ہاتھ اور پاؤں نارمل سائز سے کافی بڑے تھے لیکن میں اتنی آسانی سے تفتیشی افسر کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔
''یہ بھی آپ کی تھیوری ہے کہ مقتول کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ وقت آنے پر میں اس تھیوری کی حقیقت بھی معزز عدالت کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔ فی الحال......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ دنیا میں صرف میرے مؤکل ہی کے ہاتھ غیر معمولی بڑے ہیں؟''
''نن...... نہیں۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''اور بھی کئی لوگوں کے ہو سکتے ہیں۔''
''پھر میرا مؤکل ہی قاتل کی پوسٹ کے لیے نامزد کیوں؟'' میں نے خاصے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔
''وہ اس لیے کہ وقوعہ کے وقت ملزم کے سوا بڑے ہاتھوں والا اور کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا......'' انکوائری آفیسر نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
''آر یو شیور؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''ہنڈریڈ اینڈ ون پرسنٹ۔''
''مزہ آنے والا ہے......'' میں نے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا کانفیڈنس اس کیس کو دلچسپ بنانے والا ہے۔''
اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ میرے ان الفاظ کو اپنی تعریف سمجھے یا تنقید۔ جب انسان ادھر اور ادھر کے بیچ لٹکا ہوا ہو تو پھر اس کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جن کے بارے میں اس نے سمجھا ہوتا ہے اور نہ ہی سوچا ہوتا ہے۔
''تو پھر آپ ہی بتا دیں......'' آئی او نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''اگر جائے وقوعہ پر بڑے ہاتھوں والا کوئی اور شخص موجود تھا تو یقیناً آپ اس کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہوں گے......؟''
''سچ بتاؤں......؟'' میں نے معصومیت بھرے انداز میں پوچھا۔
''ایک دم سچ۔'' وہ زور دے کر بولا۔
''میں اس بندے کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں جانتا......!''
''تو پھر آپ اتنے دعوے کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے مؤکل نے اپنے چھوٹے بھائی جابر حسین کو قتل نہیں کیا......؟'' وہ برہمی سے بولا۔ ''اگر آپ کا مؤکل قاتل نہیں تو پھر جابر حسین کا گلا کس نے گھونٹا تھا؟''
''آئی ایم رئیلی ویری سوری۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔
وہ تنک کر بولا۔ ''سوری کس بات کی؟''
''اس بات کی سوری کہ زیر سماعت کیس کے حوالے سے میں نے آپ سے کچھ زیادہ ہی گفتگو کر لی ہے جبکہ یہ حق تو پبلک پراسیکیوٹر کا تھا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں پبلک پراسیکیوٹر یعنی وکیل استغاثہ کی حق تلفی کو ایک گناہ عظیم خیال کرتا ہوں لہٰذا اب میں اس سلسلے میں آپ سے کچھ اور ڈسکس نہیں کروں گا۔ بس چلتے چلتے آپ سے میرا ایک آخری سوال ہے......''
وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''جی، پوچھیں!''
''مقتول کے بائیں بازو کے بالائی مسل میں ایک سوئی چبھنے جیسا نشان دیکھا گیا تھا......'' میں نے انکوائری آفیسر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''بالکل کسی انجکشن کی طرح کا اور مذکورہ نشان کے گرداگرد ہلکی سی سوجن بھی تھی......؟''
''جی بالکل۔ وہ نشان میں نے بھی دیکھا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ دراصل انجکشن ہی کا نشان تھا۔''
''آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ نشان انجکشن ہی کا تھا؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔
''کیا آپ معزز عدالت کو اپنی معلومات کے ذرائع سے آگاہ کریں گے؟''
''ضرور......!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''مجھے یہ بات مقتول کی بیوی فریدہ صاحبہ نے بتائی تھی۔''

"اوہ......!" میں نے ڈرامائی انداز میں ایک گہری سانس خارج کی، پھر کہا۔ "پھر تو آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ مقتول نے کس چیز کا انجکشن لیا تھا......؟"

"جی......فریدہ صاحبہ نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول کا بلڈ گلوکوز لیول اکثر خاصا کم رہتا ہے جس کے لیے وہ میٹھی چیزیں زیادہ استعمال کرتے تھے اور کبھی ہنگامی ضرورت کے تحت وہ گلوکوز کا انجکشن بھی لے لیا کرتے تھے۔" آئی او نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ "فریدہ صاحبہ نے مجھے اس بیماری کا کوئی نام بھی بتایا تھا جو اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے۔ فریدہ صاحبہ کا کہنا تھا کہ وقوعہ کے روز دن میں کسی وقت مقتول نے گلوکوز کا انجکشن لیا تھا۔"

"لو بلڈ شوگر یا لو بلڈ گلوکوز لیول سے انسانی بدن میں جو گڑبڑ پیدا ہوتی ہے، اس خرابی یا بیماری کو میڈیکل کی زبان میں ہائپوگلائی سیمیا کہا جاتا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن ہائپوگلائی سیمیا کے لیے انجکشن یا ڈرپ ہمیشہ انٹراوینس یعنی نس میں لگائی/لگایا جاتا ہے جبکہ مقتول کے بائیں بازو پر انٹرا مسکولر انجکشن کا نشان پایا گیا تھا اور نشان کے نزدیک دکھائی دینے والے ورم کا مطلب یہ ہوا کہ وہ انجکشن مقتول کی موت سے تھوڑی دیر پہلے ہی دیا گیا تھا۔ اگر وہ انجکشن صبح میں یا دن میں کسی وقت لگایا گیا ہوتا تو شام تک اس کی سوجن اتر چکی ہوتی۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟"

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے حیرت بھرے لہجے میں الٹا مجھ سے پوچھ لیا۔ "بیگ صاحب! آپ وکیل ہیں یا کوئی ڈاکٹر؟"

"میں ایک اہلِ حرفہ وکیل ہوں لیکن اپنے کیس کی نوعیت کے مطابق میں دیگر پیشوں کے بارے میں بھی متعلقہ مستند لوگوں سے ضروری معلومات حاصل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "زیرِ سماعت کیس کے ذیل میں، میں نے ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر کے ساتھ بیٹھ کر ہائپوگلائی سیمیا پر سیر حاصل گفتگو کی ہے......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اب آپ میرے سوال کا جواب دے دیں تو نوازش ہوگی۔"

"دیکھیں جناب!" وہ دونوں ہاتھوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔ "مجھے فریدہ صاحبہ نے مقتول کی بیماری اور گلوکوز کے انجکشن کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ سب میں

اقوال خلیل جبران

کل تک میرا خیال تھا کہ میں ایک ذرّہ ہوں جو مضطربانہ طور پر زندگی کے دائرے میں چکر لگا رہا ہے اور بغیر کسی نظم وضبط کے۔

لیکن آج میں سمجھنے کی طرح سمجھتا ہوں کہ میں وہ دائرہ ہوں جس میں ساری زندگی، منظم ذرّوں کے ساتھ چکر لگا رہی ہے۔

☆☆☆

ایک دفعہ میں نے اپنی مٹھی کہر سے بھری۔ پھر اسے کھولا، کہر ایک کیڑا بن گئی تھی۔

میں نے دوبارہ مٹھی بند کی اور کھولی۔ اب کیڑے کے بجائے وہاں ایک چڑیا تھی۔

تیسری مرتبہ میں نے پھر مٹھی بند کی اور کھولی۔ اب اپنی ہتھیلی پر میں نے ایک مرد کو دیکھا جس کا چہرہ غمگین اور نگاہیں بلندیوں کو تک رہی تھیں۔

آخری بار میں نے پھر مٹھی بند کی اور اب جو اسے کھولتا ہوں تو سوائے کہر کے کچھ نہ تھا۔

لیکن اس وقت میں نہایت شیریں اور دلکش نغمے سن رہا تھا۔

☆☆☆

ان ساحلوں پر میں ہمیشہ چلتا رہوں گا۔

ریگِ ساحل اور کیفِ بحر کے درمیان!

بے شک سمندر کا چڑھاؤ میرے نقوشِ قدم کو مٹا ڈالے گا

اور ہوا کیفِ بحر کو لے اڑے گی

لیکن سمندر اور ساحل؟ یہ ابدالآباد تک رہیں گے!

☆☆☆

میں اپنے ایمان کو زندگی کے انصاف پر کیسے ضائع کر دوں جب کہ میں جانتا ہوں کہ نرم و گداز بستروں پر سونے والوں کے خواب زمین پر سونے والوں کے خوابوں سے زیادہ حسین نہیں ہوتے۔

مرسلہ: حمیرا اقبال، کوٹری

نے آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ ''آپ جو نہیں جانتے، وہ میں آپ کی سب سے اہم اور معتبر گواہ مقتول کی بیوہ فریدہ سے پوچھ لوں گا۔'' پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''جناب عالی! مجھے تفتیشی افسر سے اور کچھ نہیں پوچھنا......!''

آئی او نے جو وٹنس باکس خالی کیا تھا، وہاں استغاثہ کے گواہ نواز علی نے کھڑے ہو کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا، پھر اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیلِ استغاثہ جرح کے لیے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا۔

گواہ نواز علی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ درمیانے قد اور متناسب جسم کا مالک ایک عام سی شکل وصورت والا شخص تھا۔ اس نے پینٹ کے اوپر اوپن شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ نظر آرہا تھا۔ اس کے سر کے بالوں میں چاندی اتر چکی تھی۔

''نواز علی!'' وکیل استغاثہ نے انگلی سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے استفسار کیا۔ ''کیا آپ اس بندے کو جانتے ہو؟''

''جی، تھوڑا بہت......'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آج میں نے اسے دوسری بار دیکھا ہے۔''

''پہلی مرتبہ آپ نے اسے کب اور کہاں دیکھا تھا؟'' وکیلِ استغاثہ نے چالاکی سے پوچھا۔

''پچھلے سال بائیس نومبر کی شام یہ ہمارے دفتر میں آیا تھا اور اس نے صاحب یعنی جابر حسین کے بارے میں پوچھا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ جابر صاحب کا بڑا بھائی ہے۔''

''اب تو معلوم ہو چکا نا......؟'' وکیلِ استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''جی بالکل!'' وہ کراری آواز میں بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ اسی نے جابر صاحب کو قتل کیا ہے۔ ویسے میں اسی وقت کھٹک گیا تھا جب وقوعہ کی شام یہ ہمارے آفس آیا تھا۔ اس کے تیور بڑے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔''

''خطرناک تیور سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''اس وقت میں آفس میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ آناً فاناً میں وہاں پہنچا اور بڑے اکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''جابر کہاں ہے؟ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''صاحب تو تھوڑی دیر پہلے گھر چلے گئے ہیں۔'' یہ غصے میں آگیا اور برہمی سے بولا۔ ''جابر گھر کیسے چلا گیا۔ آج ٹھیک چھ بجے میری اس کے ساتھ ایک خصوصی میٹنگ تھی۔ میں تو وقت پر پہنچ گیا ہوں مگر وہ غائب ہے۔ غیر ذمے داری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے......!''

''اگر آپ کو جابر صاحب سے کوئی ضروری کام ہے تو آپ ان کے گھر چلے جائیں۔'' میں نے اس سے کہا۔

''بالکل، کیوں نہیں۔'' یہ طیش کے عالم میں بولا۔ ''اگر میں دفتر تک آگیا ہوں تو اس کے گھر بھی جاؤں گا۔ آپ مجھے جابر کے اپارٹمنٹ کی لوکیشن بتائیں۔ آج میں اسے چھوڑوں گا نہیں......''

''پھر آپ نے کیا کیا؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''میں نے اسے جابر صاحب کے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا اور یہ پاؤں پٹختے ہوئے آفس سے نکل گیا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''کیا مقتول نے وقوعہ کے روز دن بھر کسی وقت آپ سے ایسا کوئی ذکر کیا تھا کہ شام چھ بجے آفس میں کسی کے ساتھ اس کی میٹنگ فکس ہے؟''

''نہیں جناب......میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، البتہ جابر صاحب نے آفس سے رخصت ہوتے وقت مجھے بتایا تھا کہ گھر پر کوئی فیملی ممبران سے ملنے آرہا ہے اسی لیے وہ آفس سے جلدی جارہے ہیں......''

اس کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کر دی اور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یور وٹنس پلیز......!''

میں جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا پھر گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''نواز علی صاحب! آپ کتنے عرصے سے مقتول کے ساتھ کام کر رہے تھے؟''

''جب سے انہوں نے ''جابر ایسوسی ایٹس'' قائم کی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''مذکورہ کمپنی جولائی/اگست انیس سو ستتر عیسوی سے کام کر رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو مقتول کے پاس کم وبیش سوا تین سال ہو گئے ہیں......؟''

''جی!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے۔''
''اس دوران میں کبھی مقتول نے آپ کے سامنے اپنے بڑے بھائی ناصر حسین کا ذکر کیا؟''
''بالکل نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
''مقتول کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے تھے؟''
''ایک دم فرسٹ کلاس۔'' اس نے توانا لہجے میں جواب دیا۔
میں نے پوچھا۔ ''آپ مقتول کے ساتھ سیلری بیس پر کام کرتے تھے یا کمیشن بیس پر؟''
''سیلری بیس پر۔'' اس نے بتایا۔
''مقتول کی کمپنی سے آپ کو ماہانہ کتنی تنخواہ ملتی تھی؟''
میں ایک خاص مقصد کے تحت، غیر محسوس انداز میں استغاثہ کے گواہ کو ایک بند گلی کی سمت کھدیڑ رہا تھا۔ اس نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔
''بارہ سو روپے ماہانہ۔ اس کے علاوہ جب کوئی بڑا سودا ہوتا تھا تو جابر صاحب مٹھائی کا ڈبا اور دو، تین سو روپے اپنی مرضی سے دے دیا کرتے تھے۔''
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مقتول کی کمپنی میں کام کرتے ہوئے بہت مطمئن تھے......؟''
''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔
''کبھی آپ نے ''جابر ایسوسی ایٹس'' کو چھوڑ کر جانے کے بارے میں بھی سوچا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''ایسا سوچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وکیل صاحب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''مجھے جابر صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میں انہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ میرا مرنا جینا جابر صاحب ہی کے ساتھ تھا۔''
''ریئلی......؟'' میں نے شک زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
''جی بالکل!'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔
میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا......!''
وہ جھنجلا کر بولا۔ ''تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں......؟''
''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کی مدد کے لیے انٹری دی۔ ''استغاثہ کا معزز گواہ بڑے واضح الفاظ میں بتاچکا ہے کہ اس کی تمام تر ہمدردیاں، وفاداریاں اور وابستگیاں مقتول جابر حسین کے ساتھ تھیں۔ اس کے باوجود بھی میرے فاضل دوست بلاوجہ گواہ کی نیت پر شک کررہے ہیں اور مختلف حربوں سے سادہ لوح گواہ کو زچ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ انہیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''
''بیگ صاحب! آپ اس حوالے سے کیا کہیں گے؟'' جج نے مجھ سے پوچھا۔
''یور آنر! عین ممکن ہے کہ میری جرح کے انداز سے استغاثہ کے گواہ کو کوفت محسوس ہورہی ہو لیکن میرا یہ اقدام بلاوجہ اور بے مقصد نہیں ہے۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اگر میں گواہ کے بیان کو شک کی نظر سے دیکھ رہا ہوں تو میرے پاس ایسا کرنے کا ٹھوس جواز موجود ہے جسے میں ابھی معزز عدالت کے سامنے کھول کر رکھ سکتا ہوں۔''
''آبجیکشن اوور رولڈ!'' جج نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ ''مسٹر بیگ! پلیز پروسیڈ فردر......''
میں وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے نائب نواز علی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''میں نے ایک لمحے کے لیے یقین کرلیا کہ آپ مقتول کے ساتھ کام کرکے بہت مطمئن اور خوش تھے۔ آپ مقتول کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ آپ کی تمام تر وفاداریاں مقتول کے ساتھ تھیں پھر...... پھر آپ نے نمک حرامی کیوں کی؟''
''یہ...... یہ آپ...... کیا کہہ رہے ہیں......؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی مترشح تھی۔ ''میں نے جابر صاحب کے ساتھ کون سی نمک حرامی کی ہے......؟''
''وقوعہ کی شام ایک اجنبی شخص غصے سے بھرا ہوا ''جابر ایسوسی ایٹس'' میں داخل ہوتا ہے۔ اس وقت آفس میں آپ کے سوا اور کوئی موجود نہیں۔ وہ چراغ پا اجنبی آپ سے مقتول کے بارے میں پوچھتا ہے۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے اور الفاظ میں جنون کی جھلک ہے۔ آپ کو اس کے ارادے خطرناک نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنی زبان سے یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ آج وہ مقتول کو چھوڑے گا نہیں۔ اس کے باوجود بھی آپ مقتول کے اپارٹمنٹ کا ایڈریس اینڈ لوکیشن اس شخص کے حوالے کردیتے ہیں......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے معاندانہ نظر سے نواز علی کو گھورا، پھر سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کے اس عمل کو نمک حرامی کے کھاتے میں رقم نہ کریں تو پھر آپ

ہی بتادیں اسے کیا نام دیا جائے......؟''

گواہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

''واقعی، اس وقت مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔'' وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجھے ملزم کو مقتول کے گھر کی راہ نہیں دکھانا چاہیے تھی۔ بعد میں مجھے اپنے اس فعل پر کافی افسوس بھی ہوا تھا۔''

''بعد میں......اونہہ!'' میں نے طنزیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اب پچھتائے کیا ہووت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت......!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

اس روز میں نے انکوائری آفیسر سے جو سوال و جواب کیے تھے ان کے ایک ایک لفظ کے اندر کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوا تھا جبکہ نواز علی پر میں نے جرح برائے جرح کی تھی۔ اس کا مقصد صرف اور صرف استغاثہ کا مورال ڈاؤن کرنا تھا......!

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہوں کو عدالت میں پیش کیا گیا جن میں سے دو کے بیانات میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی لہٰذا میں ان کے ذکر کو گول کر کے تیسرے گواہ کی جانب بڑھتا ہوں جو کہ مقتول کی گھریلو ملازمہ سلمٰی تھی۔

آگے بڑھنے سے قبل آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ کلیم انصاری نے اپنے ذرائع کے گھوڑے دوڑا کر میری تمام تر مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کردی تھیں جن سے اس کیس پر میری گرفت اور زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔

سلمٰی کی عمر پینتیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کی مالک ایک دبلی پتلی عورت تھی۔ رنگت گندمی اور صورت و وضع قطع گھریلو ملازماؤں جیسی۔ جب سلمٰی کا بیان ریکارڈ ہوچکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''کیا وقوعہ کی شام یہی شخص مقتول کے اپارٹمنٹ پر آیا تھا؟'' وکیلِ سرکار نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی گواہ سے پوچھا۔

''جی!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''کیا یہ پہلے بھی کبھی وہاں آیا تھا؟''

''نہیں!''

''اس نے تم سے کیا کہا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''گھنٹی کی آواز پر میں نے ہی دروازہ کھولا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ یہ جابر صاحب کا بڑا بھائی ہے اور جابر صاحب سے ملنے آیا ہے۔ اس کی آمد کے بارے میں میڈم نے مجھے پہلے ہی بتادیا تھا۔ میں نے اندر جا کر جابر صاحب کو بتایا کہ ان کا بڑا بھائی آیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ناصر حسین کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چائے پانی رکھوں۔ وہ بھی آرہے ہیں۔ میں نے صاحب کے حکم پر عمل کیا اور پھر میں اپنے گھر چلی گئی تھی۔ میرے جانے کے بعد وہاں کیا واقعہ پیش آیا، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی......''

''جب تم مقتول کے اپارٹمنٹ سے نکلیں تو اس وقت گھر کے اندر کتنے افراد موجود تھے؟'' وکیل استغاثہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''صرف دو افراد......'' اس نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ''ایک صاحب جی اور دوسرا ان کا بڑا بھائی ناصر حسین......'' بات کے اختتام پر اس نے ملزم کی طرف اشارہ بھی کردیا۔

''تم اپارٹمنٹ سے کتنے بجے نکلی تھیں؟''

''تقریباً پونے سات بجے یا پانچ منٹ اوپر۔'' سلمٰی نے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ جج کی جانب رخ کر کے بہ آوازِ بلند بولا۔ ''جنابِ عالی! سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ملزم ٹھیک ساڑھے چھ بجے مقتول کے اپارٹمنٹ پر پہنچا اور پونے سات سے سات بجے کے درمیان گھریلو ملازمہ سلمٰی چھٹی کر کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہوگئی۔ اب وہاں رہ گئے صرف دو افراد۔ ایک ملزم اور دوسرا مقتول۔ ڈرائنگ روم کی سینٹر ٹیبل پر موجود برتنوں سے واضح ہوتا ہے کہ مقتول اور ملزم نے آمنے سامنے بیٹھ کر چائے نوش کی تھی اور پانی بھی پیا تھا اور یقیناً ان کے بیچ گفتگو بھی ہوئی ہوگی جو ظاہر ہے خوشگوار نہیں رہی تھی۔ نتیجے کے طور پر مقتول کی موت واقع ہوگئی اور دو لاکھ کی رقم بھی غائب ہوگئی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول جابر حسین کو چھ اور آٹھ بجے کے درمیان کسی وقت فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ گواہ سلمٰی کے بیان کے مطابق پونے سات بجے تک مقتول اپنے اپارٹمنٹ میں زندہ سلامت موجود تھا۔ مقتول کی اہلیہ فریدہ صاحبہ نے پولیس کو بتایا ہے کہ جب وہ آٹھ بجے گھر لوٹی تو مقتول ڈرائنگ روم کے صوفے پر مردہ حالت میں پڑا تھا۔

ان حالات و واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مقتول کو سات بجے یا زیادہ سے زیادہ سوا سات بجے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور یہ گھناؤنی حرکت ملزم کے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی...... دیٹس آل یور آنر!''

وکیل استغاثہ نے اپنے بھاشن میں جج کو متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن میری نظر میں وہ سب کچھ پانی کے ایک حقیر بلبلے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

''سلمیٰ!'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم مقتول کے اپارٹمنٹ پر کب سے کام کر رہی ہو؟''

''لگ بھگ دو سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہاری ڈیوٹی کب سے کب تک ہوتی تھی؟''

''میں صبح دس بجے کام کرنے آتی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور چھ بجے چھٹی کر کے اپنے گھر واپس چلی جاتی تھی۔''

''وقوعہ کی شام تم چھ بجے کے بجائے پونے سات بجے اپنے گھر گئی تھیں؟'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس کا کوئی خاص سبب؟''

''جی......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''اس روز صاحب جی ساڑھے پانچ بجے گھر آ گئے تھے اور اس وقت میڈم بھی گھر میں موجود تھیں۔ میڈم نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے شاپنگ کے لیے باہر جانا ہے۔ ساڑھے چھ بجے کے آس پاس تمہارے صاحب کے بڑے بھائی ناصر حسین یہاں آ رہے ہیں۔ تم انہیں چائے پانی دینے کے لیے یہاں موجود رہنا۔ جب ناصر حسین چلے جائیں تو پھر تم چھٹی کر لینا۔'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میڈم! پھر میڈم گھر سے نکل گئی تھیں۔''

''لیکن تم نے سات بجے سے چند منٹ پہلے چھٹی کر لی تھی اور اس وقت مہمان بھی گھر میں موجود تھا۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس کو گھورا۔ ''جبکہ تمہاری میڈم کا حکم تھا کہ مہمان کے جانے کے بعد تم چھٹی کرنا......؟''

''جی، میڈم نے تو مجھ سے یہی کہا تھا......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''لیکن جب میں نے مہمان کے سامنے چائے، پانی اور بسکٹس رکھ دیے تو صاحب نے مجھے چھٹی دے دی اور میں اپنے گھر چلی گئی۔''

''تمہارا گھر مقتول کے اپارٹمنٹ سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''زیادہ نہیں، پیدل کا راستہ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اپارٹمنٹس اور بنگلوں کے عقبی حصے میں جو بستی آباد ہے، میں وہیں پر رہتی ہوں۔''

''سلمیٰ! تم پورا دن مقتول کے اپارٹمنٹ پر کام کرتی تھیں۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم کسی اور گھر کا کام نہیں کرتی تھیں اور یہ بھی بتاؤ، کیا تمہاری نوکری ابھی تک برقرار ہے؟''

''ایک گھر میں مکمل ڈیوٹی دینے کے بعد کہیں اور کام کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں صرف جابر صاحب کے گھر میں ہی کام کرتی تھی اور ہاں...... میری یہ نوکری جاری ہے۔''

کلیم انصاری سے حاصل ہونے والی معلومات کا استعمال کرتے ہوئے میں نے استغاثہ کی گواہ سے پوچھا۔ ''کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گی کہ تمہیں اس کام کی کتنی تنخواہ

ملتی ہے؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''اس وقت عدالت میں جابر حسین مرڈر کیس زیرِ سماعت ہے۔ اس سے گواہ کی تنخواہ کا کیا لینا دینا......!''

''بہت کچھ لینا اور دینا ہے میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کے جواب میں ترکی بہ ترکی کہا۔ ''آپ ذرا سانس تو لیں، سب کچھ آپ کے سامنے آجائے گا۔''

''پتا نہیں......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''آپ کون سا سانپ نکالنے والے ہیں۔''

''بس آپ صبر کا دامن مضبوطی سے تھام کر رکھیں اور پوری توجہ سے دیکھتے جائیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس کیس کو جن بھی سانپوں، بچھوؤں اور زہریلے مکڑوں نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، میں وہ سب کے سب نکال کر آپ کے قدموں میں ڈال دوں گا۔''

وکیل استغاثہ نے مجھے محض گھورنے پر اکتفا کیا۔

میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ سلمٰی کی جانب متوجہ ہو گیا اور کہا۔ ''تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''جی...... مجھے ایک ماہ کی تنخواہ اب سات سو روپے ملتی ہے۔''

''اب سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''مطلب یہ کہ پہلے مجھے چھ سو روپے ملتے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''تمہاری تنخواہ میں ایک سو روپے کا اضافہ کب سے ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پچھلے سال کے آخری مہینے میں......''

''پچھلے سال کے آخری مہینے یعنی دسمبر میں، وقوعہ سے چند روز بعد۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے ایسا کون سا کارنامہ انجام دے ڈالا تھا کہ تمہاری تنخواہ میں ایک سو روپے کا اضافہ کر دیا گیا تھا جبکہ مقتول کی موت کے بعد اس گھر کا کام آدھا رہ گیا تھا؟''

''یور آنر! ڈیفنس فروعی باتوں میں الجھ کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے میرے اندازِ جرح پر اعتراض ٹھوکتے ہوئے برہمی سے کہا۔ ''اگر فریدہ صاحبہ نے اپنی گھریلو ملازمہ کی تنخواہ بڑھا دی تو...... اس سے زیرِ سماعت کیس پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟''

''بیگ صاحب!'' جج نے براہِ راست مجھ سے سوال کیا۔ ''کیا گواہ کی تنخواہ میں اضافے کا زیرِ سماعت کیس کے ساتھ کوئی کنکشن ہے؟''

''بہت گہرا کنکشن ہے جناب عالی!'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''میرے فاضل دوست ''آبجیکشن یور آنر'' کے نعروں کو تھوڑی دیر کے لیے اگر فراموش کرنے پر تیار ہو جائیں تو میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

''بی بی! آپ وکیل صاحب کے سوال کا جواب دو۔'' جج نے استغاثہ کی گواہ سلمٰی کو ہدایت دی، پھر مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔''

''میں نے تو کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ''میڈم نے خود ہی میری تنخواہ بڑھا دی تھی۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا تو آپ میڈم سے پوچھ لیں۔''

''تمہاری میڈم سے تو میں نے بہت کچھ پوچھنا ہے۔'' میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔ ''وہ جب اس کٹہرے میں آکر کھڑی ہوں گی تو میں اپنے ارمان نکال لوں گا۔ فی الحال تو تم مجھے بتاؤ کہ......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر گواہ سے سوال کیا۔

''میڈم نے صرف تمہاری تنخواہ میں محض ایک سو روپے کا اضافہ ہی کیا تھا یا اس کے علاوہ کوئی عظیم الشان گفٹ بھی دیا تھا؟''

''نن...... نہیں جی......'' وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''میڈم نے صرف میری تنخواہ ہی بڑھائی تھی۔''

میں نے اپنی فائلوں کے اندر سے ایک رسید نکال کر جج کے سامنے میز پر رکھ دی، پھر کراری آواز میں کہا۔

''جناب عالی! یہ بوہری بازار کی صرافہ مارکیٹ میں واقع ''اسٹار جیولرز'' سے کی جانے والی زیورات کی خریداری کی ڈپلی کیٹ رسید ہے جو میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے حاصل کی ہے۔ اس رسید کے مطابق گواہ سلمٰی نے چوبیس نومبر انیس سو اسّی عیسوی بروز پیر یعنی وقوعہ سے ٹھیک دو روز بعد ''اسٹار جیولرز'' سے نو ہزار چھ سو روپے کے طلائی زیورات خریدے تھے۔ اگر گواہ اس خریداری سے انکار کرے گی تو میں مذکورہ جیولرز شاپ کے مالک حبیب اللہ کو بطور ڈیفنس وِٹنس عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔ سرِ دست استغاثہ کی گواہ سے میرا یہ سوال ہے کہ وہ معزز عدالت کو بتائے، نو ہزار چھ سو روپے کی رقم اس کے پاس



کہاں سے آئی تھی؟''

جج نے مذکورہ رسید کا بغور جائزہ لینے کے بعد سلمٰی سے سوال کیا۔''بی بی! کیا تم نے یہ طلائی زیورات خریدے تھے؟''

جب سے میں نے رسید جج کی خدمت میں پیش کی تھی، استغاثہ کی گواہ کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک رنگ جارہا تھا۔ گویا پانی نشیب میں بھرنا شروع ہوگیا تھا۔ جج کے کڑے استفسار نے اسے مزید پریشان کردیا۔

''جی نہیں......'' وہ بے حد بوکھلائے ہوئے انداز میں بولی۔''جی ہاں......!''

''بی بی! ایک جواب دو۔'' جج نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہاں یا نہ۔''

''جی...... میں نے زیورات خریدے تھے......'' وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔''ان زیورات کی خریداری کے لیے تم نے رقم کہاں سے حاصل کی تھی؟''

''میری...... دس ہزار کی...... بی سی (کمیٹی)...... نکلی تھی......'' اس نے بکھری ہوئی آواز میں بتایا، پھر تھوک نگل کر حلق تر کرنے لگی۔

استغاثہ کی گواہ نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک پہلے سے سوچی ہوئی کہانی مجھے سنادی تھی مگر میں اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میری جرح نے گویا سلمٰی کے بیان کو جن چھاڈال رکھا تھا۔

''تمہاری دس ہزار روپے والی یہ بی سی کب نکلی تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''گیارھویں مہینے کی پندرہ تاریخ کو۔'' اس نے بتایا۔

''یعنی پندرہ نومبر کو، وقوعہ سے ایک ہفتے پہلے۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا، پھر پوچھا۔''تمہاری بی سی کا کون سا نمبر تھا؟''

''جی ساتواں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ استغاثہ کی گواہ دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی اور اس کی غلط بیانی کو منظر عام پر لانا مجھ پر لازم تھا۔ میں جھوٹے کو اس کے گھر تک چھوڑے بغیر بھلا کیسے واپس آسکتا تھا۔

''کل کتنی بیسیاں ہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''بیس......!'' اس نے جواب دیا۔

''بیس، بیسیوں کا مطلب یہ ہوا کہ ماہانہ پانچ سو روپے بی سی بھرنا لازمی ہے جبھی دس ہزار روپے کی بی سی نکل سکتی ہے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔''میری معلومات کے مطابق، تمہارے تین بچے ہیں، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں جی......'' وہ اضطراری لہجے میں بولی۔''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کیا یہ بات بھی درست ہے کہ تمہارا شوہر شوکت کوئی کام کاج نہیں کرتا اور وہ نشے کا بھی عادی ہے؟'' میں نے بدستور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔''کما کر لانا تو بہت دور کی بات ہے، وہ تو گھر میں رکھے ہوئے تمہارے پیسوں میں سے بھی بیس، تیس، پچاس روپے چرا کر دھوئیں میں اڑا دیتا ہے؟''

''جی! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''سلمٰی بی بی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ معزز عدالت یہ جاننے سے دلچسپی رکھتی ہے کہ تم اپنی چھ یا سات سو روپے تنخواہ میں سے پانچ سو روپے بی سی بھرنے کے بعد باقی کے ایک یا دو سو روپے سے مہینا بھر اپنا گھر کیسے چلاتی ہو......؟''

وہ بے ساختہ بولی۔''میں تو ڈھائی سو روپے بی سی بھرتی ہوں۔''

''وہ کیوں......؟'' میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔''تمہیں آدھی بی سی بھرنے کی رعایت کس وجہ سے دی گئی ہے؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔''اصل میں، میں نے آدھی بی سی ڈالی ہوئی ہے۔ باقی کی آدھی بی سی میرے بھائی ادریس کی ہے۔ ڈھائی سو روپے ادریس بھائی بھرتے ہیں......''

''اس من گھڑت کہانی کو یاد کرنے میں تمہیں کتنا عرصہ لگا ہے......؟''

"نہیں جی...... میں سچ کہہ رہی ہوں......" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو......!" میں نے اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ "میرے فاضل دوست استغاثہ کی سیدھی سادی گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"جناب عالی!" میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے فولادی لہجے میں کہا۔ "استغاثہ کی یہ گواہ کتنی معصوم اور سادہ لوح ہے، میں ابھی اس راز سے پردہ اٹھانے والا ہوں۔ معزز عدالت سے میری پُرزور اپیل ہے کہ وکیل سرکار کو [illegible]ٹ کے لیے شانت رہنے کی تلقین کی جائے۔ میرے یہ فاضل دوست کتنے بلوان اور بلونت ہیں، اس کے مظاہرے کے لیے انہیں مناسب وقت دیا جائے گا۔ یہ کراس ایگزامنیشن میں اپنی قسمت آزما سکتے ہیں۔ اس موقع پر پبلک پراسیکیوٹر کی بار بار کی مداخلت زیرِ سماعت کیس کو رُستاخیزی کی جانب لے جائے گی جس سے نراج کی راہ ہموار ہوگی جبکہ میرا مطمحِ نظر یہ ہے کہ اس کیس کو امن و سلامتی کے ساتھ جلد از جلد نمٹا دیا جائے۔ ویٹس آل یور آنر۔"

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔"

"سلمٰی بی بی!" میں نے استغاثہ کی گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ "بتاؤ، حقیقت کیا ہے؟ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے تمہیں کم از کم ایک سو جھوٹ مزید بولنا پڑیں گے اور یہ بات ذہن سے نکال دو کہ میں تمہاری جان آسانی سے چھوڑ دوں گا۔ اگر تم اس خوش فہمی میں ہو تو سمجھ لو کہ بری طرح پھنسنے والی ہو۔ میں کسی نہ کسی مرحلے پر تمہاری دروغ گوئی کا پول کھول کر رکھ دوں گا۔ سچ بولنے میں تمہاری بچت ہے۔ باقی تمہاری مرضی......!"

میری باتوں نے اس کے چہرے پر سراسیمگی طاری کردی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس ہلکورے لیتا نظر آیا لیکن ٹوٹنے کے بجائے اس نے ایک اور کوشش کی۔

"میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا......" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں آدھی بی سی یعنی ڈھائی سو روپے ہی بھرا کرتی ہوں۔ باقی کے ساڑھے چار سو روپے میں جیسے تیسے میں اپنا گھر چلاتی ہوں۔ کھانا اور کپڑے وغیرہ میڈم دے دیتی ہیں۔ اس طرح گزارہ ہو جاتا ہے۔"

"سلمٰی بی بی! تمہاری دکھ بھری کہانی نے مجھے خاصا متاثر کیا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اس لیے میں تمہاری اس بات پر چند منٹ کے لیے یقین کر لیتا ہوں کہ آدھی بی سی تمہارا بھائی ادریس بھرتا ہے۔ تو پھر اصولی طور پر آدھی بی سی ادریس کو ملنا چاہیے۔ اب ذرا معزز عدالت کو بتاؤ کہ تم نے گزشتہ سال چوبیس نومبر بروز سوموار "اسٹار جیولرز" سے نو ہزار چھ سو روپے کے زیورات کیسے خرید لیے تھے۔ تمہارے حصے میں تو آدھی بی سی یعنی پانچ ہزار روپے آئے تھے......؟"

"وہ جی...... بات دراصل...... یہ ہے کہ......" وہ پینترا بدلتے ہوئے بولی۔ "میں نے ادریس بھائی کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اپنی بی سی والے پانچ ہزار روپے مجھے ادھار دے دے تاکہ میں اپنی طلائی زیورات کی دیرینہ خواہش کو پورا کرسکوں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، ایک بھائی اپنی بہن کے لیے اتنی سی قربانی نہیں دے سکتا؟"

بات کے اختتام پر سلمٰی نے جس ہوشیاری کے ساتھ سوال کی گیند میری کورٹ میں پھینک دی تھی، اس سے آپ اس گھریلو ملازمہ کی "سادگی" کا خود ہی اندازہ لگالیں۔ میں کچھ کہوں گا تو بہت سوں کو شکایت ہوگی۔

"تاریخ انسانی بہنوں کے لیے بھائیوں کی قربانیوں سے بھری پڑی ہے لیکن تم نے اپنے ادریس بھائی کو اس کیس میں قربانی کا بکرا بنانے کی جو کوشش کی ہے، وہ تمہیں بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا، پھر سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تمہاری یہ نام نہاد دس ہزار روپے والی بی سی کس کے پاس جمع ہوتی ہے؟"

اس نے ایک لمحے کے تذبذب کے بعد جواب دیا۔ "جمیلہ باجی کے پاس۔"

"کیا تمہاری یہ جمیلہ باجی بھی اسی بستی میں رہتی ہیں جہاں تم......؟" میں نے پوچھا۔

"جی......" اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

"ٹھیک ہوگیا......" میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ "جناب عالی! وقوعہ کی شام مقتول کے اپارٹمنٹ پر جو خونیں کھیل کھیلا گیا اس کے بارے میں استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی گھریلو ملازمہ سلمٰی کافی کچھ جانتی ہے اور اس کی زبان بندی کی قیمت دس ہزار روپے مقرر کی گئی تھی جس کے بدلے میں اسے زبان پر تالا ڈالنے کے علاوہ بھرپور تعاون کے لیے بھی آمادہ کیا گیا تھا۔ قبل اس کے کہ میرے فاضل

دوست یہ سوال اٹھائیں کہ......'' میں یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہا ہوں؟ میرے پاس کون سا ٹھوس ثبوت ہے......وغیرہ ہا'' تو میں خود ہی عرض کر دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، اسے آئندہ پیشی پر بہ عین ثابت بھی کر کے دکھادوں گا، بہ شرطے کہ وکیلِ سرکار اور تفتیشی افسر مجھ سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہو جائیں......''

''ہم کیا تعاون کر سکتے ہیں؟'' وکیل استغاثہ تڑخ کر بولا۔'' آپ نے دعویٰ کیا ہے، ثبوت بھی آپ ہی کو پیش کرنا ہوں گے۔ ہم تو ویسے بھی آپ کی مخالف پارٹی ہیں......!''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل سرکار کے چہرے پر نگاہ جما کر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔'' قبلہ! میں نے کب کہا کہ آپ نے میری کوئی مدد کرنا ہے؟ آپ دونوں کی پہلی اور آخری کوشش تو یہی ہے کہ میرا موکل اور اس کیس کا ملزم عدالت سے سزائے موت یا قیدِ تاحیات کا تحفہ لے کر رخصت ہو...... ہیں نا؟''

میرے اس لتاڑ آمیز انداز پر وہ زخمی سانپ کے مانند بل کھا کر رہ گیا، پھر بیزاری سے بولا۔'' جب ہمیں آپ کی کوئی مدد نہیں کرنا تو پھر آپ کس تعاون کی بات کر رہے ہیں؟''

''قانونی تعاون......!'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟'' وہ شپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''دیکھیں جناب......!'' میں نے تلے تلے الفاظ میں کہا۔'' استغاثہ پارٹی ہو یا ڈیفنس پارٹی، دونوں قانون کے ڈانڈوں کے اندر رہتے ہوئے، قانون میں کسی بھی نوعیت کی کاہش کیے بغیر، قانون کی سربلندی اور انصاف کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس نے جواباً نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''میرے فاضل دوست! میری بھی تو یہی خواہش ہے کہ اس کیس سے متعلق ہر شخص کو انصاف ملے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ میں آئندہ پیشی پر آپ کی گواہ سلمیٰ کو دروغ گو درجۂ اوّل ثابت کر دوں۔ یہ اسی صورت ممکن ہو پائے گا جب آپ دونوں حضرات آئندہ پیشی پر سلمیٰ کے بھائی ادریس اور بی سی والی جمیلہ باجی کو عدالت میں پیش کرنے کا بندوبست کریں......'' میں نے وکیلِ استغاثہ کو وہیں پر چھوڑا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ اگلی پیشی پر ادریس اور جمیلہ کی گواہی کو یقینی بنانے کے لیے احکامات صادر کیے جائیں...... ڈیٹس آل یور آنر!''

جج نے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر جاوید احمد کو حکم دیا کہ وہ آئندہ پیشی پر متذکرہ بالا دونوں افراد کو عدالت میں پیش کرے۔ اس کے ساتھ ہی جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

آئندہ پیشی دو ہفتے بعد تھی۔

☆☆☆

میں نے اس کیس کو بہت گہرائی تک اسٹڈی کیا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں اس کی جڑوں تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں کلیم انصاری نے بھی بڑے بھرپور انداز میں میرے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔ اپنے حریف پر استیلا حاصل کرنے کے لیے ہوم ورک کے علاوہ اچھا خاصا فیلڈ ورک بھی کرنا پڑتا ہے تب جا کر کہیں کامیابی کی دیوی اپنے درشن دیتی ہے۔ لاریب! یہ کوئی کارِ سہل نہیں ہے......!

میں نے بڑے ٹھیک ٹھاک انداز میں اس کیس کی چولیں بٹھادی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ ایک دو پیشیوں میں اس کیس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے گا۔ جس طرح کسی طالب علم کو کمرائے امتحان میں بیٹھنے سے پہلے بڑی اچھی طرح یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی محنت کون سا رنگ دکھانے والی ہے۔ کمرائے عدالت بھی ایک ایسا ہی اکھاڑا ہے۔

اگلی پیشی سے تین روز پہلے نازیہ اور شازیہ مجھ سے ملنے آگئیں۔ میں اس وقت اپنے چیمبر میں فارغ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے فوراً انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد نازیہ نے کہا۔

''وکیل صاحب! ہم جوڑیا بازار میں تھوڑی شاپنگ وغیرہ کرنے آئے تھے، سوچا آپ سے بھی دعا سلام کر لیں۔ ہم نے بغیر اپوائنٹ منٹ کے آکر آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا......؟''

میں نے ان کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز دیکھے تھے جو انہوں نے چیمبر کے فرش پر رکھ دیے تھے۔ میں نے نازیہ کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ اتفاق سے میں اس وقت فری ہی تھا۔''

میں نے ان دونوں بہنوں کے لیے چائے کا آرڈر دے دیا۔ شازیہ جھک کر اپنے بیگ کے ساتھ مصروف ہو گئی پھر ایک پیکٹ نکال کر میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''یہ آپ کے لیے ہے۔''
میں نے دیکھا وہ پیکٹ اعلیٰ درجے کے بادام سے بھرا ہوا تھا۔ محتاط اندازے کے مطابق ان باداموں کا وزن ایک کلوگرام رہا ہوگا۔ میں نے حیرت بھری نظر سے شازیہ کی طرف دیکھا اور الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔
''میرے لیے......؟''
''آپ کو اس کی اشد ضرورت ہے۔'' نازیہ نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پچھلی پیشی کے وقت میں عدالت میں موجود تھی۔ آپ نے جابر چاچا کی گھریلو ملازمہ سلمٰی کو جس طرح بند گلی میں لاکھڑا کیا تھا، وہ سب انتہائی سنسنی خیز اور دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اتنی زیادہ مغزماری کے بعد دماغ تو خالی ہوجاتا ہوگا۔ میں نے سنا ہے بادام دماغی قوت کے لیے بہت مفید ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی ذہانت اور عقل کو جلا بخشتے ہیں۔''
''ایسا سنا تو میں نے بھی ہے مگر میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''بہرحال، اس تحفے کا شکریہ۔ بادام بہت ہی لذیذ ڈرائی فروٹ ہے۔''
''کیا میں جان سکتی ہوں کہ آپ بادام کی افادیت سے اتفاق کیوں نہیں کرتے؟'' نازیہ نے پوچھا۔
''مجھے بادام کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہر ڈرائی فروٹ کے اپنے بیش بہا فوائد ہیں لیکن جہاں تک انسان کی عقل و دانش کا معاملہ ہے تو اس کا خوراک سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ اگر بادام کھانے سے واقعی انسان کی عقل اور دماغی صلاحیت میں اضافہ ہوتا تو ڈرائی فروٹ بیچنے والے تمام افراد اور ان کی اولادیں ڈاکٹرز، انجینئرز، سقراط اینڈ بقراط ہوتیں، البتہ میرا تو یہ تجربہ ہے کہ......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔
''عقل بادام کھانے سے نہیں بلکہ ٹھوکر اور دھوکا کھانے سے آتی ہے......''
میری اس بات پر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔
''عدالت میں آپ اپنی مخالف پارٹی کو انتہائی سنجیدگی سے جس طرح آڑے ہاتھوں لیتے ہیں، اسے دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ ہنسی مذاق بھی کرتے ہوں گے۔'' نازیہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا یہ گن تو ابھی ابھی ہم پر ظاہر ہوا ہے......اچھا لگا!''
''سنجیدگی اور شگفتگی انسانی جذبات کے دو ایسے اظہار ہیں کہ جن کے درمیان حدِ فاصل کا ہونا بہت ضروری ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ یہ دونوں اپنے اندر بہت زیادہ جاذبہ رکھتی ہیں۔ اگر ان کے بیچ باؤنڈری لائن موجود نہ ہو تو یہ آپس میں مدغم ہو کر بہت زیادہ طوائف الملوکی پھیلاتی ہیں۔ بہرحال، عدالت کا کمرا اور میرا یہ آفس دو مختلف مقامات ہیں لٰہذا دونوں جگہوں پر اپنے موڈ اور مزاج کو بھی جداگانہ رکھنا پڑتا ہے......''
''بس، میں نے تو فیصلہ کرلیا ہے!'' شازیہ نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔
نازیہ نے گردن موڑ کر سوالیہ نظر سے اپنی چھوٹی بہن کی طرف دیکھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
''کیسا فیصلہ شازیہ؟''
''میں قانون کی تعلیم حاصل کروں گی اور ایک نامور وکیل بن کر دکھاؤں گی۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''یہ بڑا ڈیشنگ پروفیشن ہے۔''
''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی جانب دیکھا۔
نازیہ نے کہا۔ ''اور ابو کی خواہش کا کیا ہوگا؟''
''آپ ابو کی خواہش کی تکمیل کرنا۔'' شازیہ بے پروائی سے بولی۔ ''میں چند سال بعد بھی شادی کرلوں گی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔''
ان کی باہمی گفتگو سے میرے ذہن میں یہ بات تازہ ہوگئی کہ میرا موکل ناصر حسین اس سال جنوری، فروری میں اپنی دونوں بیٹیوں کی ایک ساتھ شادی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کیس کی وجہ سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا اور اب تو جنوری، فروری بھی پیچھے رہ گیا تھا۔
''کیا تم دونوں کے رشتے طے ہوچکے تھے؟'' میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔
''طے تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا......'' شازیہ نے جواب دیا۔ ''نازیہ کے لیے لڑکا دیکھ لیا گیا تھا لیکن بات چیت ابھی ابتدائی مراحل میں تھی۔ مطلب یہ کہ رشتے کی بات فکس نہیں کی گئی تھی اور میرے لیے رشتہ دیکھا جارہا تھا۔ ایک دو رشتے آئے ہوئے تھے۔ ابو ان پر غور و خوض کررہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ دسمبر میں سب کچھ فائنل کرلیا جائے گا اور......جنوری، فروری میں شادی کے لیے کوئی اچھی سی تاریخ دیکھ کر فکس کرلی جائے گی لیکن میں نے تو پکا فیصلہ کرلیا ہے کہ پہلے وکالت کا امتحان پاس کروں گی، اس کے بعد شادی کے بارے میں سوچا جائے گا۔''
میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آئیڈیا برا نہیں ہے۔''

''وکیل صاحب......!'' نازیہ شادی کے موضوع کو ایک طرف رکھتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ''آپ کے خیال میں ابو کا کیس کب تک ختم ہوجائے گا؟''

''کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ تین پیشیوں میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ فتح بھی ہماری ہی ہوگی۔''

''ان شاء اللہ!'' نازیہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں رخصت ہوگئیں۔

آئندہ پیشی پر میری توقع کے عین مطابق استغاثہ سلمیٰ کے بھائی ادریس اور پی سی والی جمیلہ باجی کو عدالت میں پیش کرنے میں ناکام رہا۔ میرے مطلوبہ ان دونوں گواہوں کا میڈیکل سرٹیفکیٹ دائر کردیا گیا تھا۔ اس موقع پر میں نے استغاثہ کے خلاف بڑھ چڑھ کر دلائل دیے تھے۔ وکیل استغاثہ بت بنا کھڑا رہا تھا۔

جج نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس میں استغاثہ کی سب سے معتبر گواہ اور مقتول جابر حسین کی بیوہ میڈم فریدہ کھڑی تھی۔ فریدہ کی عمر کم وبیش چالیس سال رہی ہوگی۔ وہ سانولی رنگت کی مالک ایک دراز قامت عورت تھی۔ فریدہ کے خال وخط میں جنس مخالف کے لیے بے پناہ کشش پائی جاتی تھی۔ اس نے ایک بیش قیمت لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

فریدہ کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہوچکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا، پھر ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

''یہ آپ کا جیٹھ ناصر حسین ہے اور ابھی تک یہ ایک ہی بات پر اٹکا ہوا ہے کہ مقتول نے اس کے دو لاکھ روپے دینا ہیں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟''

''پہلی بات تو یہ کہ میں اس شخص کو کسی بھی قیمت پر اپنا جیٹھ تسلیم نہیں کرسکتی۔'' وہ ناپسندیدہ نظر سے ناصر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ میرے شوہر کا قاتل ہے اور ویسے بھی سارے رشتے ناتے جابر کی زندگی تک تھے اور جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ملزم کا دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے۔ جابر نے اس کا ایک روپیا بھی نہیں دینا تھا۔ یہ گاہے بگاہے اپنے فرضی دو لاکھ کا مطالبہ کرکے جابر کو ٹارچر کرتا رہتا تھا۔ پھر جب ہمیں پتا چلا کہ یہ اپنی دو بیٹیوں کی شادی کرنے والا ہے تو میں نے جابر کو اس بات کے لیے مجبور کیا کہ وہ اسے دو لاکھ روپے دے دے۔ یہ مان کر نہیں کہ تم کوئی قرض اتار رہے ہو بلکہ یہ سوچ کر کہ تم اپنی بھتیجیوں کی شادی کے لیے کنٹری بیوٹ کر رہے ہو۔ جابر نے میری ضد پر اسے اپنے گھر بلایا تھا اور......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''وکیل صاحب! آپ ہماری نیت دیکھیں اور اس منحوس کے کالے کرتوت کا بھی جائزہ لیں۔ اس نے دو لاکھ روپے بھی اٹھا لیے اور اپنے چھوٹے بھائی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایسے درندہ صفت شیطانوں کے بارے میں سنا تو تھا مگر زندگی میں واسطہ پہلی بار پڑا ہے......'' پھر وہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں بولی۔

''سر! میں تو کہتی ہوں، اس شخص کی کم از کم سزا پھانسی ہونا چاہیے۔''

جج نے اس کے مطالبے پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

وکیل استغاثہ نے گواہ سے سوال کیا۔

''جب مقتول نے وقوعہ کی شام ملزم کو اپنے گھر پر بلایا تھا تو پھر یہ ''جابر ایسوسی ایٹس'' کیوں پہنچ گیا تھا؟''

ناصر حسین نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول نے اسے اپنے گھر بلایا تھا اور نہ ہی آفس آنے کو کہا تھا۔ یہ تو ناصر حسین کا فیصلہ تھا کہ وہ بائیس نومبر کی شام چھ بجے اپنے دو لاکھ روپے وصول کرنے مقتول کے آفس آرہا ہے اور اس نے مقتول پر یہ بھی واضح کردیا تھا کہ وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مقتول اسے اپنے آفس میں نہیں ملا تو اس نے نواز علی سے مقتول کے اپارٹمنٹ کا ایڈریس سمجھا اور اپنی رقم کی وصولی کے لیے اس کے گھر پہنچ گیا تھا لیکن استغاثہ نے میرے مؤکل کو پھنسانے کے لیے اس حقیقت کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔

''یہ تو آپ اسی سے پوچھ لیں......'' فریدہ نے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''شاید اسے یہ شک تھا کہ جابر گھر کے بجائے آفس میں بیٹھا ہوگا۔ اس نوعیت کے جھکی اور سائیکو افراد سے کچھ بھی بعید نہیں ہے وکیل صاحب! ایسے لوگ کسی وقت کچھ بھی کرسکتے ہیں......!''

''میڈم! آپ نے ڈرایا اور میں ڈر گیا......'' وکیل استغاثہ مصنوعی جھرجھری لیتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں بولا، پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''ویٹس آل یور آنر......!''

اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے استغاثہ کی گواہ کے نزدیک چلا گیا، پھر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''فریدہ صاحبہ! مجھے آپ کے شوہر کی موت کا بے حد افسوس ہے۔''

''اسی لیے آپ اس کے قاتل کی وکالت فرما رہے ہیں......؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔

فریدہ میری توقع سے زیادہ چالاک اور بے باک ثابت ہورہی تھی۔ اس کے انداز واطوار سے بالکل نہیں لگتا تھا کہ اسے اپنے شوہر کی موت کا ذرا سا بھی غم ہو۔ میں نے بھی لحاظ اور مروت کو ایک طرف رکھتے ہوئے خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔

''میں اپنے مؤکل کو انصاف دلانے کی غرض سے یہ کیس لڑ رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے ناصر حسین ایک بے گناہ انسان ہے۔ کسی بے بس اور بے قصور کی مدد کرنا جتنا مجھ پر فرض ہے، اتنا ہی آپ پر بھی لازم ہے۔ ملزم کی وکالت کر کے میں ایک طرف اپنے پیشے کا تقاضا پورا کر رہا ہوں اور دوسری جانب انسانیت کی خدمت۔ آپ کو میرے اس عمل پر کیا اعتراض ہے؟''

''کوئی نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں بھلا کون ہوتی ہوں اعتراض کرنے والی اور...... میرے اعتراض کرنے سے آپ کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے آپ تو اپنی فیس حلال کرنے کے لیے ملزم ہی کی حمایت کریں گے......!''

وہ خود کو حد سے زیادہ اسمارٹ ظاہر کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اس کی اسمارٹ نیس کو بھاپ میں بدلنے کے لیے اپنی جرح کا درجۂ حرارت بڑھا دیا۔

''فریدہ صاحبہ......!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال کیا۔ ''کیا آپ وردہ نامی کسی خاتون کو جانتی ہیں؟''

اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہوئے، پھر وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں......!''

کلیم انصاری کی کھوج نکالی کارآمد معلومات کو استعمال کرتے ہوئے میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا۔ ''کمال ہے......'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کچھ عرصہ پہلے تک تو وردہ سے آپ کی بڑی گہری دوستی ہوا کرتی تھی اور آج آپ اسے پہچاننے سے انکاری ہیں۔ لگتا ہے آپ دونوں کی میوچل فرینڈز سدرہ اور انیتا کو عدالت میں بلانا پڑے گا تا کہ آپ کی یادداشت کو تازہ کیا جاسکے......!''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے واضح طور پر اسے کنفیوژ ہوتے دیکھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گئی اور آواز کو کھینچ کر بولی۔

''اچھا وہ ووووووو......وردہ!''

''جی وہی وردہ جو ایک معروف ماڈل ہے اور کبھی کبھار ٹی وی ڈراما میں اداکاری کے جوہر بھی دکھاتی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''پچھلے دنوں اسی وردہ کو اپنا پروڈکشن ہاؤس بنانے کا خیال آیا تھا جس کے لیے کسی پوش ایریا میں ایک بنگلے کی ضرورت تھی اور وہ بنگلا وردہ کو آپ کے مرحوم شوہر جابر حسین نے دلایا تھا......!''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ سرسری انداز میں بولی۔ ''دراصل کافی دنوں سے میری وردہ سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے وہ فوری طور پر میرے ذہن میں نہیں آسکی۔''

''دوستوں کو ذہن میں نہیں، دل میں رکھا جاتا ہے فریدہ صاحبہ!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ آج کل آپ کی وردہ سے ان بن چل رہی ہے......؟''

''ایسی......تو......کوئی بات......نہیں......'' وہ کھوکھلی آواز میں بولی۔

میں نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس ان بن کا سبب آپ کا شوہر مقتول جابر حسین تھا......؟''

''میں سمجھ نہیں پارہی ہوں کہ آپ ہاتھ دھو کر وردہ کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں......؟'' میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے زچ ہو کر کہا۔

''کیونکہ......'' میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ ''جب وردہ، مقتول کے توسط سے سوسائٹی کے علاقے میں بنگلا خرید رہی تھی تو مقتول اور وردہ بہت نزدیک آگئے تھے۔ جب آپ کو ان کی کلوزنیس کا علم ہوا تو ایک طرف آپ نے وردہ سے قطع تعلق کر لیا اور دوسری جانب آپ نے مقتول کو بھی کھری کھری سناڈالی تھیں......؟''

''آپ بکواس کر رہے ہیں۔'' وہ غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کے کسی بھی بے ہودہ سوال کا جواب نہیں دوں گی......!''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے اپنی گواہ کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ ''فرنڈ کورٹ سے میں اپیل کرتا ہوں

کہ وہ ڈیفنس کو اس کی حدود میں رہنے کا پابند کرے۔ اس وقت عدالت میں جابر مرڈر کیس زیرِ سماعت ہے اور وکیلِ مخالف کسی وردہ کا قصہ چھیڑ کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں۔ انہیں یاد دلایا جائے کہ کسی ماڈل کا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے......''

''مگر زیرِ سماعت کیس سے مقتول جابر حسین کا تعلق تو ہے نا؟'' میں نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کے جواب میں ترکی بہ ترکی کہا۔

''ہاں ہے!'' وہ بے ساختہ بولا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا وردہ نامی یہ ماڈل زیرِ سماعت کیس کا کوئی کردار ہے؟''

''بالواسطہ نہیں مگر بلاواسطہ...... یس!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''دراصل، میرا فوکس مقتول جابر حسین اور استغاثہ کی گواہ فریدہ صاحبہ پر ہے اور وردہ ان چکی کے دو پاٹوں کے بیچ کا ایک کردار ہے اس لیے اس کا ذکر بھی ضروری ہے......!''

میں نے دانستہ گول مول جواب دیا تھا۔ اگر میں اپنی بات کو واضح انداز میں بیان کردیتا تو اس سے فریدہ بدک جاتی، پھر اس کی زبان سے اہم حقائق کو باہر لانا ناممکن کی حد تک مشکل ہوجاتا اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے دوٹوک انداز میں وکیل استغاثہ کے اعتراض کو اہمیت دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''مسٹر بیگ! پلیز پروسیڈ ٹو دی پوائنٹ۔''

وکیل استغاثہ نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا جیسے اس نے جج سے مجھے ڈانٹ پلوادی ہو۔ میں نے وکیل سرکار کو خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور مقتول کی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''فریدہ صاحبہ! وقوعہ کے وقت آپ اپارٹمنٹ کے اندر موجود نہیں تھیں۔ میری معلومات کے مطابق آپ ایک نزدیکی شاپنگ مال میں وقت گزارنے چلی گئی تھیں تاکہ دونوں بھائیوں کو پرائیویسی میسر آجائے اور وہ اطمینان سے بات کرسکیں۔ کیا میری یہ معلومات درست ہیں؟''

''ایک سو ایک فیصد درست......'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور مجھے اس بات پر حیرت بھی ہے!''

''یہ کمرائے عدالت ہے میڈم......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''یہاں حیرت کو افسوس اور افسوس کو صدمے میں بدلتے ہوئے ذرا دیر نہیں لگتی!''

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گئی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ......'' میں نے سپاٹ لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ اس نام نہاد شاپنگ سے جب لوٹیں تو آٹھ بج کر دس منٹ کا وقت تھا؟''

استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق وہ کم و بیش آٹھ بجے واپس آئی تھی۔ میں نے اسی ''کم و بیش'' کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آٹھ دس کا وقت بتایا تھا۔ اس نے میری بات پر زیادہ غور نہیں کیا اور بڑی سادگی سے بولی۔

''ہاں...... آٹھ پانچ یا آٹھ دس کا وقت تھا۔''

''پولیس کے روزنامچے کے مطابق آپ نے ٹھیک سوا آٹھ بجے تھانے فون کرکے انہیں مقتول کی موت کے بارے میں بتایا تھا......؟''

''جی بالکل!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے فوراً ہی پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔''

''جبکہ فوری طور پر تو آپ کو کوئی اور کام کرنا چاہیے تھا!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کون سا کام؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''آپ کو فوراً کسی ڈاکٹر کو گھر پر بلانا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''یا پھر آپ مقتول کو کسی قریبی اسپتال لے جاتیں لیکن چونکہ آپ کو مقتول کی موت کا پکا یقین تھا اس لیے آپ نے تھانے کا نمبر گھمادیا...... ہیں نا؟''

''میری سمجھ میں جو آیا، وہ میں نے کیا۔'' جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ''آپ کی مرضی...... جو بھی سمجھ لیں۔''

''آپ کی شادی کے معاملات کو سمجھنے میں مجھے زیادہ انٹریسٹ ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایکسکیوزمی......!'' اس نے غصیلی نظر سے مجھے گھورا۔

قبل اس کے کہ وکیل استغاثہ ''آبجیکشن یور آنر'' کے نعرے کے ساتھ ہمارے بیچ میں کود پڑتا، میں نے کہا۔

''کیا یہ درست ہے کہ مقتول کے ساتھ آپ کی تیسری شادی تھی؟''

''جی...... ہاں!'' اس نے طوعاً و کرہاً جواب دیا۔

''آپ کی پہلی شادی انیس سو اڑسٹھ عیسوی میں ایوب نامی ایک شخص سے ہوئی تھی۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''یہ شادی پانچ سال تک چل سکی۔ اس دوران میں آپ کے ہاں کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بالآخر انیس سو تہتر میں ایوب نے آپ کو بانجھ قرار دیتے ہوئے طلاق دے دی تھی......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے

ہوئے کہا۔

''انیس سو چوہتر میں آپ نے امداد حسین نامی شخص سے دوسری شادی کی مگر دو سال تک امداد حسین کی بیوی رہنے کے باوجود بھی آپ اسے اولاد کا تحفہ نہیں دے سکیں اور امداد حسین کا انتقال ہوگیا۔ چار ماہ کے بعد آپ کی مقتول سے ملاقات ہوئی اور لگ بھگ ایک سال کے عرصے میں آپ دونوں ایک دوسرے کے اتنے نزدیک آگئے کہ اگست ستتر میں آپ نے مقتول سے تیسری شادی کرلی اور تا حال...... یعنی مقتول کی زندگی تک کم و بیش ساڑھے تین سال میں آپ مقتول کے لیے کوئی اولاد پیدا نہیں کرسکی تھیں۔ کیا ان واقعات کو ایک اتفاق سمجھا جائے یا کوئی گہری منصوبہ بندی......؟''

''جناب عالی! لگتا ہے میرے فاضل دوست کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''یہ اس کیس کو ڈسٹریکٹ کرنے کی بھونڈی کوششوں میں مصروف ہیں۔ استغاثہ کی معزز گواہ نے ایک شادی کی یا دس، ان کے اندر اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے یا نہیں، ان سب باتوں کا جابر مرڈر کیس سے کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے لہٰذا میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ ڈیفنس کو ان فضول حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی بیوہ فریدہ صاحبہ کی میرج ہسٹری کو زیرِ بحث لائے بغیر اپنی جرح جاری رکھیں۔''

''اوکے سر!'' میں نے فرماں برداری سے کہا، پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ گلشن اقبال والا سپر لگژری اپارٹمنٹ آپ کے نام پر ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

''اور مقتول کی موت کے بعد ''جابر ایسوسی ایٹس'' اور مقتول کے دیگر تمام اثاثے اور بینک بیلنس سب آپ کا ہوگیا ہے؟''

''ظاہر ہے!'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''اس میں کسی شک کی گنجائش کہاں ہے۔ جابر کی اکلوتی وارث میں ہی تو ہوں۔''

میں نے جرح کے زاویے کو یکا یک تبدیل کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں استفسار کیا۔ ''فریدہ صاحبہ! کیا آپ ڈائبیٹک ہیں......؟''

''اللہ نہ کرے!'' وہ جلدی سے بولی۔

''فیملی ہسٹری کی وجہ سے پوچھ رہا ہوں......!'' میں نے بدستور اپنے انداز کو پراسرار رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سچ ہے کہ پاپا ڈائبیٹک (شوگر کے مریض) تھے۔'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ڈایابیٹز (ذیابیطس) نہیں ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ ممی کو بھی یہ مرض نہیں تھا۔ اگر ماں اور باپ دونوں ڈائبیٹز (Diabetes) کا شکار ہوں تو پھر بچوں میں اس مرض کی منتقلی کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔''

میں نے اس کی طبی موشگافیوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کے پاپا ایک طویل عرصے تک ڈائبیٹک رہے تھے اور گھٹنے سے ان کی ایک ٹانگ بھی کاٹنا پڑی تھی حالانکہ وہ نہایت ہی پابندی کے ساتھ انسولین کا انجکشن بھی لے رہے تھے......!''

گواہ کے ساتھ میرے ہمدردی بھرے رویّے کو دیکھ کر وکیل استغاثہ کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ میں نے وکیل مخالف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا فوکس، اپنے ٹارگٹ پر رکھا۔ وہ بے چارگی سے بولی۔

''اس موذی مرض نے پاپا کو بڑی اذیت دی تھی۔''

''اور آپ نے ان برے حالات میں اپنے پاپا کی بہت خدمت بھی کی تھی۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں نے سنا ہے، آپ اپنے پاپا کو انسولین کا انجکشن خود ہی لگایا کرتی تھیں۔ اس حوالے سے آپ نے اپنی ایک دوست نرس راحیلہ سے انجکشن لگانے کی باقاعدہ ٹریننگ بھی لی تھی......؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں انٹرامسکولر اور انٹراوینس دونوں قسم کے انجکشن لگالیتی ہوں۔''

''جناب عالی!'' میں نے اچانک روئے سخن جج کی جانب گھماتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ استغاثہ کی معزز گواہ میڈیکل کے شعبے سے خصوصی لگاؤ رکھتی ہے۔ اگر معزز عدالت مجھے صرف دس منٹ کی مہلت دے تو میں چند ایسے حقائق آپ کے سامنے آشکار کرنا چاہتا ہوں جس سے زیرِ سماعت کیس پر بہت زیادہ روشنی پڑے گی۔ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میرے پیش کردہ نکات اس کیس کا پانسا پلٹ دیں گے۔''

جج نے سر کی اثباتی جنبش کے ساتھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پرمیشن گرانٹیڈ!''

''جناب عالی! انسانی جسم کے اندر موجود ایک اہم عضو لبلبہ ایک ہارمون پیدا کرتا ہے جسے انسولین کہا جاتا ہے۔ انسولین ہمارے بدن کو گلوکوز استعمال کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ صحت مند پینکریاز نہایت ہی پابندی کے ساتھ انسولین پیدا کرتا رہتا ہے لیکن جب کسی وجہ سے پینکریاز اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو انسولین کی مقدار کم ہونے لگتی ہے یعنی جسم کو گلوکوز استعمال کرنے کی اجازت رفتہ رفتہ کم ہونے لگتی ہے اور پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ انسولین بننا بالکل بند ہوجاتی ہے یعنی ہر نوعیت کی مٹھاس انسانی بدن کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے۔ اس صورت میں انسان کو زندہ رکھنے کے لیے انسولین کا انجکشن دینا لازمی قرار پاتا ہے.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی، پھر استغاثہ کی گواہ سے پوچھا۔

''فریدہ صاحبہ! آپ اپنے پاپا کو انسولین کا کتنا ڈوز لگایا کرتی تھیں؟''

میں نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ چینج اوور تکنیک کا استعمال کرکے اپنے سوالات کے ذریعے استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی بیوہ فریدہ کو ایک ایسے مقام تک لانے کی کوشش کررہا تھا جہاں سے اسے فرار کے لیے کوئی راستہ نہ مل سکے۔ میرے نرم اندازِ جرح کے نتیجے میں وہ کافی ایزی ہوگئی تھی۔ اب اس کے چہرے پر وہ پہلے والی ہوشیاری اور طراری دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے جواب دیا۔ ''ایک ڈوز چالیس یونٹس کا صبح اور اسی مقدار کا ایک ڈوز شام میں۔''

''کیا آپ کے پاپا کا وزن اسّی کلوگرام کے آس پاس تھا؟''

''جی.....اٹھہتر کلوگرام۔''

''میرے خیال میں مقتول کا وزن بھی لگ بھگ اتنا ہی تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

''جابر کا وزن پچھتر کلوگرام تھا!'' اس نے بتایا۔

''جناب عالی!'' میں فریدہ کو چھوڑ کر دوبارہ جج سے مخاطب ہوا۔ ''انسولین کا ڈوز انسانی جسم کی مناسبت سے عمومی طور پر آدھا یونٹ فی کلوگرام وزن مقرر کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی شوگر پیشنٹ کا وزن ایک سو کلوگرام ہے تو اسے پچاس یونٹ انسولین لگنا چاہیے۔ علاوہ ازیں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ایک سی سی یا ایک ایم ایل میں انسولین کے ایک سو یونٹس ہوتے ہیں۔ میری فراہم کردہ یہ معلومات استغاثہ کو یکسر فضول اور بے کار محسوس ہورہی ہوں گی مگر ایسا ہرگز نہیں ہے.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو استہزائیہ نظر سے گھورا، پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔

''یور آنر! اب میں میڈیکولیگل آفیسر اور کیمیکل ایگزامر کی رپورٹس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرنا چاہوں گا.....'' میں نے کہا۔ ''مقتول کی بیوہ، ملزم، آئی او اور دوسرے چند افراد نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ مقتول جابر حسین ہائپوگلائی سیمیا کا مریض تھا یعنی اس کا بلڈ گلوکوز لیول بہت کم رہتا تھا اور وہ گلوکوز لیول کو برقرار رکھنے کے لیے میٹھی چیزوں کا زیادہ استعمال کیا کرتا تھا۔ استغاثہ کی آسانی کے لیے بتاتا چلوں کہ ذیابیطس اور ہائپوگلائی سیمیا ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی ذیابیطس میں مریض کا بلڈ گلوکوز لیول ہائی ہوجاتا ہے جسے نارمل کرنے کے لیے مختلف ادویات اور بالآخر انسولین کے استعمال پر آنا پڑتا ہے جبکہ اس کے برعکس ہائپوگلائی سیمیا میں میٹھی چیزوں کا استعمال بڑھانا پڑتا ہے اور اس مرض میں مبتلا شخص کے لیے انسولین کا استعمال، موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے.....'' میں نے چند سیکنڈ کا توقف کرکے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! ایک نارمل صحت مند انسان کا رینڈم بلڈ گلوکوز لیول 80 سے 140 ملی گرام فی ڈیسی لیٹر ہونا چاہیے یعنی اگر بلڈ گلوکوز لیول 70mg/dl سے نیچے آئے گا تو وہ ہائپوگلائی سیمیا کی حدود میں داخل ہوجائے گا۔ مقتول اس مرض کا شکار تھا۔ یہ لیول 70mg/dl سے جیسے جیسے نیچے آنے لگتا ہے، مریض کے اندر مختلف قسم کی علامتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں جن کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔ شدت کی بھوک کا احساس، ہاتھ پاؤں کا کپکپانا، بدن کا پسینے میں شرابور ہوجانا، جلد کی رنگت میں مردنی چھا جانا، دل کی دھڑکن کا حد سے بڑھ جانا، گہری غنودگی طاری ہوجانا، اگر آنکھیں کھولیں تو منظر کا دھندلا جانا...... اور جب بلڈ گلوکوز لیول 20mg/dl سے نیچے چلا جائے تو پھر دو میں سے ایک کام لازمی ہوتا ہے۔ یا تو متاثرہ شخص کوما میں چلا جاتا ہے اور یا پھر اس کی موت واقع ہوجاتی ہے......دیٹس آل یور آنر!''

وکیل استغاثہ کافی دیر سے جبراً وقہراً صبر کے گھونٹ پی رہا تھا۔ ادھر میں نے ''دیٹس آل'' کہا، ادھر اس کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے طنزیہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

''میرے فاضل دوست! تھوڑی دیر پہلے آپ نے

کیمیکل ایگزامر کی رپورٹ پر روشنی ڈالنے کی بات کی تھی۔ اگر آپ کا یہ میڈیکل لیکچر ختم ہو گیا ہو تو تھوڑی توجہ اس طرف بھی دیں......!''

''کیوں نہیں، ضرور...... میں اپنے مہربان، قدردان فاضل دوست کی فرمائش کو بھلا کیسے رد کر سکتا ہوں۔'' میں نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔

وہ معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

''میڈیکولیگل آفیسر اور کیمیکل ایگزامر کی رپورٹ کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مقتول کی موت کا سبب اس کے دماغ کا اچانک بے جان ہو جانا ہے۔ مقتول کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں اس کا دماغ مردہ ہو گیا تھا۔ ایسا عموماً اسی صورت میں ہوتا ہے جب دماغ کو آکسیجن کی سپلائی مکمل طور پر روک دی جائے یا اس کا بلڈ گلوکوز لیول 20 ملی گرام فی ڈیسی لیٹر سے نیچے چلا جائے......''

''تو اس میں پریشانی والی ایسی کون سی بات ہے؟'' وکیل استغاثہ نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی لقمہ دے دیا۔ ''ملزم نے مقتول کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مقتول کی گردن پر بڑے ہاتھوں کے حامل شخص کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ ظاہر سی بات ہے، جب ملزم نے مقتول کا گلا گھونٹا تو اس کے ساتھ ہی مقتول کی سانس بھی رک گئی ہوگی یعنی مقتول کے دماغ کو آکسیجن کی سپلائی مکمل طور پر منقطع ہو گئی تھی جس کی وجہ سے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا اور مقتول کی موت واقع ہو گئی......!''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے میٹرک اور انٹرنس سائنس سے کیا تھا یا آرٹس سے؟''

''میٹرک آرٹس سے اور انٹرنس کامرس سے۔'' اس نے بتایا۔

''پھر تو آپ کا کوئی قصور نہیں ہے......!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ جھلا کر بولا۔ ''آپ آخر کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

''میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اگر آپ نے سائنس کی بنیادی تعلیم بھی حاصل کی ہوتی تو آپ کو میرا میڈیکل کا لیکچر بور کرتا اور نہ ہی آپ میڈیکولیگل آفیسر کی رپورٹ کی ایسی احمقانہ تشریح فرماتے......!''

میری بات نے اسے تپا دیا، بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے دھیمے انداز میں اس کے زخموں پر آئیوڈائزڈ سالٹ کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے مقتول کے دماغ کے مردہ ہونے کا جو جواز بیان فرمایا ہے، وہ مبنی بر معقولیت نہیں ہے۔ کسی انسان کا گلا گھونٹنے سے اس کے جسم میں سانس کی آمد و شد تو منقطع کی جاسکتی ہے اور دم گھٹنے سے اس کی موت واقع ہو سکتی ہے لیکن اس کا بلڈ گلوکوز لیول خطرناک حد تک نہیں گر سکتا جبکہ میڈیکولیگل ایگزامر کی رپورٹ بتاتی ہے کہ مقتول کا بلڈ گلوکوز لیول اتنا نیچے آگیا تھا کہ اس کے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا تھا یعنی مقتول کی موت کا اصل سبب اس کا بلڈ گلوکوز لیول 20mg/dl سے کہیں نیچے پہنچ جانا ہے۔ باقی جہاں تک مقتول کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی تھیوری ہے تو اس میں بھی ایک جھول ہے......!''

''کیسا جھول؟'' وہ چونکتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''استغاثہ کو مقتول کی گردن پر کسی غیر معمولی بڑے ہاتھوں والے شخص کی انگلیوں کے نشانات تو نظر آگئے اور اس نے ملزم کے بڑے ہاتھوں کی وجہ سے اسے مقتول کا قاتل بھی قرار دے دیا لیکن......'' میں نے دانستہ تھوڑا توقف کر کے اس کیس کے تفتیشی افسر انسپکٹر جاوید احمد کی طرف دیکھا اور چبھنے والے لہجے میں کہا۔ ''لیکن انکوائری آفیسر کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ مقتول کی گردن پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس کا ملزم کے فنگر پرنٹس سے موازنہ بھی کر لیتا حالانکہ یہ بہت ضروری تھا۔ گلا گھٹنے کے باعث واقع ہونے والی موت کو اسٹیبلش کرنے کے لیے فنگر پرنٹس کی میچنگ ناگزیر تھی جبکہ کیس کی فائل کے اندر ایسی کوئی رپورٹ موجود نہیں ہے......!''

میرے اعتراض کے جواب میں تفتیشی افسر بغلیں جھانکنے لگا لیکن وکیل استغاثہ نے مجھے چت کرنے کے لیے ایک بقراطی چال چلی اور معتدل انداز میں بولا۔

''تو آپ کی تھیوری یہ ہے کہ مقتول کی موت گلا گھونٹنے سے نہیں بلکہ اس کا بلڈ گلوکوز لیول بہت زیادہ گر جانے کے سبب واقع ہوئی تھی۔ آپ معزز عدالت کو یہی بتانا چاہ رہے ہیں نا......؟''

''بے حد معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ یہ میری تھیوری نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور میڈیکولیگل آفیسر کی

رپورٹ مجھے مکمل سپورٹ کرتی ہے!''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے نا......'' وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔'' آپ نے اس بیماری کا کیا نام بتایا تھا......؟''

''ہائپوگلائی سیمیا!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مقتول اس بیماری میں مبتلا تھا۔'' ہائپوگلائی سیمیا کا نام لیے بغیر بولا۔''اسی بیماری کی وجہ سے مقتول کا بلڈ شوگر لیول خطرناک حد تک گر گیا ہو جس سے اس کی موت واقع ہوگئی......!''

''اگرچہ آپ کے اس عاقلانہ فرمان کی روشنی میں میرا مؤکل، مقتول کے قتل کے الزام سے صاف بچ نکلتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی میں آپ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے اس قانونی کھیل کو تھوڑا آگے بڑھانا چاہوں گا......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''کیونکہ میرا مقصد صرف اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنا ہی نہیں بلکہ اس کے چھوٹے بھائی جابر حسین کے قاتل کو بے نقاب کرنا بھی اس مشن کا حصہ ہے!''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کا مطلب کیا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

''آپ سمجھنے کی کوشش میں اپنی توانائی ضائع کرنے کے بجائے میری بات پر فوکس کریں میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کو اپنے ٹرانس میں لاتے ہوئے کہا۔''مقتول کی موت بلڈ گلوکوز لیول کے انتہائی خطرناک حد تک گر جانے سے واقع ہوئی اور ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کے خون میں انسولین کی مقدار بہت زیادہ بڑھ جائے۔ یہ درست ہے کہ مقتول کا پینکریاز جسمانی ضرورت سے زیادہ انسولین پیدا کرتا تھا لیکن مقتول اپنی صحت کے معاملات میں بے حد حساس اور فکرمند تھا لہٰذا ابتدائی علامات ظاہر ہوتے ہی وہ کوئی نہ کوئی میٹھی چیز کھا کر معاملات کو اپنے قابو میں کرلیا کرتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ خود کو مرنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ مجھے شک نہیں بلکہ صد فیصد یقین ہے کہ موت سے چند منٹ قبل مقتول کے بدن میں انسولین کی ایک ہیوی ڈوز انجیکٹ کی گئی تھی جس نے خون کے اندر موجود گلوکوز کو آناً فاناً میں کنزیوم کرکے مقتول کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ آپ کے علم میں یقیناً یہ بات تو ہوگی کہ مقتول کے بائیں بازو کے بالائی مسل میں ایک انٹرامسکولر انجکشن کا نشان واضح طور پر دیکھا گیا تھا جس کے گرد اگرد ورم بھی موجود تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ انجکشن کی سرنج میں بھری ہوئی دوا چار، پانچ سی سی کے آس پاس رہی ہوگی۔ انسولین ایک ہارمون ہے اور ہارمون انجکشن عموماً انٹرامسکولر ہی دیے جاتے ہیں......!''

''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقتول کو انسولین کا انجکشن دیا کس نے ہوگا......؟'' وکیل استغاثہ نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

میں نے وکیل استغاثہ کے ساتھ جتنا کھیلنا تھا، وہ میں کھیل چکا تھا لہٰذا معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو آپ اپنی گواہ فریدہ صاحبہ سے پوچھیں......!''

''مجھ سے کیوں......؟'' وٹنس باکس میں کھڑی استغاثہ کی گواہ یوں اچھلی جیسے میں نے اس کے پاؤں میں کوئی زہریلا سانپ چھوڑ دیا ہو۔

''میڈم فریدہ......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے سنگین لہجے میں کہا۔''وہ اس لیے کہ آپ ماہر انجکشنیات ہیں۔ آپ نے انٹرامسکولر، انٹراوینس اور انٹراسب کوٹینیس...... ہر قسم کے انجکشن دینے کی ٹریننگ لے رکھی ہے......!''

گواہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے واضح طور پر اسے بھنور کے بیچوں بیچ دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ بولتی، وکیل استغاثہ مجھ سے ڈائریکٹ ہوگیا۔

''اگر استغاثہ کی معزز گواہ انجکشن لگانا جانتی ہے تو آپ کس بنا پر یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ مقتول کو اسی نے انسولین کا ہیوی ڈوز دیا ہوگا؟''

''میں نے تو آپ کے سوال کے جواب میں صرف یہ کہا تھا کہ آپ اپنی گواہ سے پوچھیں کہ مقتول کو انسولین کا انجکشن کس نے دیا ہوگا اور آپ یہ سمجھ بیٹھے کہ میں آپ کی گواہ پر شک کررہا ہوں......'' میں نے وکیل سرکار کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے خاصے سخت لہجے میں کہا۔''چلیں آپ کی بات مان لیتے ہیں لیکن شک سے کام نہیں چلے گا میرے فاضل دوست......!''

''مطلب یہ کہ آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ مقتول کو اس کی بیوی فریدہ نے انسولین کا انجکشن دے کر موت کی نیند سلایا تھا؟'' اس نے بڑے جارحانہ انداز میں مجھ سے سوال کیا۔

میں نے پُروثوق لہجے میں کہا۔''صد فیصد یقین۔''

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس اس الزام کا......؟''

''میں عدالت میں چنا پاپڑی بیچنے نہیں آیا ہوں

میرے فاضل دوست!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا۔ "میں جو کہتا ہوں اسے ثابت کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں......" پھر میں نے وکیل استغاثہ کو نظر انداز کرتے ہوئے استغاثہ کی گواہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا اور درشت لہجے میں پوچھا۔

"آپ نے مجھ سے غلط بیانی کیوں کی تھی؟"

"نہیں تو......" وہ تعجب خیز لہجے میں بولی۔

"تھوڑی دیر پہلے آپ معزز عدالت کے روبرو مجھے بتا چکی ہیں کہ آپ ڈائبیٹک نہیں ہیں......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

"تو اس میں غلط بیانی والی کون سی بات ہے؟" الٹا اس نے مجھ پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی۔ "اللہ کا شکر ہے کہ میں اس موذی مرض میں مبتلا نہیں ہوں۔"

"اگر آپ ڈائبیٹک نہیں ہیں تو پھر آپ نے وقوعہ سے ایک روز پہلے یعنی اکیس نومبر کی شام ایک کیمسٹ سے کس کے لیے اینٹی ڈائبیٹیز انجکشن کا پورا ایک وائل خریدا تھا۔ میرا اشارہ انسولین کے پانچ سی سی والے وائل کی جانب ہے۔" میں نے اس کے ہوش و حواس پر بجلیاں گراتے ہوئے کہا۔

"مطلب...... پورے پانچ سو یونٹس انسولین......؟"

"آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں......" وہ برہمی سے بولی۔ "میں نے پاپا کی موت کے بعد کبھی انسولین کا کوئی وائل نہیں خریدا۔"

اس کی ڈھٹائی دیدنی تھی۔ آپ اگر بہت زیادہ یعنی حد سے زیادہ مثبت انداز میں سوچنے کے عادی ہیں تو "ڈھٹائی" کو "اعتماد" سے بدل بھی سکتے ہیں۔ اس کی ہٹ دھرمی کو پاش پاش کرنے کے لیے میں نے بہ یک وقت دو تیر چلائے۔ ایک اجالے میں اور دوسرا تاریکی میں۔

"آپ کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے نیچے "کامران میڈیکوز" نام کی ایک فارمیسی ہے جس کے مالک کا نام ہے سجاد علی!" یہ تھا مبنی بر سچائی وہ تیر جو میں نے کلیم انصاری کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں چلایا تھا۔ "آپ نے وقوعہ سے ایک روز پہلے سجاد علی سے "نوونارڈسک" کمپنی کی تیار کردہ پانچ سی سی والی انسولین کی بوتل خریدی تھی۔"

پھر میں نے رسک کے گہرے اندھیرے میں یہ تیر چھوڑ دیا۔ "سجاد علی اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے۔ وہ میری درخواست پر یہاں آیا ہے۔ اگر آپ نے سجاد علی سے انجکشن کی خریداری سے انکار کیا تو میں اسے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے اندر بلانے پر مجبور ہو جاؤں گا......" بات کے اختتام پر میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

کسی بڑی کامیابی کے حصول کے لیے رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ عدالت کے باہر سجاد علی کی موجودگی کے حوالے سے میں نے سراسر جھوٹ بولا تھا۔ نظریہ ضرورت بڑے کام کی شے ہے۔ میں نے اندھیرے میں جو تیر چلایا تھا وہ نشانے پر جا کر بیٹھا۔ فریدہ کے چہرے پر زلزلے کا سماں دکھائی دیا۔ وہ صحیح معنوں میں اس وقت "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" کی کیفیت سے دوچار تھی۔ پھر اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ وٹنس باکس کی چوبی ریلنگ کو تھام کر مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔

"جب انسان کی قسمت ہی ہار جائے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے!"

فریدہ کا یہ جملہ دراصل اس کا اقبالِ جرم تھا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل ناصر حسین کو بے گناہ تسلیم کرتے ہوئے باعزت بری کر دیا۔ فریدہ نے پولیس کسٹڈی میں جو اعترافی بیان دیا، اس کی چند سطریں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

"جابر ایک مکار، عیار، ہرجائی، لالچی، بے وفا اور دھوکے باز شخص تھا۔ وہ میری دوست وردہ کے ساتھ اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ عنقریب وہ مجھے چھوڑ کر وردہ سے شادی کرنے والا تھا۔ میں نے اپنے ایک بڑے ہاتھوں والے خیر خواہ توصیف احمد کے ساتھ مل کر جابر کو یادگار سبق سکھانے کا پلان بنایا۔ پھر مجھے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بس میں نے فائیو سی سی انسولین ایک ڈسپوزیبل سرنج میں بھر کر جابر کے بازو میں ٹھونک دی۔ وہ اسی لائق تھا۔ مجھے اپنے کیے پر ذرا سا بھی ملال نہیں ہے......!"

عدالت میں اس نوعیت کے جذباتی مکالموں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ عدالت کے حکم پر فریدہ کے ساتھ ہی اس کے شریکِ جرم توصیف احمد کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا گیا تھا۔

آخر میں ایک سوال سسپنس ڈائجسٹ کے ذہین قارئین کے لیے۔ اپنی سوچ کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس کہانی میں وردہ، فریدہ کے لیے مارِ آستین کی حیثیت کی حامل تھی یا فریدہ، جابر حسین کے لیے......؟

(تحریر: حسام بٹ)

ہمدردی

محمد الیاس

جب حرص و طمع کسی کے دل میں گھر کرجائے تو اپنے پرائے... خوبصورتی بدصورتی یا دوست دشمن میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی... وہ بھی ان دنوں کچھ ایسے دشمنوں کے نرغے میں گھری ہوئی تھی جو اپنایت کا مکھن لگاتے نہیں تھک رہے تھے کیونکہ... حرص نے انہیں دیوانہ کردیا تھا۔

ہمدردی کی آڑ میں طمع کے جال میں پھنسے خود غرض رشتوں کا احوال



اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، شریف اور سگھڑ لڑکی کا تصور اتنا ہی تھا کہ رائج الوقت معیار کے مطابق اسمارٹ نہ تھی۔ قد چھوٹا اور جسم بھاری۔ بے رحمانہ فاقہ کشی کرنے اور مہنگا علاج کروانے کے باوجود وزن قابو میں نہ رہتا۔ اس پر مستزاد، رنگ روپ اور نین نقش کے معاملے میں بھی قدرت مہربان نہ ہوئی تھی۔ لوگ ظاہری حسن دیکھتے ہیں، جبکہ اولاد کی شخصی خوبیوں کا ادراک صحیح معنوں میں صرف والدین کو ہوتا ہے۔ ثمرہ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی رہا کہ باپ کو اس کے ذی شعور، باتمیز اور سمجھ دار ہونے پر فخر تھا۔ رزق کی فراوانی تھی۔ مال و دولت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں عزت و وقار کی نعمت بھی حاصل رہی۔ حاجی مقبول الٰہی کی زندگی میں ایک ہی کمی رہ گئی تھی کہ حسب منشا بیٹی کا کہیں رشتہ طے نہیں ہو پار ہا تھا۔

پہلا دھوکا بیوہ بھابی کی طرف سے ہوا۔ بیٹے سے باقاعدہ ساز باز کر کے رشتہ مانگا۔ بڑے چاؤ سے منگنی کی۔ چند روز بعد ہی ماں بیٹا خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے اور خوش خبری سنائی کہ آکسفورڈ میں داخلہ ہو گیا ہے۔ چلتر باز عورت نے ہنس

کر چٹکی بجائی اور بولی۔ ”دیور جی! دو سال ایسے چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔ واپس آتے ہی سب سے پہلے شادی، پھر کوئی اور کام۔ خوب دھوم دھام سے ثمرہ کو دلہن بنا کر گھر لے جاؤں گی۔“

بیٹا، ماں سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ کہنے لگا۔ ”جوں ہی ڈگری ہاتھ میں آئی، آپ یوں سمجھ لیں کہ سکس فگر میں سیلری کا آفر لیٹر کراچی، اسلام آباد سے جاری ہو جائے گا۔“ ماں بیٹا بڑی آسانی سے سولہ لاکھ روپے کی رقم ہتھیا کر لے گئے اور چھ مہینے پورے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ منگنی توڑ دی۔

ثمرہ کے سگے ماموں نے بیٹے کے لیے ڈرتے ڈرتے رشتہ مانگ لیا۔ حاجی مقبول کو دل میں ملال آیا کہ میٹرک پاس لڑکا اس کا گھر داماد بنے گا، جو پیشے کے اعتبار سے محض ڈرائیور ہے۔ سات مرلے کا معمولی سا گھر اور روزی کا وسیلہ صرف سوزوکی ڈبا جس سے تعلیمی ادارے کو پک اینڈ ڈراپ سروس مہیا کی جا رہی تھی۔ گو کہ بیٹی نے منفی ردعمل ظاہر نہ کیا لیکن باپ کا اپنا دل ہی نہ مانا۔ دھیان بار بار اپنی بہن کی طرف چلا جاتا، جس کی زندگی بھر دامے درمے سخنے مدد کرتا رہا تھا۔ دل کڑا کر کے از خود عندیہ دے ڈالا۔ بہن پریشان ہو کر بول پڑی۔

”بھائی جان! آپ کے بڑے احسانات ہیں لیکن میرا بیٹا منہ زور ہے۔ جب بھابی نے منگنی توڑی تو میں نے اپنے طور پر گھر میں سرسری سی بات چلائی تھی لیکن کسی نے میرا ساتھ نہ دیا۔“

اسی طرح آئے روز نت نئے لوگ لڑکی دیکھنے آتے، خوب مدارات کرواتے اور گھر جا کر خاموش ہو رہتے۔ آخر کار حاجی نے بیوی کی رائے کو صائب جانتے ہوئے اتفاق کر لیا کہ وہ اپنی بہن کو اعتماد میں لے کر بات کر لے۔ گو کہ نچلے درجے کا متوسط گھرانا ہے لیکن تعلیمی قابلیت کے حوالے سے لڑکے کی اٹھان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایم فل کرتے ہی پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اور بطور لیکچرار عملی زندگی کا آغاز کر دیا۔ ارادے بلند ہیں۔ انشاء اللہ پی ایچ ڈی بھی ضرور اپنے وقت پر کر لے گا۔ باقی یہ کہ بیٹی کا شرعاً جو حصہ بنتا ہے، اس میں گاڑی اور زندگی کی ہر آسائش مہیا ہو جائے گی۔ بس یہ کہ میری اکلوتی بیٹی کو اللہ تعالیٰ ایسا شریکِ حیات عطا کر دے جو اس کی خوبیوں کو پرکھ سکے اور دل سے قدر کرے۔ دل میں ٹھان لی کہ آصف نے اگر اچھا داماد، خصوصاً محبت کرنے والا شوہر ہونے کا ثبوت دیا تو پہلے بچے کی پیدائش پر بیٹی کو پوش ایریا میں گھر بھی لے دوں گا۔ دانا شخص نے خوب سوچ بچار کر کے بیوی سے کہا۔

”نجمہ بیگم! میری جائداد میں بیٹی کا معقول حصہ بنتا ہے۔ بیٹے کی ابھی تعلیم مکمل نہیں ہوئی، لہٰذا فی الحال تقسیم کی بات کرنا قبل از وقت ہوگا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ کوئی شخص دولت کے لالچ میں میری بیٹی کا رشتہ قبول کرے۔ اس لیے سردست تم نے اپنی بہن کے ساتھ کوئی ایسی بڑی بات نہیں کرنی...... میرا مطلب ہے، اپنے طور پر جو ہم آپس میں بیٹی کے حصے کا حساب لگاتے ہوئے اس کو مکان بنوا کر دینے کے منصوبے بناتے رہے ہیں۔ اگر تمہارا بھانجا، شوہر کی حیثیت سے ہماری بیٹی کے ساتھ مخلص رہا تو وقت آنے پر وہ سب کریں گے جو ہم نے سوچ رکھا ہے۔ وہ بیٹی کا جائز حق ہے، کسی پر احسان نہیں ہوگا۔“

امید بر آئی۔ حاجی کے دل کی کلی کھل گئی۔ سابقہ منگنی کے مقابلے میں زیادہ خوشی منائی گئی۔ ہونے والے 'داماد' اس کے والدین اور بہن بھائیوں کو تحفوں سے لاد دیا۔ جتنے میں چھوٹا موٹا بیاہ ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ رقم منگنی پر خرچ کر دی گئی۔ اشاروں کنائیوں میں خواہش ظاہر کی کہ براہِ راست شادی ہی ہو جائے تاکہ فرض ادا ہو، لیکن سالی صاحبہ نے سفید پوشی کا عذر پیش کیا اور تیاری کے لیے سات آٹھ ماہ کی مہلت مانگ لی۔ اتفاقِ رائے سے طے ہو گیا کہ اسی سال دسمبر کی چھٹیوں میں خوشی منائیں گے۔

دسمبر ابھی دور تھا کہ موسم گرما کی تعطیلات کے آغاز میں ہی حاجی مقبول الٰہی پر گویا بجلی گر پڑی۔ میاں بیوی شکرانے کے طور پر عمرہ کر کے گھر لوٹے تھے کہ بری خبر سننے کو ملی۔ خالہ ان کی غیر موجودگی میں منگنی کی انگوٹھی لوٹا گئی تھی۔ روئی پیٹی اور ثمرہ کو بتایا کہ آصف نے یونیورسٹی کی کسی لڑکی سے نکاح کر لیا ہے۔ لڑکی کا باپ وفاقی حکومت کا کوئی ایڈیشنل سیکریٹری ہے۔ بیٹی اور داماد کو اسکالر شپ پر بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیج رہا ہے۔

سابقہ منگنی چھ ماہ تک چلی تھی، جبکہ موجودہ کے دو مہینے بھی پورے نہ ہوئے۔ حاجی صدمہ برداشت نہ کر پائے۔ ممکن ہے دل کا عارضہ پرانا ہو۔ کبھی ایسا موقع ہی نہ آیا کہ اس حوالے سے شبہ ہوتا اور پوری طرح طبی معائنہ کروایا جاتا۔ ہر کسی نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس سانحے پر اظہار خیال کیا۔ کوئی کہتا کہ موت کا وقت مقرر ہے۔ اسی طرح لکھی ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ یہ محض بہانہ بنا۔ دوسرا بولتا، نیک انسان تھے۔ اللہ کے گھر سے واپس لوٹتے ہی بلاوا آ گیا۔ پیشتر اس کے کہ دنیاداری کے جھمیلوں میں پڑتے۔ بعضوں نے یوں کہا کہ آج کل بیماریوں کا پتا ہی نہیں چلتا اور اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ کچھ ایسے بھی تھے، جنہوں نے بغیر لگی لپٹی کے بول دیا کہ باپ کو بیٹی کا غم مار گیا۔ غرضیکہ، جتنے منہ اتنی باتیں۔ البتہ ثمرہ کے دل میں گرہ پڑ گئی کہ اپنوں کی خودغرضی اور بے وفائی اس کے باپ

کی موت کا سبب بنی ہے۔

غم کتنا بھاری کیوں نہ ہو، انسان کو زندگی کے معمولات کی طرف لوٹنا ہی پڑتا ہے۔ تعزیت کرنے والوں میں صرف خالہ کے گھر سے کوئی فرد شامل نہ ہوا تھا۔ بہت جلد یہ بات کھل گئی کہ خالہ زاد نے محض منگنی توڑنے کی غرض سے نکاح کے بارے میں من گھڑت خبر اڑائی تھی۔ معلوم ہوا کہ گرل فرینڈ کے ساتھ تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور وہ اکیلی اسکالرشپ پر... یوایس اے چلی گئی ہے۔ ثمرہ کے ماموں نے اپنی بہن سے ایک مرتبہ پھر پرانا مطالبہ دہرایا لیکن غمزدہ عورت کوئی فیصلہ نہ کر پائی اور خاموش رہی۔ بیٹی ہر وقت کبیدہ خاطر رہنے لگی تھی۔ ذرا سی بھنک پا کر ماں سے کہہ دیا کہ باپ کا کفن ابھی میلا نہیں ہوا، لہٰذا اس موضوع پر بات کرنے کی بھی روادار نہیں۔

گھر کے تینوں افراد ماں بیٹی اور بیٹا ایک دوسرے کی دل جوئی میں لگے رہتے تاکہ صدمے سے نکل پائیں۔ مرحوم نے ترکے میں اتنا کچھ چھوڑا تھا کہ چھوٹے سے کنبے کو اگلی کئی نسلوں تک فکرِ معاش لاحق نہ ہوتی۔ ماہانہ مستقل آمدن ہی آ رہی تھی۔ ایک دوسرے کو بہلانے کی پوری کوشش کرتے لیکن گھر کی فضا سوگوار ہی رہتی۔ ماں کی دلی خواہش تھی کہ بیٹا یونیورسٹی کے مجوزہ مطالعاتی دورے پر جائے۔ اس نے کئی بار انکار کیا کہ طبیعت مضمحل سی ہے۔ دل نہیں مان رہا۔ بہن نے بھی دباؤ ڈالا۔ ماں بیٹی کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے میں وہ گھر سے نکلا تھا۔ رات کے خبرنامے میں روح فرسا خبر نشر ہوئی کہ قومی شاہراہ پر یونیورسٹی کی بس تیز رفتاری کے باعث سامنے سے آنے والے ٹرالر سے ٹکرا گئی ہے۔ سات لڑکے موقع پر جاں بحق ہو گئے، باقی تقریباً سارے ہی زخمی ہیں۔ پندرہ شدید زخمیوں میں سے آٹھ کی حالت تشویش ناک ہے۔

اگلے روز اڑھائی بجے کے قریب جوان بیٹے کا تابوت گھر میں آ گیا۔ دنیا اندھیر ہو گئی۔ علاقے بھر کے وہ لوگ بھی افسردہ ہو گئے، جن کا اس ستم رسیدہ گھرانے کے ساتھ رسمی سا راہ و ربط بھی نہ تھا۔ کیا اپنے، کیا پرائے، جواں مرگ پر امڈ آئے۔ ماں اور بیٹی، دونوں ہی سکتے کی سی حالت میں تھیں۔ ثمرہ حواس باختہ سی دیکھنے لگی کہ تائی، پھوپو اور خالہ پچھاڑیں کھا رہی ہیں۔ گویا تینوں، بین اور سینہ کوبی کرنے میں مقابلہ کر رہی ہوں۔ وہ جس کے ہتھے چڑھتی، سینے سے لپٹا کر جکڑ لی جاتی۔ رو رو کر مرنے والے کی خوبیاں گنوائی جاتیں۔ بھانجی کو اگر خالہ نے دبوچ رکھا ہے تو جیٹھانی نے دیورانی کو بانہوں میں بھر لیا ہے اور پھوپو اپنی باری لینے پر تلی بیٹھی ہے۔

بیٹے کو باپ کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے چوتھا دن ڈھلنے کو آیا تو ثمرہ کا دماغ چکرانے لگا کہ تینوں خواتین ٹلنے کا نام نہیں لے رہیں۔ اس دوران میں جو کوئی بھی اپنے گھر کو گئی تو جلد ہی واپس لوٹ آئی۔ ماں صدمے سے نڈھال ہوئی پڑی رہتی جبکہ خالہ، پھوپو اور تائی کے مابین جو غیر اعلانیہ مسابقت جاری تھی، رفتہ رفتہ یوں رنگ دکھانے لگی کہ ابتدا میں نوک جھونک ہوئی اور نوبت یہاں تک آئی کہ ایک دوسرے پر حیلے بہانے غرّانے خوخیانے بھی لگ گئیں۔ ان میں کسی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دوسری دونوں کو بیک وقت اٹھا کر باہر پھینک دے۔ نجمہ ابھی عدت میں تھی اور ثمرہ اس کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہتی۔

ثمرہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تینوں بزرگ خواتین سے کہا کہ بہت ماتم پرسی ہو گئی، اب انہیں اپنے اپنے گھروں کی بھی خبر لینی چاہیے۔ دکھ کی اس گھڑی میں ساتھ دینے کا بہت شکریہ۔ ماموں نے سارے کام سنبھال رکھے ہیں۔ ہم ماں بیٹی کو ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کی مہلت درکار ہے۔

وہی تینوں خواتین، جن میں سے ہر ایک چند لمحے پہلے تک دوسری دونوں کو کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی، چونک گئیں۔ خالہ اور پھوپو نے یوں نگاہیں جھکا لیں گویا خجالت محسوس کی ہو لیکن تائی صاحبہ نے بھنّا کر کہا۔ ”دیکھو لڑکی! میں سیدھی کھری بات کرنے والی عورت ہوں۔ یہ جو تمہاری خالہ اور پھوپو بیٹھی ہیں چھاؤنی ڈالے، مجھے نہیں پتا کیوں؟ ہم سے جو تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی، اس کا بڑا صدمہ ہے۔ مقبول الٰہی، اللہ اس کا جنتوں میں ٹھکانا کرے انشاء اللہ، میرا سگے بھائی جیسا دیور۔ بیٹا ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر رہ نہ سکا، جہاز پکڑا اور آ گیا۔ بڑا پشیمان ہے کہ نیک چاچا کو دکھ دیا۔ کہتا ہے، اللہ کو کیا جواب دوں گا۔ ازالہ کرنے آیا ہے۔“

خالہ اور پھوپو کچھ گڑبڑا سی گئیں۔ ہونقوں کی طرح دیکھنے لگیں۔ کچھ سمجھ نہ پائیں کہ بولیں یا چپ ہی رہیں۔ ثمرہ بول پڑی۔ ”تائی جی! اس ہمدردی کا بہت شکریہ۔ بیٹے سے کہیں، اگلا جہاز پکڑے اور واپس چلا جائے۔ تایا، پھوپی اور خالہ تینوں میں سے کسی زاد کی مہربانی نہیں چاہیے......“

پھوپو سے صبر نہ ہوا اور ٹوک دیا۔ ”ماموں جو اس گھر کا کھڑپینچ بنا بیٹھا ہے، اب اسی کا زاد ہی چلے گا۔“

”وہ جو ڈرائیور ہے؟“ تائی نے نند کو ٹوکتے ہوئے جھٹ سوال کر ڈالا تو ثمرہ نے تحمل سے جواب دیا۔

”ڈرائیور تو شاید نہ مانے، گلی کا سوئیپر مان جائے گا۔ بھائی کا چہلم ہو لے، بات کر کے دیکھ لیں گے۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر جائیں۔“

⌘⌘⌘



محفلِ شعر و سخن

❄ ناہید یوسف......اسلام آباد

کہتا ہے کہ آواز یہیں چھوڑ کے جاؤ
میں ورنہ تمہیں اذنِ رہائی نہیں دیتا
چرکے بھی لگے جاتے ہیں دیوارِ بدن پر
اور دستِ ستمگر بھی دکھائی نہیں دیتا

❄ زرین خان......حیدرآباد

کیا یہ ممکن تھا جو کوزے میں سمندر آتا
میں نے سوچا تھا کہ مٹھی میں زمانہ آئے

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال

عجب کھیل ہے مٹی سے بنے لوگوں کا
بے وفائی کرو تو روتے ہیں وفا کرو تو رلاتے ہیں

❄ نورین نعمان......کراچی

کچھ اس طرح سے شامل ہوا کہانی میں
کہ اس کے بعد جو کردار تھا فسانہ ہوا
تو کیا تو اپنے اسیروں ہی کو بھلا بیٹھا
یہ امتحاں تو نہیں یہ تو آزمانا ہوا

❄ نعیم احمد......بہاولپور

ہم جیسے تنہا لوگوں کا رونا کیا مسکانا کیا
جب چاہنے والا کوئی نہیں پھر جینا کیا مرنا کیا

❄ کامران شاہد......میر پور خاص

کر رہے ہیں یاد اسے ہم روز و شب
ہیں بھلانے کی اسے تیاریاں
کہاں گئے سبھی ان کی خبر تو لے ظالم
وہ بے خبر جو تیری زندگی میں آئے تھے

❄ صبا حمید......ٹنڈو الہیار

اس دور میں چہرے پہ لکھے ہوتے ہیں حالات
ہر شخص یہاں جیسے کتابوں کی طرح ہے

❄ چلبلی ہیر......جھنگ سٹی

برسے گا ٹوٹ ٹوٹ کر ابرِ محبتاں
ہم چیختے رہیں گے کہ حاجت نہیں رہی
اک روز کوئی آئے گا لے کر کے فرصتیں
اک روز ہم کہیں گے ضرورت نہیں رہی

❄ محمد شہباز اکرم نوئی......پاک پتن شریف

وقت کے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں
آئینہ گردشِ دوراں کو دکھانے والے

❄ وسیم اختر......ملتان

لہراتے ہوئے آتے تھے وہ امن کا پرچم
پرچم کو اٹھائے ہوئے نیزے کی انی تھی

❄ حرا خان......کراچی

درد کا احساس مجھ کو درد سے پہلے بھی ہے
چوٹ سہلا رہا ہوں جو ابھی کھائی نہیں

❄ روا جاوید......بٹل ہزارہ

اے دلِ ناداں کسی کا روٹھنا مت یاد کر
آن ٹپکے گا کوئی آنسو بھی اس جھگڑے کے بیچ

❄ ضمیر رضا......چکوال

کتنا پُرہول ہے شیشے کے گھروں کا منظر
وہی پتھر کے زمانے کی فضا لگتی ہے

❁ ناصر خان......کوئٹہ

کب سے ترے ہونٹوں کی طرف دیکھ رہا ہوں
کشکولِ سماعت میں کوئی پھول گرا دے

❁ عاشی گلزار......حیدرآباد

ہنسنے سے کبھی خوش نہیں ہوتا مرا دل
یاں مجھ کو ہنسانا بھی رلانے کے لیے ہے

❁ امجد پرویز......سرگودھا

جو مری پیاس کو بھڑکائے نہ لب تک پہنچے
ایسے پانی کو تو میں آگ لگانا چاہوں
کیا کروں اس کی طرح میں نہیں بدخُو ورنہ
سو بہانے ہیں اگر بات بڑھانا چاہوں

❁ محمود خاور......فیصل آباد

اب تو تم شہر کے آداب سمجھ لو جانی
جو ملا ہی نہیں کرتے وہ ملا کرتے ہیں

❁ دلاور خان......مانسہرہ

دل کتنا آباد ہوا جب دید کے گھر برباد ہوئے
وہ بچھڑا اور دھیان میں اس کے سو موسم ایجاد ہوئے
تم میری اک خود مستی ہو میں ہوں تمہاری خود بینی
رشتے میں اس عشق کے ہم تم دونوں بے بنیاد ہوئے

❁ سنبل......گلگت

اس سے نبھے گا رشتۂ سود و زیاں بھی کیا بھلا
میں ہوں بلا کا بدحساب' اس کو حساب چاہیے

❁ ارم کامران......سکھر

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

❁ احسن جمال......اسلام آباد

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آبِ بقا اور سہی

❁ رانا کلیم......کراچی

ہم ترا ہجر منانے کے لیے نکلے ہیں
شہر میں آگ لگانے کے لیے نکلے ہیں
شہر کوچوں میں کرو حشر بپا آج کہ ہم
اس کے وعدوں کو بھلانے کے لیے نکلے ہیں

❁ ثنا صادق......کراچی

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

❁ فیاض خان......اوکاڑہ

تمہیں چاہیں گے جب چھن جاؤ گی تم
ابھی ہم تم کو ارزاں پا رہے ہیں
کسی صورت انہیں نفرت ہو ہم سے
ہم اپنے عیب خود گنوا رہے ہیں

❁ صائمہ حبیب......آزاد کشمیر

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

❁ ارم کاشف......جھنگ سٹی

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

❁ افشاں الیاس......چنیوٹ

ایک گماں کا حال ہے اور فقط گماں میں ہے
کس نے عذابِ جاں سہا، کوئی عذابِ جاں میں ہے

❁ مہتاب احمد......حیدرآباد

کسی نے پھر ہمیں تسخیر کر لیا آخر
کوئی مثال تو آتی تری مثال کے بعد
ہم اہلِ خواب کی مجبوریاں سمجھتے ہیں
سو ہم نے کچھ نہیں سوچا ترے خیال کے بعد

❁ لبنیٰ وکیل......کوئٹہ

ہم نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
درد بھیجو نہ تم دوا بھیجو

❁ تحریم صدیقی......سیالکوٹ

یہاں پہ ہم ہیں، وہاں تم ہو، کیا حساب کریں
عجب طرح سے زمیں بانٹ دی گئی ہے مری
سرِ عدالتِ دنیا کبھی گواہی نہ دوں
اسی لیے تو زباں کاٹ دی گئی ہے مری

❁ زوہیب ملک......کراچی

اب کیا کہوں کہ سارا محلّہ ہے شرمسار
میں ہوں عذاب میں کہ مرے زخم بھر گئے
ہم نے بھی زندگی کو تماشا بنا دیا
اس سے گزر گئے کبھی خود سے گزر گئے

❁ جنید ملک......کراچی

یعنی کیا کچھ بھلا دیا ہم نے
اب تو ہم خود سے ڈرتے رہتے ہیں

❄ نوشتہ گلزار......بھکر

دل کے معاملے جو تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہے
اک ہوس تھی دل میں جو دل سے گریز پا بھی تھی

❄ حمزہ آریان......تلہ گنگ

تھکا دیا ہے تمہارے فراق نے مجھ کو
کہیں میں خود کو گرالوں اگر اجازت ہو

❄ منیر شگفتہ......وہاڑی

جاتے جاتے آپ اتنا کام تو کیجیے مرا
یاد کا سارا سر و ساماں جلاتے جائیے

❄ نادیہ ریاض......نواب شاہ

سنا ہے اب انہیں رستے فریب دیتے ہیں
جو لوگ چھوڑ گئے تھے مجھے شرارت میں

❄ شاہینہ مہتاب......چنیوٹ

سائے میں بیٹھی ہوئی نسل کو معلوم نہیں
دھوپ کی نذر ہوئے پیڑ لگانے والے

❄ طاہر مجاہد......پھالیہ

ازل سے لوگ مساوات چاہتے ہیں یہاں
غلام ہوتے ہوئے بادشاہ ہوتے ہوئے

❄ اسما خلیل......اٹک

یہاں یہ لوگ ہیں محرومیوں کے مارے ہوئے
کسی سے کچھ نہیں کہنا یہاں مروت میں

❄ سعدیہ......ایبٹ آباد

تو جو تم کہہ رہے ہو کیا اسے بھی جھوٹ ہی سمجھیں
ابھی تم نے کہا سچ بولنے والے نہیں ملتے

❄ سلیم قادر ......میانوال رانجھا

بدل گیا ہے سبھی کچھ اس ایک ساعت میں
ذرا سی دیر ہمیں ہوگئی تھی عجلت میں

❄ میمونہ اصغر......کراچی

جس آگ سے روشن ہوا احساس کا آنگن
اس آگ کو اشکوں کے حوالے نہیں کرنا

❄ انعم کمال......حیدرآباد

رستے گلیوں پر ہنستے ہیں آنکھیں ویرانی پر
کیسا منظر بدل گیا اس خوش رفتار کے ساتھ

❄ شبانہ حسن......لاہور کینٹ

کب سے راہوں میں تری گرد بنے بیٹھے ہیں
تجھ سے ملنے کے لیے وقت کو ٹالے ہوئے لوگ

❄ طارق کلیرا......تحصیل نور پور تھل

میں مسافر ہوں سو رستے مجھے راس آتے ہیں
میری منزل کو مرے واسطے رستے کردے

❄ صبا سحر......کراچی

آسمانوں کی کشش کھنچتی رہتی ہے مگر
خاک سے پاؤں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے

❄ محمد علی آثم......ڈی آئی خان

کوئی بھی یاد مکمل نہیں ہے اس کے بغیر
یہ ایسا کون ہے شامل مری ضرورت میں

❄ محمد الیاس......بلوچستان

مسافروں کو نصابِ سفر بھی یاد نہیں
پلٹنا چاہتے ہیں اور گھر بھی یاد نہیں

❄ ولید رضا......ساہیوال

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹادیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

❄ عمران شیروانی......لاہور

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

❄ نوروز خان......کوئٹہ

کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

❄ اویس خان......پشاور

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہو کہ جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے

کوپن برائے شمارہ دسمبر 2020

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

سرمئی بادلوں نے سردیوں کے دھندلائے ہوئے سورج کو یکدم ہی چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ عرشیہ شاپنگ بیگز ہاتھ میں لیے آٹو سے اتری، ہاتھ ہلا کر فرینڈز کو الوداع کہا اور ''پرسنل کی'' سے داخلی دروازہ کھول کر پورچ میں داخل ہوئی۔ صبح صبح نہا لینے کی وجہ سے اس کے جسم میں اب تک کپکپی سی تھی اور وہ کافی کا ایک مگ لینے کے لیے بے چین تھی لیکن اس سے پہلے وہ رمشا سے بھی ملنا چاہ رہی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔ پورچ، لان اور حتیٰ کہ سٹنگ میں بھی اسے رمشا دکھائی نہ دی تو وہ سیدھا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف ہی بڑھ گئی۔ پاکستان ائرفورس جیسے ادارے کے ساتھ منسلک ہو جانا کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی اور یہ کامیابی عرشیہ تقریباً

سازش

صبا مغل

حسد اگر کسی شکل یا وجود میں ہوتا تو یقیناً بھڑکتے شعلوں کی صورت ہوتا ... کیونکہ جو جذبۂ دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ رہ کر بھی کسی کی زندگی کو تباہ کرسکتا ہے وہ باہر رہ کر شاید دنیا کو ہی جلا دیتا۔ بہرحال جو بھی ہوا حسّاس دلوں کے لیے سوچ کے کئی در وا کر گیا۔

حقیقت کو نظرانداز کرکے حسد کو داستان بنانے والوں کا قصہ



حاصل کر چکی تھی۔ وہ ائرفورس میں ایجوکیشن کے شعبے سے وابستہ ہورہی تھی۔

''عرشیہ بیٹا! شاپنگ ہوگئی پوری؟''

''جی امی! شاپنگ ہوگئی۔ بڑا ڈیسنٹ سا جوڑا خریدا ہے کل کے فنکشن کے لیے...... آئیں میں دکھاؤں آپ کو......''

عرشیہ کی نظر ادھ کھلی وارڈ روب سے اندر لٹکتے سرمئی اور ہلکے نیلے رنگ کے یونیفارم پر پڑی جو اس کی امی نے شاید ابھی تازہ تازہ استری کر کے ہینگ کیا تھا۔

''امی! رمشا اور مامی کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟''

''پتا نہیں بیٹا! وہ کون سا مجھے بتا کر جاتے ہیں۔''

عالیہ بیگم عرشیہ کے سر پر پھونک مار کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''ہاں...... بیٹا! آج تمہاری اسکول ٹیچر مس سدرہ ملی تھیں۔ پی اے ایف میں تمہارے ایڈمیشن کا سن کر خوشی سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا۔ بے حد خوش ہوئیں اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ شام کو ان کے ہاں مٹھائی لے جاتے ہیں۔ پھر کل تو آپ کی ویل کم پر جانا ہے نا......''

عالیہ بیگم نے مان بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں بیٹا...... وہ بقایا پیسے ہیں نا آپ کے پاس...... انہی میں سے مٹھائی خرید لیتے ہیں۔'' عرشیہ ہونٹوں کو سکیڑے یکدم خاموش سی ہوگئی۔ سیاہ بالوں کی ریشمی لٹیں کانوں کے پیچھے سے ڈھلک کے اس کے گلابی عارض کو چھو رہی تھیں۔

''امی! وہ تو میں نے اس سے پاس خرید لیا ہے۔'' عرشیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''پاس...... کیسا پاس عرشیہ! اور کس کے لیے؟''

''امی! وہ آرگنائزر نے کہا تھا کہ اگر آپ والدین کے علاوہ کسی قریبی دوست کو فیئر ویل پارٹی میں لانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو ایک ہزار روپے کر پاس خریدنا ہوگا۔ تو...... وہ میں نے رمشا کے لیے پاس لے لیا ہے پارٹی کا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی...... انجوائے کرے گی۔''

عرشیہ نے ایکسائٹڈ ہوتے ہوئے کہا۔ عالیہ بیگم بیٹی کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھ کر خاموش ہوگئیں۔ عرشیہ پاس ہاتھ میں لیے ایک دفعہ پھر رمشا کی تلاش میں کمرے سے باہر نکل پڑی۔ عالیہ بیگم کو اپنی بیٹی کے بھولپن پر بہ یک وقت غصہ اور ترس بھی آیا۔ بھابی اور بھتیجی کا بگڑتا ہوا رویہ ان کے سامنے تھا۔ اس وجہ سے انہوں نے خود کو بھی ان دونوں سے تھوڑا محدود کر لیا تھا اور عرشیہ کو بھی گاہے بگاہے سمجھاتی تھیں پر اس معصوم سی لڑکی کے دل کی ڈور تو جیسے اپنی ماموں زاد رمشا ہی سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ بچپن سے اسے اپنی سگی بہن ہی سمجھتی تھی۔

☆☆☆

''مما! یہ کچن میں چائے والے برتن کیوں پڑے ہیں۔ کوئی آیا تھا؟'' رمشا تیوریاں چڑھائے ماں کے کمرے میں داخل ہوئی جو بیڈ پر ٹیک لگائے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں بیٹا...... یہ اوپر والی کے مہمان تھے۔ وہ پڑوس میں ذکیہ آنٹی ہیں نا، وہ عرشیہ کے داخلے پر مبارک باد دینے آئی تھیں۔'' اوپر والی سے ان کی مراد اپنی نند عالیہ ہی تھی۔

''تو مبارک بادیں لینی آتی ہیں، برتن نہیں دھونے آتے انہیں۔ نیچے گند ڈال کر چلی جاتی ہیں......'' رمشا نے بہ آواز بلند کہا جیسے وہ اوپر پھپھو اور عرشیہ کو سنانا چاہ رہی ہو۔

''اوہو! ادھر آ کر بیٹھو۔ اپنا موڈ خراب نہ کرو۔'' شازیہ بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے بلایا۔

''آج انہی مفت خوروں سے ہانڈی روٹی کروانی ہے۔ میں تمہارا ہی کالج سے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ مارکیٹ جانا ہے۔ تمہارے جہیز کے لیے تھوڑی ہل جل شروع کریں۔'' ماں نے سنہری بالوں کی لٹیں اس کے دودھیا کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے کہا۔

''مما...... مجھے اب بے تحاشا غصہ آتا ہے ان دونوں ماں بیٹیوں پر۔ اب اس عرشیہ کا ائرفورس میں داخلہ نہ ہوگیا، جیسے تمغۂ امتیاز مل گیا اسے۔ ہر کوئی اٹھ کر مبارک بادیں دینے آ رہا ہے۔ دونوں کے مزاج ہی اور ہوتے جا رہے ہیں۔ دل کر رہا ہے ایسا سبق سکھاؤں کہ واپس زمین پر آ کر پڑیں۔'' رمشا کا بے پناہ غصہ اور انتشار اس کے چہرے سے واضح ہونے لگا تھا۔ شازیہ بیگم، عرشیہ کے معاملے میں اس کے منفی جذبات سے بہ خوبی واقف تھیں۔

''ارے بیٹا! دفع کرو اس کو۔ چاہے جہاز اڑائے، چاہے چاند پہ جائے، ہماری بلا سے...... تمہیں بھلا کس چیز کی کمی ہے۔ لڑکی کی سب سے بڑی کامیابی اس کا اچھا رشتہ ہونے میں ہے اور دیکھو...... پورے خاندان میں کوئی ہے ایسی لڑکی جس کا اتنی پڑھی لکھی اور اونچی فیملی میں رشتہ ہوا ہو اور وہ بھی اتنے ہینڈسم ڈاکٹر لڑکے سے...... اور وہ دیکھو، وہ بے چاری اوپر والی تو شکل و صورت میں تم جیسی تو نہیں ہے۔ چلو یہ معرکہ مار لیا ہے تو شاید کوئی مناسب جگہ رشتہ ہو جائے۔''

اپنے منگیتر عارش کا ذکر آتے ہی رمشا کے خوبصورت سرخ و سپید چہرے پر سرخی سی پھیل گئی لیکن پھر اچانک ہی

اس کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ بھینچے ہوئے جبڑوں اور کینہ پرور نگاہوں میں کوئی گہری سوچ ہلکورے لینے لگی پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔

''مما! میں نے آپ کو کل بتایا تھا نا کہ میرے کمرے میں چوہا ہے۔ مجھے آج رات بھی اس کی کھٹ پٹ سنائی دی ہے...... مجھے تو ساری رات ہی ڈر لگتا رہا ہے۔''

''رمشا! کوئی چوہا نہیں۔ کل کام والی سے میں نے ساری صفائی کروائی تھی۔ تم خوامخواہ سر پر نہ سوار کرو۔'' شازیہ بیگم نے وارڈ روب سے چادر نکالتے ہوئے کہا۔

''نہیں مما...... واقعی میں وہاں چوہا ہے......'' اس نے ماں کی طرف دیکھے بغیر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

من موہنی صورت والی عرشیہ اور اس کی والدہ عالیہ کے ساتھ چند سال پہلے ایک بڑا سانحہ ہو چکا تھا۔ عالیہ بیگم کے شوہر کاروباری سلسلے میں کراچی گئے اور وہاں ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ ان کا جسدِ خاکی واپس لوٹا تو عالیہ بیگم کو اپنی زندگی گھپ اندھیروں کی نذر ہوتی دکھائی دی۔ عالیہ بیگم غیروں میں بیاہ کر گئی تھیں۔ چند ہفتے انہوں نے سسرال میں گزارے اور پھر...... ایک جھلسا دینے والی دوپہر میں ان کے بڑے بھائی امجد چپ چاپ اپنی بیوہ بہن اور بھانجی کو گھر لے آئے تھے۔ اس دن بھائی کی گاڑی میں اے سی نے خوشگوار ٹھنڈک کر رکھی تھی۔ باہر تیز روشنی تھی لیکن عالیہ بیگم کو اپنی دنیا میں تیرگی اور تپش کے سوا کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن اسی دم عرشیہ کا لمس، اس کا خیال ان کے اندھیروں میں روشنی کی کرن بن کر اتر آتا تھا۔ عرشیہ کی عمر اس وقت صرف بارہ برس تھی۔

یہاں بھائی امجد کے دو بچے تھے۔ بڑا بیٹا اور چھوٹی بیٹی۔ بھابی کا رویہ تو عالیہ بیگم کے ساتھ لیا دیا ہی تھا، پر بچے خاص طور پر عرشیہ اور رمشا آپس میں خوب کھیلتے تھے۔ عالیہ بیگم کے بھائی امجد بھی عرشیہ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ عرشیہ اور اپنے بچوں کے درمیان فرق نہ کریں۔ عالیہ بیگم نے بھائی کے منع کرنے کے باوجود عرشیہ کے اسکول میں جاب شروع کر دی تھی۔ اب گھر کے کام کاج کے ساتھ ساتھ خرچہ بھی شیئر کرتی تھیں لیکن کوشش کے باوجود انا اور روایتی سوچ کی اس دیوار کو نہ گرا سکی تھیں جو ان کی بھابی شازیہ نے اپنے اور ان کے درمیان قائم کر لی تھی۔ بہر حال...... عالیہ بیگم اس بات کو دیکھ کر خوش تھیں کہ عرشیہ اور رمشا ایک دوسرے کے ساتھ بہنوں کی طرح رہنے لگی ہیں۔

مصلحت پسندی جہاں اکثر فائدہ مند ثابت ہوتی ہے وہاں اکثر ڈھکے چھپے اختلافی نقصانات بھی کر دیتی ہے۔ عالیہ کے بھائی امجد قریبی رشتوں کے حوالے سے حساس طبیعت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بہن کے گھر آنے کے بعد انہوں نے عرشیہ اور اپنی بیٹی رمشا کے درمیان کبھی فرق نہیں کیا تھا۔ وہ جو چیز بھی رمشا کے لیے لے کر آتے، وہی چیز عرشیہ کو بھی ملتی تھی۔ تہواروں اور سالگراہوں کے موقعوں پر اکثر ان کے کپڑے ایک جیسے ہی ہوتے اور پھر سب سے اہم چیز جس نے رمشا کے دل میں عرشیہ کے لیے رفتہ رفتہ نفرت کا بیج بویا، وہ اس کے والد کا انکار تھا...... اس کی ہر اس خواہش اور تقاضے کے لیے، جو وہ رمشا کے ساتھ ساتھ عرشیہ کے لیے بھی پورا کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ عرشیہ اور رمشا نے ایک ساتھ ہی میٹرک کے امتحانات دیے تھے۔

''بابا...... پاس ہونے کی خوشی میں کیا انعام دے رہے ہیں مجھے؟'' رمشا نے فرطِ محبت سے باپ کی گردن کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''بتاؤ بیٹا جی! آپ کو کیا چاہیے؟'' عالیہ کے بھائی امجد نے بیٹی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی اور آپ کو پتا ہی ہے — مجھے جے سیون چاہیے۔'' رمشا نے ایک مشہور موبائل کمپنی کے لیٹسٹ ورژن کا نام لیا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں مان تھا، یقین تھا۔ امجد کچھ دیر سوچتے رہے، پھر گویا ہوئے۔

''رمشا بیٹی...... بات دراصل یہ ہے کہ...... جو موبائل تم چاہ رہی ہو، وہ کافی مہنگا ہے۔ میں تمہیں تو لے کر دے دوں لیکن پھر بیٹا...... عرشیہ کے دل میں خیال آئے گا کہ میرے پاس ایسا موبائل نہیں ہے اور...... چلو خیر...... کوئی بات نہیں...... تم چند ماہ انتظار کر لو۔ میں جب لوں گا تو انشاء اللہ تم دونوں کو لے کر دوں گا۔'' اور یہ پہلا موقع تھا جب رمشا نے عرشیہ کے لیے اپنے دل میں باقاعدہ حسد اور نفرت کے جذبات محسوس کیے اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ کئی مواقع آئے، کئی باتیں ہوئیں جب رمشا نے باپ کی محبت اور اپنے حق میں عرشیہ کو اپنے برابر اور پورا پورا حصے دار پایا۔ وقت گزرتا گیا۔ رمشا کے دل میں حسد اور بغض کے بیج کی آبیاری ہوتی گئی اور وہ ایک تناور درخت میں بدل گیا۔ بہ ظاہر رمشا اور عرشیہ ایک دوسرے سے ملتے، باتیں کرتے لیکن کوئی نہیں جان سکا کہ رمشا کا تن من کس آگ میں جل رہا ہے۔ بلکہ کئی دفعہ رمشا کو عرشیہ کو نیچا دکھانے کا موقع ملا تو اس نے کسی قسم کے تردد سے کام نہیں لیا تھا۔ البتہ عرشیہ کا دل صاف تھا۔ اس

کے پاس تو رمشا ہی رمشا تھی اور وہ اسے بہنوں کی طرح چاہتی تھی۔ عرشیہ بلا کی ذہین اور مضبوط لڑکی تھی۔ اسکول کی جاب اور گھر میں ٹیوشن پڑھا کر عالیہ بیگم جو بھی کما رہی تھیں، اس کی تعلیم پر خرچ کرتی تھیں۔ اسے ایک اچھے مقام پر دیکھنا ان کی زندگی کی امید بھی تھی اور مقصد بھی۔ دوسری طرف رمشا نے میٹرک کیا تو اس کی خالہ نے جھٹ سے اپنے بیٹے عارش کا رشتہ بھیج دیا۔ رمشا کے لیے جس فیملی سے رشتہ آیا تھا، وہ ان کے باقی کے خاندان سے ذرا ہٹ کے تھی۔ یہ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی مہذب تھے۔ عارش کی پوری فیملی ڈاکٹر تھی اور وہ خود بھی ایک نجی کالج سے ایم بی بی ایس کر کے حال ہی میں فارغ ہوا تھا اور ایک نجی اسپتال میں ہی جاب کر رہا تھا۔ ان کا خاندان میں زیادہ ملنا ملانا نہیں تھا۔ بس رمشا کی یہ خالہ اس کے بچپن سے ہی عارش کے لیے اس میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ رمشا کے تو وارے نیارے ہوگئے۔ اس کے والدین بھی بے حد خوش تھے۔ انہوں نے بھی جھٹ سے ہاں کا پیغام بھجوادیا تھا اور چند دنوں میں ان کی منگنی بھی ہوگئی۔ عارش بلاشبہ ایک وجیہہ اور قابل انسان تھا۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ یہ ''رشتہ'' وہ پہلا موقع تھا جس نے رمشا کو عرشیہ کے مقابلے میں ایک امتیازی مقام دیا تھا۔ وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی اور خود کو پوری طرح سے عرشیہ کے مقابلے میں سپیریئر جان رہی تھی لیکن اندر کا بغض بدستور اپنی جگہ قائم تھا۔ شاید قدرت اور ہی فیصلہ کروانا چاہ رہی تھی۔

......گھر کے ایک کمرے میں عرشیہ اور رمشا مصروف گفتگو تھیں۔ عرشیہ نے رمشا کو بتایا کہ کل شام کو اسے فیئرویل پارٹی پر اس کے ساتھ جانا ہے اور اس کے ساتھ ہی پارٹی کا پاس رمشا کی طرف بڑھایا۔

''یار! میں کیسے جاسکتی ہوں۔'' رمشا نے بیزاری سے کہا۔ ''تمہیں پتا بھی ہے کہ عارش کے گھر والے آرہے ہیں، میری عیدی لے کر۔ تم تو جانتی ہو کہ بڑی عید پر بھی کتنا سامان لے کر آئے تھے وہ۔ میں تو سمیٹتے سمیٹتے تھک جاتی ہوں۔ اوہ... پھر کل تو سارا دن میرا سونے کا پلان ہے۔''

عرشیہ کے ہاتھ سے پاس لیے بغیر ہی رمشا نے اپنے نہ جانے کا عذر دے دیا۔ اس وقت اس کی صراحی دار گردن غرور سے اکڑی جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور تیکھا پن عرشیہ کو چیخ چیخ کر اپنی برتری کا احساس دلانا چاہ رہا تھا۔

''لیکن یار...... ویل کم تو شام کو ہے۔ تب تک تو تم فریش ہوجاؤ گی۔'' رمشا کے سپاٹ جواب پر عرشیہ نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا...... اب میں اصل مسئلہ سمجھی۔ یار! پاس کے پیسے مجھ سے لے لو لیکن یقین کرو میں تمہارے ساتھ جا نہیں سکتی۔ بولو کتنے کا آیا تھا پاس......؟'' رمشا نے بے پروائی سے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

عرشیہ دل مسوس کر رہ گئی۔ وہ رمشا کی ایسی ہی بے اعتنائیوں پر ہمیشہ دکھی ہوتی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر لحاف میں منہ دے کر آنسو بہاتی رہی۔ رات کو رمشا کے سسرالی جہاں اس کے لیے عیدی لے کر آئے، وہاں عرشیہ کو بھی اس کی کامیابی کی خوشی میں مٹھائی کا ڈبا اور رمشا جیسا ہی ایک بہترین سوٹ گفٹ کیا۔

''ہم عورتوں کو تو ہانڈی روٹی تک ہی محدود کر کے رکھ دیا ہے معاشرے نے۔ ایسے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ آکر کام کرنا تو بلاشبہ بہت بڑی کامیابی ہے اور وہ بھی ائرفورس میں۔'' رمشا کی ساس نے عرشیہ کے لیے تعریفی کلمات کہے تو رمشا جیسے سرتاپا جھلس کر رہ گئی۔ وہ عرشیہ کے سسرالی نہیں تھے۔ ان کی طرف سے توجہ اور پذیرائی کی حق دار صرف اور صرف وہ ہے۔ رمشا نے سوچا۔ رمشا نے ہمیشہ یہ خیال رکھا تھا کہ اس کے سسرالیوں اور عرشیہ میں ملاقات کم سے کم ہو۔ خاص طور پر وہ عرشیہ اور عارش کے ملنے سے بہت خوفزدہ رہتی تھی۔ اکثر اس کی کوشش ہوتی تھی کہ عارش اور عرشیہ کا آمنا سامنا ہی نہ ہو۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ سیدھی سادی عرشیہ میں ایک خاص قسم کی کشش ہے جو صنف مخالف کو شدت سے اپنی طرف کھینچ سکتی ہے اور وہ عارش کے سلسلے میں اس طرح کا کوئی رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔ آج اپنے سسرالیوں سے عرشیہ کی تعریف سن کر اس کے اندر کی کدورت اور بغض انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اپنے ناپاک ارادے پر عمل کرنے کے لیے اس کا ارادہ کچھ اور مضبوط ہوگیا۔

☆☆☆

گھڑی کی سوئیاں رات پونے گیارہ بجے کا پیغام دے رہی تھیں۔ رمشا نے اپنے کمرے کی لائٹس آف کررکھی تھیں۔ اس اندھیرے میں بھی اس کی آنکھوں میں جلتی انتقام کی سرخی واضح ہو رہی تھی۔ وہ بند دروازے کے ساتھ ہی کھڑی تھی اور کان پوری طرح قدموں کی چاپ پر لگے تھے۔ رات گیارہ بجے۔ یہ وہی وقت تھا جب عرشیہ روزانہ بڑی پابندی کے ساتھ کچھ وقت بیسمنٹ کے اسٹڈی روم میں گزارتی تھی اور پھر...... عرشیہ کے قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ جیسے ہی عرشیہ نے بیسمنٹ کی سیڑھیاں اترنا شروع کیں، رمشا نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

''چوہا......'' وہ چیختی ہوئی دیوانہ وار سیڑھیوں کی طرف دوڑی۔ عرشیہ نے رمشا کو اس قدر خوفزدہ دیکھا تو اسے تھامنے کے لیے بازو پھیلائے لیکن عرشیہ خود کو حواس باختہ ظاہر کرتے ہوئے پوری قوت سے عرشیہ سے ٹکرا گئی۔ عرشیہ ہوا میں اچھل کر بہت بری طرح سے کمر کے بل سیڑھیوں پر لڑھکتی چلی گئی۔

☆☆☆

عرشیہ کو ایک سرکاری اسپتال میں داخل ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی فریکچر سے تو بچ گئی تھی لیکن ''ورٹیبرا'' میں خلا پیدا ہو گیا تھا جس کا حل صرف اور صرف آپریشن تھا۔ آپریشن کے بعد بھی بات امید کی ہی تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں پر دوبارہ کھڑی ہو سکے گی اور نارمل زندگی گزارے گی۔ عرشیہ اور اس کی والدہ عالیہ بیگم کی زندگی میں جیسے پھر سے اندھیرے امڈ آئے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا جس کی اتھاہ گہرائی میں سب کچھ ڈوب کر رہ گیا تھا۔ دوسری طرف رمشا نے بڑی صفائی اور چالاکی سے اس معاملے کو حادثے کی شکل دی تھی جبکہ اس کے پیچھے کئی دنوں پر مشتمل پوری پلاننگ تھی اس کی۔ وہ عرشیہ سے ایسا زبردست بدلہ لے سکے گی، اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اندر سے سرشار تھی۔ ظاہری طور پر خود کو عرشیہ کے لیے دکھی ظاہر کرتی تھی۔ پھر اسی دوران میں رمشا اور اس کی والدہ شازیہ بیگم شادی کی شاپنگ کی غرض سے مہینے ڈیڑھ مہینے کے ویزے پر دبئی چلی گئیں اپنے عزیزوں کے پاس۔ وقتِ رخصت شازیہ بیگم نے کہا۔

''عالیہ بہن! عرشیہ کی بڑی پریشانی ہے۔ دل تو نہیں کرتا جانے کو، پر کیا کروں۔ تمہیں تو پتا ہے اس کی خالہ نے اسی سال کے آخر کی تاریخ ڈال دی ہے شادی کی۔ مزید دیر کرنے کا فائدہ کوئی نہیں۔ میں نے سوچا کہ چلو چھوٹی بہن سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور رمشا کے لیے زیور اور کچھ چیزیں خرید لوں گی۔''

بے چاری عالیہ بیگم جو عرشیہ کے ساتھ اس حادثے کے بعد بالکل ہی چپ ہو گئی تھیں، خالی خالی نظروں سے اپنی بھابی کے بناوٹی رویّے اور مصنوعی تاثرات کو دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

عرشیہ کا کیس کچھ پیچیدہ تھا۔ اسپتال والوں نے خود ہاتھ ڈالنے کے بجائے عرشیہ کو ایک نجی اسپتال منتقل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کی حالت دن بہ دن بگڑ رہی تھی۔ والدہ اور ماموں پریشانی سے بے حال ہو رہے تھے۔ لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ یہاں نئے اسپتال میں ڈاکٹر عارش کی موجودگی نے جیسے ان کی ساری مشکلات آسان کر دیں۔ عرشیہ کی والدہ ڈاکٹر عارش کا شکریہ ادا کرتے نہ تھکتیں اور یہیں پر عرشیہ کا کامیاب آپریشن بھی ہوا۔

ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ وہ ائرفورس میں تو اپنا کیریئر شاید شروع نہیں کر سکتی تھی لیکن بالکل نارمل طریقے سے زندگی گزار سکتی تھی۔ ڈاکٹر عارش کے گھر والے بھی آئے اور انہوں نے بھرپور طریقے سے عرشیہ اور اس کی والدہ کی دلجوئی کی۔ آپریشن کے تیسرے چوتھے دن کی بات ہے۔ رات ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ عرشیہ تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ عالیہ بیگم بھی پاس ہی ٹوسیٹر پر تکیہ لگائے سو رہی تھیں۔ یہ ایک زبردست قسم کا وی آئی پی روم تھا اور ڈاکٹر عارش کے توسط سے ہی انہیں مہیا کیا گیا تھا۔ موسم بدل چکا تھا۔ پنکھے تو نہیں چلنا شروع ہوئے تھے لیکن کمبل میں اکثر اب گرمی لگنے لگتی تھی۔ عرشیہ بھی اسی کشمکش سے گزر رہی تھی۔ اسے حبس محسوس ہو رہا تھا لیکن پنکھا چلانے کے لیے وہ اپنی والدہ کو بے آرام نہیں کرنا چاہ رہی تھی اور بیڈ کے ساتھ والی سلائڈنگ ونڈو تو وہ بالکل بھی نہیں کھولنا چاہتی تھی...... اس وقت تو بالکل بھی نہیں۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور ڈاکٹر عارش اندر داخل ہوئے۔

''اوہو...... آنٹی تو سو رہی ہیں۔ میں نے خوامخواہ بے آرام کیا۔ اصل میں آج نائٹ ڈیوٹی تھی میری۔ آپ کے روم کی لائٹ جلتی دیکھی تو سوچا آپ شاید جاگ رہے ہیں تو...... سلام دعا ہو جائے۔'' عارش نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''اور...... کیسا رہا دن آپ کا، عرشیہ...... اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟'' عارش آہستہ آواز میں بولتے ہوئے قریب ہی چیئر پر بیٹھ گیا۔

''پہلے سے بہتر ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ!''

''اس میں شکریے کی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ مجھے اس سے زیادہ کرنا چاہیے تھا۔ آپ صرف مریضہ ہی نہیں، عزیزہ بھی تو ہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرایا۔

دونوں کچھ دیر تک دھیمی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر عارش کے لب و لہجے سے پُرخلوص ہمدردی اور انسیت جھلکتی تھی۔ عرشیہ نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''رمشا سے آپ کی بات ہوتی ہے؟''

''ہاں، کبھی کبھی...... لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''اس نے بتایا ہی نہیں کہ دبئی سے کب واپسی ہے۔ امی کو بھی اس بارے میں کوئی فون نہیں آیا۔''

''اوہو! شاید آپ کو پتا نہیں چلا۔ ان کی واپسی کچھ لیٹ ہوگئی ہے۔ رمشا کی خالہ بیمار پڑگئی ہیں۔ جگر میں کوئی رسولی ڈائیگنوز ہوئی ہے۔ اگلے ماہ ان کا آپریشن ہے۔ اس آپریشن کے بعد رمشا اور آنٹی واپس آئیں گے لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔''

''ہاں، امجد ماموں نے تھوڑا ذکر تو کیا تھا بیماری کا لیکن تفصیل نہیں بتائی تھی۔'' عرشیہ نے جواب دیا۔

قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں۔ جس عرشیہ کو رمشا اپنے منگیتر عارش کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتی تھی، وہ ہر روز عارش سے مل رہی تھی۔ وہ اس کی مریضہ تھی اور وہ دن میں کم از کم دو بار اس کی مزاج پرسی کے لیے آتا تھا۔ اس سے بات کرتا تھا، اس کی تکلیف بانٹتا تھا۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ عالیہ بیگم کو ضروری کام سے اسپتال سے گھر جانا پڑا اور عارش نے چند گھنٹوں کے لیے خود عرشیہ کی تیمارداری کی۔ یہ مسلسل ملاقاتیں ڈاکٹر عارش کے اندر ایک عجیب سا جذبہ جگا رہی تھیں۔ ایک بے نام سی کشش تھی جو اسے کھینچ کر عرشیہ کے روم کی طرف لے آتی تھی۔ وہ اسے ہر دن پہلے سے بہتر دیکھنا چاہتا تھا اور وہ بہتر ہو رہی تھی۔ اس کے گالوں کی سرخی اور پیشانی کی چمک اسے واپس مل رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں رات کے وقت جب وہ اپنے بستر پر لیٹتا تو رمشا کے بجائے عرشیہ کی صورت اس کی نگاہوں میں گھومنے لگتی۔ وہ خود کو ٹوکتا، اپنے ذہن کو منتشر ہونے سے روکتا۔ کچھ دیر کے لیے یہ کوشش کامیاب رہتی لیکن تب ایک بار پھر وہ اسی سادہ سے چہرے کو اپنے پردۂ تصور پر براجمان پاتا۔ ایسے میں وہ خود ہی اپنا تجزیہ کرنے بیٹھ جاتا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ عرشیہ کے فزیوتھراپسٹ کو فون پر ہدایات دینے کے بعد اس نے اپنا سر تکیے پر ٹکایا اور خاموش لیٹ گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ اس کی بائیں کہنی کے ایک پرانے زخم کو سہلاتا چلا جا رہا تھا۔ عرشیہ کا خیال پھر دماغ میں سما رہا تھا۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ کیا وجہ تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی رمشا کا چہرہ اس کی نگاہوں میں دھندلا رہا تھا۔ اسے اب رمشا کے دبئی سے آنے والے فون کا شدت سے انتظار نہیں ہوتا تھا اور جب فون آتا تھا وہ اس سے جم کر بات نہیں کر پاتا تھا۔ دل کے شیشے میں یہ ایک کیسی لکیر سی نمودار ہوگئی تھی؟ وہ اس لکیر کی موجودگی پر غور کرتا تو پھر وہی خیال اس کے دل و دماغ پر کوڑے برسانے لگتا جو عرشیہ کو پیش آنے والے حادثے کے وقت اس پر حملہ آور ہوا تھا۔

اس روز رمشا کی امی نے ہی فون پر عارش کو خبر سنائی تھی کہ عرشیہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔ واقعے کی تفصیل سے عارش کو پتا چلا تھا کہ رمشا اپنے کمرے میں کسی چوہے کی موجودگی سے ڈر کر بھاگی اور زینے کے قریب عرشیہ سے جا ٹکرائی، جو اسٹڈی کے لیے بیسمنٹ میں جا رہی تھی۔

بظاہر اس تفصیل میں چونکنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ایک حادثہ ہی نظر آتا تھا۔ ایک ایسا حادثہ جس نے بلند پروازی کے سپنے دیکھتی ہوئی عرشیہ کو اچانک ہی عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا۔ وہ جو بی اے ایف میں ایڈمیشن کے بعد خود کو ایجوکیشن کی فیلڈ میں ایک روشن منزل کی طرف گامزن دیکھ رہی تھی، اچانک ہی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوب گئی تھی...... ہاں...... بے شک یہ ظاہری طور پر ایک حادثہ ہی نظر آتا تھا لیکن ماضی کے ایک واقعے نے عارش کے ذہن میں کھلبلی سی مچا دی تھی۔ اسے یاد آیا تھا کہ اس کے بچپن میں بھی تو اسی قسم کا ایک واقعہ ذرا کم شدت کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس وقت رمشا غالباً چھٹی کلاس میں تھی۔ عارش آٹھویں میں ہوگا۔ سردیوں کی چھٹیوں میں وہ رمشا کے گھر آیا ہوا تھا (ان دنوں عرشیہ اور اس کی بیوہ والدہ بھی رمشا کے گھر شفٹ ہو چکے تھے)۔ ایک دن رمشا ایسے ہی ایک چھپکلی سے ڈر کر بھاگی تھی اور عارش سے آ ٹکرائی تھی۔ عارش سیڑھیوں سے گرا تھا۔ اس کے ایک گھٹنے اور بائیں کہنی پر سخت چوٹیں آئی تھیں۔ وہ چار پانچ دن تک اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا تھا...... اس واقعے کے کوئی چھ ماہ بعد ایک روز رمشا نے ہنستے ہوئے رازداری کے ساتھ اس پر انکشاف کیا تھا کہ وہ تب چھپکلی سے نہیں ڈری تھی بلکہ اس نے جان بوجھ کر اسے سیڑھیوں سے گرایا تھا۔ وجہ بتا کر اس نے عارش کو مزید حیران کر دیا تھا۔ اس کے الفاظ آج تک عارش کو یاد تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''تم عرشیہ کو سائیکل چلانا سکھا رہے تھے۔ میرے بار بار منع کرنے کے باوجود تم باز نہیں آ رہے تھے۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا...... اور میں نے مجبوراً ایسا کر دیا...... بعد میں مجھے افسوس بھی ہوا۔''

برسوں پہلے کی یہ ساری بات رمشا یقیناً بھول چکی تھی۔ باقی اہلِ خانہ بھی شاید بھول ہی چکے تھے مگر عارش نہیں بھولا تھا...... اور اگر بھول بھی گیا تھا تو اس عرشیہ والے واقعے نے سب یاد کرا دیا تھا۔ اب پچھلے کئی ہفتے سے وہ سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ اسے بتدریج اس بات کا پختہ یقین ہوگیا تھا کہ عرشیہ کا سیڑھیوں سے گرنا اور شدید زخمی ہونا محض ایک حادثہ نہیں تھا۔

وہ عرشیہ کی طرف جو ایک غیر معمولی کشش محسوس کر رہا تھا، وہ بھی ہر وقت اسے سخت الجھن میں مبتلا رکھتی تھی۔ وہ سمجھ

نہیں پا رہا تھا کہ اس کشش کی اصل وجہ کیا ہے؟ کیا یہ وہ زیادتی ہے جو رمشا کی طرف سے عرشیہ کے ساتھ ہوئی ہے یا پھر یہ عرشیہ کی سادہ خوبصورتی اور اس کے حسنِ اخلاق کا کرشمہ ہے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ یہ دونوں پہلو ہی اس روز افزوں کشش کی وجہ بن گئے ہوں۔

وہ ایک اور بات بھی محسوس کرتا تھا۔ یہ سب کچھ یکسر یک طرفہ بھی نہیں تھا۔ کسی وقت اسے صاف محسوس ہوتا تھا کہ عرشیہ بھی اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ یہ جذبات ...... سات مقفل دروازوں کے پیچھے چھپے ہوئے کسی دفینے کے مانند تھے۔

☆☆☆

......کوئی دو ماہ بعد جب رمشا اپنی والدہ کے ساتھ لاہور ائرپورٹ پر اتری تو اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ وہ ان تہلکہ خیز تبدیلیوں سے آگاہ ہوچکی تھی جو اس کی غیر موجودگی میں یہاں رونما ہوئی تھیں۔ اسے پتا چل چکا تھا کہ اس کے ساتھ عارش کی سردمہریوں کی اصل وجہ کیا ہے؟ اس کو یہ قیامت خیز خبر بھی مل چکی تھی کہ عارش نے عرشیہ کا علاج کرتے کرتے خود کو بھی ایک ''روگ'' لگایا ہے۔ اس نے عرشیہ کو باقاعدہ پروپوز کیا تھا...... عرشیہ اور اس کی والدہ کے شدید انکار کے باوجود وہ اپنے مطالبے پر ڈٹا ہوا تھا۔ لاڈلے بیٹے کے سامنے اس کے اپنے والدین کی بھی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ عارش ایک نہایت گہرے لیکن طوفانی عشق کا شکار ہوا ہے۔

لاہور پہنچنے تک رمشا اور اس کی والدہ شازیہ بیگم کو یہ احساس ہوچکا تھا کہ کھیل ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے...... پھر بھی امید کی ایک کرن ابھی تک رمشا کے اندر موجود تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ جب براہِ راست عارش سے ملے گی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے گی تو اسے ارادہ بدلنے پر مجبور کردے گی اور شاید وہ انگوٹھی جو عارش بے رحمی سے اتار چکا ہے، دوبارہ پہن لے گا۔ وہ اپنا ایک آخری زور لگانا چاہتی تھی۔

لاہور پہنچتے ہی رمشا نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ یہی تھا کہ عارش سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات اسی ریسٹورنٹ میں ہوئی جہاں وہ اس سے پہلے بھی ملا کرتے تھے...... وہی فائیو اسٹار ماحول...... لیکن آج صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔

ان دونوں کی یہ ملاقات دھماکا خیز ہی نہیں، نتیجہ خیز بھی ثابت ہوئی۔ عارش نے صاف لفظوں میں اس سے کہہ دیا کہ وہ ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ وہ سب کچھ ختم ہوچکا ہے جو کبھی ان دونوں کے درمیان تھا۔

وہ پھنکاری۔ ''تم سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ تم بے وفا ہو، دغاباز اور مکار ہو۔''

وہ بولا۔ ''رمشا! تم مکاری کا لفظ بولتے ہوئے کچھ زیادہ جچتی نہیں ہو۔ اس معاملے میں، میں تو کیا شاید کوئی بھی تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ تم نہایت اعلیٰ پائے کی کینہ پرور بھی ہو۔''

رمشا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عارش کا منہ نوچ لے۔ پتا نہیں اس نے کس طرح خود پر ضبط کر رکھا تھا۔ وہ غصیلی آواز میں بولی۔ ''کیا کردیا ہے میں نے؟ تم نے کیا مکاری دیکھی ہے مجھ میں؟''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''پہلی مرتبہ بہت عرصہ قبل دیکھی تھی اور تم نے اس کا اعتراف بھی کیا تھا۔ تم شاید اسے معمولی بات سمجھ کر بھول چکی ہو لیکن میری کہنی پر اور میرے دل پر ابھی تک اس کا ہلکا سا نشان موجود ہے۔'' اس نے اپنی کہنی عریاں کرکے رمشا کو دکھائی۔

وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی کہنی کا وہ نشان دیکھنے لگی جو کئی برس پہلے سیڑھیوں پر لڑھکنے کے سبب بنا تھا...... پھر دھیرے دھیرے رمشا کے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہوگیا...... وہ نتیجے پر پہنچ رہی تھی اور نتیجہ نکالنا کوئی بہت زیادہ دشوار نہیں تھا...... یقیناً اس کے خیالات تیزی سے سفر کرکے عارش کی کہنی سے عرشیہ کی ریڑھ کی ہڈی تک جا پہنچے تھے...... ہاں...... دونوں واقعات میں فرق صرف ...... چھپکلی اور چوہے کا ہی تو تھا، باقی تو سب ایک جیسا تھا۔

رمشا کا چہرہ پہلے سرخ ہوا پھر بتدریج زرد پڑ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ نمودار ہوچکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، کوئی وضاحت کرتی، کوئی عذر لنگ پیش کرتی، عارش نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''رمشا! تم نے عرشیہ سے اس کی زندگی کا حسین ترین سپنا چھین لیا۔ وہ پی اے ایف کے گولڈن چانس سے محروم ہوگئی مگر اس کے بدلے میں تمہیں مجھ کو کھونا پڑا ہے...... ہاں رمشا! تم کھو چکی ہو مجھے......''

وہ یک لخت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں مصمم ارادوں کی بلند و بالا لہر جھلک دکھا رہی تھی۔ ''خدا حافظ رمشا! میں جا رہا ہوں، پرسوں ہفتے کی شام میرا اور عرشیہ کا نکاح ہے۔''

وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی رہی...... بیٹھی رہی اور اسے جاتا دیکھتی رہی۔

⌘⌘⌘



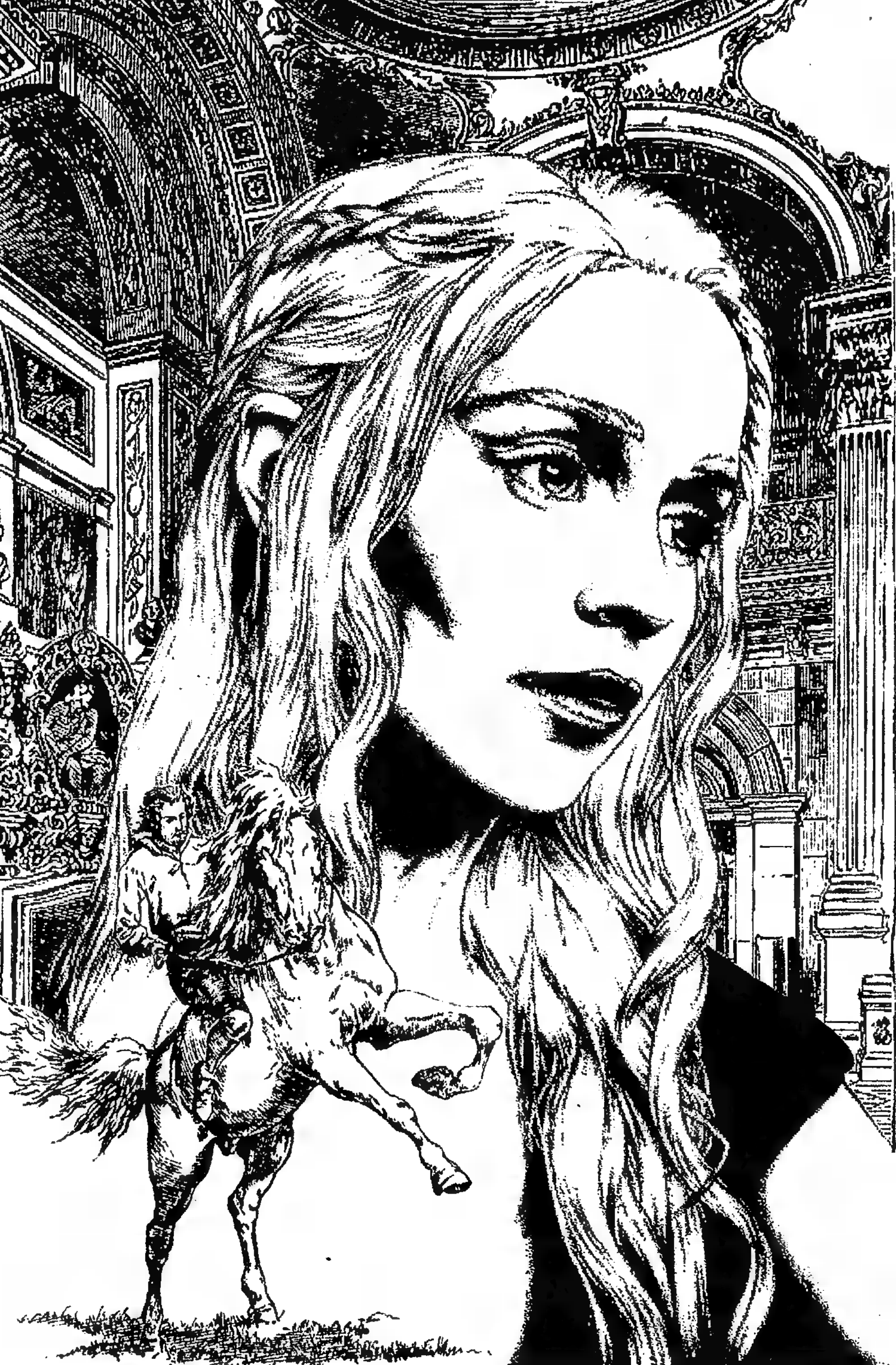
ساشا

عمر عبداللہ

آٹھواں حصہ

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دانا باپ کا بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کے "آگاہ" رہنے کی صلاحیت کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور آنکھوں میں سنہرے خواب تھے' جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ساشا کا تعلق ڈاکوؤں کے ایک ایسے گروہ سے ہے جس کا سردار اس کا اپنا باپ تھا۔ ساشا کا باپ ڈاکو بننے سے قبل ایک عرب امیر کے دربار سے وابستہ تھا اور امیر کے بیٹے کے اتالیق کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ان فرائض کی انجام دہی کے دوران ہی اسے کچھ ایسے بدترین حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ عزت دار زندگی چھوڑ کر ڈاکو بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ مختلف قومیتوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل اپنا گروہ ترتیب دیتا ہے جو طویل عرصے کے لیے کسی ایک جگہ سکونت اختیار نہیں کرتا۔ ایسے گروہ کے درمیان رہ کر جنگلوں اور بیابانوں میں پرورش پانے والا ساشا ایک ایسے نوجوان کے طور پر سامنے آتا ہے جسے فنون حرب اور سخت جانی میں کمال حاصل ہے اور جو طرح طرح کی زبانیں بولنے اور سمجھنے میں مہارت رکھتا ہے۔ گروہ کے بیشتر افراد کی رائے کے مطابق وہ اپنے باپ کا بہترین جانشین ہے لیکن اس منظم گروہ میں ایک ایسا سازشی ٹولا بھی موجود ہے جو ساشا کی جگہ اپنے آدمی کو سردار دیکھنا چاہتا ہے۔ ساشا کے باپ کی موت پر اس ٹولے کو سر اٹھانے کا موقع ملتا ہے اور سرداری پر قبضے کے لیے پورا زور لگایا جاتا ہے۔ ان نامساعد حالات میں ساشا کو اپنی زندگی بچانے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ دشمنوں سے چھپتا چھپاتا اور بھاگتا ہوا وہ ایک بااثر امیر کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور اسے مشکوک جان کر قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس قید خانے میں اپنی زبان دانی کی صلاحیت کی بنیاد پر وہ ایک اتفاق کا فائدہ اٹھا کر امیر کی نظروں میں سرخرو ہونے کا موقع حاصل کر لیتا ہے۔ امیر کا قرب حاصل کرنے کے بعد جہاں وہ کچھ اہم رازوں سے واقف ہوتا ہے، وہیں امیر کی خوبصورت بیٹی کا بھی اسیر ہو جاتا ہے۔ امیر کی اپنے چھوٹے بھائی سے شدید دشمنی اور اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ اس پراسرار خزانے کا راز ہے جو انہیں نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے اپنے باپ سے ملا ہے۔ ایک معین مدت مکمل ہونے کے بعد اس خزانے کا راز کھلنے والا ہے اور امیر بڑا بھائی ہونے کے ناتے خود کو خزانے کے راز کا حق دار سمجھتا ہے لیکن حقیقتاً اس کی بے راہ روی اور بداخلاقی کے باعث اس کا باپ اسے اس حق سے محروم کر کے چھوٹے بیٹے کو یہ حق تفویض کر دیتا ہے۔ خزانے کی تلاش میں پیش آنے والی دشواریوں اور پیچیدگیوں سے گزرتا ساشا کئی ذیلی معاملات میں بھی الجھا رہتا ہے۔ ادھر کفار سے برسرِ پیکار مسلمانوں کا ایک قافلہ بہادر داؤد کی راہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ داؤد ساتھیوں سمیت ایک بستی میں پڑاؤ ڈال دیتا ہے تاہم پناہ گزینوں میں شامل سارہ نامی لڑکی اور راہباؤں کے پیچھے کچھ لوگ انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش میں ہیں۔ بستی میں قیام کے دوران بھی انہیں کافی نقصان اٹھانا پڑا جس کی وجہ سے وہ سردار پر شک کرتے ہیں۔ ادھر ساشا پڑاؤ کے دوران انسانی آنکھ سے مشابہ ایک غار کی طرف بڑھتا ہے مگر وہاں اسے سانپ ڈس لیتا ہے اور باہر سے کوئی غار کا دہانہ بند کر دیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

داؤد سخت مضطرب تھا۔ ایک طرف سردار مراد کی حالت بگڑتی جا رہی تھی تو دوسری طرف محاصرین کا اشتعال بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی ہلاکت نے ان کے غم وغصے میں اضافہ کر دیا تھا اور اس بات کی کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی کہ ان سے مزید مذاکرات کر کے ان کے جذبات کو قابو میں کیا جا سکے۔ داؤد انہیں ان کے اس رویے میں حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ سردار مراد پر حملے کے نتیجے میں ہی سہی، نہتے لوگوں کا بے دردی سے قتل اس کے لیے رنج کا باعث بنا تھا اور وہ مرنے والوں کے لواحقین کے ردعمل کی طرف سے متفکر تھا۔ ایک طرف اسے اپنے باہر موجود ساتھیوں کی فکر تھی تو دوسری طرف اپنے ساتھ یہاں محصور خواتین کے تحفظ کے لیے تشویش میں مبتلا تھا۔ محاصرین کا کوئی سخت ردعمل ان سب کی جانوں کو خطرے میں ڈال سکتا تھا۔

''کیا بات ہے محترم! میں آپ کے چہرے پر بہت زیادہ تفکر کے سائے دیکھ رہا ہوں۔'' اپنی سوچوں میں گھرا وہ چھت کی منڈیر سے جھانک کر باہر موجود محاصرین کا جائزہ لے رہا تھا کہ اپنے قریب سے سنائی دینے والی آواز پر پلٹ کر دیکھا، اس کے سامنے کبیر کھڑا تھا۔

''جو کچھ تم لوگوں نے کیا ہے اس کے بعد میں متفکر ہونے کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔'' اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں پھیل گئیں اور تلخی سے جواب دیا۔

''جو کچھ ہوا اس میں میرا براہِ راست کوئی کردار نہیں تھا۔ بس اتنی بات ہے کہ میں سردار پر حملے کے بعد اس کے بپھر جانے والے ساتھیوں کو قابو میں نہیں کر سکا۔'' اس نے بے نیازی سے اپنی صفائی پیش کی۔

''سردار پر حملہ کرنے والے کے پاس خنجر کی موجودگی کی ذمے داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے تھا کہ کوئی شخص ہتھیار سمیت سردار تک نہ پہنچ سکے۔'' اس کا تیز لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ کبیر کی وضاحت اس کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

''میرا خیال ہے، ہم آرام سے بیٹھ کر اس سارے معاملے پر گفتگو کرتے ہیں۔ آیئے میرے ساتھ نیچے

چلیے۔'' کبیر نے اس کے تیز لہجے کا بُرا مانے بغیر رسان سے اسے پیشکش کی جسے وہ رد نہ کرسکا۔

''سردار مراد کی حالت تشویش ناک ہے، ایسے میں اگر محاصرین نے حملہ کر دیا تو تم سمیت دوسرے لوگ شاید دل جمعی سے دفاع نہ کرسکیں۔'' کبیر کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''آپ ضرورت سے زیادہ تشویش کا شکار ہیں۔'' کبیر اس کی بات سن کر خفیف سا مسکرا کر بولا اور پھر پلٹ کر دیوار گیر الماری کھول کر اس میں سے سرخ مشروب سے بھری ایک بوتل اور گلاس باہر نکالا۔

''یہ نوش فرمایئے۔ امید ہے آپ کے اعصاب کی کشیدگی میں کمی واقع ہوگی۔'' اس نے گلاس بھر کر پیش کیا۔ داؤد جو اسے کوئی سخت جواب دینے کا سوچ رہا تھا، محض گھور کر رہ گیا اور گلاس تھام کر اسے ہونٹوں سے لگالیا۔ پہلے ہی گھونٹ نے اسے چونکا دیا۔ یہ لاجواب ذائقہ اور خوشبو اسے بھولے نہیں تھے۔ اس کی سوالیہ نظریں کبیر کی نظروں سے ٹکرائیں۔

''پہلے آرام سے مشروب نوش فرمایئے۔ آپ کو آپ کے سوالات کے جواب بھی مل جائیں گے۔'' کبیر اس کی نظروں کا سوال پڑھ کر رسانیت سے بولا تو اس نے بھی مزید حجت میں پڑے بغیر وہ خوش ذائقہ اور فرحت بخش مشروب گھونٹ گھونٹ کر کے حلق سے اتارنا شروع کر دیا۔ جوں جوں مشروب کا گلاس خالی ہو رہا تھا وہ اپنے اندر عجیب سی طمانیت اور راحت اترتی محسوس کر رہا تھا۔

''وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ گلاس خالی کر چکا تو کبیر نے دھیمی آواز میں کہا۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ محاصرین کی موجودگی میں، میں یہاں سے نکل کر باہر کیسے جاسکتا ہوں؟'' اس نے ''کون'' کا سوال نہیں اٹھایا تھا کہ جواب پہلے ہی مشروب کی صورت میں اسے مل چکا تھا۔

''وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ آپ صرف آمادگی ظاہر کیجیے۔''

''یہ ملاقات کب ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔

''شام ڈھلنے ہی والی ہے۔ پوری طرح تاریکی چھا جائے تو میں آپ کے یہاں سے جانے کا انتظام کر دوں گا۔''

''میں تو آج تک تمہیں سردار مراد کے وفاداروں میں شمار کرتا رہا ہوں۔'' اسے کبیر کا کردار کھل جانے پر حیرت تھی۔

''میں صرف حق کا ساتھ دینے والوں میں سے ہوں۔'' اس کا لہجہ مستحکم تھا، یعنی وہ اپنے کردار کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن تھا۔ پھر اس نے مزید وضاحت کی۔

''شاید آپ کے دل و دماغ میں میرے لیے کچھ منفی خیالات ابھر رہے ہوں لیکن میں خود کو خوش نصیب تصور کرتا ہوں کہ قدرت نے مجھے ایک ایسے شخص تک پہنچا دیا جو زندگی کے لیے کچھ اعلیٰ تصورات رکھتا ہے۔''

''ان صاحب میں یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ میں نے خود بھی اپنا دل ان کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کیا تھا۔'' داؤد اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کے اس اعتراف پر کبیر کا چہرہ کھل اٹھا اور جوش سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

''فی الحال آپ آرام کیجیے۔ تاریکی چھانے پر میں خود آپ سے رابطہ کرلوں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' داؤد اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ کبیر کے مشورے کے مطابق وہ واقعی کچھ دیر آرام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن راستے میں ایک ملازم نے اطلاع دی کہ سردار مراد اسے یاد کر رہا ہے۔ وہ سردار کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر دستک دے کر اجازت حاصل کرنے کے بعد اندر داخل ہوا تو نظریں سیدھی بستر پر دراز سردار پر پڑیں۔ اسے لگا کہ سردار کے چہرے کی سیاہی کچھ اور بھی بڑھ گئی ہے۔ وہ عجیب سی کیفیات کا شکار اس کے بستر کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' سردار نے نحیف سی آواز میں کہا تو وہ اس کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بستر کی دوسری طرف سردار کا معالج موجود تھا اور اس کی کلائی تھامے نبض دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں درج تشویش پڑھ کر یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا کہ سردار کی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہے۔

''میں معذرت خواہ ہوں کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکا۔'' اس کی دھیمی آواز میں شرمندگی کا عنصر غالب تھا۔

''یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ فی الحال سب سے اہم مسئلہ آپ کا صحت یاب ہونا ہے۔ اپنے ذہن پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر معالج سے اس سلسلے میں تعاون کیجیے۔'' وہ زندگی اور موت کے درمیان معلق اس شخص سے کوئی سخت بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ میں بچ سکوں گا، اسی لیے مرنے سے پہلے تم سے معافی مانگ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔'' سردار کی آواز لحہ بہ لحہ آہستہ ہوتی جارہی تھی اور اس کی بات سمجھنے کے لیے اسے اپنی پوری توجہ اس کی آواز پر مرکوز کرنی پڑ رہی تھی۔

''کاش میں تم لوگوں کے لیے کچھ کر پاتا۔'' اس کی اندر دھنس جانے والی آنکھوں میں سے آنسو لڑھک کر

کنپٹیوں پر بہنے لگے۔ اس بار داؤداس کی دل جوئی کے لیے بھی کچھ نہیں بول سکا۔ اس کی بار بار کی معذرت اور پچھتاوے کے اظہار سے اسے لگا تھا کہ ان کے ساتھ جو کچھ برا ہوا، اس میں یقیناً سردار کا ہاتھ تھا۔

''یہاں کی الجھنوں کو چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کو بچانے کی فکر کرو۔'' اسے یہ چھوٹی سی نصیحت کرتے ہوئے سردار کا سانس اکھڑنے لگا۔

''میری درخواست ہے کہ فی الحال آپ یہاں سے چلے جائیں۔ سردار کے لیے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں ہے۔'' معالج نے مضطرب لہجے میں اس سے درخواست کی اور خود پھرتی سے ایک پیالی میں موجود عرق چمچ کی مدد سے سردار کے منہ میں ٹپکانے لگا۔ داؤداس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک بڑے کمرے میں چند لوگوں کے ساتھ عشا کی باجماعت نماز ادا کی۔ اس مکان میں موجود ہر شخص تشویش کا شکار تھا۔ انہیں محاصرین کی طرف سے حملے، غذائی قلت اور باہر موجود اپنے پیاروں کی سلامتی جیسے خدشات لاحق تھے۔ ان لوگوں سے جدا ہو کر وہ ایک بار پھر چھت پر جا پہنچا۔ سوچنے کو بہت کچھ تھا لیکن اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے پر آمادہ نہیں تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا لیکن اسے اپنی یہ کیفیت بری نہیں لگ رہی تھی۔ ایک طرح سے ایسا ہلکا پھلکا پن طاری تھا جس نے عارضی طور پر اسے تفکرات سے آزاد کر دیا تھا۔

''آپ یہاں ہواخوری کر رہے ہیں اور میں آپ کو ادھر رہائشی حصے میں تلاش کر رہا تھا۔'' وہ پتا نہیں کتنی دیر اس کیفیت میں بیٹھا رہا تھا۔ اپنے قریب سے کبیر کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''معاف کرنا دوست! نیند نہیں آ رہی تھی اور اندر گھٹن بھی محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں یہاں چلا آیا۔'' اس نے زحمت کے لیے معذرت چاہی۔

''آپ چلنے کے لیے تیار ہیں؟'' کبیر نے دھیمی آواز میں اس سے دریافت کیا۔

''بالکل!'' وہ اپنی جگہ چھوڑ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔'' کبیر نے مزید کوئی اضافی بات نہیں کی اور چھت سے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس کی پیروی کی۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ عقبی حصے کی طرف جانے لگا۔ داؤداس کے پیچھے پیچھے تھا۔ رات کے اس پہر بیشتر روشنیاں گل کر دی گئی تھیں، اوپر سے آسمان بھی چاند سے محروم تھا اور اکا دکا تارے ہی اپنی جھلک دکھا رہے تھے جن کی روشنی تاریکی کو کم کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اسے اپنے آگے چلتا کبیر بس ہیولے کی طرح ہی دکھائی دے رہا تھا۔ عقبی دروازے کے قریب پہنچنے پر ہیولوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

''یہ شخص آپ کو مطلوبہ مقام تک پہنچا دے گا اور صبح سے پہلے آپ کی یہاں واپسی کی ذمے داری بھی اسی کی ہوگی۔'' کبیر نے ایک دبلے پتلے ہیولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔

''تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟'' وہ ذرا فکرمند سا مستفسر ہوا۔

''میری یہاں موجودگی ضروری ہے۔ آپ بالکل بے فکر ہو کر اس کے ساتھ تشریف لے جائیں۔ یہ اپنی ذات سے بڑھ کر آپ کی جان کی حفاظت کرے گا۔'' کبیر نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

''میرے بازو ابھی اتنے کمزور نہیں ہوئے ہیں کہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے کسی دوسرے کی ضرورت پڑے۔'' وہ برا مان کر بولا اور کبیر کو معذرت یا وضاحت کا موقع دیے بغیر مذکورہ شخص سے مخاطب ہوا۔

''چلو، کہاں چلنا ہے؟'' اس شخص نے یوں کبیر کی طرف دیکھا جیسے اس کی اجازت کا طلب گار ہو۔

''جاؤ اور خیال رکھنا کہ مہمان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔'' اس نے ہدایت دی تو وہ ہیولا اسے لے کر عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے رہ جانے والے باقی ہیولوں نے دروازہ بند کر لیا۔ اب وہ اپنے اجنبی راہنما کے ساتھ تاریکی میں آگے بڑھ رہا تھا اور اندھیرے میں نظریں ان محاصرین کو کھوج رہی تھیں جن کے بارے میں اسے یقین تھا کہ سردار مراد کی رہائش گاہ کا محاصرہ کرتے ہوئے انہوں نے عقبی حصے کو ہرگز بھی نظرانداز نہیں کیا ہوگا۔

''رک جاؤ۔'' ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ اچانک دو افراد ان کے راستے میں حائل ہو گئے۔

''کون ہو تم؟'' روکنے کے ساتھ ہی سخت لہجے میں استفسار کیا گیا۔

''زہر۔'' اس کے راہنما کا جواب عجیب تھا۔

''زہر کس کا ہے؟'' جواب میں اس سے بھی عجیب استفسار کیا گیا۔ داؤد محسوس کر سکتا تھا کہ سوال کرنے والے کا لہجہ اب پہلے جیسا سخت نہیں ہے۔

''جس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔'' اپنے راہنما کے اس جواب نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ طے شدہ اشاروں میں

ایک دوسرے کی شناخت سے آگہی حاصل کر رہے ہیں۔

''ہاں مگر اس کے چاہنے والوں کے لیے تو بہشت کی شرابیں تیار رکھی ہیں۔''

شناخت کا عمل مکمل ہوا اور انہیں وہاں سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ سردار مراد کی رہائش گاہ میں محصور کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کے ساتھ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لیے یہ سخت محاصرہ بے معنی ہے اور وہ جب چاہیں اس محاصرے سے گزر کر آ جا سکتے ہیں۔

اس کا راہنما اسے مختلف راستوں پر سے گزارتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ آبادی سے کنی کترا کر گزریں، اس لیے راستہ قدرے طویل ہو گیا۔ بہر حال وہ اس مکان تک پہنچ گئے جو داؤد کے لیے انجانا نہیں تھا۔ حسبِ سابق اسے خاموشی سے اس مخصوص کمرے تک پہنچا دیا گیا جہاں وہ پہلے بھی سحر انگیز شخصیت والے نوجوان سے ملاقات کر چکا تھا۔

''خوش آمدید میرے دوست! میں بہت شدت سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔'' نوجوان نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔

''آپ سے دوبارہ ملاقات کی تمنا میرے دل میں بھی تھی۔'' داؤد نے اس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر سچائی سے اعتراف کیا۔

''پاک روحیں ایک دوسرے کی رفاقت کی طلب گار ہوا کرتی ہیں۔'' نوجوان نے مسکرا کر جواب دیا اور اس کا ہاتھ تھامے تھامے ہی اس جگہ تک پہنچ گیا جہاں صاف شفاف چاندنی پر خوبصورت گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔

''یہاں تک آنے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' وہ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ چکے تو اس نے محبت بھرے لہجے میں داؤد سے پوچھا۔

''چھوٹی موٹی تکلیفیں میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ میری اصل پریشانی یہ ہے کہ میرے قافلے کا بہت زیادہ نقصان ہو چکا ہے۔ ہم حسبِ ارادہ اپنا سفر طے کرنے سے محروم ہو گئے ہیں اور اب دو حصوں میں تقسیم ایک دوسرے کے حال سے بے خبر یوں مشکل میں گھرے ہوئے ہیں کہ ہمیں مستقبل کا کوئی فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل نہیں رہی ہے۔'' اس نے ایک ہی سانس میں اپنے سارے اہم مسائل پیش کر دیے۔

''آپ کا شکوہ غلط نہیں ہے لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ نصیب کے آگے سر جھکا دینے میں ہی بھلائی ہے۔'' اس نے سابقہ ملاقات میں ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیا اور بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ سارا نصیب ہی کا کھیل ہے کہ آپ ایک خاص وقت میں اس علاقے میں موجود ہیں اور اس وقت کا فائدہ اٹھا کر حق و باطل کی اس لڑائی میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔'' وہ بہت سلیقے سے اسے اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''حق و باطل کی لڑائی......؟'' داؤد الجھن زدہ سا بڑبڑایا۔ ''جس لڑائی میں دونوں طرف سے میرے مسلمان بھائیوں کو ہی مارا جاتا ہے، اس لڑائی میں، میں حق و باطل کا فیصلہ کس بنیاد پر کروں؟''

''بہت سادہ سی بات ہے۔ حق کبھی کسی کی زندگی مشکل نہیں بناتا اور سردار مراد مذہب کے نام پر ہمارے لیے اللہ کی زمین تنگ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ میں اور میرے ساتھی یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں اور وہ یہاں صرف اپنے پسندیدہ عقائد رائج رکھے۔''

''اس سلسلے میں سردار سے مذاکرات کیے جا سکتے تھے لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد مذاکرات کی امید رکھنا مشکل ہے۔'' وہ نوجوان کی بات سن کر افسردگی سے بولا۔ اس پل اس کی آنکھوں کے سامنے سردار مراد کا لحہ بہ لحہ زندگی سے دور جاتا وجود گھوم گیا تھا۔

''سردار پر حملے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہ سردار کے اپنے اعمال ہیں جنہوں نے لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے اتنی نفرت بھر دی ہے۔''

''سردار مرنے والا ہے اور اس کے بعد شاید ہی کوئی ہو جو مزاحمت کر سکے۔'' اس نے اپنی رائے دی۔

''یہ تمہاری لاعلمی ہے۔ سردار ایک فتنہ طراز بیٹی کا باپ ہے اور اس کی بیٹی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے ایک اشارے پر نوجوان اپنی جوانیاں لٹا دینے میں بھی عار نہیں سمجھتے۔''

''میں واقعی اس سلسلے میں لاعلم ہوں۔'' داؤد نے حیرانی سے اعتراف کیا۔

''وہ پردے میں رہتی ہے اور مرد تو دور کی بات، اجنبی عورتوں کے روبرو بھی آنے سے گریز کرتی ہے لیکن وہ ہے اور اپنے باپ سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔''

''کمال ہے، آپ ایک عورت سے خوفزدہ ہیں۔'' داؤد حیران ہوا۔

''کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عورت بڑے بڑے شہنشاہوں کے تخت الٹ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''

''مجھ سے آپ کیا چاہتے ہیں؟'' داؤد نے اس کا مدعا جاننا چاہا۔

''آپ کے قافلے کی خواتین سردار مراد کی رہائش گاہ پر مقیم ہیں۔ اگر سردار زادی تک رسائی کے لیے ان خواتین کا تعاون حاصل ہو جائے تو ہماری مشکل آسان ہو جائے گی۔'' اس نے اپنا مقصد بیان کر دیا۔ جب وہ یہ بات کہہ رہا تھا تو داؤد کے ہونٹوں سے سرخ مشروب کا گلاس لگا ہوا تھا۔ انوکھی خوشبو اور ذائقے والا یہ مشروب دوران گفتگو ایک خادم نہایت خاموشی سے پیش کر گیا تھا اور حقیقتاً مشروب کی حواس پر چھا جانے والی انفرادیت نے داؤد کی توجہ بانٹ لی تھی۔ شاید اسی لیے مردوں کی لڑائی میں عورتوں کو استعمال کرنے کی تجویز نے اسے جذباتی نہیں کیا تھا۔

''میری ساتھی خواتین ہی کیوں؟ مجھے یقین ہے کہ کبیر اور اس کے ساتھیوں کی طرح آپ کے کچھ وفادار خادماؤں میں بھی شامل ہوں گے۔''

''آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے لیکن سردار زادی بہت چالاک ہے اور خادماؤں پر ایک حد سے زیادہ اعتبار نہیں کرتی۔ آپ کی ساتھیوں کی بات البتہ الگ ہوگی۔ وہ گمان بھی نہیں کر پائے گی کہ ان پردیسی خواتین میں ہماری کوئی مددگار شامل ہو سکتی ہے۔''

''میں کوشش کروں گا کہ کسی خاتون کو اس امر کے لیے راضی کر سکوں۔'' داؤد بہر حال تذبذب کا شکار تھا اس لیے دوٹوک جواب دینے سے قاصر رہا۔

''یہ سوچ کر کوشش کیجیے گا کہ اس پر ہمارے ہی نہیں، آپ کے مستقبل کا بھی دارومدار ہے۔ سردار مراد، اس کی بیٹی اور اس کے کسی دوسرے ساتھی کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ آپ کو آپ کے قافلے سمیت یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ موجودہ حالات میں ہم بھی صرف اسی صورت میں آپ کی کوئی مدد کر سکتے ہیں کہ ہمیں اس علاقے میں بالادستی حاصل ہو۔'' داؤد کے مقابلے میں اس کا موقف بہت دوٹوک تھا۔

''مجھے حتمی فیصلے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار ہے۔'' وہ جو میدان جنگ میں بے خطر دشمن کے مقابل ڈٹ جاتا تھا، اس وقت نہ جانے کیوں اعصاب زدگی کا شکار ہونے لگا اور گھبراہٹ آمیز لہجے میں درخواست کی۔

''میں بارہ گھنٹے سے زیادہ کی مہلت نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے محاصرین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور وہ میری اجازت کے بغیر ہی سردار کے مکان پر حملہ کر دیں۔''

''میں جلد از جلد آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔'' اس نے گلاس میں باقی رہ جانے والے آخری چند قطرے بھی اپنے حلق میں انڈیل لیے اور متذبذب سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب اجازت دیجیے۔''

''میری طرف سے اجازت ہے لیکن جاتے جاتے اپنے دوست کا یہ تحفہ ساتھ لے جائیے۔'' اس نے اپنے بائیں جانب دھری شفاف شیشے کی چھوٹی سی صراحی اسے تھمائی۔ صراحی میں وہی فرحت بخش سرخ مشروب بھرا ہوا تھا۔

''اس تحفے کو قبول کرنے سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہوگا لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں کہ میں اب تک اپنے مہربان دوست کے نام سے بھی واقف نہیں۔'' اس نے موقع پا کر اس کا تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی۔

''ثوبان۔'' اس نے داؤد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اپنے نام سے آگاہ کیا تو وہ ایک بار پھر سابقہ ملاقات کے تجربے سے گزرا اور اسے لگا کہ نوجوان کی آنکھوں سے نکلنے والی طاقتور لہریں اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی ہیں۔ وہ کھویا کھویا سا صراحی ہاتھ میں لیے وہاں سے پلٹ گیا۔

☆☆☆

وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا لیکن موجودہ صورتِ حال نے اسے کچھ پل کے لیے ششدر کر دیا تھا۔ ایک طرف اسے سانپ نے ڈس لیا تھا تو دوسری طرف کسی نے غار کا دہانہ بند کر کے اسے یہاں قید کرنے کا انتظام کر دیا تھا۔ یہ ایک نہایت بھیانک صورتِ حال تھی۔ وہ اس تاریک غار کے اندر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا اور کسی کو خبر بھی نہ ہو پاتی کہ سردار امان کی تربیت سے ایک شاہکار انسان بن جانے والا بے پناہ صلاحیتوں کا مالک سا شاکس انجام سے دوچار ہوا۔

''نہیں، میں اس بے بسی کی موت کو قبول نہیں کر سکتا۔'' اسے خیال آیا تو بہ آوازِ بلند خود کو باور کروایا اور سب سے پہلے اپنی انگلیوں میں دہکتے انگاروں کی طرف توجہ دی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی تدبیر نہ کی تو زہر اس کے بازو میں پھیل کر آہستہ آہستہ سارے جسم میں سرایت کر جائے گا اور اسے اپنی تمام تر شہ زوری کے باوجود شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایک حقیر کینچوے کی سی یہ موت وہ کیسے گوارا کرتا۔ فوراً ہی اپنی کمر سے بندھا

پٹکا کھول کر کھینچا اور کلائی سے ذرا اوپر اسے باندھنے لگا۔ گرہ کو مضبوطی دینے کے لیے اسے اپنے ہاتھ کے ساتھ ساتھ دانتوں کا استعمال بھی کرنا پڑا تھا۔ پٹکے کے ایک سرے کو دانتوں میں دبائے بائیں ہاتھ کی حرکت سے بہرحال وہ ایک سخت گرہ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری پٹی اس نے اپنے لباس کو پھاڑ کر بنائی اور اسے کہنی سے ذرا نیچے پہلے والے طریقے سے باندھا۔ دونوں پٹیاں اتنی سختی سے باندھی گئی تھیں کہ اسے خود اپنے خون کی روانی رکتی ہوئی محسوس ہوئی اور ہاتھ سن پڑنے لگا لیکن وہ جانتا تھا کہ خون کی روانی میں یہ خلل ہی زہر کے پھیلنے کی رفتار بھی سست کر دے گا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے قدم غار کے دہانے کی طرف بڑھائے۔ دہانے کا وہ پتھر جسے اس نے آتے وقت باہر پڑا پایا تھا، اب مضبوطی سے وہاں جما ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی قوت سے پتھر کو دھکیلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ جو اپنے زورِ بازو پر بڑا زعم رکھتا تھا، اس ناکامی پر ششدر رہ گیا اور ایک بار پھر پہلے سے زیادہ قوت استعمال کر کے پتھر کو دھکیلنے کی کوشش کی۔ اس بار بھی ناکامی نے اسے منہ چڑایا لیکن ساتھ ہی وہ یہ اندازہ لگانے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ پتھر کو دہانے پر مضبوطی سے جمائے رکھنے کے لیے باہر سے کسی رکاوٹ کا استعمال کیا گیا ہے۔

''اب تم یہاں سے کبھی نہیں نکل سکو گے ساشا! تمہاری وجہ سے میرا لوئیس دردناک موت کا شکار بنا، اب تم اس غار میں تنہا بھوک پیاس سے سسک سسک کر مرتے ہوئے موت کی اذیت کو محسوس کرنا۔'' باہر سے شاید اس کی کوششوں کا اندازہ لگا لیا گیا تھا، چنانچہ سرد لہجے میں یہ اطلاع دی گئی۔ وہ غم اور غصے میں بھری امیرزادی حورم کی آواز پہچان سکتا تھا۔ اپنے محبوب کی موت پر برہم، انتقام کی آگ سینے میں بھرے اس سفر میں شامل ہونے والی حورم بنت ارغل آخرکار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''مجھے امید ہے کہ تم لوئیس کی موت کا فیصلہ صادر کرنے والے اپنے باپ کو بھی ضرور اس کے انجام تک پہنچاؤ گی۔'' اس کی بلند آواز میں گہرا طنز تھا۔

''ابھی تو تم اپنے انجام سے لطف اٹھاؤ۔'' لوئیس سے محبت کے باوجود ایک بیٹی یقیناً اپنے باپ کے لیے کوئی سخت فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی اس لیے اس کے طنز پر تلملا کر بولی۔

''یہ ادھورا اور غیر منصفانہ انتقام ہمیشہ تمہاری روح پر بوجھ بنا رہے گا۔'' وہ ایک بار پھر بلند آواز سے چیخا لیکن اس بار امیرزادی کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس نے ایک دو بار مزید اسے مخاطب کر کے اس کی موجودگی کا اندازہ کرنا چاہا لیکن مکمل خاموشی سے اندازہ ہوا کہ وہ وہاں سے جا چکی ہے۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ حورم تنہا وہاں نہیں آئی ہو گی۔ اس بھاری پتھر کو دہانے پر نصب کر دینا ایک تنہا لڑکی کے بس کی بات نہیں تھی۔ بہرحال جو بھی تھا، اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ اس غار میں قید کر دیا گیا تھا اور وہ بھی اس حال میں کہ ایک سانپ کا زہر دھیرے دھیرے اس کے خون کے ساتھ جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر زہر دماغ تک پہنچ گیا تو اس کی قوتِ عمل صفر رہ جائے گی۔ اس حد تک پہنچنے سے پہلے اسے ہر حال میں اپنے اس غار سے باہر نکلنے کا انتظام کرنا تھا چنانچہ ایک بار پھر جدوجہد کرنے لگا۔ جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے اس نے ایک بار پھر پتھر کو دھکیلنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ خود اس نے بھی شکست تسلیم نہیں کی اور مسلسل کوشش میں جتا رہا۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی سانس پھول گئی اور وہ خود ایڑی سے چوٹی تک پسینے میں نہا گیا۔

تھک ہار کر اسے اپنی کوشش کو موقوف کرنا پڑا اور غار کی ایک دیوار سے پشت لگا کر بیٹھنے کے بعد اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش کے دوران اس نے حلق میں پڑتے کانٹوں کو بھی محسوس کیا۔ اچھا خاصا فاصلہ پیدل طے کر کے یہاں پہنچا تھا اور اب ٹھیک ٹھاک محنت بھی کر چکا تھا اس لیے پیاس لگنا ایک فطری سی بات تھی لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ پیاس کی شدت حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ یکدم ہی اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا اور اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم بھی تپ رہا ہے۔ یقینی طور پر سانپ کے زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ چھوٹی انگلی میں دہکتے انگارے اب اس کے پورے جسم میں دہکنے لگے تھے۔ اگر غار میں اس درجے تاریکی نہ ہوتی تو وہ دیکھ لیتا کہ اس کے ہاتھ کی جلد اپنی رنگت دھیرے دھیرے بدلنے لگی ہے۔

''بندشیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ پتھر دھکیلنے کی کوشش میں ہاتھ پر باندھی گئی پٹیاں واقعی ڈھیلی پڑ گئی تھیں اور شاید اسی وجہ سے زہر کو جسم میں پھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ پہلے والی بندشوں کو چھیڑے بغیر اس نے لباس سے ایک اور پٹی پھاڑ کر نکالی اور کہنی سے

اوپر تقریباً شانے کے جوڑ کے قریب اسے باندھنے لگا۔ اس تیسری پٹی کو اس نے لاشعوری طور پر پہلی دو پٹیوں سے زیادہ سختی سے باندھا تھا۔ ہر ذی نفس کی طرح اسے بھی اپنی جان پیاری تھی اور لاشعوری طور پر موت سے خوفزدہ، اپنی زندگی بچانے کے لیے ممکنہ کوششیں کررہا تھا لیکن اس تاریک غار میں امکانات تھے ہی کتنے جو وہ کسی نئے زاویے سے کوشش کرتا۔ ایک بار پھر اٹھ کر دہانے کے پتھر پر ہی زور آزمائی کرنے لگا۔ نتیجہ حسبِ سابق تھا۔ تھک ہار کر اسے اپنی یہ کوشش ترک کرنا پڑی کہ اس کوشش کا نتیجہ اپنی توانائی کھونے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے آستین سے ماتھے پر پھسلتے ہوئے پسینے کے قطروں کو صاف کیا اور ایک جگہ بیٹھ کر ٹھنڈے دماغ سے صورتِ حال کا تجزیہ کرنے لگا۔

سوتے وقت اس نے اپنے ہتھیار جسم سے الگ کرکے رکھ دیے تھے، یہاں تک کہ پنڈلی سے بندھا رہنے والا خنجر بھی سرہانے رکھ چھوڑا تھا اور آنکھ کھلتے ہی یونہی باہر نکل گیا تھا۔ باہر نکل کر اس غار کی طرف آتے ہوئے بھی اس نے ہتھیار ساتھ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ اول تو اسے کوئی خطرہ ہی درپیش نہیں تھا، دوم یہ کہ اسے اپنی شہ زوری پر ناز تھا اور جانتا تھا کہ خالی ہاتھ بھی بہت خوبی سے اپنا دفاع کرسکتا ہے لیکن قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ اسے دفاع کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور انتقام سے بھری ایک عورت نہایت چالاکی سے اسے اس تاریک غار میں سسک سسک کر مرنے کے لیے بند کرگئی تھی۔ بھوک اور پیاس سے مرنا بے حد خوفناک سہی لیکن اس صورت میں اسے کچھ مہلت تو مل جاتی کہ وہ اس قید سے نجات کے لیے کوئی کوشش کرپاتا لیکن یہاں تو لحہ بہ لحہ جسم میں سرایت کرتے زہر کے ساتھ موت قریب آتی چلی جارہی تھی۔ اس جیسے جری اور زورآور شخص کے لیے اپنی ایسی بے بس موت کا تصور بہت تکلیف دہ تھا اور خود کو ایسی حقیر موت سے بچانے کے لیے مسلسل اپنے دماغ کو اِدھر اُدھر دوڑا رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے اپنا ہاتھ بے دھیانی میں جیب میں ڈالا اور چونک گیا۔

دھات کا لمس ایسا نہیں تھا جسے وہ نظرانداز کردیتا۔ اس نے ایک بے قراری کے عالم میں اس شے کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں لے کر باہر نکالا۔ اس دوران وہ اس شے کے بارے میں اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ قلم تراشنے والا چھوٹا سا چاقو تھا جسے کل کسی وقت سلیمان کے ساتھ نقشوں پر کام کرتے ہوئے وہ اپنی جیب میں ڈال کر بھول گیا تھا۔

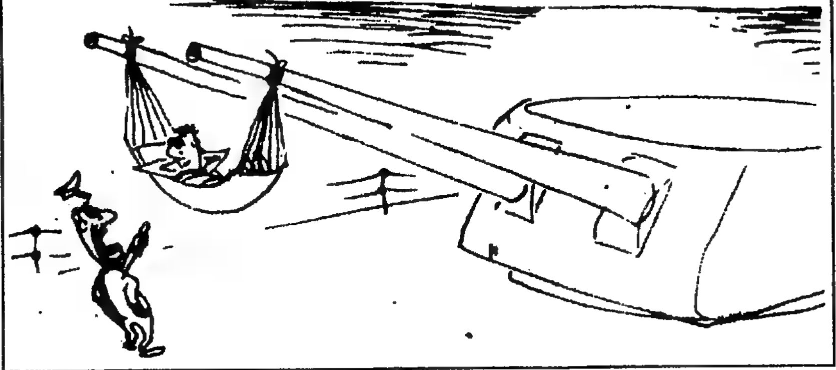
اس ننھے سے چاقو کو ہاتھ میں لیے وہ سوچنے لگا کہ اتنی بڑی مصیبت میں یہ ننھا سا چاقو بھلا اس کے کس کام آسکتا ہے؟ حقیقتاً یہ ایک مایوس کن صورتِ حال تھی لیکن پھر اچانک ہی اسے اپنے باپ کی بات یاد آئی۔ وہ کہا کرتا تھا۔

''حالات کو اپنے حق میں کرنے کے لیے وسائل سے زیادہ انسان کا عزم اہم ہوتا ہے۔ ایک پُرعزم انسان معمولی وسائل کے ساتھ بھی حیران کن کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔''

باپ کی یہ بات یاد آئی تو ہاتھ میں موجود وہ ننھا سا چاقو بھی اسے قیمتی لگنے لگا۔ اس نے اپنی مضبوط اور کھردری انگلیوں سے چاقو کو ٹٹولا اور پہلی بار اس بات کو محسوس کیا کہ وہ عام قلم تراش چاقوؤں کی بہ نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ اب اسے چاقو کی اس خوبی کا استعمال کرنا تھا۔ دل میں ایک نئی آس لیے وہ ایک بار پھر غار کے تنگ دہانے کے قریب آبیٹھا۔ اب وہ دہانے پر موجود پتھر کو دھکیل کر ہٹانے کے بجائے ایک دوسری ترکیب لڑا رہا تھا۔ اس نے چاقو کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ پتھر کی جڑ میں کھدائی شروع کردی تھی۔ اسے امید تھی کہ دہانے کا خلا چوڑا ہوگا تو پتھر اتنی مضبوطی سے وہاں جما نہیں رہ سکے گا اور وہ اسے دھکا دے کر وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ ایک قلم تراش کی مدد سے کی جانے والی یہ کوشش دیوانگی کہلاتی لیکن وہ ساشا تھا اور وہ یہ دیوانگی دکھا سکتا تھا۔ اس کی انگلیاں نہایت مستقل مزاجی سے سخت اور پتھریلی سطح پر حرکت کررہی تھیں۔ چاقو کی دھاتی نوک کی رگڑ سے آہستہ روی سے نکلنے والے پتھر کے ذرات اس کے حوصلے کو مزید بڑھا رہے تھے۔ حلق میں پڑتے کانٹوں، جسم میں دہکتے انگاروں اور خون میں سرایت کرتے زہر سے بے نیاز وہ پوری جانفشانی سے اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ وہ ساشا تھا، اپنی طاقت، جرأت اور مستقل مزاجی اس کا غرور تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کا یہ غرور آج بھی سرخرو ہوگا۔

اچانک ہی اس کے متحرک ہاتھ کو ایک جھٹکا سا لگا اور چاقو کی جنبش رک گئی۔ وہ یقینی طور پر کوئی نہایت سخت پتھر تھا جس کے آگے چاقو کا ننھا سا پھل شکست سے دوچار ہوگیا تھا اور اب وہ دھاتی پھل سے محروم دستے کو ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھا تھا۔ اس کی ہر خوبی قسمت کے آگے شکست کھا چکی تھی اور وہ ہر عمل سے محروم اس تنگ و تاریک غار میں مرنے کے لیے بے بس بیٹھا تھا۔

''کیا سچ مچ میں یہاں، اس جگہ بیٹھے بیٹھے ایک حقیر و بے بس چوہے کی سی موت مرجاؤں گا؟'' اس کے اندر سے



سوال ابھرا اور وہ عجیب وحشت کے عالم میں چیخ اٹھا۔

”کوئی ہے؟ مجھے یہاں سے نکالو۔ مجھے بچاؤ۔“

وہ جسے صرف اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرنا سکھایا گیا تھا، جس کا حوصلہ کسی چٹان جیسا تھا اور جس کی بہادری پر اس کے باپ کو ناز تھا، وقت کے اس نازک لمحے میں قید کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح اپنی جان بچانے کے لیے کسی مددگار کو پکار رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس جگہ قید ہے، اس کے اطراف صرف ویران اور سنگلاخ پہاڑیاں ہی ہیں اور کسی ذی نفس کی یہاں موجودگی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے، پھر بھی ایک موہوم سی آس پر پکارے جا رہا تھا۔

”کیا خبر کوئی مجھے موجود نہ پا کر میری تلاش میں اس طرف آنکلا ہو اور میری آواز سن کر متوجہ ہو جائے۔“

”شاید کہ حورم ہی ابھی تک باہر موجود ہو اور میرے پکارنے پر اس کے دل میں رحم آجائے۔“

”ہوسکتا ہے کہ قافلہ کوچ کر رہا ہو اور قافلے والے اس مقام سے گزرتے ہوئے میری صدا سن لیں۔“

زندگی سے جڑے رہنے کی فطری خواہش کے تحت اس کے ذہن میں مختلف امکانات روشن ہو رہے تھے اور وہ مدد کے لیے پکارتا چلا جا رہا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ تنگ دہانے کے آس پاس ہی کچھ ایسے خفیہ روزن یا رخنے تھے جہاں سے آوازوں کی اندر باہر رسائی اور قلیل مقدار میں ہوا کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، اسی لیے مستقل طور پر وہیں جما اپنی کوشش میں مصروف رہا لیکن آخر کب تک؟ حلق، جس میں پہلے ہی کانٹے اگے ہوئے تھے،

مسلسل چیخنے سے مزید خشک ہو گیا اور زبان تو گویا صحرا کی زمین تھی جو پانی سے محرومی پر چٹخ کر رہ گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ صرف چیخنے کا نتیجہ نہیں ہے، یہ سانپ کے اس زہر کا بھی اثر ہے جو اس کے خون میں شامل آہستہ آہستہ پورے جسم میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ دراصل یہ اپنے جسم میں اترا سانپ کا زہر ہی تھا جو اسے یوں وحشت زدہ کر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کتنا ہی بہادر اور جرأت مند سہی، یہ زہر اسے زیادہ مہلت نہیں دے گا اور مہلت نہ ہونے کا احساس اسے عظیم ساشا کے بجائے ایک معمولی آدمی کے ردِعمل کی طرف لے گیا تھا۔

چیختے چیختے آخر ایک لمحہ وہ آیا جب اسے احساس ہوا کہ وہ چیخنے کے لیے منہ تو ضرور کھولے ہوئے ہے لیکن آواز اس کے خشک حلق سے برآمد ہونے سے قاصر ہے۔ بند ہوجانے والی آواز نے اسے اپنی اس آخری امید سے بھی محروم کر دیا کہ کوئی اس کی پکار سن کر اس کی مدد کے لیے اس غار تک پہنچ جائے گا۔ امید ٹوٹی تو وہ خود بھی ٹوٹ کر رہ گیا اور نڈھال سا زمین پر گر گیا۔

”اب کیا باقی رہ گیا ہے جو مجھے یہ امید دلا سکے کہ میں اب بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔“

غار کی پتھریلی زمین پر پڑے پڑے اس نے سوچا اور حلق میں اگے کانٹوں کی چبھن اور بھی شدید ہو گئی۔

”ہم نے ساری عمر دوسروں سے چھین کر اپنے عیش و آرام کا سامان کیا، یہاں تک کہ بابا نے میرے لیے دولت کا ایک بڑا ڈھیر یہاں اس دور دراز مقام پر جمع کر ڈالا کہ

اگر میں چاہوں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس دولت کے بل بوتے پر دنیا کے جس گوشے میں چاہوں، عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا ہوں۔ آج میں دولت کے اس انبار کے ساتھ یہاں موجود ہوں لیکن دولت کا وہ انبار مجھے عیش و آرام کی زندگی دینا تو دور کی بات...... میری چند سانسیں بھی نہیں بڑھا سکتا۔" وہ اپنے ہر مسام سے نکل کر پتھریلی زمین پر گرتے پسینے کی بوندوں کو محسوس کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

"میں جو اتنی زبانوں کا ماہر ہوں اور جس کے بارے میں بابا کو گمان تھا کہ میں کہیں بھی چلا جاؤں، لوگوں کو اپنی بات آسانی سے سمجھا سکتا ہوں، آج اتنا بے بس ہوں کہ کسی کو اپنی بات سمجھانا تو دور، کسی تک اپنی آواز بھی نہیں پہنچا سکتا۔"

غار کی تاریکی کی وجہ سے وہ پہلے ہی کچھ نہیں دیکھ پا رہا تھا پھر بھی اس نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ اتر رہی ہے۔ یہ دھندلاہٹ باہر کی روشنی سے محرومی کے باعث نہیں تھی بلکہ اس بات کا اعلان تھی کہ اس کے اپنے اندر روشن زندگی کے چراغ کی لو ماند پڑتی جا رہی ہے۔

"میں وہ تھا جس کی تلوار کے آگے بڑے سے بڑا سورما نہیں ٹھہر پاتا تھا لیکن میری موت ایک ایسی عورت کے ہاتھوں واقع ہونے جا رہی ہے جس نے کسی ہتھیار سے نہیں، محض اپنے جذبۂ انتقام سے مجھے زیر کر دیا ہے۔" اس کے ہاتھ پاؤں حرکت کرنے کی قوت کھو چکے تھے لیکن دماغ مسلسل سوچنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔

"سنا ہے مشکل میں پھنسے لوگ کہیں سے کوئی آس نہ پائیں تو اپنے اللہ، بھگوان، گاڈ، دیوی، دیوتا کسی نہ کسی کو مدد کے لیے پکارتے ہیں لیکن میں کسے پکاروں کہ مجھے ایسی کسی ہستی سے متعارف نہیں کروایا گیا۔ میں مسلمان ہوں، نہ ہندو، نہ یہودی، نہ عیسائی اور نہ ہی کسی اور مذہب کا پیروکار...... اس مشکل گھڑی میں جبکہ میں اپنی تمام تر خوبیوں سمیت بالکل بے بس و لاچار ہوں آخر کسے مدد کے لیے پکاروں؟" اس کی آنکھوں سے چند قطرے نکل کر زمین پر ٹپکے تو وہ خود ہی حیران رہ گیا۔ اسے اتنا کچھ سکھانے والے اس کے باپ نے اسے یوں بے بسی سے رونا تو نہیں سکھایا تھا۔ وہ تو ہمیشہ اسے صرف یہ سکھاتا تھا کہ وہ مرد ہے اور مرد اتنی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے کہ کبھی خود کو بے بس محسوس نہ کرے لیکن وہ آج سچ مچ بے بس ہو گیا تھا اور یہ بے بسی اسے رلا رہی تھی۔

"بابا نے مجھے رونا نہیں سکھایا تو پھر کون ہے جو مجھے یوں بے بس کر کے رلا رہا ہے؟"

پتا نہیں کہاں سے خیال کی ایک رو آ کر اس کے ذہن سے ٹکرائی اور وہ اس بے دم سی حالت میں پڑے پڑے بھی چونک گیا۔

"ہاں کوئی ہے...... کوئی تو ہے جس کی مرضی کے آگے سردار امان جیسے بھی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں اور ساشا جیسے بھی حقیر کیڑوں کی طرح بے بس ہو جاتے ہیں۔" دنیا کے ہر انسان سے کٹا اس پل وہ "اُسے" سوچ رہا تھا جس کے بارے میں سوچنے کی اس نے کبھی زحمت نہیں کی تھی اور صرف اس لیے نہیں کی تھی کہ اسے بے پناہ علوم سے نوازنے والے اس کے باپ نے اسے کبھی اس وجود، اس ہستی سے روشناس نہیں کروایا تھا۔

"آخر بابا نے ایسا کیوں کیا تھا؟" اس کے ذہن میں اٹھنے والے سوال کا جواب دینے کے لیے کوئی موجود نہیں تھا لیکن اسے یاد آ رہا تھا کہ اس کے اردگرد موجود لوگوں میں سے کوئی بھی اس کی طرح بالکل بے دین نہیں تھا۔ وہ ڈاکو، لٹیرے، لالچی، بے رحم جیسے بھی لوگ تھے لیکن ان کا کوئی نہ کوئی مذہب، کوئی نہ کوئی خدا تھا جسے وہ پابندی سے نہ سہی لیکن کسی نہ کسی موقع پر یاد ضرور کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے باپ کو بھی کبھی کبھار زمین پر ماتھا ٹکاتے دیکھا تھا لیکن اس نے اسے بہت کچھ سکھانے کے باوجود ماتھا ٹکانا نہیں سکھایا تھا۔

"کیوں؟ آخر کیوں؟" بہت شدت سے اٹھنے والا سوال اسے غصے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ آخر کیوں تھا وہ اس قدر محروم کہ اوروں کی طرح مشکل گھڑی میں کسی ایسی ہستی کو نہیں پکار سکتا تھا جو بظاہر کوئی نسبت نہ ہوتے ہوئے اس کے لیے زندگی کے اسباب پیدا کر دیتی۔

"میں اس محرومی کو کیوں قبول کروں؟ میں اس دنیا میں ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی ہستی، کوئی نہ کوئی طاقت ایسی ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور کسی کے متعارف کروائے بغیر بھی میں یہ حق رکھتا ہوں کہ اس پیدا کرنے والی ہستی کو اس مشکل گھڑی میں پکاروں۔" جانے یہ سوچ کہاں سے اس کے ذہن میں آئی تھی لیکن آ گئی تھی اور وہ بے اختیار پکار اٹھا۔

"اے میرے پیدا کرنے والے...... اے اس زمین و آسمان کے مالک......! بے شک آج تک میں تجھ سے بے نیاز رہا لیکن جواب میں مجھ سے بے رخی نہ برت اور میری جان بچانے کے اسباب پیدا کر دے۔ مجھے مرنے

سے انکار نہیں ہے لیکن میں ایسی حقیر موت نہیں چاہتا۔ میں ایک بہادر ہوں اور تجھ سے بس اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے موت دے تو ایسی کہ مجھے اپنے مرنے پر یوں شرمندگی نہ ہو۔'' جسے جانتا نہیں تھا، آج اسے یوں پکار رہا تھا جیسے اس سے بڑھ کر کبھی کسی سے آشنا نہ رہا ہو۔

☆☆☆

''مجھے سردار کی بیٹی کے بارے میں علم ہے۔ وہ واقعی بڑی شاندار لڑکی ہے۔ ہماری یہاں آمد کے بعد اس نے سردار مراد کے کہنے پر ہم سے ملاقات کی تھی اور مجھے اعتراف ہے کہ اس ملاقات میں اس نے مجھے متاثر کیا تھا۔''

وہ ثوبان سے ملاقات کی اگلی صبح ہی سارہ سے ملا اور تمام معاملہ اس کے سامنے رکھ کر اس سے سردار مراد کی بیٹی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے اسے اطلاع دی۔

''نام کیا ہے اس لڑکی کا؟''

''لیلیٰ!'' سارہ نے اسے جواب دیا اور پھر اس کی معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''دیکھنے میں ہی ایک نہایت نڈر اور بے باک لڑکی محسوس ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر اپنے باپ کے بعد اس کی جگہ سنبھالنے کا حوصلہ ہے۔''

''یعنی ثوبان کو سردار مراد کے بعد اس کی بیٹی سے بھی نمٹنا ہوگا۔'' داؤد دھیرے سے بڑبڑایا۔

''لگتا ہے آپ ثوبان کا ساتھ دینے کا حتمی فیصلہ کر چکے ہیں۔'' سارہ نے اندازہ لگایا۔

''شاید ہمارے پاس اپنے بچاؤ کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔'' اس نے گویا سارہ کے اندازے کی تصدیق کی۔

''ثوبان کوئی دھوکے باز بھی ہو سکتا ہے۔ بے شک ہم سردار مراد کی طرف سے مشکوک ہیں لیکن بعض اوقات حقیقت وہ نہیں ہوتی جو نظر آتی ہے اور ہم کھلی آنکھوں سے بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔'' دھیمی آواز میں بولتی سارہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تم ثوبان سے نہیں ملیں اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو۔ وہ سحر انگیز شخصیت کا مالک ہے اور اس کے باطن کا اجلا پن اس کے چہرے سے جھلکتا ہے۔'' سارہ کو ثوبان کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ ثوبان کی سحر انگیز آنکھوں کو اپنے روبرو محسوس کر رہا تھا۔

''اگر آپ اسے اس قدر قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں تو پھر بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میں اور ثریا مل کر آپ کے حسب خواہش لیلیٰ تک رسائی اور اس کا اعتماد حاصل

کوزے میں دریا

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ کسی بھی چیز کی دو بار قدر کرتا ہے۔ ایک ملنے سے پہلے، دوسرا کھو دینے کے بعد۔

جو انسان بہت لڑنے کے بعد بھی آپ کو منانے کا ہنر رکھتا ہے تو سمجھ لینا کہ وہ آپ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔

مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ

کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔'' اگرچہ اس کے دماغ میں اب بھی چند خدشات تھے لیکن اس نے داؤد سے مزید حجت نہیں کی۔ وہ اس کا محسن تھا اور اس نے ایک ایسے وقت میں اسے پناہ دی تھی جب وہ اس بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی تھی اور دشمن شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب میں تھے۔

دوسری بار بھی داؤد ہی اس کی زندگی اور عزت بچانے کا سبب بنا تھا اور اسے اس خانقاہ سے نکال لایا تھا جہاں اس سے پہلے ہی کئی مظلوم لڑکیاں گناہوں سے پاک زندگی گزارنے کی خواہش میں دھوکا دہی کا شکار ہو کر نہایت ذلت آمیز زندگی گزار رہی تھیں۔ خانقاہ سے اس کے ساتھ داؤد اور اس کے ساتھیوں کی مدد سے فرار ہونے والی راہبائیں اب بھی ان کے ساتھ تھیں اور داؤد نے اس کی طرح انہیں بھی اپنی پناہ میں لے لیا تھا جس کے نتیجے میں ان کا مصیبت زدہ قافلہ مزید مسائل میں گھر گیا تھا لیکن داؤد نے ایک بار بھی راہباؤں کی واپسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اب وہ ایسے شخص کی بات ماننے سے انکار کرتی بھی تو کیسے؟

''مجھ پر اس قدر اعتماد کرنے کے لیے شکریہ۔ امید ہے میں تاحیات تمہارے لیے قابلِ اعتبار رہوں گا۔'' جذبۂ دل بھی کبھی داؤد کی زبان پر چند ایسے الفاظ لے آتا تھا جو اس کے جذبات کے عکاس ہوتے تھے۔ سارہ الفاظ سے بھی زیادہ اس کی بولتی آنکھوں سے گڑبڑا اٹھی۔

''میں جا کر دیکھتی ہوں کہ طیبہ کی طبیعت سنبھلی یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بے چاری ثریا اکیلی پریشان ہو رہی ہو۔'' ایک بودا سا بہانہ بنا کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ان خاتون کے لیے میرے دل میں بھی بہت رنج ہے۔ اللہ انہیں سکون دے۔'' سارہ کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے اس نے بھی فوراً موضوع بدل دیا۔ حقیقتاً بھی اسے

طیبہ کی حالت پر افسوس تھا۔ بیوگی کے بعد بچی کے آگ میں جل کر مر جانے کا واقعہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کی حالت بگڑ جاتی تھی۔

''اب میں چلتی ہوں۔'' سارہ آہستہ سے کہہ کر اندرونی حصے کی طرف بڑھی تو اس کی نظروں نے بے ساختہ ہی اس کا تعاقب کیا۔ اس پل اسے یہ لگا کہ دروازے کے پیچھے کوئی تھا جو سارہ کو آتے دیکھ کر تیزی سے ہٹ گیا تھا۔

''شاید کوئی جاسوس.....'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور سارہ کے دروازے کے پار جاتے ہی اپنی نظروں کا رخ بدل لیا۔ وہ چلی گئی تھی تب بھی اس کے وجود کی خوشبو اس جگہ چکراتی اس کے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ رازداری کے خیال سے انہوں نے دورانِ گفتگو اپنے مابین فاصلہ بہت کم رکھا تھا اس لیے بھی خوشبو اس کے حواسوں پر زیادہ سوار ہوگئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر زنان خانے سے باہر جانے والے راستے کا رخ کیا اور سیدھا مکان کے اس حصے میں جا پہنچا جہاں اس کے لیے ایک بستر کا بندوبست تھا۔ بستر پر نیم دراز ہو کر اس نے بے ساختہ ہی ایک کپڑے میں چھپا کر رکھی گئی سرخ مشروب کی صراحی سے ایک گلاس بھر کر اسے حلق میں انڈیلا اور سرور بھری کیفیت میں آنکھیں موند لیں۔ مشروب کا اثر تھا کہ سارہ کی خوشبو کا جادو جو وہ ایک بے حد عملی انسان ہوتے ہوئے بھی دن کی روشنی میں، جاگتی آنکھوں سے ایک ایسا خواب دیکھنے لگا جس میں سارہ اس کی دلہن بنی اس کے روبرو تھی۔ یہ خواب کتنا طویل تھا اس کا تو اسے اندازہ نہیں ہوا لیکن چند روتی کُرلاتی آوازوں نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

''کیا ہوا ہے؟'' دماغ ابھی تک پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا لیکن بلند آواز میں کیے جانے والے بینوں نے اسے باہر نکل کر ملنے والے پہلے آدمی سے یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا۔

''سردار ...... ہائے میرے سردار......'' اس آدمی نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنے سینے پر دوہتڑ مارے اور بلبلا کر چیخا تو داؤد کو اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔ وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف بھاگا جہاں اس کی سردار سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ مکان میں موجود شاید ہر فرد ہی نے اس کمرے کا رخ کر لیا تھا اس لیے اسے کمرے میں داخل ہونے کا راستہ نہیں ملا اور وہ اپنی طرح باہر رہ جانے والے افراد کے ساتھ کھڑا رونے والوں کی آوازیں سننے لگا۔

''سردار زادی۔'' رونے کی تیز آوازوں کے درمیان سنائی دینے والی یہ آواز شاید اس سمیت چند لوگوں نے ہی سنی ہوگی۔ بے ساختہ ہی اس نے اسے دیکھنے کے لیے آنکھوں کو حرکت دی جس کے بارے میں کافی سن چکا تھا۔ اس نے اپنے سامنے لمبے قد کی مالک ایک لڑکی کو گہرے رنگ کی قبا میں تیز تیز قدموں سے اس طرف آتے دیکھا۔ لڑکی کا چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا تاہم سختی اور غصے کا تاثر دیتی آنکھیں عیاں تھیں۔ قریب آنے پر سب ہی نے اسے دیکھ لیا اور بین کی آوازیں یکدم ہی بہت تیز ہوگئیں۔

''میں اپنے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہنتی ورنہ ایک بہادر کی موت پر عورتوں کی طرح بین کرنے پر اپنی کلائیوں کی چوڑیاں اتار کر تمہیں پہننے کے لیے ضرور پیش کرتی۔'' اس کی تیز آواز میں کسی شیرنی کی سی غضب ناکی تھی۔ رونے والے ٹھٹک کر خاموش ہوگئے اور وہ مضبوطی سے قدم اٹھاتی کمرے کی طرف بڑھی۔ لوگوں نے خود اِدھر اُدھر ہو کر اسے اندر داخل ہونے کی جگہ دی۔ داؤد نے باہر کھڑے کھڑے ہی دیکھا کہ وہ سردار کے بستر کے قریب چند پل سر جھکائے کھڑی رہی پھر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں بولی۔

''میرے باپ کو ناحق موت کا نشانہ بنانے والے میرے جیتے جی اس سرزمین پر سکھ کا سانس نہیں لے سکیں گے۔ ظالموں کو جا کر بتا دو کہ سردار مراد کی بیٹی ابھی زندہ ہے اور اس کے ہاتھ تلوار کا بوجھ اٹھانے کی طاقت رکھتے ہیں۔''

وہ باہر کھڑا ہونے کے باوجود اس کا ایک ایک لفظ واضح طور پر سن سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سردار زادی کے الفاظ نے وہاں موجود افراد پر جادو کا سا اثر کیا اور وہ جو ابھی کچھ دیر قبل مایوسی سے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، جوش و جذبے سے بھرے سردار اور سردار زادی کے حق میں نعرے لگانے لگے۔

''سردار کی تجہیز و تکفین کے انتظامات فوری طور پر کیے جائیں۔ بعد نماز عصر انہیں ان کی وصیت کے مطابق مسجد کے احاطے میں دفنایا جائے گا۔'' نعرے بازی کا سلسلہ رکا تو اس نے کبیر کی طرف رخ کر کے اسے حکم دیا۔

''مگر باہر محاصرین......'' کبیر نے اسے حالات کا احساس دلانا چاہا۔

''میں نے کہہ دیا نا کہ سردار کی تدفین ان کی وصیت کے مطابق مسجد کے احاطے میں ہوگی تو بس ہوگی۔'' اس نے

چنگھاڑتی ہوئی آواز میں کبیر کوٹوکا اور دھب دھب زمین پر پیر مارتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ داؤد دم بخود سا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کا ایسی عورت سے زندگی میں پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا جس کے جسم پر لباس تو عورتوں جیسا تھا لیکن جسم کے اندر روح شاید کسی مرد کی حلول کر گئی تھی۔

پھر اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ سردار زادی کے احکامات پر من وعن عمل شروع ہو چکا ہے۔ وہ لوگ جو سردار کی موت کے غم سے نڈھال ہو کر کچھ دیر کے لیے اپنی سدھ بدھ کھو چکے تھے، اب نئے سرے سے منظم ہو کر سارے امور انجام دے رہے تھے۔ سردار کو غسل دینے اور کفنانے کی ذمے داری کچھ لوگوں کو سونپ دی گئی تھی اور باقی لوگ مختلف امور انجام دے رہے تھے۔ داؤد نے اس بات کو واضح طور پر محسوس کیا کہ کچھ لوگ اس انداز میں سارے مکان میں گھومتے پھر رہے تھے جیسے وہ باقی لوگوں کی نگرانی کر رہے ہوں۔ ان افراد کی موجودگی میں اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ کبیر سے رابطہ کرے اور آگے کے لائحہ عمل سے متعلق کچھ دریافت کرے۔ ویسے اب اسے کبیر نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ کہیں مصروف ہو گیا تھا یا پھر ان لوگوں میں شامل تھا جنہیں سردار زادی نے کسی ضروری گفتگو کے لیے علیحدہ کمرے میں بلوا رکھا تھا اور کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس کمرے کے قریب پر بھی مار سکے۔

عصر کی اذان ہوتے ہی جنازہ اٹھنے کا اعلان ہوا اور سردار مراد کے چاہنے والے اس کی میت کو کاندھوں پر اٹھائے صدر دروازے کی طرف بڑھے۔ داؤد بھی جنازے کے اس جلوس میں شامل تھا۔ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ صدر دروازے کے قریب سردار زادی ہاتھ میں ننگی تلوار لیے گھوڑے کی پیٹھ پر موجود ہے۔ تلوار کے علاوہ وہ اس کے شانے سے لٹکی کمان اور تیروں سے بھرا ترکش بھی واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔

''دروازہ کھول دیا جائے۔'' سردار زادی کی بلند اور بارعب آواز فضا میں گونجی تو دربان بلا تاخیر بھاری دروازے کو کھولنے کے لیے لپکے۔ اس دروازے کے پیچھے وہ محاصرین موجود تھے جن کے بارے میں اندیشہ تھا کہ وہ موقع ملتے ہی اندر آگھسیں گے اور انتقام کے جوش میں اندر موجود ہر شخص کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ دروازہ کھلا اور باہر کھڑے لوگوں کی جھلک نظر آئی تو کچھ ہو جانے کے خیال سے داؤد کا دل زور سے دھڑکا اور بے اختیار ہی اس نے اپنی تلوار کے دستے کو تھام لیا لیکن اگلا لمحہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ صدر دروازے کے قریب موجود سردار زادی نے دروازہ کھلتے ہی اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور پلک جھپکتے ہی چوکھٹ عبور کر کے محاصرین کے روبرو یوں جا کھڑی ہوئی جیسے ان کو للکار رہی ہو کہ ہے اگر کوئی مائی کا لال تو میرے سامنے آئے اور میرا راستہ روک کر دکھائے۔

خاموشی کا ایک مختصر لیکن بوجھل لمحہ عجیب سنسنی اور دہشت کے ساتھ گزرا، پھر محاصرین کے درمیان میں ہی سے چند تیغ زن نکل کر دائیں بائیں سے یوں سردار زادی کے گرد پھیل گئے کہ لگا انہوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔ یوں گھر جانے پر بھی جنگجو شہزادی کے اطمینان میں سرمو فرق نہ آیا اور وہ ویسے ہی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار گردن اکڑائے سامنے دیکھتی رہی۔

''سردار مراد...... زندہ باد۔''

''سردار زادی...... زندہ باد۔''

یک لخت ہی سردار زادی کے گرد گھیرا ڈالنے والے تیغ زنوں نے فلک شگاف نعرے لگائے تو داؤد کو احساس ہوا کہ جن لوگوں کو محاصرین کے ساتھ سمجھ رہا تھا، وہ دراصل سردار زادی کے محافظین تھے جنہوں نے بہت چالاکی سے محاصرین کے درمیان جگہ بنالی تھی اور اب محاصرین اور سردار زادی کے درمیان دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ سردار مراد کے مرنے کی خبر مکان سے باہر گئی تھی اور سردار کے وہ وفادار جواب تک کسی وجہ سے خاموش تھے، حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے از خود وہاں جمع ہو گئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شروع سے محاصرین کے ساتھی بنے ان کے درمیان موجود رہے ہوں اور اب وقت ضرورت سامنے آگئے ہوں۔ اس موقع پر اسے ثوبان کے لیلیٰ کے متعلق کہے ہوئے الفاظ بھی یاد آئے۔ اس نے کہا تھا۔

''سردار ایک فتنہ طراز بیٹی کا باپ ہے اور اس کی بیٹی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے ایک اشارے پر نوجوان اپنی جوانیاں لٹا دینے میں بھی عار نہیں سمجھتے۔''

وہ ان الفاظ کو اب ایک حقیقت کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ سردار زادی لیلیٰ کے گرد حصار قائم کرنے والے جوان فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے عجب سرفروشانہ انداز میں آگے بڑھنا شروع ہو چکے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ لیلیٰ کا گھوڑا بھی حرکت میں تھا۔ بڑھنے والوں کے سرفروش و بے باک انداز نے محاصرین کو اس طرح مسحور کیا کہ وہ خود بخود ہی دائیں بائیں کھسک کر انہیں راستہ دیتے

چلے گئے۔ جنازے کا جلوس بھی اب صدر دروازے سے باہر نکل چکا تھا اور سردار زادی اور اس کے ساتھیوں کے نقش قدم پر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جلوس کے ساتھ ساتھ چلتا داؤد دیکھ سکتا تھا کہ ان کے دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف بھی مسلح افراد حفاظت کے لیے موجود ہیں۔ حقیقتاً سردار زادی نے اپنے باپ کی میت کو اس کے آخری ٹھکانے تک پہنچانے کے لیے بہت موثر انتظامات کیے تھے اور کئی دن تک اپنے ہی مکان میں محصور رہنے والا سردار مراد پوری شان سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اس موقع پر اس نے ایک بار پھر کبیر کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا اور کیوں غائب ہو گیا تھا؟

نمازِ جنازہ اور تدفین کے دوران بھی اسے کبیر کہیں نظر نہیں آیا البتہ عبدالمالک سے ملاقات ہوگئی۔ وہ دوسرے کئی لوگوں کی طرح از خود جنازے میں شرکت کے لیے آ گیا تھا۔

''اللہ کا شکر ہے اخی کہ آپ بہ خیریت ہیں۔ میں اور دوسرے ساتھی آپ اور خواتین کی طرف سے فکرمند تھے۔ ہمیں اندر کے حالات کے بارے میں کوئی صحیح اطلاع بھی نہیں پہنچ پا رہی تھی۔'' اس نے جس گرمجوشی سے گلے مل کر یہ بات کہی اس سے ظاہر تھا کہ وہ سچ مچ بہت پریشان رہا تھا۔

''میں بھی تم لوگوں کے لیے فکرمند تھا لیکن یہ تسلی تھی کہ لطیف نے تمہیں میری اور دیگر لوگوں کی خیریت سے آگاہ کر دیا ہوگا تو تمہیں زیادہ پریشانی نہیں ہوگی۔'' اس نے محبت سے عبدالمالک کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''لطیف...... میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا اخی! لطیف تو آپ ہی کے ساتھ تھا نا؟'' عبدالمالک الجھ گیا۔ اس وقت وہ دیگر لوگوں سے قدرے ہٹ کر کھڑے ہوئے تھے اور لوگوں کے جھرمٹ کی وجہ سے سردار مراد کی قبر پر مٹی ڈالے جانے کا عمل ان کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا تھا۔

''لطیف تو ہنگامہ ہوتے ہی وہاں سے نکل گیا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ وہ سیدھا تم لوگوں کے پاس ہی پہنچا ہوگا۔'' وہ خود تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

''لطیف قطعی غیر ذمے دار لڑکا نہیں ہے اس لیے اس کی اس گمشدگی سے میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے ہیں۔'' عبدالمالک کا چہرہ اتر گیا تھا۔

''اللہ سے اچھی امید رکھو۔ میں واپس جا کر اس کے بارے میں تحقیق کرتا ہوں۔'' اندر سے وہ خود پریشان ہو گیا تھا اور دل میں خیال آ رہا تھا کہ کہیں اس دن کے ہنگامے میں لطیف بھی کسی حادثے کا شکار نہ ہو گیا ہو لیکن عبدالمالک کو تسلی دی۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟'' عبدالمالک نے پوچھا۔

''نہیں۔ تمہارا باہر رہ کر باقی ساتھیوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ میں بھی خواتین کی وجہ سے واپس جانے پر مجبور ہوں۔ حالات بڑے عجیب و غریب ہیں اور میں وہاں رہ کر خواتین کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔''

''حالات تو واقعی عجیب و غریب ہیں۔ ہم سے بھی کچھ لوگوں نے خفیہ طور پر ملاقاتیں کی ہیں۔ واضح تعارف تو کسی نے نہیں کروایا لیکن گفتگو سے ظاہر تھا کہ ان میں سے کچھ سردار مراد کے حامی اور کچھ اس کے مخالفین تھے۔ دونوں ہی طرح کے لوگوں نے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہم ان کا ساتھ دے کر فائدے میں رہیں گے۔ ہم نے فی الحال آپس میں مشاورت کر کے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے کا بہانہ بنا کر دونوں گروہوں کے لوگوں کو ٹال دیا ہے لیکن اندازہ ہے کہ ہمارے لیے کڑا وقت آنے والا ہے۔'' عبدالمالک نے اسے آگاہ کیا۔

''بہت محتاط رہو عبدالمالک! میں جلد تم سے رابطہ کر کے کوئی واضح لائحہ عمل اختیار کرنے کے سلسلے میں ہدایات دوں گا۔'' ملنے والی اطلاع نے اسے مضطرب کر دیا لیکن اسی لمحے وہاں مرنے والے کے لیے دعائے مغفرت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اس لیے مزید گفتگو کی گنجائش نہ رہی اور انہوں نے بھی دیگر لوگوں کی طرح دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ دعا کے بعد لوگ واپس پلٹنے لگے۔ اسے بھی انہی لوگوں کے ساتھ جانا تھا اس لیے عبدالمالک کو ایک بار پھر محتاط رہنے کی ہدایت کر کے سب کے ساتھ شامل ہو گیا۔

واپس سردار مراد کے مکان پر پہنچنے پر محاصرین نے تند و تیز نعرے لگا کر ان کا استقبال کیا لیکن وہ بس نعرے بازی تک ہی محدود رہے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ حملے کی کوشش کرتا۔ اپنے محافظوں کے جلو میں آگے چلتی سردار زادی نے اپنا گھوڑا نعرے بازی کرنے والوں کے مقابل لے جا کر روک دیا اور بنا ایک لفظ کہے انہیں تیز نظروں سے گھورتی رہی۔ اس کی نظروں کا جادو تھا یا وہ لوگ خود اس سے کچھ سننا چاہتے تھے کہ آہستہ آہستہ ان کے نعرے دم توڑ گئے اور انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اس خاموشی میں سردار زادی کی بے خوف آواز گونجی۔

''یقین کرو کہ میرے پاس اتنے وفادار ہیں کہ اگر میں حکم دے دوں تو وہ تم لوگوں کو پیس کر رکھ دیں یا تیروں کی ایسی بارش ہو کہ تمہارے جسم چھلنی کرنے کے بعد بھی کئی تیر باقی بچ جائیں لیکن میں صرف اس لیے ایسا کوئی سخت فیصلہ کرنے سے گریزاں ہوں کہ میں نہیں چاہتی کہ باہر سے آئے ہوئے ایک زہریلے ناگ کی سازش سے بہک جانے والے میرے معصوم ہم قوموں کو کوئی نقصان پہنچے۔ تمہارا سردار تمہاری بے وجہ نفرت کا نشانہ بن کر آج قبر میں جا سویا ہے۔ تم چاہو تو مجھے بھی قتل کر دو لیکن یاد رکھنا کہ اس کے بعد کوئی نہ ہوگا جو تمہیں دنیا و آخرت کی تباہی سے بچا سکے۔'' وہاں مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی میں اس باہمت و بے باک لڑکی کی آواز ہر ایک واضح طور پر سن سکتا تھا۔ داؤد ایک بار پھر اس سے متاثر ہوا۔

اپنی بات کے اختتام پر وہ اچانک ہی اپنی ڈھال بنے نوجوان کو ایک طرف دھکیل کر محاصرین کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کے اس جرأت مندانہ اقدام نے سب کی سانسیں روک دیں۔ داؤد بھی دم بخود رہ گیا۔ نفرت اور جذبۂ انتقام سے بھرے ان افراد سے کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اس پر حملہ کر دیتے۔ سینے میں پیوست ہونے والا صرف ایک تیر بھی اس کا کام تمام کر سکتا تھا لیکن وہ کسی مرد سے بھی زیادہ بے باکی سے گردن اٹھائے ان سب کے مقابل کھڑی تھی۔ چند بوجھل پل نہایت خاموشی سے گزرے۔ کسی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں آیا تو اس نے ایک گہری سانس لی اور پہلی بار یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے اندر کتنی ہی نفرت سہی لیکن ابھی تمہارے اندر تمہاری قومی غیرت کی رمق باقی ہے اور یہ غیرت گوارا نہیں کر سکتی کہ اپنی ہی قوم کی بیٹی پر ہتھیار اٹھاؤ۔'' اپنی بات کہہ کر وہ آہستہ سے پلٹ گئی۔ اس موقع پر داؤد نے مشاہدہ کیا کہ باہر سے ان کے ساتھ شامل ہونے والے باہر ہی رک گئے تھے اور صرف وہی لوگ مکان میں داخل ہوئے تھے جو پہلے سے اندر موجود تھے۔ ان افراد میں وہ خود بھی شامل تھا۔

مکان کے اندر پہنچ کر ایک بار پھر اسے کبیر کی جستجو ہوئی اور نظروں سے تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ دبی زبان میں چند ایک افراد سے اس کے بارے میں استفسار بھی کیا لیکن کسی سے بھی کبیر کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس وقت اسے کبیر سے بھی زیادہ لطیف کی فکر تھی چنانچہ دستر خوان لگا تب بھی مجبوراً مشکل سے چند نوالے زہر مار کیے اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

''کبیر نے آپ کو بلایا ہے۔'' وہ چھت پر جانے والی سیڑھیوں کا رخ کرتا اس سے قبل ہی کسی نے اس کے قریب سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے چونک کر اطلاع دینے والے اس نوعمر لڑکے کو دیکھا اور پوچھا۔

''کبیر کہاں ہے؟''

''آپ میرے ساتھ آئیے۔'' لڑکے نے اس سے کہا اور یوں آگے بڑھتا چلا گیا جیسے یقین ہو کہ وہ اس کے پیچھے ضرور آئے گا۔ واقعی وہ نہیں رک سکتا تھا۔ پیغام لانے والے کو زنانہ رہائشی حصے کی طرف جاتے دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا لیکن وہ اسے اس اندرونی حصے میں نہیں لے گیا جہاں سارہ اور ثریا سے دریافت احوال کے لیے جاتا تھا۔ وہ اسے زنانہ رہائشی حصے کے عقبی طرف کھلنے والے ایک کمرے کے دروازے تک لے گیا تھا۔

''آپ اندر تشریف لے جائیں۔ میری ذمے داری بس یہیں تک راہنمائی کرنے کی تھی۔'' نوجوان نے دروازے کے باہر رک کر شائستگی سے کہا تو وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ امید کر رہا تھا کہ اندر جاتے ہی کبیر سے سامنا ہوگا لیکن خلافِ توقع وہاں استقبال کے لیے ایک بوڑھی ملازمہ موجود تھی۔

''کبیر کہاں ہے؟'' اس کی حسیات اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس دلا رہی تھیں اس لیے ملازمہ سے قدرے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

''آپ تشریف رکھیں۔ میں اندر آپ کی آمد کی اطلاع دے دیتی ہوں۔'' اس کے خراب لہجے کے باوجود ملازمہ نے ادب سے جواب دیا اور ایک دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ وہ مضطرب سا ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ مختصر سامان والے اس کمرے میں جائزہ لینے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے اس کی نظریں مستقل اس دروازے پر لگی ہوئی تھیں جس کے پیچھے بوڑھی ملازمہ غائب ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا اور اس کھلے دروازے سے گزر کر کوئی اندر آیا۔ آنے والی ہستی کو دیکھ کر وہ بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ اپنی خواہش کے برخلاف آپ کو کبیر کے بجائے مجھ سے ملاقات کرنی پڑ رہی ہے۔'' اس کے سامنے کھڑی سرو قامت، نقاب پوش سردار زادی کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

''میں اس سب کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' اس

نے اعصاب کو لگنے والے جھٹکے سے فوری طور پر خود کو سنبھال لیا اور سنجیدگی سے بولا۔

''آپ کو کبیر کی جستجو تھی تو میں نے سوچا کہ آپ کو اس کی گرفتاری کی اطلاع دے کر آپ کی الجھن دور کردوں۔'' پُرسکون لہجے میں کہتی ہوئی وہ ایک موڑھے پر ٹک گئی اور داؤد کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا لیکن حقیقتاً اس کے دماغ میں سوالات کا ایک ہجوم تھا۔

''کبیر پر مجھے شک تھا اور کچھ دنوں سے میرے وفادار اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ شک یقین میں ڈھلا تو اسے گرفتار کرلیا گیا اور اب تک وہ اپنے بیشتر جرائم کا اقرار کرچکا ہے۔ اسے اس کے ساتھیوں کی طرح خودکشی کا موقع نہیں دیا گیا تھا اس لیے ہمیں پہلی بار کچھ مفید معلومات حاصل ہوسکی ہیں۔'' وہ اس کی طرف سے کوئی سوال کیے بغیر ہی اسے بتانے لگی۔

''یقیناً مجھے یہ سب بتانے کا کوئی مقصد ہوگا؟'' وہ اپنی خاموشی برقرار نہیں رکھ سکا۔

''یقیناً......'' اس نے داؤد کے اندازے کی تصدیق کی اور لحاتی توقف کے بعد بولی۔

''یہ بات پہلے ہی میرے علم میں ہے کہ تمہیں یہاں سے اس زہریلے ناگ سے ملاقات کے لیے لے جایا گیا تھا جس نے ہمارے علاقے کے لوگوں کے دلوں میں نفرت و عداوت کا زہر اتار دیا ہے۔ ثبوت کے طور پر تمہارے سامان سے اس ناگ کا تحفۂ خاص سرخ مشروب حاصل کرلیا گیا ہے اس لیے تمہارے پاس تردید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''یعنی میں اس وقت خود کو زیرِ حراست سمجھوں؟'' سردار زادی کا اندازِ تخاطب اس پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے بدل گیا تھا لیکن خود اس نے جواب میں سکون کا مظاہرہ کیا۔

''حراست میں لینا مقصود ہوتا تو تمہیں اس کمرے تک بلوانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔''

''میں اس عزت افزائی کا مقصد جاننا چاہتا ہوں۔'' جواباً اس کا لہجہ کٹیلا ہوا۔

''میں اور میرے وفادار اس بات کو سمجھ رہے ہیں کہ تمہیں سازش کے تحت پھنسانے اور اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انسانی دماغ کو زیر کرلینے والے سرخ مشروب کی تمہارے پاس موجودگی اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔'' سردار زادی کی زبان سے دوسری بار سرخ مشروب کا ذکر ہوا تو اس کے اندر بے ساختہ ہی اس مشروب کی طلب جاگی۔ وہ فرحت بخش و جادو اثر مشروب اس کشیدہ صورتِ حال میں یقیناً اس کے اعصاب کو سکون پہنچا سکتا تھا۔

''بدبخت ثوبان کے متعارف کردہ اس سرخ مشروب کی خصوصیت ہے کہ اسے پی کر انسان بظاہر خود کو بہت تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کے مطابق یہ اتنا جادو اثر ہے کہ طالب علم اپنا ہفتوں کا سبق دنوں میں یاد کرلیتے ہیں لیکن یہ مشروب صرف ان ہی لوگوں کو عنایت کیا جاتا ہے جن سے ثوبان خوش ہو۔ ہمارے ایک جاسوس نے طالب علم کا روپ دھار کر بہت مشکل سے اس مشروب کی معمولی مقدار حاصل کی تھی جس پر تحقیق کرکے حکیم صاحب نے رائے قائم کی کہ اس میں کوئی ایسی نشہ آور شے ملائی گئی ہے جس سے ہمارے علاقے کے لوگ واقف نہیں لیکن یہ طے ہے کہ وہ نشہ ذہنوں کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' اس کی طلب سے بےخبر وہ اسے روانی سے بتاتی جارہی تھی۔

''میں ان سب باتوں کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' داؤد کو پتا نہیں کیوں خلافِ مزاج غصہ آگیا۔

''مقصد صرف اتنا ہے کہ واضح طور پر قصوروار ہوتے ہوئے بھی میں تمہیں شک کی گنجائش دینا چاہتی ہوں کیونکہ میرے باپ کی تمہارے بارے میں بہت اچھی رائے تھی اور وہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ تمہارا ساتھ دینا چاہتے تھے۔'' اسے داؤد کی دخل اندازی پسند نہ آئی اور ناگواری سے بولی۔

''یہ تمہارے باپ کی مہربانی تھی کہ میں اپنے لوگوں کے ساتھ اس علاقے میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔ ہم اپنے قیمتی خیموں سے محروم ہوگئے ہیں، ہمارے قافلے میں سے ایک عمر رسیدہ خاتون اور ایک نومولود بچی کو زندہ جلا کر ہلاک کردیا گیا ہے اور اب میرا ایک نہایت وفادار ساتھی بھی غائب ہے۔'' داؤد بولنے پر آیا تو اس کی ناگواری کو خاطر میں لائے بغیر ایک ایک نقصان جتاتا چلا گیا۔

''اپنے کئی جرائم کے ساتھ ساتھ کبیر اس بات کا بھی اعتراف کرچکا ہے کہ اسی نے ثوبان کے کہنے پر اپنے ساتھیوں کے ذریعے وہ آگ لگوائی تھی۔ اس طرح تمہیں سردار سے بدگمان کرکے اپنے ساتھ ملانے کی سازش کی جارہی تھی۔'' اس نے نہایت تیزی سے صفائی پیش کی۔

''میں کیسے اس یک طرفہ بیان کو سچ مان لوں؟ بغیر ثبوت کے ہر بیان اور الزام مشکوک ہے۔'' داؤد نے صاف

گوئی کا مظاہرہ کیا۔
''تمہیں ثبوت حاصل کرنے کا موقع دیا جائے گا۔''
اس نے غصے سے دانت کچکچائے اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔
''کبیر اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ کبیر نے اعتراف کرلیا ہے کہ سردار پر حملہ کرنے والے کو زہر میں بجھا خنجر اسی نے دورانِ تلاشی چپکے سے فراہم کیا تھا اور وہی تھا جو ایسے حالات پیدا کرتا رہا جن کی وجہ سے لوگ سردار سے مزید بدگمان ہوگئے۔ اس لیے اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کبیر کو کسی صورت معاف کیا جاسکے لیکن تمہیں میں ایک موقع دینا چاہتی ہوں۔ تمہاری ثوبان تک رسائی ہے، اس لیے تم ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتے ہو۔ مجھے اس کے اندرونی راز لا کردو۔ جواب میں، میں تمہیں ہر الزام سے بری کردوں گی۔'' اس نے کھل کر اپنا مقصد بیان کردیا۔
''اگر میں اس تعاون سے انکار کردوں؟''
''تمہارے پاس اس کی گنجائش نہیں ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
''شاید تم بھول رہے ہو کہ اس مکان کے ایک حصے میں تمہارے قافلے کی خواتین بھی مقیم ہیں اور تم اس وقت تک ان تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے جب تک میں اجازت نہ دے دوں۔'' بلی پوری طرح تھیلے سے باہر نکل آئی تھی۔ داؤد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔
''اگر تمہارا جواب ہاں میں ہو تو اسی کمرے میں رک کر مزید ہدایات کا انتظار کرنا، دوسری صورت میں دروازے کے اس طرف میرے مسلح ساتھی تمہارے منتظر ہوں گے جو تمہارے جرائم کی پاداش میں تمہیں گرفتار کرلیں گے۔'' اس نے باقی کی بات کھڑے ہو کر سخت لہجے میں مکمل کی اور ایک جھٹکے سے مڑ کر اندرونی دروازے میں غائب ہوگئی۔ داؤد اتنا کمزور نہیں تھا کہ اس عورت کو زیر نہ کرسکتا لیکن اسے ماننا پڑا کہ ترپ کا پتا سردارزادی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنی کسی غلطی سے ثریا، سارہ اور دیگر خواتین کی زندگیاں خطرے میں ڈالنے کی حماقت نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

''کیا انسان کو نظر نہیں آتا کہ ہم نے اس کو ایک قطرے سے پیدا کیا اور اب وہ ہم سے بحث کرتا ہے اور ہمارے خلاف مثالیں گھڑتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ کہتا ہے کہ مُردے کی گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ اس سے کہہ دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ وہ (اللہ) تو سب کچھ بنانا جانتا ہے۔'' (سورۃ یٰسین، آیات 77 تا 79)

آہستہ آہستہ بحال ہوتے حواس کے ساتھ وہ اپنے قریب سے مسلسل سنائی دیتی بھنبھناہٹ کو اب الفاظ کی صورت میں سمجھنے کے لائق ہوگیا تھا اور ہر لفظ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔
''ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا اور اب وہ ہم سے بحث کرتا / جھگڑتا ہے۔'' اسے الفاظ کسی چابک کی طرح لگے تھے اور احساس ہو رہا تھا کہ پیدا کرنے والی ہستی سے بے نیاز رہ کر صرف اپنی ذات کی خوبیوں کے غرور میں مبتلا رہنا بھی خالق سے جھگڑنے کے برابر ہی تھا۔ مخلوق ہوکر خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھنے کی غلطی خالق کو للکارنے جیسا جرم تھا۔
''اس سے کہہ دو کہ وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ وہ (اللہ) تو سب کچھ بنانا جانتا ہے۔''
وہ اس دعوے کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ اس نے اس دعوے کو سچ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ جو ایک تاریک غار میں کسی حقیر کیڑے کی طرح پڑا تڑپ رہا تھا اور جس کی ہر خوبی کو موت کے اندھیروں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اب اگر اپنے قریب سے کوئی انسانی آواز سن کر اسے سمجھ سکتا تھا تو اسے یقین تھا کہ یہ کوئی معجزہ ہی تھا جو وہ موت کے اندھیروں سے ایک بار پھر زندگی کی روشنیوں کی طرف لوٹ آیا تھا۔
''کیا وہ (اللہ) جس نے آسمان اور زمین بنائے اس کو یہ قدرت نہیں کہ وہ ان جیسے دوبارہ بنا سکے؟ کیوں نہیں؟ وہی تو ہے سب چیزوں کا بنانے والا اور ہر چیز کا علم رکھنے والا۔ جب وہ کسی چیز کو بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے ''ہوجا'' پس وہ ہوجاتی ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور ہم سب کو اسی کے پاس واپس جانا ہے۔'' (سورۃ یٰسین۔ آیات 81 تا 83)
اب وہ الفاظ کو پہلے سے بھی زیادہ وضاحت سے سن اور سمجھ سکتا تھا۔ نہایت پُرکشش آواز میں سماعتوں میں اترتے یہ الفاظ براہِ راست اس کے دل پر اثر کر رہے تھے اور وہ حیرت سے سوچ رہا تھا کہ اتنا باعلم ہوتے ہوئے بھی آج تک وہ اس ہستی سے کیسے بے نیاز رہا تھا جس نے وسیع و عریض، بے کراں آسمان و زمین سے لے کر پُرفتن انسان، مختلف اقسام، جسامت اور خوبیوں کے حیوانات، رنگارنگ گل بوٹے، بدلتے موسم، چاند، سورج، تارے اور دیگر ان گنت جاندار و بے جان اشیاء کو تخلیق کرکے یوں

اپنے ہونے کا ثبوت دیا تھا کہ کسی کے متعارف کروائے بغیر بھی ایک صاحبِ عقل اور ذی شعور انسان کو اس کے ہونے کا اقرار لازما کرنا چاہیے۔ جو یہ اقرار نہیں کرتا اس کی عقل پر یقیناً پردے ہی پڑے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بھی ان ہی افراد میں شمار کر رہا تھا اور شدید احساسِ ندامت تھا جس کے زیرِ اثر اس کی بند آنکھوں کے پیچھے سے آنسوؤں کے قطرے نکل کر دائیں بائیں اس کی کنپٹیوں پر بہہ نکلے تھے۔

''کتنا مہربان ہے تو میرے مالک کہ تو نے اپنے مجھ جیسے بندے کی بھی، جو کبھی تیرا بندہ بن کر نہیں رہا، پکار سنی اور میری روٹھ جانے والی سانسوں کو واپس میرے وجود میں لے آیا۔'' اس کے قریب سے ابھرنے والی آواز بند ہوگئی تھی لیکن اب وہ اپنے خالق سے یوں راز و نیاز میں مصروف تھا کہ اسے اس آواز کے بند ہو جانے کا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔

''تُو نے مجھے بنایا ہے اور یقیناً میرا تیری طرف لوٹ کر جانا طے ہے لیکن یہ میری نادانی تھی کہ میں نے کبھی اس امر پر غور ہی نہیں کیا اور بے فکری سے اس دنیا کے ہنگاموں میں گم رہا۔'' وہ موت کی سرحد کو چھو کر آیا تھا اس لیے اس لائق تھا کہ ایک عام انسان کے مقابلے میں زیادہ گہرائی سے خالق و مخلوق کے رشتے کے بارے میں غور کر سکے۔ وہ جتنا جتنا غور کر رہا تھا، اس کے آنسو اتنی ہی روانی سے بہتے چلے جا رہے تھے۔

''کیا آپ کہیں تکلیف محسوس کر رہے ہیں، میرے آقا؟'' خلوص کی حدت سے پُر ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر آ کر ٹکا اور اس نے اپنے قریب سے پھر وہی آواز سنی جس نے اسے اپنے اردگرد سے بیگانہ کر کے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہ آواز اب الہامی الفاظ کی ادائیگی کے بجائے خود اس سے مخاطب تھی۔ ناچار اسے اپنی آنکھیں کھولنا پڑیں۔ اس کے سامنے فیرس کا چہرہ موجود تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں بے پناہ تشویش اور فکرمندی لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ فوری طور پر اسے کوئی جواب نہیں دے سکا اور خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ بے ہوشی کے عرصے میں جب بھی کچھ دیر کے لیے اس کے حواس لوٹتے تھے تو اسے اپنے قریب جن افراد کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا، ان میں فیرس یقینی طور پر شامل تھا۔

''میں سلیمان صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔'' اس کی طرف سے کوئی جواب نہ دیا گیا تو وہ بے چارہ مزید پریشان ہوگیا۔

''رک جاؤ فیرس۔'' اس نے اسے مڑتے دیکھ کر پکارا۔

''حکم کیجیے آقا!'' اس کی آواز سن کر فیرس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''مجھے تھوڑا سا پانی پلاؤ۔''

''ابھی لیجیے۔'' اس نے پھرتی سے ایک کونے میں دھری صراحی سے آب خورہ بھرا اور اسے سہارا دے کر اٹھانے کے بعد آب خورہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اسے معمولی پیاس لگی تھی لیکن پانی پیتے ہوئے وہ کانٹے یاد آئے جو اس تاریک غار میں مقید اس نے اپنے حلق میں اگتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ پانی کی ایک بہت بڑی نعمت ہونے کا احساس پہلی بار اس کے دل میں جاگا۔ اس نے ایک عجیب سی عاجزی کے جذبات کے ساتھ آب خورے میں موجود پانی کو ختم کیا۔

''شکر ہے آپ کو پوری طرح ہوش آ گیا۔ میں آپ کی طرف سے بہت تشویش میں مبتلا تھا لیکن سلیمان صاحب نے مجھے یقین دلایا تھا کہ تمہارا آقا ایک غیر معمولی انسان ہے اور انشاء اللہ جلد موت کو شکست دے کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوگا۔'' فیرس مسرت آمیز لہجے میں اسے بتا رہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اپنے لیے ''غیر معمولی'' کے الفاظ کا استعمال اسے ایک غرور آمیز خوشی میں مبتلا کر دیتا لیکن اس وقت تو یہ الفاظ کسی کوڑے کی طرح اسے لگے تھے اور اسے غار میں بیتا وہ وقت یاد آ گیا تھا جب تکلیف سے نڈھال، موت کے خوف سے لرزہ براندام وہ کسی بچے کی طرح بے بسی سے کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت کی بے بسی نے اسے باور کروا دیا تھا کہ اس کے باپ سردار امان نے اسے چاہے کتنی ہی خوبیوں سے مرصع کر کے ایک عجوبۂ روزگار میں ڈھال دیا تھا، وہ تھا بہرحال زوال پذیر اور محدود قوتوں کا مالک ایک معمولی انسان، جس کی قدرت کے اس وسیع کارخانے میں محض ایک معمولی پرزے سے زیادہ حیثیت نہیں تھی۔

''آپ کو بھوک محسوس ہو رہی ہوگی۔ آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں اور سلیمان صاحب کو بھی اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کو ہوش آ گیا ہے۔'' فیرس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ اس کے ہوش میں آنے پر کتنا خوش ہے۔

''سلیمان کہاں ہے؟''

''وہ ساری رات آپ کے سرہانے موجود تھے۔ ابھی فجر کے بعد ہی میں نے انہیں زبردستی آرام کے لیے بھیجا ہے

لیکن انہوں نے سختی سے مجھے ہدایت دی تھی کہ کسی بھی غیر معمولی بات کی صورت میں انہیں فوراً اطلاع دی جائے۔''
''اور تمہارے خیال میں میرا ہوش میں آجانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے؟'' مسکراہٹ نے بے ساختہ اس کے لبوں کو چھوا۔
''بے شک یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ وہ سانپ جس نے آپ کو ڈسا تھا، بے حد زہریلا تھا۔ معمولی قوتِ برداشت کا آدمی تو اس کے زہر سے چند لمحوں میں ہی چٹ پٹ ہوجاتا ہے۔'' فیرس نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔
''میں بھی شاید ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر ہی چکا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ مجھے معجزاتی طور پر یہ نئی زندگی عطا کی گئی ہے۔'' وہ پھر ان دردناک لمحات میں پہنچ گیا جب زندگی قطرہ قطرہ کرکے اس کی رگوں سے نکلتی چلی جارہی تھی۔
''کیا تم مجھے بتاسکتے ہو فیرس کہ میں کیسے بچ گیا؟'' کھوئے کھوئے لہجے میں فیرس سے یہ سوال کرتے ہوئے بھی وہ غار کی تاریک اور حبس زدہ فضا میں موجود تھا۔
''دیکھا جائے تو یہ صرف اور صرف اللہ کی مہربانی تھی کہ آپ موت کے پنجوں سے نکل آئے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ آپ کو بچانے کے لیے اس مالک دوجہاں نے مجھ جیسے انسانوں کو متعین کردیا۔'' فیرس نے عاجزی سے جواب دیتے ہوئے اسے تفصیل سے آگاہ کرنا شروع کیا۔
''میں فجر کی نماز پڑھ کر سلام پھیر رہا تھا تو میں نے آپ کو انسانی آنکھ سے مشابہ چٹان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ آپ یونہی چہل قدمی کے لیے تشریف لے جارہے ہیں اس لیے زیادہ توجہ نہیں دی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہوگیا۔ قافلے کی روانگی کا وقت ہونے پر جب آپ مجھے نظر نہیں آئے تو تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ سلیمان صاحب اور دوسرے لوگوں سے معلوم کرنے پر علم ہوا کہ صبح سے کسی نے بھی آپ کو نہیں دیکھا ہے جس کا مطلب تھا کہ آپ قافلے میں موجود نہیں ہیں۔ چونکہ میں نے آپ کو چٹان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے میں آپ کو تلاش کرتا ہوا ان پہاڑوں کے درمیان جا پہنچا لیکن تلاش کے باوجود مجھے وہاں آپ کا کوئی سراغ نہیں ملا اور میں نے سلیمان صاحب کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔
''سلیمان صاحب میری بات سن کر چونک گئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے امیر زادی حورم اور خواجہ سراسنبل کو اس طرف سے آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم امیر زادی سے تو کوئی سوال جواب نہیں کرسکتے تھے لیکن سنبل کو گھیر لیا۔ زبانی باز پرس پر اس نے اپنی زبان نہ کھولی لیکن اس کے انداز سے ہم نے بھانپ لیا کہ یقیناً دال میں کچھ کالا ہے۔ ہمیں تھوڑی سختی اور تشدد سے کام لے کر اس کی زبان کھلوانی پڑی۔ اس سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں ہم اس غار تک پہنچے جہاں آپ بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ اتفاقاً ہم نے وہاں اس خطرناک سانپ کو بھی دیکھ لیا چنانچہ سلیمان صاحب کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ آپ کی بے ہوشی کا کیا سبب ہے۔ ہم نے آپ کو غار سے یہاں منتقل کیا اور سلیمان صاحب پوری تندہی سے آپ کے علاج میں جت گئے۔ حقیقتاً انہوں نے کئی گھنٹے ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر گزارے ہیں اور مجھے یہ لگتا ہے کہ اپنے استاد شمس الدین سے حاصل کردہ تمام علم انہوں نے آپ کے علاج پر صرف کردیا ہے۔ علاج کرنے کے ساتھ ساتھ وہ مسلسل دعاؤں کا بھی ورد کرتے جارہے تھے۔ میں نے کئی بار ان کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان کی دواؤں سے زیادہ دعاؤں کی وجہ سے زندگی کی طرف واپس لوٹے ہیں۔'' اسے یہ سب بتاتے ہوئے فیرس پر جذباتی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔
''تم نے بھی تو میرے لیے دعا کی ہوگی؟'' اس نے غور سے فیرس کو دیکھا۔
''میں دعا کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا؟'' اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔
''ابھی جب میں ہوش میں آیا تو تم میرے سرہانے بیٹھے کیا پڑھ رہے تھے؟''
''وہ سورۂ یٰسین تھی۔ کلامِ پاک کا دل سمجھی جانے والی سورۂ مبارکہ۔'' فیرس نے عقیدت سے پُر لہجے میں اس کے سوال کا جواب دیا۔
''اس کلام نے عجیب طرح سے میرے دل کو کھینچا تھا فیرس، لیکن میں بس آخر کے چند جملے ہی صحیح طور پر سن سکا۔ کیا تم مجھے پوری سورۂ سنادو گے؟'' اس کی فرمائش پر پہلے فیرس کے چہرے پر حیرانی کے رنگ دوڑے، پھر وہ خوشی سے کھل اٹھا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔
''کیوں نہیں میرے آقا! میں ضرور آپ کو سناؤں گا۔''
''یہ کیا بدمعاشی ہے فیرس! تم یہاں بیٹھے آرام سے اپنے آقا کے ساتھ باتیں بنا رہے ہو اور مجھے اطلاع تک نہیں دی۔'' اچانک ہی خیمے میں داخل ہوجانے والے

سلیمان کے جملے نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔
''میں آپ کو اطلاع دینے آ ہی رہا تھا، بس آقا کی چند باتوں کا جواب دینے کے لیے رک گیا تھا۔'' فیرس نے ذرا شرمندگی سے سلیمان کو جواب دیا لیکن اب وہ اس کے بجائے پوری طرح ساشا کی طرف متوجہ تھا اور ایک ہاتھ سے اس کی نبض کی رفتار جانچنے کے ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے پپوٹے اٹھا کر بھی معائنہ کر رہا تھا۔
''شاندار! تمہاری حالت میں بہت تیزی سے اور بہت زبردست تبدیلی آئی ہے۔ تم بہت شاندار رفتار سے صحت مندی کی طرف واپس پلٹ رہے ہو۔'' وہ اب اس کا ہاتھ تھامے جلد کی رنگت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔
''میں خاصی کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔'' ساشا نے اسے اپنی کیفیت سے آگاہ کیا۔
''اصل بات یہ ہے کہ تمہاری زندگی بچ گئی ہے۔ کمزوری کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دواؤں اور اچھی غذا کے استعمال سے انشاءاللہ وہ بھی دور ہو جائے گی۔'' سلیمان نے اسے تسلی دی اور سرہانے رکھی چند بوتلوں میں سے ایک بوتل اٹھا کر اس کے منہ میں چند قطرے ٹپکائے۔
''بہت بدذائقہ دوا ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔
''افادیت کے مقابلے میں اس کے ذائقے کی کوئی اہمیت نہیں۔ تمہارے جسم سے زہر کے اثرات ختم کرنے کے لیے میں نے جو دوائیں استعمال کروائی ہیں، اس میں اس دوا کا کلیدی کردار ہے، اور وہ دیکھو...... تمہارے منہ کا ذائقہ ٹھیک کرنے کے لیے میاں فیرس کچھ لیے چلے آ رہے ہیں۔'' سلیمان نے اسے فیرس کی طرف متوجہ کیا۔ وہ سلیمان کے معائنہ کرنے کے دوران باہر چلا گیا تھا اور اب ایک بڑی رکابی میں بھاپ اڑاتا پیالہ رکھے خیمے میں داخل ہو رہا تھا۔
''اس خالی خولی شوربے سے میرے جیسے لمبے چوڑے آدمی کا خاک پیٹ بھرے گا اور خاک طاقت آئے گی۔'' فیرس نے اسے تکیوں کے سہارے بٹھانے کے بعد پیالہ اس کے روبرو کیا تو وہ پیالے میں موجود شوربے اور اس میں تیرتے گوشت کے ریشوں کو دیکھ کر منہ بناتے ہوئے بولا۔
''غذا کا تعین کرنا میرا کام ہے۔ یہ اچھی علامت ہے کہ تمہیں بھوک محسوس ہو رہی ہے لیکن ابھی احتیاط ضروری ہے۔ بے ہوشی کے عرصے میں ہم بہت قلیل مقدار میں پھلوں کا رس اور شوربا تمہارے معدے میں پہنچانے میں کامیاب ہو سکے تھے اس لیے بہتر ہے کہ لمبے عرصے سے خالی معدے پر ایک دم سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔''
''میں کتنے گھنٹوں بعد ہوش میں آیا ہوں؟'' اس نے سلیمان کی نصیحت سنتے ہوئے سوال کیا اور اپنے ہاتھ سے شوربا پلانے کے خواہش مند فیرس کو اشارے سے منع کر کے خود چمچہ تھام لیا۔
''تم گھنٹوں نہیں، دنوں بعد ہوش میں آئے ہو۔ پورے دو دن بعد۔ اس سے پہلے تم کبھی کبھی آنکھیں کھولتے تھے اور تھوڑا بہت بڑبڑاتے بھی تھے لیکن بہر حال وہ ہوش کی کیفیت نہیں تھی۔''
''میرے ذہن میں کچھ ہلکا ہلکا سا خیال ہے تو سہی لیکن مکمل ہوش میں، میں اب ہی تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن دو دن ...... مجھے یقین نہیں آتا کہ میں کامل دو دن سے ہوش و حواس سے بیگانہ بستر پر پڑا ہوا ہوں۔''
''اور مجھے حیرت ہے کہ تم دو دن میں اٹھنے کے لائق کیسے ہو گئے۔ جس سانپ نے تمہیں کاٹا تھا اس کا کاٹا تو زندہ ہی مشکل سے بچتا ہے۔ بچ بھی جائے تو ہفتوں بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔ تمہیں تو طبی امداد بھی بہت دیر سے ملی۔ اگر میں ماضیِ قریب میں تمہیں شدید زخمی حالت سے تیزی سے روبہ صحت ہوتے ہوئے نہیں دیکھ چکا ہوتا تو اس وقت میرا حیرت سے برا حال ہوتا۔ استادِ محترم جناب شمس الدین ٹھیک کہتے تھے کہ تم غیر معمولی انسان ہو اور تمہارا مدافعتی نظام نہایت شاندار اور مضبوط ہے۔'' سلیمان کے لہجے میں ستائش تھی لیکن وہ کانپ سا گیا۔
''کیا انسان کو نظر نہیں آتا کہ ہم نے اسے ایک قطرے سے پیدا کیا......''
فیرس کی پڑھی جانے والی سورۂ مبارکہ کی آیت اس کے دماغ میں گونجی اور شدت سے احساس ہوا کہ ایک قطرے سے پیدا ہونے والے انسان کو غرور زیب نہیں دیتا۔ معمولی قطرے سے تخلیق کیا جانے والا انسان کتنی ہی طاقت حاصل کر لے، اس کی ہستی اور زندگی محض مثلِ حباب ہے جو کبھی بھی اپنا وجود کھو سکتی ہے۔
''ہاتھ کیوں روک لیا۔ تمہیں یہ سارا شوربا ختم کرنا ہے اور اس کے بعد بھی فیرس وقفے وقفے سے تمہیں جو کچھ کھلائے پلائے اسے خاموشی سے نگل لینا ہے۔ ہم پہلے ہی خاصی تاخیر کا شکار ہو چکے ہیں اور تمہارے ہوش میں آنے کی خبر امیر تک پہنچنے کی صورت میں انہیں کوچ سے روکنا اب میرے بھی بس میں نہ ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم سفر کے لیے کچھ توانائی حاصل کر لو۔''

''تمہارا مطلب ہے ہمارا قافلہ اب بھی اسی جگہ موجود ہے جہاں مجھے یہ حادثہ پیش آیا تھا؟'' وہ امیر کی اس سفر کے لیے بے چینی سے واقف تھا اس لیے اس بات پر حیرت ہوئی کہ ان کا قافلہ دو دن سے ایک ہی مقام پر ٹھہرا ہوا ہے۔

''میں نے امیر کو صاف بتادیا تھا کہ کوچ کی صورت میں، میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اگر وہ میری راہنمائی اور نقشوں سے محرومی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں تو شوق سے جاری رکھیں۔ اصل میں تمہاری حالت اتنی تشویش ناک تھی کہ تمہیں سفر کی صعوبتوں سے بچا کر مکمل یکسوئی سے تمہارے علاج پر توجہ دینا ناگزیر تھا۔ اپنی صاحب زادی کا قصور ہونے کی وجہ سے بھی امیر محترم پر تھوڑا دباؤ پڑا اور کچھ ارسلہ خاتون نے میری حمایت کی تو امیر کو میرا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔''

''یعنی امیر آگاہ ہیں کہ یہ سب کیسے پیش آیا؟''

''بالکل! انہیں بے خبر رکھنے سے کچھ حاصل بھی نہ ہوتا۔''

''ان کی طرف سے کیا ردِعمل آیا؟'' اسے امیر زادی حورم کا انجام جاننے کا اشتیاق ہوا۔ جذبۂ انتقام سے لبریز اس لڑکی نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

''ردِعمل......'' سلیمان تلخی سے ہنسا۔

''خواجہ سرا سنبل دو دن سے بھوکا پیاسا ایک خیمے میں بندھا پڑا ہے اور امیر زادی حورم یقیناً اپنے شاہانہ خیمے میں ہر میسر آسائش سے مستفید ہوتے ہوئے تمہارے خلاف کسی نئے انتقامی منصوبے کی بُنت میں مصروف ہیں۔''

''یعنی اصل مجرم کو چھوڑ کر محض حکم کے غلام کو نشانہ بنایا گیا ہے۔''

''صاحبِ اختیار و اقتدار لوگوں کا انصاف عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔'' سلیمان کے لہجے میں ایک تلخی بھری اداسی تھی۔

''تم میری طرف سے سنبل کے لیے معافی کی سفارش کرنا۔ جب اصل مجرم کے لیے معافی ہے تو اعانتِ جرم کرنے والے کو سزا دینا چہ معنی دارد۔''

''اعانتِ جرم بھی کوئی قابلِ معافی عمل نہیں ہے۔'' سلیمان کو اس کی سفارش پسند نہ آئی۔

''وہ مجبور انسان ہے دوست! تم خود بتاؤ کہ کیا سنبل کے لیے ممکن تھا کہ وہ امیر زادی کے کسی حکم کو ماننے سے انکار کرسکے۔'' اس نے شوربے کا پیالہ خالی کر کے فیرس کو تھمایا۔ وہ ان کی گفتگو میں دخل دیے بغیر ادھر اُدھر بکھرا سامان سمیٹنے میں مصروف تھا۔ اس نے پیالہ تھمایا تو اسے لے کر خیمے سے باہر نکل گیا۔

''سنبل کو معافی دلوانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ اس طرح ہمارا احسان مند ہوجائے گا اور ممکن ہے کہ مستقبل میں کبھی اسے اس احسان کو اتارنے کا خیال بھی آجائے۔'' اس نے سلیمان کو اپنی تجویز کے ایک اہم پہلو کی طرف متوجہ کیا۔

''اسی ترکیب سے تم نے فیرس کو بھی اپنا بے دام غلام بناڈالا ہے۔ میں حیران ہوں کہ وہ تم سے کیسے اتنی شدید محبت کرنے لگا ہے۔ یہ دو دن جس میں تم بے ہوش رہے ہو، وہ یا تو تمہاری خدمت کرتا رہا ہے یا پھر تمہاری زندگی کے لیے دعاؤں میں مصروف رہا ہے۔''

''فیرس کی بات بالکل الگ ہے۔ اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ بھی پہنچے تو میں اس کی ذات میں ایسی کشش محسوس کرتا ہوں جو مجھے اس سے حسنِ خلق سے پیش آنے پر مجبور کرتی ہے۔ شاید یہ اس کے کردار کی مضبوطی اور ایمان کی پختگی کا نتیجہ ہے۔'' اس کے کانوں میں ایک بار پھر فیرس کی تلاوت گونجنے لگی تھی۔

''پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور ہم سب کو اسی کے پاس واپس جانا ہے۔''

سلیمان اس سے کیا کہہ رہا ہے، وہ اس پر غور کرنے کے بجائے اس بات پر غور کررہا تھا کہ جس نے مجھے پیدا کیا، جو مجھ سمیت ساری کائنات پر حکومت کرتا ہے اور جس کے پاس بالآخر ہم سب کو لوٹ کر جانا ہے، میں اب تک اس ہستی سے کیوں غافل رہا اور کیا اب بھی میرے پاس اس سے غافل رہنے کی گنجائش ہے؟ وہ جس نے مجھے نئی زندگی دینے کے ساتھ ساتھ اس بات کی مہلت دی کہ میں اس نئی زندگی کے لیے اپنی ترجیحات طے کرسکوں، کیا اس بات کا حقدار نہیں کہ میں اس کی کھوج کروں؟ اپنی ذات سے سوالات کا یہ سلسلہ عظیم ساشا کے لیے کن نعمتوں کے در کھولنے والا ہے، اس کا فی الحال کسی کو علم نہیں تھا۔

☆☆☆

''کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ درست ہے؟''

''شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سردار زادی نے خود مجھے کبیر کی گرفتاری کی اطلاع دی تھی اور اس اطلاع کو سن کر ہی میں نے مناسب سمجھا کہ فوری طور پر سردار مراد کا گھر چھوڑ دوں۔ کبیر کے زبان کھول دینے کی صورت میں مجھے اپنی گرفتاری کا بھی اندیشہ لاحق ہوچلا تھا۔'' اس نے دانستہ ثوبان کی سحر انگیز آنکھوں سے آنکھیں ملانے سے گریز

کیا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کی کشش سے لوگوں کے دماغ مسخر کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے جھوٹ بول سکے۔

''لیلیٰ نے تمہیں یہ اطلاع کیوں دی؟'' ثوبان کے ماتھے پر ایک لکیر میں اضافہ ہوا۔

''وہ صرف یہ وضاحت کرنا چاہتی تھی کہ ہماری خواتین کے رہائشی حصے میں لگنے والی آگ سے سردار مراد کا کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ آگ کبیر کے ساتھیوں نے اس کے حکم پر لگائی تھی۔'' اس نے اطمینان سے اس متوقع سوال کا جواب دیا۔

''اس طرح اس نے تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ کبیر کو ہرگز بھی ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم تمہارے دشمن نہیں بلکہ تم سمیت ان سارے لوگوں کے نجات دہندہ ہیں جنہیں سردار مراد نے کسی نہ کسی طور یرغمال بنا کر رکھا ہوا تھا اور اب اس کی بیٹی جبر کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔'' ثوبان کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

''میں ان سب باتوں کو نہیں جانتا۔ مجھے صرف اتنا علم ہے کہ میں اور میرے لوگ اس علاقے میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور آپ نے مجھے یقین دہانی کروائی تھی کہ آپ یہاں سے نکلنے میں ہماری مدد کریں گے۔'' اس نے اس بے بس انسان کی طرح جواب دیا جس کے اختیار میں کچھ نہ رہا ہو۔

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن مدد بھی تو میں اسی صورت میں کر سکتا ہوں جب حالات ہمارے قابو میں ہوں۔ حالات پر قابو پانے کے لیے تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ہمارا ساتھ دینا پڑے گا ورنہ وہ...... کی بچی، ہر چیز پر اپنا تسلط قائم کر لے گی۔ جادوگرنی ہے وہ......'' ثوبان نے ایک ہی جملے میں لیلیٰ کے لیے دو دفعہ گالی کا استعمال کر کے اسے حیران کر دیا۔ وہ اب تک اسے بے حد مہذب انسان سمجھتا تھا اور اسے امید نہیں تھی کہ وہ اس کی زبان سے کسی عورت کے لیے گالیاں سنے گا۔

''میں پہلے ہی ہر طرح سے آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ آپ جو کہیں، میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' اپنی کیفیت کے برعکس اس نے انکساری سے جواب دیا۔

''ہمارے لیے سب سے زیادہ مفید تو یہی ہوتا کہ تم سردار مراد کا گھر نہ چھوڑتے تا کہ کبیر کو کھود دینے کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو پاتی اور تمہارے ذریعے ہم وہاں کی اطلاعات حاصل کرتے رہتے۔''

''میں نے بتایا نا کہ میں ڈر گیا تھا کہ کہیں میری گرفتاری کی نوبت بھی نہ آجائے۔'' اس نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں یہی کہوں گا کہ تم نے ضرورت سے زیادہ عجلت سے کام لیا لیکن بہر حال جو ہوا سو ہوا، اب ہمیں آگے کا لائحہ عمل طے کرنا ہے۔ فی الحال تم آرام کرو، کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں تمہیں تمہاری ذمے داریوں سے آگاہ کر دوں گا۔'' اس نے یکدم ہی گفتگو ختم کر دی اور ایک خدمت گار کو طلب کر کے اسے اس کے ساتھ ایک کمرے میں بھجوا دیا۔

محدود سامان والے اس چھوٹے سے کمرے میں آکر وہ ازسرِنو معاملات پر غور کرنے لگا۔

سردارزادی لیلیٰ نے اس کی ساتھی خواتین کو یرغمال بنا کر اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ثوبان کے پاس جائے اور اس کے قریب رہ کر اسے اس کے لائحہ عمل سے باخبر رکھے۔ لیلیٰ نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ بے شک میں تمہیں مجبور کر کے تم سے یہ کام لے رہی ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر تمہارے اندر خیر کا پہلو ہوا تو کسی وقت تم میرا ساتھ دینے پر خوشی محسوس کرو گے۔ لیلیٰ کا یہ دعویٰ سچ ثابت ہوتا یا نہیں، فی الحال تو وہ الجھن کا شکار تھا۔ اسی الجھن زدہ کیفیت میں کافی سارا وقت گزر گیا۔ اس نے چاہا کہ اپنے کمرے سے باہر نکل کر ادھر اُدھر کی سن گن لے سکے لیکن اسے روک دیا گیا اور بتایا گیا کہ اسے اس کی اجازت نہیں۔ اس پابندی نے اس کے اعصاب کو مزید کشیدہ کر دیا اور نہایت بے دلی سے خود کو فراہم کردہ کھانا زہر مار کیا۔ کھانے کے ساتھ مخصوص سرخ مشروب بھی مہیا کیا گیا تھا۔ اس مشروب کو دیکھ کر اس کا دل اسے پینے کے لیے مچلنے لگا لیکن اس نے زبردست قوتِ ارادی سے کام لے کر اپنی خواہش پر قابو پائے رکھا۔ لیلیٰ نے اسے اس مشروب کی جن خصوصیات سے آگاہ کیا تھا ان کے مطابق مشروب نشہ آور تھا اور یہ مشروب پلا کر ثوبان لوگوں کے دل و دماغ نہایت ہوشیاری سے اپنے قابو میں لے لیتا تھا۔ لیلیٰ کے بقول اس مشروب اور اپنی جادو اثر آنکھوں کے زور پر اس نے کمزور عقیدہ لوگوں کے دماغوں میں غلط عقائد راسخ کر دیے تھے اور اب وہ لوگ اپنے ہی مسلمان بہن بھائیوں کو کافر قرار دیتے تھے۔

داؤد مذہب کے نام پر پیدا کیے جانے والے اختلافات کی تباہی سے آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مسلمانوں

کے درمیان موجود چھوٹے چھوٹے مذہبی عقائد کا اختلاف ہی تھا جس نے ان کی طاقت کو تقسیم کر دیا تھا اور وہ ایک قوم بن کر اغیار کے مقابل کھڑے ہونے کے بجائے آپس میں ہی الجھ کر رہ گئے تھے۔ کہنے کو سب مسلمان تھے لیکن فرقہ واریت اور تعصب نے ان کے دلوں میں اتنا زہر بھر دیا تھا کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کا ساتھ دینے کو ترجیح دیتے تھے اور یوں رفتہ رفتہ ان کے ماضی کی شان و شوکت خاک میں ملنے لگی تھی۔

مختلف سوچوں اور فکروں میں گھرا وہ چیونٹی کی رفتار سے گزرتے وقت کی اذیت سہنے پر بھی مجبور تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں وقت گزاری کے لیے کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ پُرتکلف کھانا بے رغبت ثابت ہوا تھا۔ لیلیٰ کی تنبیہ کے باعث اس نے سرخ مشروب سے لذت اندوز ہونے سے بھی اجتناب کیا تھا البتہ رفعِ شک کے لیے اتنا ضرور کیا تھا کہ مشروب کی نصف سے زیادہ مقدار ضائع کر دی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے بظاہر کچھ وقت قیلولہ کرتے ہوئے گزارا لیکن اس کا اندرونی اضطراب اسے کسی طور چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ آخر کار وقتِ عصر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے ایک خدمت گار کو بلا کر ثوبان کے لیے پیغام دیا۔

''میں اپنے ساتھیوں کے لیے سخت مضطرب ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے غیاب کے بعد سردار مراد کے گھر میں مقیم میری ساتھی خواتین اور دیگر اہلِ قافلہ کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہ برتی جائے۔''

اس پیغام کے جواب میں ثوبان کی طرف سے سرخ مشروب کے ساتھ یہ پیغام دیا گیا۔

''میں تمہاری پریشانی اور اندیشوں سے ناواقف نہیں ہوں میرے دوست! میں تمہاری پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے مسلسل تگ و دو میں لگا ہوا ہوں اور یقیناً جلد ہی تمہیں کوئی اچھی خبر سناؤں گا لیکن فی الحال تمہیں صبر سے کام لینا ہوگا اور قیدِ تنہائی کی تکلیف بھی برداشت کرنی ہوگی کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرے چند خاص وفاداروں کے سوا کسی کو تمہاری یہاں موجودگی کا علم ہو اور کسی مخبر کے ذریعے دشمنوں تک اطلاع پہنچ جائے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اگر ایسا ہوا تو یہ تمہارے ساتھیوں کے حق میں زیادہ برا ہوگا۔ خود کو پُرسکون رکھو تاکہ وقتِ ضرورت بہتر طور پر میرا یعنی حق کا ساتھ دے سکو۔''

ثوبان کے اس پیغام کے بعد اس کی بے چینی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئی۔ اس پیغام سے اتنا اندازہ تو ہو رہا تھا کہ ثوبان کوئی زبردست قسم کی کھچڑی پکانے میں مصروف ہے لیکن وہ اس کے لائحہ عمل سے ناواقف تھا۔ یوں سردار زادی لیلیٰ کی خواہش کے مطابق اسے کسی قسم کی معلومات بھی فراہم نہیں کر سکتا تھا اور اسے اندیشہ ستا رہا تھا کہ اس کی طرف سے کسی رابطے کا نہ ہونا کہیں لیلیٰ کو اس کی طرف سے بدگمان نہ کر دے اور وہ خیال کرے کہ وہ اس کے حکم کے مطابق عمل نہیں کر رہا ہے۔ لیلیٰ کی بدگمانی اس کے ساتھیوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اندیشوں، وسوسوں اور احساسِ بے بسی نے یلغار کر کے اس کے اعصاب کو اتنا کشیدہ کر دیا کہ اس کے لیے بھیجے جانے والے سرخ مشروب سے گریز مشکل ہو گیا اور وہ اپنی اعصابی کشیدگی دور کرنے کے لیے مشروب کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گیا لیکن عجیب سا اتفاق ہوا کہ ابھی اس کی انگلیوں نے مشروب سے بھرے پیانے کو چھوا ہی تھا کہ ایک غراہٹ سی سنائی دی اور ہاتھ کو جھٹکا لگنے کے ساتھ ہی پیانہ لڑھک گیا۔ پیانے میں موجود مشروب فرش پر بہہ گیا اور وہ حیرت زدہ نظروں سے اس بلی کو دیکھنے لگا جو اس کی مسہری کے نیچے سے نکل کر اچانک حملہ آور ہو گئی تھی اور اب مزے سے فرش پر گرے ہوئے مشروب کو زبان نکال نکال کر چاٹ رہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بلی نے نیچے گرا ہوا سارا مشروب صاف کر ڈالا اور بڑی آسودگی سے جھومنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ پٹ سے زمین پر گر گئی۔ داؤد نے گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ کر اس کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ بلی گہری نیند سو رہی ہے۔ وہ اس نیند کو مشروب کے اثر کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسے مشروب کے نشہ آور ہونے کا یقین آنے لگا۔ اپنی ذات کی حد تک اس نے مشروب کا محض اتنا اثر دیکھا تھا کہ ایک فرحت بخش سا احساس ہوتا تھا اور ذہن ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ ایک جوان اور طاقتور مرد کے مقابلے میں مشروب نے اس چھوٹی سی بلی پر زیادہ اثر کیا تھا اور وہ اس میں شامل نشے کے اثر سے بے ہوشی کی نیند سو رہی تھی۔ یہ چھوٹا سا واقعہ لیلیٰ کے حق میں ایک دلیل تھا لیکن بہرحال ابھی وہ ثوبان سے پوری طرح بدگمان نہیں ہوا تھا کیونکہ پہلی دو ملاقاتوں میں ثوبان نے اس پر اپنی شخصیت کا جو خوبصورت اثر چھوڑا تھا، وہ ابھی اس کے حصار سے نہیں نکلا تھا۔

اس واقعے کے بعد اس نے مناسب سمجھا کہ کسی پر اپنا اضطراب ظاہر نہ ہونے دے اور خود کو پُرسکون ظاہر کرے۔

اس مقصد کے تحت وہ بستر پر دراز ہو گیا اور بے ساختہ ہی زیرِ لب ان دعاؤں اور آیات کا ورد کرنے لگا جو ایک مسلمان گھرانے کا بچہ ہونے کے ناتے اسے ابتدا ہی سے سکھائی گئی تھیں لیکن عملی زندگی میں آنے کے بعد اس کا زیادہ وقت اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرتے ہوئے گزرا تھا اور پنج وقتہ نماز کی ادائیگی کے سوا کم ہی ایسی فرصت میسر آئی تھی کہ وہ اتنے اطمینان سے ذکر و اذکار میں اپنا وقت صرف کرتا۔ فرصت کے ان لمحات میں اپنے خالق کے ذکر نے اس کی طبیعت پر مثبت اثر ڈالا اور وہ جو کہ صرف خود کو مطمئن ظاہر کرنے کے لیے بستر پر لیٹا تھا، خود بخود پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ سکون کی اس کیفیت میں کب نیند طاری ہوئی، اسے اس کا بھی علم نہیں ہو سکا۔ آنکھ کھلی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ دیر کے لیے نہیں سویا تھا لیکن اس مختصر نیند نے ہی اس کی طبیعت پر مثبت اثر ڈالا تھا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے آنے والا رات کا کھانا بھی رغبت سے کھایا۔ کھانے کے بعد وہ چھوٹی سی پھلوں کی ٹوکری سے انگور کا خوشہ اٹھا رہا تھا کہ لپٹے ہوئے مومی کاغذ نے اپنی طرف توجہ کھینچ لی۔ اس نے کاغذ نکال کر احتیاط سے اس کی تہ کھولی۔ وہاں صرف ایک سطر تحریر تھی۔

''رات کے تیسرے پہر رابطہ کرنے والے شخص کے ساتھ چلے آنے کی صورت میں آپ کو آپ کی الجھنوں سے نجات مل جائے گی اخی! والسلام۔ آپ کا لطیف۔''

مختصر پیغام سے زیادہ پیغام کے آخر میں لکھے ہوئے نام نے اسے برقی جھٹکا لگایا تھا۔ لطیف کا غیاب اس کے لیے ایک معما تھا اور اب لطیف نے اسے ایک ایسی جگہ پر مخاطب کیا تھا جہاں وہ ایک فیصد بھی اس کی موجودگی کی امید نہیں رکھتا تھا۔ اپنے اس فرماں بردار اور جاں نثار ساتھی کی طرف سے کیے جانے والے غیر متوقع رابطے نے اسے بے حد جذباتی کر دیا اور اس نے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ ایک بار پھر اس پیغام کو پڑھا۔ تحریر بے حد شکستہ تھی اور وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لطیف کے ہاتھوں ہی سے لکھی گئی ہے لیکن اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس پیغام کو نظر انداز کر دے۔ اس پیغام کی صورت میں اگر اس کے لیے کوئی دھوکا تیار کیا گیا تھا تب بھی لطیف کے بارے میں جاننے کے لیے وہ ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ عشا کی نماز کو بے حد طوالت کے ساتھ ادا کرنے کے بعد اس نے لطیف کے لیے بالخصوص دعا کی اور پھر بستر پر دراز ہو کر بنا پلک جھپکے اس نامعلوم شخص کا انتظار کرنے لگا جو اسے اس کے پیارے لطیف تک پہنچا دیتا۔ اب پتا نہیں وقت آہستہ گزر رہا تھا یا آنے والا ہی تاخیر کا شکار ہو گیا تھا کہ اسے اپنے انتظار کا عرصہ بے حد طویل محسوس ہوا اور جب آنکھیں دروازے پر ٹکی ٹکی پتھرانے سی لگی تھیں تو وہ بند دروازے کو بے آواز کھلتا دیکھ کر بڑی مشکل سے خود کو اچھلنے سے باز رکھ سکا۔

آنے والا ایک باریش نوجوان تھا۔ کمرے میں جلتے چراغ کی مدھم روشنی میں وہ نوجوان کے چہرے کی بے پناہ سنجیدگی کو دیکھ سکتا تھا۔ آپس میں نظریں ملتے ہی نوجوان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر ہاتھ ہی کے اشارے سے اپنے ساتھ چلنے کی ہدایت دی۔ وہ جو منتظر ہی بیٹھا تھا، فوراً اس کے پیچھے چل پڑا۔ کمرے کے باہر موجود پہرے دار کو اس نے ایک دیوار سے پشت ٹکائے خواب خرگوش کے مزے لیتے دیکھا۔ پہرے دار کے قریب سے دبے پاؤں گزر کر وہ دونوں طویل برآمدے میں خاموشی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ نہ ہونے کے برابر روشنی کے باعث اسے بہت دھیان سے اپنے راہنما کے پیچھے چلنا پڑ رہا تھا۔ بڑے سے مکان کی بھول بھلیوں میں گھماتا وہ اسے لیے بالآخر ایک آہنی دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور دروازے پر تین بار مدھم سی دستک دی۔ جواب میں پہلے دروازے میں موجود آہنی کھڑکی کھلی اور کسی نے چراغ کی روشنی ڈال کر باہر جھانکا، پھر نہایت احتیاط سے بھاری دروازہ کھول دیا۔ ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ پھرتی سے بند کر لیا گیا۔

''زیادہ وقت مت لگانا۔ تمہاری وجہ سے میں بھی مشکل میں پھنس سکتا ہوں۔'' دروازہ بند کرنے والے نے بھرائی ہوئی آواز میں ہدایت دی۔

''بے فکر رہو۔ ہمیں تمہارے تحفظ کا پورا خیال ہے۔'' داؤد کے راہنما نے پہرے دار کو تسلی دی اور آگے بڑھ گیا۔ داؤد اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ایک سلاخ دار کوٹھری کے سامنے جا رکنے پر داؤد کا دل زور سے دھڑکا۔ کوٹھری کے ننگے فرش پر ایک شخص سجدے میں گرا دکھائی دے رہا تھا۔ کم روشنی کے باعث وہ اس شخص کے خدوخال نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن قد کاٹھ میں لطیف سے مشابہت تھی۔ دبلے پتلے مناسب قامت کے اس شخص پر پہلی نظر میں اسے لطیف ہی کا گمان ہوا لیکن جب اس شخص نے سجدے سے سر اٹھایا تو اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ الجھے ہوئے لمبے بالوں والا وہ شخص لطیف نہیں ہو سکتا تھا۔

''اندر تشریف لے جائیے۔'' اسے ساتھ لانے

والے نوجوان نے کوٹھری کا سلاخ دار دروازہ کھول کر آہستہ سے کہا تو وہ خاموشی سے سر جھکا کر کوٹھری میں داخل ہو گیا لیکن حقیقتاً لطیف کو نہ پا کر اس کے دل میں مایوسی سی اتر آئی تھی۔ اسے لانے والا نوجوان واپس پلٹ چکا تھا اور بے چینی سے اس شخص کے سلام پھیرنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''السلام علیکم!'' آخر کار وہ شخص اس کی طرف متوجہ ہوا اور نہایت نرم لہجے میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' داؤد نے جواب دیا لیکن حقیقتاً وہ اس میلے لباس اور گندے حلیے میں موجود مدقوق سے شخص سے الجھن محسوس کر رہا تھا۔

''میرا نام نورالدین ہے۔ آپ سے میں لطیف کے ذریعے متعارف ہوا تھا اور شدت سے خواہش مند تھا کہ کسی طرح آپ سے ملاقات ہو جائے۔'' اس کی آواز میں عمر رسیدگی اور کمزوری کے باعث لرزش سی تھی۔

''لطیف کہاں ہے؟'' وہ اپنی بے چینی کو ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں آپ کو آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا لیکن میری خواہش ہے کہ پہلے آپ میری داستان سن لیں تاکہ حقائق آپ کے علم میں آسکیں اور آپ مستقبل کے لیے کوئی بہتر لائحہ عمل طے کر سکیں۔'' بوڑھے نے شائستگی سے درخواست کی۔

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' لطیف کے لیے بے قراری کے باوجود اسے اس شخص کی بات سن لینا مناسب محسوس ہوا۔

''آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ جس جگہ آپ مجھے ایک قیدی کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں، کبھی میں اس جگہ کے سیاہ و سفید کا مالک ہوا کرتا تھا اور نہایت عیش و عشرت کی زندگی گزارتا تھا۔ میری بدقسمتی کہ ایک روز میری ایک ایسے دھوکے باز سے ملاقات ہو گئی جس نے اپنی شعبدہ بازی سے مجھے اپنے ایک صاحب کرامت و برگزیدہ ہستی ہونے کا یقین دلا دیا۔ اس شخص کی خدمت کو سعادت تصور کرتے ہوئے میں نے اسے اپنے مکان میں جگہ دے دی اور زندگی کے تمام معاملات میں اس کی رائے کو مقدم جاننے لگا۔ اس شخص کے زیر اثر میرا طرزِ زندگی اور عقائد تبدیل ہونے لگے۔ میں نے نیکی تصور کرتے ہوئے اس کی خواہش پر اپنے مکان کے ایک بڑے حصے میں مدرسہ قائم کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن تھا کہ نیکی کا کام کر رہا ہوں کہ اچانک ایک رات میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ میرے نوجوان بیٹے نے مجھے اطلاع دی کہ رات کی تاریکی میں کچھ لوگ خفیہ طور پر مکان میں آتے ہیں اور بزرگ سے ملاقات کرتے ہیں۔ میں نے محض تجسس کے تحت اس سلسلے کا کھوج لگانے کی کوشش کی تو مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ میں اصل میں ایک شیطانی ٹولے کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔'' بوڑھا یقیناً بولتے بولتے تھک گیا تھا اس لیے سانس لینے کو رکا اور پھر آنکھیں مسل کر یوں دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا جیسے جو کچھ بتانے جا رہا ہو، اسے بیان کرنا اس کے لیے بہت اذیت ناک ہو۔

''میں جذباتی آدمی تھا۔ بجائے اس کے کہ دانش مندی سے صورتِ حال کو سنبھالتا، ایک دم سامنے جا کر ان لوگوں کو لعن طعن شروع کر دی۔ نتیجتاً ان کے ہاتھوں مغلوب کر لیا گیا اور میرے بیوی بچوں کو یرغمال بنا کر مجھے مجبور کیا گیا کہ میں ان کی ہدایات پر عمل کروں۔ اپنے اہلِ خانہ کی زندگیاں بچانے کے لیے مجھے ان کے حکم پر لوگوں کے سامنے یہ بات پھیلانی پڑی کہ میں اپنی بیوی کے والد کے بلاوے پر ان کے وطن جا کر وہاں ان کا کاروبار سنبھالنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور اپنے پیچھے اپنا مکان مدرسے کے لیے وقف کر جاؤں گا۔ میرے تعاون کے بدلے میرے اہلِ خانہ کی جان بخشی کی امید دلا کر بظاہر انہیں یہاں سے روانہ کر دیا گیا اور میں اپنے ہی مکان میں ایک قیدی کی حیثیت سے رہنے لگا۔ اہلِ علاقہ یقیناً یہی سمجھتے ہوں گے کہ میں بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہجرت کر چکا ہوں لیکن مجھ پر جو بیتی اس کا علم صرف مجھے ہی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر... پُراذیت انداز میں آنکھیں بھینچ لیں۔ داؤد کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا، وہ بس یک ٹک بوڑھے کو دیکھتا اس کے داستان مکمل کرنے کا منتظر رہا۔ بالآخر بوڑھے نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

''میں اس غلط فہمی میں تھا کہ خود کو قیدی بنوا کر میں اپنے بیوی بچوں کے لیے آزادی اور زندگی کا سودا کر چکا ہوں لیکن ایک روز مجھ پر انکشاف کیا گیا کہ یہ بھی محض دھوکا تھا اور ان سب کو راستے میں ہی ہلاک کر کے ان کی لاشیں دفن کر دی گئی تھیں۔ ایک قیدی اس انکشاف پر رونے دھونے، چیخنے چلّانے اور گالیاں دینے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ میں نے بھی یہی سب کیا اور اس شیطان کے لیے تسکین کا سامان کرتا رہا۔ وہ ظالم مجھ سے کہتا تھا کہ تم نے اپنا مکان دے کر ہم پر ایک احسان کیا ہے اور اس احسان کے بدلے تمہاری زندگی بخش دی گئی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس نے محض

اپنی اذیت پسندی کی تسکین کے لیے مجھے زندہ رکھا ہوا تھا اور گاہے بگاہے ذہنی اور جسمانی اذیت دیتا رہتا تھا۔ پھر ایک دن اس شیطان کو قتل کر دیا گیا۔''

''آپ شاید ثوبان کے باپ کی بات کر رہے ہیں جسے سردار مراد نے زہر دے کر ہلاک کیا تھا؟'' داؤد ایک دم بول پڑا۔

''ہا ہا......'' بوڑھا نور الدین بے ساختہ ہنسا۔''آپ نے یقیناً یہ بات ثوبان کی زبانی سنی ہوگی؟''

''جی ہاں۔'' داؤد نے چبھتے ہوئے لہجے میں اعتراف کیا۔

''وہ عمر میں کم لیکن حقیقت میں اپنے نام نہاد باپ سے زیادہ بڑا شیطان ہے۔''

''نام نہاد باپ......؟''

''ہاں۔ قتل ہونے والا اس کا سگا باپ نہیں تھا۔ بس وہ اس کا بیٹا ہونے کا کردار نبھا رہا تھا، تب ہی تو اپنے مفادات کے حصول کے لیے اس کی جان لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ اس قتل سے ایک طرف اس نے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کیں تو دوسری طرف خود سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اب وہ زیادہ چالاکی اور ہوشیاری سے سارے معاملات چلا رہا ہے۔''

''آپ کو اس قید خانے میں بیٹھے بیٹھے سارے معاملات کا کیسے علم ہے؟''

''اپنے نام نہاد باپ کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ثوبان خود مجھے اس طرح کی اطلاعات دیتا ہے۔ میری ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔'' اس نے اپنے بازو پر سے آستین اتاری۔ کئی پرانے اور مندمل زخموں کے ساتھ ساتھ وہاں ایک تازہ زخم بھی دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ سب ثوبان نے کیا ہے؟'' داؤد کے لیے آنکھوں دیکھی پر بھی یقین کرنا مشکل تھا۔

''وہ سچ مچ ایک ناگ ہے جو دیکھنے میں جتنا خوبصورت ہے، فطرت میں اتنا ہی خطرناک۔ مسلمانوں کا بہروپ بھر کر وہ ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے۔ اس کی تعلیمات، نشہ آور مشروب اور آنکھوں کے سحر نے نوجوانوں کے ذہنوں کو اتنی بری طرح مسخر کر رکھا ہے کہ وہ اپنی ہی قوم کے دشمن بن چکے ہیں۔ نوجوانوں کی ایک ایسی کھیپ بھی تیار کی جا چکی ہے جو یہاں سے نکل کر دور دراز علاقوں میں اسلام کے نام پر غلط عقائد کا پرچار کرے گی اور یوں زہر پھیلتا ہی چلا جائے گا۔''

''کون لوگ ہیں جو یہ سازش کر رہے ہیں؟'' داؤد مضطرب ہوا۔

''وہی جن سے بچ کر تم نے یہاں پناہ لی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے مذہب پر لانے میں ناکامی کے بعد انہوں نے یہ چال چلی کہ ان کے اصل عقائد کو ہی تباہ کر دیا جائے اور عقیدے کی جنگ میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے کاٹ دے۔'' نور الدین کے انکشافات نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھے۔

''آپ اتنا کچھ جانتے ہیں اور اتنا اختیار بھی رکھتے ہیں کہ یہاں اس قید خانے میں مجھے بلوا کر مجھے یہ سب بتا سکیں تو پھر آپ خود باہر نکل کر اپنے لوگوں کو اس سازش سے آگاہ کیوں نہیں کرتے؟'' ایک اہم سوال اس کی زبان پر مچلا۔

''یہاں سے باہر جانے کے ہر راستے پر پہرا ہے۔ اتنے برسوں کے صبر کے صلے میں، میں نے بس اتنا ہی اختیار پایا ہے کہ آپ کی یہاں آمد کی اطلاع پا کر آپ کو یہاں بلوا سکوں۔ آپ کو یہاں لانے والا نوجوان سردار زادی لیلیٰ کا ایک وفادار ہے جس نے نہ جانے کتنی جدوجہد کے بعد یہاں اپنا مقام بنایا ہے۔ قید خانے کا پہرے دار ہمارا وفادار نہیں۔ وہ لالچ کے تحت تعاون کر رہا ہے لیکن بار بار خطرہ نہیں مول لیا جا سکے گا۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے ماضی کی طرح ایک بار پھر دینِ اسلام کی خاطر تلوار نیام سے نکالیں اور ان گھس پیٹھیوں سے نمٹنے کے لیے سردار زادی لیلیٰ کا ساتھ دیں۔'' نور الدین کے ماضی کا حوالہ دینے پر اسے ایک بار پھر لطیف کا خیال آیا۔ یقیناً لطیف نے ہی نور الدین کو اس کے ماضی سے آگاہ کیا تھا۔

''آپ نے ابھی تک مجھے میرے ساتھی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''اس کے حوالے سے میرے پاس کوئی خوش کن خبر ہوتی تو گوش گزار کرنے میں قطعی تاخیر سے کام نہ لیتا۔'' نور الدین کا سر اور نظریں دونوں جھک گئیں۔ داؤد آنکھیں پھاڑے اس میلے کچیلے بوڑھے کو دیکھتا رہ گیا جو اس تاریک قید خانے میں بیٹھا کسی بدروح کی طرح ہیبت ناک نظر آتا تھا۔

پُر خطر جزیروں اور بغاوتوں کے جنگل
میں بھٹکتے مسافر کی داستان کے
مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

بھیدوں بھری محبت کی تکلیف دہ راہوں کا فکرانگیز انجام

پُراسرار محبت

کاوش صدیقی

کہتے ہیں کہ جب خاموشی کو زبان مل جائے تو کیا سامع اور کیا مقرر... سب اس خاموشی کے شور میں کہیں دب جاتے ہیں... انہیں بھی کبھی حالِ دل بیان کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر سماج دشمن بن گیا تھا مگر اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کے حالِ دل سے اچھی طرح واقف تھے۔ جانے یہ کیسا اسرار تھا جو صرف محبت کرنا جانتا تھا۔

اماں کا چہرہ بہت پُرسکون تھا۔ وہ سو رہی تھیں۔ ان کے گھنے بال دو حصوں میں کر کے ان کے دائیں بائیں بہت سلیقے سے پھیلائے ہوئے تھے۔ ان کے ادھ کھلے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہی مسکراہٹ جو ان کی شخصیت کا دائمی حصہ تھی۔ وہ مسکراہٹ جسے ابا کی موت نے مضمحل تو کر دیا تھا مگر معدوم نہیں کیا تھا۔

دوسروں کی موجودگی میں ہمیشہ سمٹ کر بیٹھنے والی اماں آج بہت اطمینان سے لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے انداز میں اب بھی وہی تمکنت تھی جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔

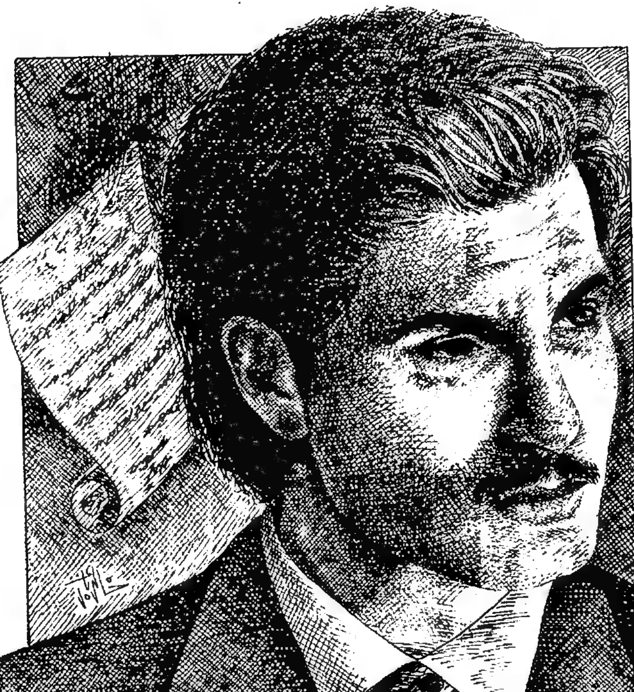
ان کے چہرے پر سپیدی کے ساتھ ساتھ ہلکی سی زردی بھی پھیل گئی تھی۔ یہ زردی کافور کی تھی جو ان کے چہرے کے گرد، گردن کے آس پاس، سارے کپڑوں پر پھیلا ہوا تھا۔

یہ اماں تھیں...... گھر سے جا رہی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ میرے ہوش میں اماں کبھی کسی بھی رات کسی کی بھی... تیمارداری، شادی بیاہ کے لیے.. گھر سے باہر رہی ہوں۔

پورے گھر میں الوداعی ملاقات کے لیے رشتے دار جمع تھے۔ دبی دبی سسکیوں، آہ و زاری، مدھم مدھم رونے کی آوازیں گھر کی ساری فضا میں متحرک تھیں۔

ہمارا گھرانا تو ویسے ہی بہت مختصر تھا۔ ہم دو بھائی اماں اور ابا۔ ابا تو کئی سال پہلے ہی انتقال کر چکے تھے پھر





اماں نے ابا جیسی توجہ سے ہمیں پالا۔
اور...... بس اچانک ہی۔ اپنی عادت کے عین مطابق کسی کو کچھ کہے بغیر کسی کو خدمت کا موقع دیے بغیر بس جیسے اچانک بجلی کی رو منقطع ہو جائے۔ جیسے چلتے چلتے ہوا اچانک ٹھہر جائے۔ بس ایسا ہی ہوا۔
ابا کی دسویں برسی تھی کچے قیمے کے کباب جو ابا ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے بہت شوق سے کھاتے تھے، تیار کیے تھے۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے سامنے رکھا ہوا کھانا دیکھ رہی تھیں۔ سورۃ یاسین ان کے سامنے کھلی ہوئی تھی۔ اللہ ہی جانے وہ یہ سب اتنی تیزی سے کیسے بنا لیتی تھیں۔
باوجود ہم دونوں بھائیوں کے کہنے کے وہ ابا کی برسی میں کسی کو نہیں بلاتی تھیں۔
''جانتے ہو برسی کا کیا مطلب ہوتا ہے؟''
''جی......'' بڑے بھائی نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ اب بھلا یہ بھی کوئی بتانے، سمجھانے، کہنے کی چیز تھی کہ پوچھا جائے کہ برسی کیا ہوتی ہے؟
''جی کہیے۔'' میں نے بھائی کے تاثرات میں حیرت کو محسوس کر کے جلدی سے پوچھا۔ ''جی اماں آپ بتائیے۔''
''برسی کا مطلب ہے یاد کرنا، بچھڑنے والے کو پوری جزئیات کے ساتھ یاد کرنا۔ اس کی یادوں کے ساتھ جڑ جانا۔'' وہ خاموش ہو گئیں پھر بولیں ایک گہری سانس لے کر۔ ''تم لوگ ابھی کہاں سمجھو گے۔''
''نہیں اماں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ کچھ معاملات میں...... صرف ہمیں ہی ہونا چاہیے۔ ہے نا؟''
''ہاں۔'' انہوں نے ایک افسردہ مسکراہٹ سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
میں نے کہا۔ ''ہمیں اپنے کچھ معاملات میں، اپنی محبتوں کے کھوج کے دنوں میں بلاوجہ بھیڑ لگانے کی ضرورت نہیں۔ مجمع تو یکسوئی کو نگل دیتا ہے۔ تنہائی ملاقات کے تاثر کو گہرا کر دیتی ہے۔''
پھر اس کے بعد ابا کی برسی پر ہم کسی کو نہیں بلاتے تھے۔ بس ضرورت مند کو خاموشی سے کچھ دیتے رہتے تھے۔
یہ بھی برسی کا ہی دن تھا۔
سب کھانا وغیرہ تیار کر کے اماں سورۃ یاسین پڑھ رہی تھیں۔
میں نے ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے اشارے سے روکا اور اشارے ہی سے بتایا ابھی پڑھ رہی ہوں...... مزید چار باقی ہیں۔
''میں پڑھ دوں اگر آپ تھک گئی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں۔'' انہوں نے منع کیا اور پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔ میں زیر لب کلمہ توحید کا ورد کرنے لگا۔
تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا۔ ''جاؤ لے جاؤ مگر جلدی آنا۔'' انہیں معلوم تھا کہ میں حافظ جی سے باتیں کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔
''پتا نہیں کیوں گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''
''میں ابھی آیا۔'' میں نے کہا اور ٹرے میں سارا سامان ترتیب سے رکھنے لگا۔ ابا کے کپڑے اور دیگر سامان میں نے پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔
مجھے مسجد آنے اور جانے میں تھوڑی ہی دیر لگی، حافظ جی روکتے رہ گئے مگر مجھے اماں کا خیال تھا اس لیے فوراً ہی پلٹ آیا۔ اماں اپنے کمرے میں تھیں۔ میں نے ان کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بستر پر لیٹی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
میں نے دروازے میں سر ڈال کر کہا۔ ''چائے بنا کر لاتا ہوں۔''
انہوں نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔ میں پلٹ کر باورچی خانے میں آ گیا۔ کبابوں، قورمے، سویوں کی ملی جلی خوشبو باورچی خانے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے چائے بنائی اور لے کر اماں کے کمرے کی طرف بڑھا۔
میں اندر گیا تو وہ بستر سے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔
''آپ اٹھ رہی تھیں کیا؟''
''پیاس لگ رہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔
''میں پانی لے کر آتا ہوں۔'' میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بیرونی کمرے میں رکھے فریج میں سے پانی کی بوتل اور گلاس لے کر اندر آ گیا۔
''یہ لیجیے۔'' میں نے پانی گلاس میں انڈیل کر انہیں دیا۔
''پھر پورا بھر کے گلاس دیا؟'' اماں بھرا گلاس نہیں پیتی تھیں۔
''کوئی بات نہیں حسبِ معمول باقی میں پی لوں گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
''اتنا بڑا ہو گیا ہے اور جھوٹا پانی پیتا ہے۔''
''اپنی اماں کا جھوٹا پانی پینا کون سی بری بات ہے؟'' میں نے کہا تو وہ ہنسنے لگیں۔
میں نے ان کا بچا ہوا پانی پیا اور چائے کا کپ انہیں پکڑا دیا۔
انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ''چائے تو بہت اچھی ہے۔''

''آپ کو اچھی لگی۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔
''جب تم مسجد گئے تھے تو تمہارے ابا آئے تھے۔'' اماں نے کہا۔
''کیا......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
وُہ بولے... اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔''
میں نے کہا۔ ''ارسل کھانا لے کر مسجد گیا ہے اور آپ یہاں آ گئے۔''
میں اماں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چائے کے کپ والا ہاتھ ہوا میں ہی معلق تھا۔
''تمہارے ابا یہاں بیٹھ گئے میرے پاس۔'' وہ میری طرف بغیر توجہ دیے بول رہی تھیں۔
''یہ جو تم مجھے کھانا اِتنے اِتنے دنوں کے بعد بھیجتی ہو، تو مجھے بہت بھوک لگتی ہے۔ بھوک لگی ہی رہتی ہے۔''
''تو اور کیا کروں......؟'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر اچانک کہا۔ ''تم تو جانتے ہو نا تمہارے ابا بھوک کے ہمیشہ ہی کچے تھے۔ بھوک ان سے برداشت ہی نہیں ہوتی تھی۔''
''جی۔'' میں نے بہ مشکل تمام کہا اور چائے کا کپ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔
اماں کہنے لگیں۔ ''تمہارے ابا کہنے لگے تم میرے پاس آجاؤ۔ میرے ساتھ چلو۔''
''اماں آپ ٹھیک تو ہیں؟'' میں نے جیسے کسی ٹرانس سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟''
''وہ سامنے والی الماری دیکھ رہے ہو نا۔'' انہوں نے کہا۔
میں نے اس الماری کی طرف دیکھا جس میں اماں اپنے پیسے، زیورات، کاغذات اور ساری چیزیں رکھتی تھیں۔
''تمہارا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ سخت بے پروا ہے۔ خیر اس سے ملنا تھا مگر دیر ہو رہی ہے۔'' انہوں نے چائے کا ایک لمبا اور آخری گھونٹ بھرا۔ چائے کا کپ خالی کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھا اور لیٹ گئیں۔ ''ذرا میرے پاؤں تو سہلا نا جیسے سُن ہو رہے ہوں۔'' انہوں نے کہا۔
میں جلدی سے ان کے پائنتی بیٹھ گیا اور ان کے پاؤں دبانے لگا۔ اماں کے پاؤں سرد ہو رہے تھے۔
وہ لیٹے ہوئے بول رہی تھیں۔
''پریشان مت ہونا اور بھائی سے بالکل بھی نہ لڑنا۔ وہ زبان کا تیز ہے دل کا برا نہیں ہے۔ اسے بتانا کہ میں اس سے تم جتنا ہی پیار کرتی ہوں مگر وہ گدھا ہے نا۔'' اماں ہنسیں۔
''سب چیزیں سامنے الماری میں ہیں۔'' انہوں نے اشارے سے کہا۔ پھر آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گئیں۔

میں تھوڑی دیر ان کے پاؤں دباتا رہا۔
''اچھا بھئی چلیے۔'' ان کی دھیمی سی آواز آئی۔ انہوں نے اپنے پیروں کو سمیٹا۔ میرے ہاتھوں کے پیالے خالی ہو گئے۔ میں نے ان کے سمیٹے پاؤں کو سیدھا کیا اور دبانے لگا مگر چند لمحوں بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے کچھ ہو گیا ہے۔
جیسے چلتے چلتے ہوا رک گئی ہو۔ جیسے شور تھم کے خاموشی کی چادر تن گئی ہو۔
''اماں......اماں......'' میں نے اماں کے پیروں کو ہلایا اور ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سو گئی تھیں۔
میں تیزی سے اٹھ کر ان کے چہرے کے پاس آیا، ان کے چہرے کو ہلایا۔ ''اماں......اماں......'' مگر وہ خاموش تھیں۔
اماں تو ایک ذرا سی آہٹ پر اٹھ جاتی تھیں۔ میں نے ایک زور کی چیخ ماری۔ ''اماں......اماں......'' مگر اماں نہیں تھیں۔

☆☆☆

سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اماں کے بعد جیسے گھر ویرانہ ہو گیا تھا۔ بھلا سات ارب کی آبادی میں ایک فرد کی کمی سے کیا اثر پڑتا ہے۔
پہلے ابا ہماری دنیا چھوڑ گئے۔ اماں نے شاید اسی دن سے دل چھوڑ دیا تھا مگر گوشت کے لوتھڑے کو وقتِ معین تک تو محوِ حرکت رہنا ہے۔ اماں کیا گئیں، میری دنیا بھی جیسے خالی ہو گئی۔
''یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' مرسل بھائی نے کمرے کی بتی جلائی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولے۔ ''ایسے نہ دیکھا کرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''
''کیا؟''
''تمہاری اتنی خالی خالی آنکھیں۔'' انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے الجھن ہوتی ہے۔'' میں خاموش رہا۔
''اظہر بھائی آئے تھے۔'' مرسل بھائی نے کہا۔ ''تمہیں پوچھ رہے تھے۔ خالہ نے بھی تمہیں بلایا ہے۔''
''اچھا۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔
''میرا تو اب یہاں دل نہیں لگتا۔'' مرسل بھائی دوبارہ بولے۔ ''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''
''معلوم نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ جو چاہیں کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''
''واقعی؟'' مرسل بھائی نے کہا۔
میں خاموش رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مرسل بھائی کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ارادہ ہے؟ میں بالکل اس سارے معاملے سے غیر متعلق تھا۔ مرسل بھائی تھوڑی دیر کھڑے

رہے۔ پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔
اچانک فون پر بیل ہوئی۔ ''ہیلو۔''
''کل آفس آ رہے ہو نا؟'' دوسری طرف سے شاہ زیب نے پوچھا جو میرا آفس کولیگ تھا۔
''ہاں۔'' میں نے ایک گہری سانس لی فون بند کر کے۔
میں گھر سے باہر نکل آیا۔ خالہ کا گھر تھوڑی ہی دور تھا۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور آہستہ قدموں سے خالہ کے گھر کی طرف چل دیا۔ میں اندر داخل ہوا۔
''ارے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ تم یہاں آجایا کرو، مگر تم تو سنتے ہی نہیں ہو۔'' انہوں نے مجھے دیکھتے ہی بنا میرے سلام کا... جواب دیے کہا۔
''جی۔'' میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ خالہ کی آواز سن کر دوسرے کمرے سے خالو بھی نکل آئے۔
''ارے تم کہاں ہو بھئی۔'' انہوں نے حسبِ معمول خوش دلی سے کہا۔ ''اتنے دبلے کیوں ہو رہے ہو؟''
''ہم تو غیر ہیں نا۔ یہاں کیوں آؤ گے؟'' خالہ نے نجف سے کہا۔
''ایسا مت کہیے۔'' میں نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ''آپ سب نے تو اپنوں سے بڑھ کر ساتھ دیا ہے۔''
''چائے۔'' رعنا نے چائے لا کے آگے رکھی۔ ساتھ میں کچھ بسکٹ بھی تھے۔ میں نے چائے کا کپ تھام لیا اور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔
''سب مصروف ہیں اپنے اپنے کاموں میں۔'' اس نے اطلاع دی۔
خالو بولے۔ ''آفس جا رہے ہو یا نہیں؟''
''کل سے جاؤں گا۔''
''دیکھو بیٹا۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔ ''دکھ وقت کے ساتھ ساتھ ہی کم ہوتا ہے۔ مصروفیت ہوگی تو دل بھی بہلا رہے گا اور دکھ کا احساس بھی کم ہوتا جائے گا۔''
''جی۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔
اسی وقت مظہر اندر داخل ہوا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی بولا۔ ''ارے یار کہاں ہو۔ میں تمہارے گھر سے ہو کر آ رہا ہوں۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔'' وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔
''لو گھر میں قدم رکھا نہیں اور باہر کی پڑ گئی' اچھا جاؤ۔'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''مگر کھانا یہاں میرے پاس کھانا۔''
میں اور مظہر کئی دنوں بعد گھر سے نکلے تھے۔ باتوں باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور گیارہ بج گئے۔
''اب تو امی بے بھاؤ کی سنائیں گی۔'' وہ گھڑی دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولا۔
''تو کیا ہوا۔ اس میں نیا کیا ہے؟'' میں نے کہا۔
''ہاں واقعی۔'' مظہر ہنسنے لگا۔
''مجھے گھر پر ہی اتار دینا۔'' میں نے کہا۔
''اور کھانا؟'' مظہر نے مجھے دیکھا۔
''اب اتنی چائے، پراٹھے کے بعد ہرگز گنجائش نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

☆☆☆

گھر میں تنہائی تھی۔ ارسل بھائی اپنے کمرے میں تھے میں تو ہمیشہ سے ہی اماں کے کمرے میں رہتا تھا۔ سو اب بھی وہیں تھا۔
میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور اماں کے خالی بستر کو دیکھنے لگا پھر پتا نہیں کب میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''رونے کی کیا بات ہے؟'' اماں نے کہا۔
''آپ جو مجھے چھوڑ گئیں۔'' میں نے کہا۔
''کیا کرتی تمہارے ابا بھی تو بہت اکیلے تھے نا۔ تم نے سوچا ہی نہیں کہ اماں اکیلی کیسے رہیں گی؟''
''اور میں جو اکیلا ہو گیا ہوں؟'' میں نے غصے سے کہا۔
''تم اکیلے کہاں ہو۔ میں ہوں تمہارے ساتھ اور وہ بھی۔''
''کون؟'' میں نے استعجاب سے پوچھا۔ اماں ہنس دیں۔
''کیوں ہنس رہی ہیں آپ؟'' میں نے چلا کے پوچھا۔
''کیا بات ہے کیوں چیخ رہے ہو؟'' ارسل بھائی نے کمرے کا پردہ ہٹا کے پوچھا۔
میں چونک گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔
''پتا نہیں کیا بات ہے۔ پاگل ہو رہا ہے۔'' ارسل بھائی بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔
میں اندھیرے کمرے میں اپنے بستر پر بیٹھا آنکھیں پھاڑے اماں کے بستر کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تو اماں مجھ سے باتیں کر رہی تھیں اور اماں کیا جانتی ہیں۔ کس کو کہہ رہی تھیں۔
میں تو اپنے آپ میں بھی خود کو شریک نہیں کرتا اور کون ہے وہ جسے اماں کہہ رہی تھیں۔ آخری بات جو میرے ذہن میں تھی وہ یہ تھی کہ کیا مرنے کے بعد ماں پر بیٹے کے راز کھل جاتے ہیں؟

☆☆☆

''بہت سارے کام ہیں۔'' خالہ نے کہا اور اپنے چشمے کی اوٹ سے مجھے دیکھا۔ ''اظہر کی شادی طے ہو گئی ہے۔'' انہوں نے بتایا۔
''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ''اس میں اچھی بات کیا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''تم نہیں سمجھو گے۔'' وہ بولیں۔

رعنا نے کہا۔ ''امی اچھی تو ہیں وہ۔''

''سب ہی اچھے ہیں۔'' وہ بولیں۔

میں سمجھ نہ سکا کہ خالہ کی اس بات کا مطلب کیا ہے۔

اسی وقت تم چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئیں اور چائے میرے سامنے رکھ کر خالہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

''یہ گھر بن رہا ہے۔'' تم نے کہا۔

''اچھی بات ہے۔''

''کیا آج اچھی بات کا رٹا لگایا ہوا ہے۔'' رعنا نے ہنس کر کہا۔

''شادی ہونا، گھر بننا میرے خیال میں اچھی بات ہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس بات سے کون انکار کرتا ہے؟'' میں نے تمہاری طرف دیکھا۔ پرامید نگاہوں سے... تم نے نظر جھکالی۔

رعنا نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ہنس دی۔

☆☆☆

تمہارا گھر بننا شروع ہوگیا تھا۔ نچلے پورشن کی تکمیل کے بعد ایک دن کھڑکی کا شیشہ شاید صحیح سے جڑا نہیں تھا۔ نیچے آن گرا اور ایک دھماکے سے کرچی کرچی ہوگیا۔ گھبراہٹ میں تمہارا پیر ٹوٹے ہوئے کانچ پر پڑ گیا اور پیر کا انگوٹھا زخمی ہوگیا۔

''کہاں لگی دکھاؤ؟'' میں نے دیکھا اور تیزی سے ڈیٹول اٹھایا۔ روئی پر لگا کر تمہارے پاؤں پر لگا دیا۔

''بڑی جلن ہے۔'' تم نے پاؤں پیچھے کھینچ لیا۔

''اب ٹھیک ہوجائے گا۔'' میں نے کہا اور جھک کر پیر پر ہلکی سی پھونک ماری۔ ''اب ٹھیک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھنڈک بھی۔ جلن بھی۔'' تم نے دھیمے سے کہا اور پیر کو آہستگی سے پیچھے کھینچ لیا۔ میری انگلیوں کی دسترس سے باہر۔ ہماری نگاہیں ملیں۔ میں اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہمارے درمیان اکثر خاموشی باتیں کرتی تھی اور جب اکیلے ہوتے تھے تو تنہائی شکوہ کرتی تھی۔

☆☆☆

پیسے پاس ہوں، وسائل کی بہتات ہو تو پھر ہر کام جلد ہی ہو جاتا ہے۔ چھ ماہ میں ہی تمہارا دو منزلہ مکان تیار ہو گیا۔ اس دوران میں نے آفس کے بعد سارا وقت اسی معاملے میں صرف کیا۔ خالو بہت خوش تھے۔

''اظہر، مظہر کو تو پروا ہی نہیں مگر تم نے کمال کر دیا۔'' خالو نے کہا۔ ''بہت بھاگ دوڑ کی تم نے۔''

''گھر کے لیے بھاگ دوڑ تو کرنا ہی پڑتی ہے ورنہ گھر کہاں بنتا ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' تم نے دھیرے سے مداخلت کی۔ ''گھر بنانے کے لیے حوصلہ چاہیے ہوتا ہے۔''

تمہاری بات میں عجب سا تاثر تھا۔ خالو نے روا روی سے کہا۔ ''بھئی ہماری بیٹی کتنی سمجھدار ہوگئی ہے۔''

''مگر لوگ سمجھیں تو سہی۔'' تم نے کہا اور اٹھ گئیں۔ میں خاموش رہا۔

خالو نے کہا۔ ''تمہاری خالہ نے جان کھائی ہوئی ہے۔ ذرا مارکیٹ چلتے ہیں، شادی کارڈ کا کوئی ڈیزائن پسند کر آتے ہیں۔''

''ابو میں بھی چلوں؟'' رعنا نے چہک کر کہا۔

''بھلا موٹر سائیکل پر تم کیسے جاؤ گی؟'' خالہ نے مداخلت کی۔ ''دو چار اچھے اچھے ڈیزائن لے آنا۔ سب پسند کرلیں گے۔''

ہم دونوں نکل کر باہر آ گئے۔ خالو بولے۔ ''دیکھو بھئی میں تمہارے ساتھ چل تو رہا ہوں مگر راستے میں مجھ سے اگر باتیں کرنا تو منہ میری طرف نہ کرنا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے موٹر سائیکل کو کک مارتے ہوئے پوچھا۔

''پچھلی بار اپنے بھتیجے تجمل کے ساتھ گیا تھا وہ مجھ سے منہ پیچھے کر کے باتیں کرتا تھا بار بار، ایک بار اس نے جونہی منہ پیچھے کیا، موٹر سائیکل ایک گاڑی میں ٹھونک دی۔''

یہ سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔

ہم نے مارکیٹ سے تین چار ڈیزائن کے کارڈ پسند کیے اور ڈیزائن لے کر گھر چلے آئے۔

خالو نے آتے ہی چائے کی فرمائش کردی۔ ''گرما گرم سموسوں کے ساتھ چائے تو لازمی ہونی چاہیے۔'' خالو ہنسے۔ وہ بہت خوش تھے، گھر میں پہلی شادی تھی۔ تم اور رعنا کارڈ دیکھنے لگیں۔

''کارڈ تو سب ہی اچھے ہیں۔'' خالہ کو کارڈ پسند آئے تھے۔ ''اب اس میں سے جو اچھا لگے وہ چن لو۔''

''یہ بھی اچھا ہے۔'' میں نے ایک کارڈ اٹھایا۔

''ہاں یہ اچھا ہے۔'' تم نے فوراً ہی کہا۔

میں نے تمہاری طرف دیکھا مگر تمہاری نگاہیں میرے ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر تھیں۔

رعنا نے ہم دونوں کو دیکھا۔ پھر وہ بولی۔ ''ہاں یہی اچھا ہے۔''

خالہ اور خالو نے بھی اسی کو فائنل کر دیا۔
مہندی اور مایوں ایک ہی دن کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اظہر بھائی کی شادی ان کے تایا کے گھر طے پائی تھی لہٰذا دونوں ہی گھرانے ہر بات پر متفق تھے۔
مہندی والے دن تم بہت اچھی لگ رہی تھیں، بعض اوقات لفظ ضروری نہیں ہوتے۔ احساس کامل ہو تو ہر چیز ہی ترجمان بن جاتی ہے۔ تمہاری سپید انگلیاں بڑی مہارت سے ڈھولک پر تھاپ دے رہی تھیں۔ خاندان بھر کی لڑکیاں جمع تھیں۔ سب بہت اچھی تھیں لیکن تمہاری کیا بات تھی۔
شادی کی تمام رسمیں بہت دھوم دھام سے ہوئیں۔ دونوں ہی گھرانوں کی پہلی شادی تھی۔ لہٰذا کمی دونوں طرف سے ہی کوئی نہیں تھی۔ لبنیٰ بھابی چھوٹے سے قد کی تھیں۔ تیز و طرار، جملے باز، ہنسنا، ہنسانا ان کی عادت تھی۔

☆☆☆

محبت کے متعلق ہر ایک کا اپنا ہی نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ محبت اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ اسے لفظوں کی محتاجی نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود کچھ کہنا ضروری ہے، اظہار ضروری ہے، ورنہ پھر جذبے اپنی قدر کھو دیتے ہیں۔
میں سوچتا تھا کہ تم کیا سوچتی ہو گی۔ میرے متعلق؟ آنکھیں بات تو کرتی ہیں مگر تشریح تو نطق کی محتاج ہے۔ خدا سے زیادہ دلوں کے بھید سے کون واقف ہے۔ مگر اس نے بھی اپنی ذات کے اظہار کی وضاحت کے لیے لفظوں کو تخلیق کیا۔
میں کیا کروں؟
تم سے کہوں تو کیا کہوں۔ کیسے کہوں۔
بعض اوقات یہ جملہ کتنا مشکل کتنا ثقیل ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا۔ مجھے تم اچھی لگتی ہو! کتنا لمبا سفر ہوتا ہے اس جملے کے پیچھے۔
میں سوچتا ہوں کہ تم سے کہوں کہ تم ہی زندگی ہو، تم ہی اعتبار ہو، تم ہی ہو کہ جس کے بغیر میری ذات نامکمل ہے۔
مگر مجھے یہ سب کہنے میں دیر لگ گئی۔

☆☆☆

وہ صبح بہت خوش گوار تھی۔ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ قدرے خنک ہوا اچھی لگ رہی تھی۔
مجھے شاہ زیب کا فون آیا۔ ”یار موسم اچھا ہے کیا خیال ہے، دوست کہہ رہے ہیں۔ ہاکس بے چلا جائے۔“
”مگر دفتر؟“ میں نے سوال کیا۔
”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ شاہ زیب ہنسا۔ ”آج اتوار ہے۔ تم کل نہیں آئے تھے تب پروگرام بنا تھا۔ چلے آؤ چلتے ہیں۔“
”روانگی کہاں سے ہو گی؟“ میں نے پوچھا۔
”میرے گھر سے۔“ شاہ زیب نے بتایا۔ ”موٹر سائیکل سب یہیں چھوڑ دیں گے۔ گاڑی دفتر سے لے لی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔
”چلو میں بھی آتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
جب پہنچا تو معلوم ہوا کہ سرفراز کی شادی کی خوشی میں یہ پارٹی ارینج کی گئی ہے۔ ”سرفراز کی ایک طویل محبت بھری کہانی کا انجام بڑا بھیانک ہوا تھا۔ اس کی شادی اسی سے ہو گئی تھی جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ آہ۔ بے چارہ سرفراز۔“ سلیم نے ایک زوردار مصنوعی آہ بھری۔
اس کا انداز ایسا تھا کہ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔
تھوڑی ہی دیر میں ہمارا قافلہ ہاکس بے کی جانب رواں دواں تھا۔
سب موسم کا مزہ لے رہے تھے۔ گاڑی کا ٹیپ فل آواز میں بج رہا تھا۔ ہاکس بے پہنچ کر کوئی نہانے لگا۔ کسی نے سگریٹ سلگا لیا۔ کوئی گنگنانے لگا۔ ٹھنڈی خنک ہوا۔ سمندر کا کنارہ اور بھری محفل میں تنہائی۔ تمہارا خیال آ گیا۔
شاہ زیب ڈرائیور کے ساتھ مل کر گاڑی سے سامان نکال رہا تھا۔ میں اٹھ کر ساحل کی نم آلود ریت پر ٹہلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا، ساحل کی گیلی ریت پر تمہیں سوچنا اچھا لگ رہا تھا۔ میں چلتا رہا۔
”ارے تم؟“ اچانک ایک مانوس آواز نے مجھے چونکا دیا۔
میں نے دیکھا۔ تم اور رعنا میرے سامنے کھڑی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔
مجھے یک بارگی ایک مسرت کا احساس ہوا۔ چند لمحے تو میں جیسے ساکت کھڑا رہ گیا۔
”کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟“ رعنا نے شرارت سے کہا۔ ”کہاں گم ہو گئے بھئی؟“
”تم لوگ یہاں کیسے؟“
”ایویں بس۔“ رعنا ہنسی۔ ”خواب دیکھ رہے تھے ہاکس بے جائیں گے۔ آنکھ کھلی تو یہاں موجود تھے۔“
اس دوران تم خاموش رہیں۔
اتنے میں مظہر وہاں آ گیا۔ ”ارے تم؟“ وہ خوشی سے چلّایا۔ ”چلو کرکٹ کھیلیں۔“
پھر وہ بولا۔ ”مگر تم؟“
”آفس کے سارے دوست پکنک منانے نکلے ہیں۔ سرفراز کی شادی کی پارٹی دی جا رہی ہے۔“ میں نے بتایا۔

مظہر بھی سرفراز کو جانتا تھا۔
''بس رات ہمارا بھی اچانک ہی پروگرام بن گیا۔'' مظہر نے بتایا۔ ''اظہر بھائی، بھابی، امی، ابو سب ہی آئے ہوئے ہیں۔''
''چلو بھئی لڑکیو! ہمیں کچھ کھانے کو دو۔'' مظہر نے تم دونوں سے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اسے خالو نے آواز دی تھی۔ رعنا بھی مظہر کے پیچھے چلی گئی۔
تھوڑی دیر کے لیے ہم تنہا ہو گئے۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔
''چپ کیوں ہو؟''
''کیا کہوں؟''
''کچھ بھی۔'' میں نے کہا۔
تم نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر تم نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے دیکھا اور واپس مڑ گئیں۔ تمہارے گورے گورے سپید پاؤں سمندر کی سرمئی ریت پر نقش پا ثبت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اچانک میں نے دیکھا۔ اظہر بھائی دور کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔
میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا، پھر مجھے شاہ زیب کی آواز آئی۔ میں واپس مڑ گیا۔
شاید ہم دونوں ہی بزدل تھے۔ یا شاید ہم دونوں ہی پہل کے منتظر تھے۔

☆☆☆

اظہر بھائی کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ سب بہت خوش تھے۔ خاندان کی پہلی بچی تھی۔ مٹھائیاں بٹ رہی تھیں۔ تحائف وصول کیے جا رہے تھے۔
میں نے اظہر بھائی کو مبارکباد دی۔ انہوں نے بڑی سرد مہری سے شکریہ ادا کیا۔ مجھے حیرت ہوئی ان کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔
البتہ تم نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ مبارکباد وصول کی تھی۔ پھوپی جان بننے کی۔
خالہ بولیں۔ ''اگر تمہیں جلدی نہیں ہے تو ذرا نہاں کو سینٹر چھوڑ دو۔''
''جی بہتر۔'' میں نے کہا۔
اسی وقت اظہر بھائی باہر نکلے اور بولے۔ ''میں جا رہا ہوں، راستے میں چھوڑتا جاؤں گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' تم نے جواب دیا اور میری طرف دیکھا۔
میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر میں اظہر بھائی تمہیں لے کر روانہ ہو گئے۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر واپس آ گیا۔
مرسل بھائی گھر پر ہی تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی بولے۔ ''کہاں تھے تم؟''
''کوئی کام تھا کیا؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں یار بہت دن ہو گئے ہیں، آفس آفس کے چکر میں باتیں ہی نہیں ہوتی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں تم سے مشورہ کروں۔''
''خیریت تو ہے نا، کہیں کوئی۔''
''بکومت۔'' وہ تیزی سے بولے۔ ''مجھے ایک آفر آئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ قبول کر لوں۔ بہت اچھی جاب ہے مڈل ایسٹ میں۔'' مرسل بھائی انجینئر تھے۔
''ضرور۔ انسان کو اپنے لیے آگے بڑھنے کی راہ چھوڑنی نہیں چاہیے۔ آپ کو موقع مل رہا ہے تو ضرور کریں۔''
''مگر تم یہاں اکیلے رہ جاؤ گے۔'' مرسل بھائی نے کہا۔
''اس کا مطلب ہے کہ آپ فیصلہ کر چکے ہیں، مسئلہ صرف میرا رہ گیا ہے۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ ''آپ اطمینان رکھیں میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو اکیلے نہ رہ سکوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے آپ کو جانا کب تک ہے؟''
''دو مہینے تو لگ جائیں گے۔'' مرسل بھائی بولے۔
بہت دنوں کے بعد ہم لوگ آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ ہم دونوں نہاری کھانے گئے، پھر بیٹھے پان کھائے، باتیں کیں، شہر جاگ رہا تھا۔ ہم لوگ بھی جاگ رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔ بچپن کی یادیں ایک دوسرے کو سنا کر ہنس رہے تھے۔
صبح میں کافی دیر سے اٹھا۔ میں نے مرسل بھائی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ نہیں تھے۔ آج اتوار تھا۔ ہو سکتا ہے کسی کام سے گئے ہوں۔ گیارہ بج رہے تھے۔ میں نہانے گھس گیا۔ نہا کر آیا۔ بالوں میں کنگھا کر ہی رہا تھا کہ اچانک دروازے پر کسی نے بیل دی۔
میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ اظہر بھائی سامنے کھڑے تھے۔
''ارے آپ۔ اندر آ جائیں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔
''چائے پئیں گے آپ۔'' میں نے پوچھا۔
انہوں نے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔
''بڑا صاف ستھرا گھر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ چھڑوں کے گھر تو بڑی بری حالت میں ہوتے ہیں۔''
وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کا جملہ کافی ہتک آمیز تھا۔
اچانک مجھے احساس ہوا کہ جیسے کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔
''تم لوگ شادی کیوں نہیں کرتے؟'' انہوں نے پوچھا۔

خالہ اور خالو نے بھی اسی کو فائنل کر دیا۔
مہندی اور مایوں ایک ہی دن کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اظہر بھائی کی شادی ان کے تایا کے گھر طے پائی تھی لہٰذا دونوں ہی گھرانے ہر بات پر متفق تھے۔
مہندی والے دن تم بہت اچھی لگ رہی تھیں' بعض اوقات لفظ ضروری نہیں ہوتے۔ احساس کامل ہو تو ہر چیز ہی ترجمان بن جاتی ہے۔ تمہاری سپید انگلیاں بڑی مہارت سے ڈھولک پر تھاپ دے رہی تھیں۔ خاندان بھر کی لڑکیاں جمع تھیں۔ سب بہت اچھی تھیں لیکن تمہاری کیا بات تھی۔
شادی کی تمام رسمیں بہت دھوم دھام سے ہوئیں۔ دونوں ہی گھرانوں کی پہلی شادی تھی۔ لہٰذا کمی دونوں طرف سے ہی کوئی نہیں تھی۔ لبنیٰ بھابی چھوٹے سے قد کی تھیں۔ تیز و طرار، جملے باز، ہنسنا، ہنسانا ان کی عادت تھی۔

☆☆☆

محبت کے متعلق ہر ایک کا اپنا ہی نقطہ نظر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ محبت اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ اسے لفظوں کی محتاجی نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود کچھ کہنا ضروری ہے، اظہار ضروری ہے، ورنہ پھر جذبے اپنی قدر کھو دیتے ہیں۔
میں سوچتا تھا کہ تم کیا سوچتی ہوگی۔ میرے متعلق؟
آنکھیں بات تو کرتی ہیں مگر تشریح تو نطق کی محتاج ہے۔ خدا سے زیادہ دلوں کے بھید سے کون واقف ہے۔ مگر اس نے بھی اپنی ذات کے اظہار کی وضاحت کے لیے لفظوں کو تخلیق کیا۔
میں کیا کروں؟
تم سے کہوں تو کیا کہوں۔ کیسے کہوں۔
بعض اوقات یہ جملہ کتنا مشکل کتنا ثقیل ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا۔ مجھے تم اچھی لگتی ہو! کتنا لمبا سفر ہوتا ہے اس جملے کے پیچھے۔
میں سوچتا ہوں کہ تم سے کہوں کہ تم ہی زندگی ہو، تم ہی اعتبار ہو، تم ہی ہو کہ جس کے بغیر میری ذات نامکمل ہے۔
مگر مجھے یہ سب کہنے میں دیر لگ گئی۔

☆☆☆

وہ صبح بہت خوش گوار تھی۔ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ قدرے خنک ہوا اچھی لگ رہی تھی۔
مجھے شاہ زیب کا فون آیا۔ ''یار موسم اچھا ہے کیا خیال ہے، دوست کہہ رہے ہیں۔ ہاکس بے چلا جائے۔''
''مگر دفتر؟'' میں نے سوال کیا۔
''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' شاہ زیب ہنسا۔ ''آج اتوار ہے۔ تم کل نہیں آئے تھے تب پروگرام بنا تھا۔ چلے آؤ چلتے ہیں۔''
''روانگی کہاں سے ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔
''میرے گھر سے۔'' شاہ زیب نے بتایا۔ ''موٹر سائیکل سب یہیں چھوڑ دیں گے۔ گاڑی دفتر سے لے لی ہے۔'' وہ ہنسنے لگا۔
''چلو میں بھی آتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔
جب پہنچا تو معلوم ہوا کہ سرفراز کی شادی کی خوشی میں یہ پارٹی ارینج کی گئی ہے۔ ''سرفراز کی ایک طویل محبت بھری کہانی کا انجام بڑا بھیانک ہوا تھا۔ اس کی شادی اسی سے ہو گئی تھی جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ آہ۔ بے چارہ سرفراز۔'' سلیم نے ایک زوردار مصنوعی آہ بھری۔
اس کا انداز ایسا تھا کہ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔
تھوڑی ہی دیر میں ہمارا قافلہ ہاکس بے کی جانب رواں دواں تھا۔
سب موسم کا مزہ لے رہے تھے۔ گاڑی کا ٹیپ فل آواز میں بج رہا تھا۔ ہاکس بے پہنچ کر کوئی نہانے لگا۔ کسی نے سگریٹ سلگا لیا۔ کوئی گنگنانے لگا۔ ٹھنڈی خنک ہوا۔ سمندر کا کنارہ اور بھری محفل میں تنہائی۔ تمہارا خیال آ گیا۔
شاہ زیب ڈرائیور کے ساتھ مل کر گاڑی سے سامان نکال رہا تھا۔ میں اٹھ کر ساحل کی نم آلود ریت پر ٹہلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا، ساحل کی گیلی ریت پر تمہیں سوچنا اچھا لگ رہا تھا۔
میں چلتا رہا۔
''ارے تم؟'' اچانک ایک مانوس آواز نے مجھے چونکا دیا۔
میں نے دیکھا۔ تم اور رعنا میرے سامنے کھڑی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔
مجھے یک بارگی ایک مسرت کا احساس ہوا' چند لمحے تو میں جیسے ساکت کھڑا رہ گیا۔
''کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟'' رعنا نے شرارت سے کہا۔
''کہاں گم ہو گئے بھئی؟''
''تم لوگ یہاں کیسے؟''
''ایویں بس۔'' رعنا ہنسی۔ ''خواب دیکھ رہے تھے ہاکس بے جائیں گے۔ آنکھ کھلی تو یہاں موجود تھے۔''
اس دوران تم خاموش رہیں۔
اتنے میں مظہر وہاں آ گیا۔ ''ارے تم؟'' وہ خوشی سے چلّایا۔ ''چلو کرکٹ کھیلیں۔''
پھر وہ بولا۔ ''مگر تم؟''
''آفس کے سارے دوست پکنک منانے نکلے ہیں۔ سرفراز کی شادی کی پارٹی دی جا رہی ہے۔'' میں نے بتایا۔

مظہر بھی سرفراز کو جانتا تھا۔
''بس رات ہمارا ابھی اچانک ہی پروگرام بن گیا۔'' مظہر نے بتایا۔ ''اظہر بھائی، بھابی، امی، ابو سب ہی آئے ہوئے ہیں۔''
''چلو بھئی لڑکیو! ہمیں کچھ کھانے کو دو۔'' مظہر نے تم دونوں سے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اسے خالو نے آواز دی تھی۔ رعنا بھی مظہر کے پیچھے چلی گئی۔
تھوڑی دیر کے لیے ہم تنہا ہو گئے۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔
''چپ کیوں ہو؟''
''کیا کہوں؟''
''کچھ بھی۔'' میں نے کہا۔
تم نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر تم نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے دیکھا اور واپس مڑ گئیں۔ تمہارے گورے گورے سپید پاؤں سمندر کی سرمئی ریت پر نقش پا ثبت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اچانک میں نے دیکھا۔ اظہر بھائی دور کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔
میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا، پھر مجھے شاہ زیب کی آواز آئی۔ میں واپس مڑ گیا۔
شاید ہم دونوں ہی بزدل تھے۔ یا شاید ہم دونوں ہی پہل کے منتظر تھے۔

☆☆☆

اظہر بھائی کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ سب بہت خوش تھے۔ خاندان کی پہلی بچی تھی۔ مٹھائیاں بٹ رہی تھیں۔ تحائف وصول کیے جا رہے تھے۔
میں نے اظہر بھائی کو مبارکباد دی۔ انہوں نے بڑی سرد مہری سے شکریہ ادا کیا۔ مجھے حیرت ہوئی ان کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔
البتہ تم نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ مبارکباد وصول کی تھی۔ پھوپی جان بننے کی۔
خالہ بولیں۔ ''اگر تمہیں جلدی نہیں ہے تو ذرا نہاں کو سینٹر چھوڑ دو۔''
''جی بہتر۔'' میں نے کہا۔
اسی وقت اظہر بھائی باہر نکلے اور بولے۔ ''میں جا رہا ہوں راستے میں چھوڑتا جاؤں گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' تم نے جواب دیا اور میری طرف دیکھا۔
میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر میں اظہر بھائی تمہیں لے کر روانہ ہو گئے۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر واپس آ گیا۔
مرسل بھائی گھر پر ہی تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی بولے۔ ''کہاں تھے تم؟''
''کوئی کام تھا کیا؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں یار بہت دن ہو گئے ہیں آفس آفس کے چکر میں باتیں ہی نہیں ہوتی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں تم سے مشورہ کروں۔''
''خیریت تو ہے نا، کہیں کوئی۔''
''بکومت۔'' وہ تیزی سے بولے۔ ''مجھے ایک آفر آئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ قبول کر لوں۔ بہت اچھی جاب ہے مڈل ایسٹ میں۔'' مرسل بھائی انجینئر تھے۔
''ضرور۔ انسان کو اپنے لیے آگے بڑھنے کی راہ چھوڑنی نہیں چاہیے۔ آپ کو موقع مل رہا ہے تو ضرور کریں۔''
''مگر تم یہاں اکیلے رہ جاؤ گے۔'' مرسل بھائی نے کہا۔
''اس کا مطلب ہے کہ آپ فیصلہ کر چکے ہیں، مسئلہ صرف میرا رہ گیا ہے۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ ''آپ اطمینان رکھیں میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو اکیلے نہ رہ سکوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے آپ کو جانا کب تک ہے؟''
''دو مہینے تو لگ جائیں گے۔'' مرسل بھائی بولے۔
بہت دنوں کے بعد ہم لوگ آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ ہم دونوں نہاری کھانے گئے، پھر بیٹھے پان کھائے، باتیں کیں، شہر جاگ رہا تھا۔ ہم لوگ بھی جاگ رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔ بچپن کی یادیں ایک دوسرے کو سنا کر ہنس رہے تھے۔
صبح میں کافی دیر سے اٹھا۔ میں نے مرسل بھائی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ نہیں تھے۔ آج اتوار تھا۔ ہو سکتا ہے کسی کام سے گئے ہوں۔ گیارہ بج رہے تھے۔ میں نہانے گھس گیا۔ نہا کر آیا۔ بالوں میں کنگھا کر ہی رہا تھا کہ اچانک دروازے پر کسی نے بیل دی۔
میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ اظہر بھائی سامنے کھڑے تھے۔
''ارے آپ۔ اندر آ جائیں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔
''چائے پئیں گے آپ۔'' میں نے پوچھا۔
انہوں نے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔
''بڑا صاف ستھرا گھر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ چھڑوں کے گھر تو بڑی بری حالت میں ہوتے ہیں۔''
وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کا جملہ کافی ہتک آمیز تھا۔
اچانک مجھے احساس ہوا کہ جیسے کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔
''تم لوگ شادی کیوں نہیں کرتے؟'' انہوں نے پوچھا۔

”پہلے تو مرسل بھائی کی شادی ہو گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اماں نے ان کے لیے لڑکی دیکھ رکھی تھی مگر جب تک ان کا گریجویشن مکمل نہیں ہوتا ہمیں انتظار کرنا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور تم؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔ پہلے مرسل بھائی کی شادی ہو گی پھر سوچوں گا۔“

”اچھی بات ہے ضرور سوچنا۔“ انہوں نے کہا۔ پھر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولے......” ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے؟“

”جی کہیے۔“ میں نے جواب دیا۔ دفعتاً مجھے پھر احساس ہوا کہ کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔

اظہر بھائی کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ”دیکھو خالہ کے انتقال کے بعد تم دونوں بھائی اکیلے رہتے ہو۔ چھڑے چھانٹ۔“ انہوں نے چھڑے چھانٹ پر خاصا زور دیا۔

”تمہارا ہمارے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ سارا محلہ جانتا ہے کہ ہم رشتے دار نہیں ہیں۔ بس برسوں پرانی محلے داری ہے۔ اتنی پرانی کہ نئے آنے والوں کو پتا ہی نہیں چلتا، لیکن ہم اور تم تو جانتے ہیں نا کہ ہم رشتے دار نہیں ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”آپ جو کہنا چاہتے ہیں وہ کھل کر کہیں۔ ظاہر ہے جب ہم رشتے دار ہیں ہی نہیں تو تکلف کیسا؟“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”میں چاہتا ہوں تم ہمارے گھر مت آیا کرو۔“ انہوں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

”لیکن؟“

”لیکن کیا؟“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے مجھے مزید بولنے سے روکا۔ ”نہ تم بچے ہو، نہ میں بچہ ہوں لیکن کے آگے بہت کچھ ہو سکتا ہے جو نہ میں سننا چاہتا ہوں نہ جاننا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم اتنے سمجھ دار تو ہو گے ہی کہ جو میں کہہ رہا ہوں اسے سمجھ سکو۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں خاموش رہا۔

وہ دروازے پر پہنچ کر رکے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”امید ہے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔“ وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا؟

وہ محبت، وہ تعلق، وہ رشتہ جو میرے اندر تھا میری روح میں پیوست تھا اُس کی بارآوری اتنی کیسے بڑھ گئی کہ سب کی نگاہوں میں آ گئی۔ کیسے برگ و بار نے مجھے ڈھک لیا کہ بیں تو گم ہو گیا اور شجرِ محبت عیاں ہو گیا۔

اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کس سے پوچھو گے؟ معلوم نہیں کتنی دیر ہوئی جب دروازے پر کسی نے دستک دے کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

کوریئر والا تھا۔ مرسل بھائی کے لیے پوسٹ آئی تھی۔ میں نے لے کر مرسل بھائی کے کمرے میں رکھ دی۔

اچانک جیسے زندگی سے میری دلچسپی ہی ختم ہو گئی۔

میں اپنے کمرے میں آ کر اپنے بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔

اماں کے جانے کے بعد آج پہلی بار مجھے تنہائی کا احساس ہوا تھا۔ ذات کے بکھرنے کا تجربہ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔

☆☆☆

”تمہارا دماغ خراب ہے، اتنی اچھی نوکری کیوں چھوڑ رہے ہو؟“

شاہ زیب نے میرا استعفا دیکھا تو مجھ پر برس پڑا۔

”اور وہ بھی بغیر نوٹس کے۔ امجد صاحب تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ مسئلہ کیا ہے؟“ شاہ زیب نے پوچھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں بس۔ یہاں سے دل اچاٹ ہو گیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

ایک بار آپ اندر سے ٹوٹ جائیں تو پھر ہر جگہ سے ٹوٹنے لگتے ہیں۔

میں نے مرسل بھائی سے بہانہ بنایا کہ ہماری فرم لاہور میں اپنی برانچ کھول رہی ہے اور وہاں مجھے منیجر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ کیونکہ آپ بھی جا رہے ہیں تو میں نے بھی یہ آفر قبول کر لی۔

”اچھا کیا۔“ انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ ”تمہارا دل بہلا رہے گا۔ کب جانا ہے؟“

”کل۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا؟“ وہ پریشان ہو گئے۔ ”اتنی جلدی۔“

”جب جانا ہی ہے تو کیا جلدی کیا دیر۔“ میں نے اوپری دل سے ہنس کر کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ مرسل بھائی کی اچھی عادت تھی کہ وہ کسی بھی معاملے کی کرید میں نہیں پڑتے تھے۔

☆☆☆

اسے ترک کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ جس سے کوئی وعدہ نہ ہو۔ جس سے کوئی اقرار نہ ہو... اور نہ ہونے کے باوجود سب کچھ اسی کے وجود سے مشروط ہو۔

مجھے کوئی شہر سے جانے کے لیے نہ کہہ رہا تھا، نہ مجبور کر رہا تھا لیکن اظہر بھائی کی بات کے بعد جیسے اس شہر میں،

اس گلی میں سانس لینا مشکل ہو گیا تھا۔ جس میں تمہاری خوشبو تمہاری مہک رچی بسی تھی۔ بعض وجود آپ کی قربت میں ہی حدت انگیز نہیں ہوتے۔ بدن کی حرارت ان کو دیکھنے سے بھی برقرار رہتی ہے لیکن جب وجۂ زندگی نہ رہے تو پھر زندگی کا کیا فائدہ؟

میں نے شہر سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ کہاں جانا ہے مجھے نہیں معلوم تھا لیکن پھر منزل جیسے سامنے آ گئی۔ میں اماں اور ابا کی قبر پر بیٹھا تھا۔

کچھ نہیں پڑھ رہا تھا۔ بس دونوں قبروں کو دیکھے جا رہا تھا۔

اچانک میرے عقب سے آواز آئی۔ ''جلدی کرو ٹرین ساڑھے تین بجے چلے گی۔''

''اچھا۔'' دوسرے نے کہا اور پھر قدموں کے سنگ ریزوں پر گھسٹنے کی آواز آئی۔ بعض لوگوں کی عادت زمین پر پیر گھسیٹ کر چلنے کی ہوتی ہے۔ کچر کچر...... جیسی آواز۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔

دونوں تیز تیز قدموں سے قبرستان کے بیرونی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ وہاں دو قبروں پر گلاب کے تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔ ہم اپنے پیاروں کو کہاں کہاں چھوڑ جاتے ہیں۔

میں اٹھ کر گھر آیا۔

کپڑوں کے چند جوڑے رکھے اور مرسل بھائی کے نام ایک مختصر سا پیغام چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ میرا رخ اسٹیشن کی طرف تھا۔

ساڑھے تین بجے والی ٹرین لاہور جانے کے لیے تیار تھی۔ میں ٹکٹ لے کر اندر گھس گیا۔

میں اس وقت بالکل خالی الذہن تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں لاہور کیوں جا رہا ہوں لیکن اس شہر میں دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

مگر پھر وہی۔ آنکھیں بند کرتے ہی تمہارا چہرہ روشن ہو گیا۔

''کیوں جا رہے ہو؟''

''پتا نہیں۔''

''واپس آ جاؤ۔''

''کس کے لیے؟''

تم خاموش ہو گئیں۔

بس تمہارے حوالے سے سوچنا اور بے بس ہونا میری محبت کا خاصہ بن گیا تھا۔

سوتے جاگتے سفر تمام ہو گیا اور لاہور آ گیا۔

لاہور۔ داتا کی نگری۔ میں اس سے پہلے کبھی لاہور نہیں آیا تھا۔ بس دفتر کا ایک دوست جس کا نام زاہد تھا، وہ واقف تھا میرا۔ ایک سال پہلے کچھ دنوں کے لیے دفتر جوائن کیا تھا۔ تب اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ میں نے کیوں نجانے اس کا پتا سنبھال لیا تھا۔

میں اسٹیشن سے باہر نکلا۔ دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے، میں نے ایک پی سی او سے فون کیا اور آنے کا مقصد بتا دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں مجھے زاہد کا چہرہ دکھائی دیا۔ ویسا ہی دبلا پتلا، مجھول سا، ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ ہم دونوں گرم جوشی سے ملے۔

''کب آئے، کیسے آئے، کیا پروگرام ہے؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''بات یہ ہے کہ مجھے اپنے لیے کوئی ٹھکانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی سستا سا ہوٹل بتاؤ۔''

''لو اس کی کیا ضرورت ہے، میرے پاس جگہ ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔'' زاہد کے انداز میں بڑی بے تکلفی تھی۔

''میں پتا نہیں کب تک رہوں۔ تمہیں مسئلہ نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

مجھے کیا مسئلہ ہوگا۔ دو مہینے پہلے ہی میں نے سنگل بیڈ کا فلیٹ لیا ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بندہ مل جائے تو شیئر کر لوں۔ قسمت میں تم لکھے تھے۔'' زاہد ہنسا۔

''آدھا کرایہ میں دوں گا۔'' میں نے فوراً کہا۔

''اچھا بھئی۔ چلو تو سہی۔'' زاہد نے جواب دیا۔

اور ہم دونوں ہوٹل سے باہر آ گئے۔ زاہد کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں تو اپنی موٹر سائیکل وہیں چھوڑ آیا ہوں۔

''پریشان نہ ہو'' زاہد نے کہا۔ ''تم میری موٹر سائیکل بھی استعمال کر سکتے ہو۔''

''اچھا۔'' میں نے گردن ہلا دی۔

زاہد کا فلیٹ دو کمروں، ایک باتھ روم اور مختصر سے کچن پر مشتمل تھا۔ بلڈنگ گندی اور سیڑھیاں نیم تاریک تھیں۔ مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں تو سب اپنی مرضی سے چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆

زاہد کے ساتھ زندگی آہستہ آہستہ رواں ہو گئی۔ میرے پاس جس فرم میں کام کا تجربہ تھا اسی نوعیت کی فرم میں زاہد کے توسط سے ملازمت بھی مل گئی۔

ہم دونوں اکثر باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ میرے کام کے انداز سے خوش تھے۔ میں نے اپنے پرانے دفتر سے رابطہ کر کے کسٹم کلیئرنس کی بہت اچھی لائن سیٹ کر لی تھی۔ شہریار صاحب اس بات سے بہت خوش ہو گئے تھے کہ ان کی کراچی کے چکروں سے جان چھوٹ گئی تھی۔

"آپ کو کراچی میں کیا برا لگتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دو چیزیں۔" شہریار صاحب نے فوراً جواب دیا۔ "مشینی زندگی اور ٹکا سا انداز۔"

"ٹکا سا انداز؟" میں نے انہیں وضاحت طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں یار تم کراچی والے اس طرح صاف جواب دیتے ہو کہ دل ٹوٹے ہو جاتا ہے۔ تمہیں دل رکھنا ہی نہیں آتا۔"

میں خجل سا ہو گیا۔

"تم سے ایک بات پوچھوں؟" انہوں نے کہا۔

"جی۔"

"کیا تمہاری کوئی منگنی شنگنی، شادی کا مسئلہ چل رہا ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر رابعہ سے شادی کر لو۔"

"رابعہ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے کہا۔ "کون سی رابعہ؟"

"ہماری کمپیوٹر آپریٹر۔" انہوں نے کہا۔ "وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔"

"کیا؟" میں بھونچکا رہ گیا۔ "اس نے کہا؟"

"میں بچہ نہیں ہوں۔" شہریار صاحب نے متانت سے کہا۔ "زندگی دیکھی ہے۔ ہم پنڈو ہوا کو سونگھ کر بارش کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کونپل دیکھ کر فصل پہچان لیتے ہیں۔ تم ایسے بھرا پرا گھر چھوڑ آئے تو اس کا سبب بھی تو ہوگا۔ تم جیسے لوگ آدرشی ہوتے ہیں۔ جذبات کے ہاتھوں خود کو سزا دیتے رہتے ہیں۔"

ان کا تجزیہ حیرت انگیز تھا۔ میں چپ رہا۔ کسی نے اس طرح میرے اندر نہیں جھانکا تھا۔

"سوچ لو۔" انہوں نے کہا۔ "وہ لوگ زیادہ اہم ہوتے ہیں... جو ہم سے محبت کریں۔ ہمیں چاہیں۔"

میں چپ ہی رہا۔

☆☆☆

رابعہ خوش شکل تھی، دبلی پتلی وہ پہلی لڑکی تھی جو عینک لگانے کے باوجود بری نہیں لگتی تھی۔ پھر وہ میرا خیال رکھنے لگی۔

"ایسا مت کرو۔" مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔

"کیا؟" وہ بولی۔

"جو تم کر رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"تم کس چیز سے الجھن محسوس کر رہے ہو؟" اس نے اسی نرمی سے پوچھا جس طرح وہ بات کرتی تھی۔

"میرا اتنا خیال مت رکھو۔ میں مسافر ہوں۔"

"ہر مسافر کہیں نہ کہیں ٹھہر جاتا ہے۔" اس نے منطقی دلیل دی۔

"تم نہیں سمجھو گی۔" میں نے چائے کا ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ میرے حلق کی نالی تک ایک تلخ لکیر کھنچ گئی۔

"سمجھنے کے لیے بات ضروری ہے۔ تم تو بات ہی بہت کم کرتے ہو۔" وہ ذرا ٹھہر کے بولی۔

میں نے کسمسا کے پہلو بدلا اور کہا۔ "کوئی بات ہی نہیں ہے کرنے کی۔"

"زخم گہرا ہو تو کھرنڈ، آتے آتے وقت بھی لگتا ہے اور ٹیسیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ بہتر ہے آدمی اس سے نجات کے لیے درد کش گولیاں کھا لے۔" اس نے بڑی رسانیت سے کہا۔

"کون سی گولی؟"

"میں۔" اس نے اچانک میری طرف گہری نگاہ سے دیکھا۔ "مجھے گولی سمجھ کر نگل لو، میں بظاہر کڑوی مگر تاثیر میں اچھی ہوں......" اس نے بے ساختہ کہا۔

میں گنگ اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس رات زاہد کے فلیٹ میں نہ آس پاس کا شور تھا، نہ بدبو کا احساس، نہ ہی زاہد کے خراٹے مجھے محسوس ہو رہے تھے۔

"یہ کیا ہوا؟"

"تم مجھ سے دور جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں تم سے کیسے دور جا سکتا ہوں؟" میں نے جواب دیا۔

"مجھے چھوڑ گئے نا۔" اس نے شکوہ کیا۔

"میں تم سے کہاں بھاگ سکتا ہوں؟" میں ننھے بچے کی طرح بلکا۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "میں تمہیں کیسے ترک کروں؟"

"میں ترک نہیں ہو سکتی۔ جذبے سے روح ترک نہیں ہوتی ہے۔ یہ اس سے سوا ہے۔"

"تم حیران کرتی ہو۔"

"تم جب افسردہ ہوتے ہو تو میں دکھی ہو جاتی ہوں۔" اس نے دھیمے سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

"نہیں جب تم اکیلی، اداس ہوتی ہو تو میں پریشان ہو جاتا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

’’عجیب سا رشتہ ہے ہمارا۔‘‘ اس نے کہا۔
اور پھر اپنی ہی ہنسی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔
میں نے دیکھا۔ زاہد اپنے بستر پر بیٹھا مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
’’کیا ہوا؟‘‘ میں ہیر سمیت کر اٹھ بیٹھا۔
’’تم سوتے میں باتیں کرتے ہو۔ روتے ہو۔ قہقہہ لگاتے ہو؟‘‘ زاہد کی آنکھوں میں بے حد حیرت تھی۔
’’شاید کوئی خواب دیکھا ہوگا۔‘‘ میں نے ہنسنے کی کوشش کی اور اٹھ کر کولر سے پانی نکال کے پینے لگا۔

☆☆☆

پتا نہیں کیا ہوا؟ بہت سادگی سے میری شادی رابعہ سے ہوگئی۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ واقعہ کیونکر رونما ہوگیا۔
بالکل اسی طرح جیسے آپ کومے کے عالم میں ہوں اور آپ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ اس دن دفتر میں رابعہ نہیں آئی تھی۔
معلوم ہوا کہ رابعہ کے والد کو دل کا دورہ پڑا ہے... اور وہ ہاسپٹل میں ہیں۔ دفتر کے سب لوگ انہیں دیکھنے گئے۔ میں ... بھی دیکھنے گیا۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔
رابعہ ان کے پاس اکیلی تھی۔ میں نے آہستگی سے پوچھا۔ ’’اور کوئی نہیں ہے؟‘‘
’’نہیں کوئی نہیں ہے۔‘‘ اس کے چہرے پر افسردگی تھی اور ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔
’’بس میں اور بابا ہی ہیں ایک دوسرے کے ساتھ۔‘‘ اس نے دھیمے سے کہا اور اپنی خشک آنکھوں کو رگڑا۔
’’پریشان نہ ہو۔‘‘
وہ کچھ نہیں بولی اور اپنے باپ کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اچانک وہ زور سے ہلے۔ مانیٹر پر دل کی حالت بتانے والی لائنیں بے ترتیب ہوگئیں۔
ایک ڈاکٹر نے جلدی سے انجکشن تیار کر کے ان کے بازو میں انجیکٹ کیا، پھر دوسرا انجکشن۔
چند ہی لمحوں میں ان کی سانسیں متوازن ہوگئیں۔
دونوں ڈاکٹرز باہر نکل گئے۔ ان میں سے ایک نے جاتے جاتے مجھے پلٹ کے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔
میں دبے پاؤں اس کے پیچھے باہر نکل آیا.... وہ راہداری میں کھڑے ہو کر بولا۔ ’’بات یہ ہے کہ یہ بالکل آخری اسٹیج پر ہیں، کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم ان کو اس وقت لائف سیونگ میڈیسن دے رہے ہیں۔ دعا کیجیے۔‘‘
اس نے میرا جواب سنے بغیر میرے شانے پر تھپکی دی اور آگے بڑھ گیا۔
میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔
پھر میں دھیرے دھیرے اندر چلا گیا، پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ اچانک وہ کسمسائے۔ رابعہ تیر کی طرح ان کی طرف بڑھی۔
’’بابا...... بابا۔‘‘ اس نے ان کے چہرے پر جھک کر کہا۔ ’’آنکھیں کھولیں۔ میں رابی۔‘‘
اس نے ان کے چہرے پر اپنا ہاتھ پھیرا۔
’’یہ......؟‘‘ انہوں نے مختصراً نحیف آواز میں کہا۔
’’ارسل...... ارسل......‘‘ رابعہ نے کہا۔
ان کی انگلیوں میں مانیٹر کی کلپ لگی تھی۔ انہوں نے بمشکل اپنا ہاتھ ہلایا۔ میں نے جلدی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔
’’را...... بی......‘‘ انہوں نے آہستہ سے کہا۔
اور میرا ہاتھ کھسکا کے رابعہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں ششدر رہ گیا۔
ہم دونوں چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔
اچانک جیسے کمرے میں بلا کا سکوت چھا گیا۔
رابعہ نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور کال بیل کو پاگلوں کی طرح دبانے لگی۔ چند ہی لمحوں میں دونوں ڈاکٹرز اور اس کے پیچھے پیچھے دو نرسیں دوڑتی ہوئی آئیں۔
ڈاکٹر نے ان کی نبض چیک کی، مانیٹر کی طرف دیکھا جہاں سب ختم ہو چکا تھا......

☆☆☆

رابعہ کے والد کی تدفین کے تیسرے دن شہریار صاحب نے اپنے گھر میں قاضی کو بلا کر ہمارا نکاح کروا دیا۔
شہریار صاحب کا کہنا تھا کہ اب رابعہ بالکل تنہا ہوگئی ہے۔
تب مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ رابعہ کسی مجبوری میں نہیں اپنے وقت کو کاٹنے کے لیے ملازمت کر رہی تھی۔ اس کا ایک کنال کا دو منزلہ گھر تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔
مری کے ایک حادثے میں والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ہمراہ انتقال کر گئی تھیں۔ دیگر کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ اس نے اپنے والد کو میرے متعلق بتا دیا تھا۔
بس باپ اور بیٹی ایک دوسرے کے رفیق تھے۔
ہم بھی الگ الگ کمروں میں سوتے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ میری شادی ہوگئی ہے۔ بالکل یوں تھا جیسے یہ بھی موت کی کوئی رسم ہو۔ بس ایک فرق ہمارے درمیان آیا تھا۔ رابعہ تم کے بجائے مجھے آپ سے مخاطب کرنے لگی تھی۔

ہم ایک ہی گھر میں مانوس اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے۔
یہ بابا کے چالیسویں کے چوتھے یا پانچویں دن کی بات ہے۔ جب اس نے کہا۔ ''ہمارے ایک دور کے رشتے دار آرہے ہیں۔ انہیں بابا کا پتا چلا ہے۔ وہ دو تین دن یہیں رہیں گے۔''
''اچھی بات ہے۔ کیا میری وجہ سے کوئی پرابلم ہوسکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں یہ بات نہیں ہے۔'' رابعہ قدرے ہچکچا کے بولی۔ ''اصل میں ان کے ساتھ ان کی بیٹی اور داماد بھی ہیں۔ تو میں...... '' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
''ہاں بات مکمل کرو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔
''آپ دوسرے کمرے میں سوتے ہیں تو وہ ___''
رابعہ چپ ہوگئی۔
''اچھا اس لیے پریشان ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم جیسا چاہو ویسا ہی ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔
''شکریہ۔'' وہ دھیمے سے بولی۔
☆☆☆
دوسرے دن وہ لوگ آگئے۔
تھوڑی دیر تو رسمی باتیں ہوتی رہیں، پھر آہستہ آہستہ ان کا رخ خاندانی باتوں کی طرف مڑ گیا۔
میں چپ چاپ سنتا رہا۔ چوذھری فضل اللہ کی بیٹی اور داماد آرام کے لیے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔
''اگر آپ تھک گئے ہیں تو میں چائے آپ کو کمرے میں پہنچادوں۔'' رابعہ نے مجھے دیکھ کر کہا۔
''ہاں یہ بہتر رہے گا۔'' میں نے جواب دیا اور ان سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔
میں رابعہ کے کمرے میں آگیا۔
کمرا بڑی خوبصورتی اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کے وسط میں ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ڈبل بیڈ کے ساتھ ہی مخملی دیوان تھا۔ کمرے میں مکمل قالین کے بجائے وسط میں ایک خوبصورت غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں موتیا کی ہلکی سی مہک تیر رہی تھی۔
کمرے سے نفاست اور تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ دیوان کے دونوں طرف کشن رکھے ہوئے تھے۔ میں دیوان پر بیٹھ گیا۔
میں نے سامنے دیوار کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک خوبصورت پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ جس میں خزاں کا زرد موسم پینٹ تھا۔ مگر ایک طرف گلاب کی ایک ننھی کلی زردی مائل سبز پتوں کے درمیان کھلی ہوئی تھی۔ خزاں کے باوجود بہار کی امید باقی تھی۔
مجھے پینٹنگ اچھی لگی۔
''ارے آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ وہاں بیٹھیے۔''
اچانک رابعہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا وہ چائے کا کپ ایک چھوٹی سی ٹرے میں لیے کھڑی تھی۔
''میں ابھی آتی ہوں۔'' اس نے چائے دے کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔
میں چائے ختم کر کے دیوان پر ہی لیٹ گیا۔ نرم و گداز دیوان نے جیسے مجھے اپنے پہلو میں بھرلیا۔
''کیا بات ہے۔'' میں نے پوچھا۔
وہ مجھے بہت بکھری بکھری لگ رہی تھی۔
''کچھ نہیں یوں لگتا ہے جیسے سارا بدن اذیت سے بھرا ہے۔ ہمت ہی نہیں ذرا بھی۔'' اس کی آواز تکلیف کی شدت سے مرتعش تھی۔
''کیا ہوا؟'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا جو بے حد سرد ہو رہا تھا۔
''تم سے دوری کی تکلیف اور جلن کم ہے کیا؟''
''میں بہت بے قرار ہوں۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''جی چاہتا ہے کہ تم سامنے ہو اور تم سے کہتا جاؤں۔''
''تم پاگل ہو۔'' وہ مسکرائی۔
''ہوں صرف تمہارے لیے۔'' میں نے کہا۔
''چلو سو جاؤ تھک گئے ہوگے۔'' اس نے دھیرے دھیرے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔
''تم چلی جاتی ہو جونہی میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔'' میں نے انکار کیا۔
''تم آنکھیں بند کرو گے تو میں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے مسکرا کے تسلی دی۔
میں نے پرسکون ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔
☆☆☆
میری آنکھ کھلی تو میں دیوان پر ہی سو رہا تھا۔ البتہ ایک چادر میرے اوپر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا رابعہ دریچے میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔
میرے اٹھنے کی کسمساہٹ کو محسوس کر کے اس نے اپنا رخ بدلا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''چائے لاؤں؟''
''ہاں۔'' میں نے گردن ہلائی۔
''آپ فریش ہولیں۔'' اس نے کہا اور باہر نکل گئی۔
میں نے اٹھ کر باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ باہر آیا تو وہ

چائے لیے منتظر تھی۔
"مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کب سو گیا۔" میں نے کہا۔
اس نے جواب دیا۔ "نیند بھی کیا چیز ہے۔ ایک نئے جہان میں پہنچا دیتی ہے۔"
میں نے چونک کر اسے دیکھا مگر رابعہ چائے کے کپ کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور چائے پینے لگا۔ تھوڑی دیر میں آفس چلا گیا۔ گھر میں گاڑی موجود تھی ڈرائیور کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ رابعہ خود بہت اچھی ڈرائیو کر لیتی تھی۔
دفتر آ کے میں روزمرہ کے کاموں میں الجھ گیا۔ رابعہ کا دوپہر کے کھانے کے لیے فون آیا.. مگر میں نے منع کر دیا۔ مہمانوں کو شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ رابعہ ان کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ میں بھی دفتر میں مصروف تھا۔
شہریار صاحب اپنے آبائی گاؤں گئے ہوئے تھے۔ میں تقریباً نو بجے واپس آیا تو گھر میں سناٹا تھا۔
"کیا ہوا مہمان کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"انکل کی بھانجی آ کر انہیں لے گئیں۔ آج وہیں رہیں گے اور کل رات میں عمرے کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔" رابعہ نے بتایا۔
"کھانا لگاؤں؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔
جتنی دیر میں تازہ دم ہو کر آیا، رابعہ نے میز پر کھانا لگا دیا تھا۔ میں نے کہا۔ "بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔ کیا بنایا ہے؟"
"پسندے اور مونگ کی دال، ساتھ میں سلاد۔" اس نے بتایا۔
"بہت اچھا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔
"لگتا ہے آپ کو پسند ہیں۔"
"ہاں۔ اماں بناتی تھیں۔" میں نے جواب دیا۔
"اپنی پسند مجھے بتایا کیجیے۔" اس نے سالن کی پلیٹ میرے سامنے رکھی۔ "اچھا لگے گا آپ کے لیے بناتے، پکاتے۔" اس کا انداز خالصتاً ایک روایتی عورت کا سا تھا۔
کھانا ختم ہوا تو چائے لے کر ہم اپنے بیڈروم میں آ گئے۔
"آپ سارے دن میں تھک گئے ہوں گے۔" اس نے پوچھا۔
وہ ڈریسنگ میز پر بیٹھی اپنے کانوں کے بندے اتار رہی تھی۔ اس نے آئینے میں مجھے دیکھا۔ میں اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔
"میں جانتی ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" اس نے کہا۔
"بھلا کیا؟"
"یہی کہ میں آپ کے گلے پڑ گئی۔" اس نے دھیمے سے کہا۔
"میں ایسا نہیں سوچتا۔" میں نے کہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری آواز میں جیسے کرختگی تھی۔ میں نے چائے ختم کی اور لیٹ گیا۔ جہازی سائز کے بیڈ کے ایک طرف میں تھا اور دوسری طرف وہ اور ہمارے درمیان خلا تھا۔
"سو گئے کیا؟" اس نے بڑی نرمی سے میرے گالوں پر ہاتھ رکھا۔
"نہیں تمہارا انتظار کیے بغیر کیسے سو سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ کمرے میں موتیا کی بھینی بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی۔
"کتنا یاد کرتے ہو مجھے؟" اس نے دھیرے سے کہا۔
اس کے گھنے سیاہ بادل جیسے بال میرے سارے چہرے پر پھیل گئے اور ان میں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چھن چھن کے آنے لگی۔ موتیے کی مہک بھی۔
میں نے اسے تھام لیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو تھام لیا۔ پھر چاندنی نے ہمیں اپنے اندر سمو لیا۔
میری آنکھ کھلی تو رابعہ کا ہاتھ میرے سینے پر تھا۔ وہ مجھ سے بچوں کی طرح چپکی سو رہی تھی۔ مجھے کرنٹ سا لگا۔
یہ کیا ہو گیا؟
میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹایا اور دھیرے دھیرے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔
یہ کیا ہو گیا؟ میں نے سوچا۔
پتا نہیں کیسے رابعہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اپنے بال سمیٹتے ہوئے بیڈ سے پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔
اس نے سامنے دیکھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اسے میں نظر آ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں، میں نے نگاہیں جھکا لیں۔
رابعہ نے مجھے دیکھا اور بولی۔ "کسی اور کے دھوکے میں ہی سہی، آپ میرے پاس تو آئے۔"
میں چپ رہا۔
وہ اٹھ کر چلی گئی، چند لمحوں بعد ہی شاور سے پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ میرا ذہن ماؤف تھا۔
وہ کب باہر آئی۔۔۔ کب کمرے سے باہر گئی، کب

واپس آئی۔ میں نہیں جانتا لیکن جب دھیرے سے اس نے میرا ہاتھ ہلایا تو میں چونکا۔
"کیا ہوا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔
"پتا نہیں۔" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔ "پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔"
"میں جانتی ہوں۔" وہ بڑی رسانیت سے بولی۔ "رات ہوتے ہی آپ گم ہو جاتے ہیں کسی اور کی دسترس میں جا پہنچتے ہیں۔"
وہ دوبارہ کمرے سے باہر چلی گئی۔
میں تھوڑی دیر بیڈ سے پاؤں لٹکائے بیٹھا رہا۔
☆☆☆
رابعہ بہت اچھی بیوی تھی۔ بہت سلیقہ شعار، دھیان رکھنے والی، ہر شے کو سج سج کے برتنے والی، وہ مجھے بھی ایسے ہی برتتی تھی۔
مگر میں دو دنیاؤں میں جی رہا تھا۔ ایک وہ دنیا جس میں رابعہ تھی۔ میری نئی زندگی تھی۔ رب کا فضل ہی فضل تھا اور دوسری دنیا تم تھیں۔ جو رات کے ساتھ ہی اپنا در وا کر دیتی تھی۔
اچھا کھانا، اچھا پینا، کوئی روک ٹوک نہ ہو، مکمل خود مختاری۔ مگر جیسے میرے اندر کچھ خاص تھا۔ صحرا میں جلتی ریت کی طرح۔ جتنا بھی پانی برس جائے صحرا پیاسا ہی رہتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کیا میں ناشکرا ہوں؟
بالکل اچانک ہنستے ہنستے۔ باتیں کرتے کرتے۔ میں خاموش ہو جاتا۔ بے وجہ اداسی مجھے گھیر لیتی۔
میں نے سنا۔ ماسی بشیراں جو ہمارے پاس کام کرتی تھی اور ہمارے پاس ہی رہتی تھی۔ ایک دن رابعہ سے کہہ رہی تھی۔
"صاحب کو کسی سیانے کو دکھاؤ۔"
"کیوں؟" رابعہ نے پوچھا۔
"تم دیکھتی نہیں صاحب کی آنکھیں۔ بعض اوقات بالکل خالی خالی سی ہو جاتی ہیں۔ یوں جیسے ان میں زندگی ہی نہ ہو۔"
"ارے کیا بے تکی باتیں کر رہی ہو۔" رابعہ نے فوراً کہا۔
رات کو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی رابعہ نیا نیا پرفیوم دیکھ رہی تھی جو وہ آج ہی مارکیٹ سے لائی تھی کہ اچانک شیشی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور فرش پر گر کے کرچی کرچی ہو گئی۔ وہ ننگے پیر تھی اچانک پیچھے ہٹی تو ایک زوردار سی آواز نکل گئی۔
پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا کے بیڈ پر بٹھایا اور غسل خانے سے ڈیٹول لے کر روئی سے اس کے پیر کا زخم صاف کرنے لگا۔
شیشے کا ٹکڑا اس کے انگوٹھے کے نچلے حصے میں کھب گیا تھا۔ میں نے بڑی نرمی سے اس کانچ کے ٹکڑے کو نکالا۔ زخم صاف کیا۔ ڈیٹول کی تیزی سے رابعہ نے ہلکی سی جھرجھری لی۔
"کیا اس کو بھی ایسے ہی چوٹ لگی تھی۔ آپ نے ایسے ہی زخم صاف کیا تھا؟" رابعہ نے آہستہ سے پوچھا۔
روئی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں رابعہ کو دیکھنے لگا۔
اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ تھاما۔ "کہہ دینے سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔"
"کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔" میں نے کہا۔
تم بیٹھی ہوئی تھیں۔
"ابھی تک زخم بھرا نہیں۔" میں نے شکوہ کیا۔
"بعض زخم کہاں بھرتے ہیں؟" تم نے جواب دیا۔
"اپنا خیال کیا کرو۔"
"میں کیوں رکھوں اپنا خیال۔ تم جو ہو۔"
اچانک جیسے تم تحلیل ہو گئیں۔ میں نے دیکھا۔ رابعہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کمرے میں موتیا اور ڈیٹول کی ملی جلی مہک بھری ہوئی تھی۔
رابعہ بیڈ کے کونے سے ٹیک لگائے دیکھتی رہی۔
"تمہیں چائے پلاؤں؟" میں نے پوچھا۔ رابعہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
میں نے کچن میں آ کے چائے بنائی اور دو کپ لے کر اس کے پاس آ گیا۔ رابعہ نے ایک ننھا سا گھونٹ بھرا۔ پھر بولی۔ "چائے تو آپ نے بڑی اچھی بنائی ہے۔"
"ہاں۔ میں اور اماں رات کو سونے سے پہلے چائے پیتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔ اماں سارے دن کام کاج کر کے تھک جاتی تھیں تو پھر میں چائے بنا کر لے آتا تھا۔"
"اور کچھ بتایئے؟ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "اگر ہم اپنے دکھ، سکھ ایک دوسرے سے نہیں کہیں گے تو ہماری کون سنے گا۔"
"تم نے تو مجھے سکھ ہی سکھ دیا ہے لیکن شاید میں تمہیں کچھ نہ دے سکا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔
"ایسا مت کہیں۔" رابعہ نے فوراً کہا۔ "آپ نے مجھے مکمل کیا۔ مجھے آپ اچھے لگے۔ بس اور قدرت نے بھی ہمیں ملا دیا۔"
"تم خوش قسمت ہو۔" میں نے دھیمے سے کہا۔ "تم

نے جو چاہا مل گیا۔ آدھا ادھورا۔"
"میں تقدیر کی تقسیم پر راضی ہوں۔ آپ جتنے بھی مجھے ملے ہیں میں خوش ہوں۔" رابعہ نے آہستہ سے کہا۔

☆☆☆

دن رات میں بدل جاتے ہیں۔ صبح شام میں ڈھل جاتی ہے لیکن بعض دفعہ اندر کا موسم ٹھہر جاتا ہے۔
میرے اندر بھی ایسا ہی موسم ٹھہر گیا تھا۔ تمہارے انتظار، تمہارے ساتھ کا موسم۔
رابعہ مجھ سے زیادہ بہادر تھی۔ گزرتے دنوں نے مجھے تھکن دی تھی اور ساتھ ساتھ رابعہ کے ساتھ کی تصدیق بھی۔ شاید یہ تصدیق نہ ہوتی تو میں رابعہ کو بھی اپنے خواب کا حصہ ہی سمجھتا رہتا۔
ہمارے پاس تمثیل آ گیا تھا۔ میرے اور رابعہ کے وجود کی رسید۔
تمثیل جوں جوں بڑا ہوتا جا رہا تھا، میری شکل و صورت میں ڈھلتا جا رہا تھا۔
"آپ کو پتا ہے کہ پہلا بچہ اگر شوہر کی شکل پر جائے تو کیا مطلب ہوتا ہے؟" رابعہ نے تمثیل کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔
"جینز کا معاملہ۔" میں نے جواب دیا۔
"آپ مردوں کی سمجھ میں کچھ باتیں کبھی نہیں آ سکتیں۔" رابعہ نے کہا۔ "اولاد کی شکل و صورت کا تعلق احساسات سے بھی ہوتا ہے۔" وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔ "اگر بچہ ہوبہو باپ کی شکل پر ہے تو اس کا مطلب ہے کہ عورت کو ذہنی اور جذباتی طور پر اپنے شوہر کی محبت اور توجہ حاصل ہے۔"
میں نے رابعہ کو غور سے دیکھا۔
وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ "محبت تو محبت ہی ہوتی ہے چاہے وہ یک طرفہ ہی کیوں نہ ہو۔ عورت محبت کی مصور ہوتی ہے، اپنے جذبے کے قلم سے اپنے وجود میں محبت کو مجسم ڈھال دیتی ہے۔ مصور بھی۔ مجسمہ ساز بھی۔"
وہ ذرا رکی پھر آہستگی سے بولی۔ "آپ سے بہتر اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے بھلا؟"
میں خاموش اسے دیکھتا رہا۔ نہ جانے کیوں مجھے رابعہ کی کوئی بات بری نہیں لگتی تھی۔ رابعہ کے بابا کا جو کاروبار میں نے سنبھالا تھا، گزشتہ برسوں میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔
مگر ایک بات تھی، کاروبار کے تمام معاملات میں رابعہ کے ہی دستخط چلتے تھے۔ حالانکہ اس نے کئی بار کہا کہ کیوں آپ مجھ سے چھوٹے چھوٹے چیک، کنٹریکٹ سائن کراتے ہیں، آپ کلی مالک اور مختار ہیں۔"
مگر یہ بات میں اس کی نہیں مان سکا۔ میں تو بس تہی دامن، خالی ہاتھ ... رہنا چاہتا تھا۔ خود پر کوئی بوجھ رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جسے کوچ کرتے سمے کوئی پریشانی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔
اس دن تمثیل کی بائیسویں سالگرہ تھی۔ وہ بالکل میری جوانی کی تصویر تھا۔ ہم بہت خوش تھے۔ رابعہ چہک رہی تھی۔
کافی دوستوں نے تحائف دیے تھے۔ اس کو موٹر سائیکل کا بہت شوق تھا مگر نجانے کیوں رابعہ کو موٹر سائیکل سے خوف آتا تھا۔
اس نے اس کی ضد کے باوجود اس کو نئی گاڑی دلا دی تھی۔
"یہ تحفہ میرے اور پاپا کی طرف سے ہے۔" اس نے کہا۔
تمثیل بہت خوش ہوا۔ اس کے کالج کے بہت سے دوست آئے تھے... جو ہلا گلا کر کے تھوڑی دیر پہلے ہی گئے تھے۔ وہ ماں کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنے تحائف کھول رہا تھا اور بار بار جھٹکے سے سر کو جھٹک کر بالوں کو پیچھے کر رہا تھا۔ بالکل میری طرح۔ میں جیسے اپنے آپ کو ہی دیکھ رہا تھا۔
رابعہ نے مجھے کہا۔ "ہمارے پاس آ جائیں۔"
"تمہیں دیکھنا اچھا لگ رہا ہے۔" میں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔
"تم کیا کہہ رہے تھے؟" اچانک تم نے سوال کیا۔
میں نے چونک کر دیکھا۔ تم کرسی پر بیٹھ کر میری طرف دیکھ رہی تھیں۔
"آج میرے بیٹے کی بائیسویں سالگرہ ہے۔" میں نے کہا۔
"ہاں۔" تم نے تمثیل کو غور سے دیکھا۔ "یوں لگتا ہے کہ وہ تم ہو۔ جس کو وقت نے منجمد کر دیا ہے۔"
"تم سناؤ۔"
"تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے؟" تم نے پوچھا۔
"ہاں۔"
"میں نے تمہیں ایک اقتباس سنایا تھا مگر۔"
"مگر کیا؟"
میں چپ ہو گیا۔
اس نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ کسی ناول کا اقتباس نہیں تھا تمہارا اعتراف تھا۔ بزدل! تم نے کہنے میں کتنی دیر لگا دی؟"
"ان دنوں مجھے ناول پڑھنے کا بڑا خبط سوار تھا۔"

میں نے سنایا۔ ’’ مصنف کہتا ہے .... کیا ہوا۔ اگر ہم مل نہ سکے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ملائیں گے۔ ان کی راہ میں کوئی دیوار نہ کھڑی کریں گے۔‘‘

میں نے اتنے برسوں بعد بھی من وعن اقتباس دہرایا۔

’’ایک بات پوچھوں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’تم مجھے چھوڑ کیوں گئے؟‘‘

’’میں نے تمہیں کہاں چھوڑا۔ بھلا کوئی اپنے آپ کو چھوڑ سکتا ہے؟ ہم جیسے لوگ جو محبت کے مارے، محبت کے دم سے تحلیل ہو جائیں، لوگ انہیں نفرت سے کیوں مارتے ہیں۔‘‘

’’کیا ہوا آپ کو۔ کیوں اتنے سرد ہو رہے ہیں آپ؟‘‘ مجھے آواز نے چونکا دیا۔

میں نے دیکھا ... میرے دونوں ہاتھ رابعہ کے ہاتھوں میں تھے۔

☆☆☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ رابعہ تیار ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ’’کہاں کی تیاری ہے؟‘‘

’’میں نے آپ کے لیے وقت لیا ہے ڈاکٹر سے۔ اسپیشلسٹ ہیں۔‘‘ اس نے بالوں میں برش کو پھیر کر واپس رکھا۔ ’’آپ بھی اٹھ جائیں۔ جلدی سے تیار ہو جائیں۔‘‘

’’مجھے کیا ہوا؟‘‘ میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔

’’آپ کو اپنی پروا نہیں لیکن مجھے تو ہے۔ آپ دن بہ دن کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔‘‘

رابعہ کی آواز میں غصہ تھا۔

’’تم ناحق پریشان ہو رہی ہو۔‘‘ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

’’چلیں مان لیا کہ آپ کو کچھ نہیں ہوا لیکن کیا آپ میرے لیے بھی نہیں چل سکتے؟‘‘ رابعہ نے کہا۔

’’اچھا۔‘‘ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

ڈاکٹر سبحان شہر کے مشہور فزیشن تھے۔ ہمارے فیملی ڈاکٹر تھے۔ ان سے کافی دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

انہوں نے میرا تفصیلی معائنہ کیا۔ کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے۔ پھر کہنے لگے۔ ’’ڈاکٹر کے لیے یہ کہنا تو بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ ملتے رہیے، لیکن کبھی کبھی ملنا اچھا ہوتا ہے۔‘‘

انہوں نے بات کے آخر میں قہقہہ لگایا۔

’’ڈاکٹر کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟‘‘ رابعہ نے فکر مندی سے پوچھا۔

’’بالکل نہیں۔ بلکہ ایسا کیجیے کہ آپ میاں بیوی کہیں گھوم پھر آئیں ایک جگہ رہتے رہتے ہم لاشعوری طور پر بھی اپنے مقامات سے اکتا جاتے ہیں۔‘‘

’’اچھی بات ہے۔‘‘ میں نے کہا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر ہم باہر آ گئے۔

ڈاکٹر سبحان کی تجویز کردہ دوائیں لے کر ہم گھر آ گئے۔ تمثیل ابھی کالج سے نہیں آیا تھا۔

پتا نہیں کیوں میرا کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ ہر چیز سے جیسے نامانوسیت سی ہو گئی تھی۔

رابعہ دو گلاس میں جوس لے آئی۔

’’یہ لیں جناب۔‘‘ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ’’اور یہ بتائیں کہ کیا کھائیں گے؟‘‘

’’جو تم بناؤ۔‘‘

’’کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ آپ فرمائش کریں۔ غصہ کریں۔ نخرے کریں۔‘‘ رابعہ ہنس دی۔

’’تم کسی چیز کا موقع ہی نہیں دیتی ہو۔ سب جیسے ... خودکار طریقے سے ہوتا جاتا ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

مجھے جوس پی کر نیند آنے لگی تھی۔ میں سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو رابعہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ بہت آہستہ آواز میں۔ اس دوران وہ میری طرف دیکھتی بھی جا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے فون رکھ دیا اور میری طرف بڑھ آئی۔

’’اٹھ گئے، آپ کچھ کھائیں گے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’نہیں بس ایک کپ چائے پلا دو۔‘‘ میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چائے اور شامی کباب تل کر لے آئی۔

’’میں نے سوچا کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے تو ذرا آپ کے ساتھ دو چار کباب ہی کھا لیے جائیں۔‘‘

رابعہ کو کھلانے کے ہزار طریقے آتے تھے۔

میں نے ایک کباب اٹھا کر توڑا۔ مجھے کڑوا سا لگا۔ مگر میں کچھ بولا نہیں، پھر میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا وہ بھی مجھے کڑواہٹ سے بھرا لگا۔

’’شاید مجھے بخار ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اچھا۔‘‘ رابعہ نے جلدی سے چائے کا کپ رکھ دیا اور میرا ماتھا چھوا۔

’’ہاں آپ کو تو واقعی بخار ہے۔‘‘

اسی وقت تمثیل اندر آیا۔

’’کیا ہو رہا ہے؟‘‘ اس کی آواز توانائی سے بھرپور تھی۔ تر و تازہ چہکار۔

"تم پاپا کے پاس بیٹھو۔" رابعہ نے کہا۔ "تمہارے پاپا کو بخار ہو گیا ہے۔ میں دوا لاتی ہوں۔" رابعہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

"کیا ہوا پاپا، کیوں بخار آ گیا؟" تمثیل نے میرے پیر دبانا شروع کر دیے۔

"نہیں رہنے دو۔" میں نے پاؤں پیچھے کھینچے۔

"تو کیا ہوا؟" اس نے کہا۔ "مجھے خدمت کا موقع دیں۔ آپ کے پاس کہاں رہا ہوں۔ بورڈنگ میں بھیج دیا تھا آپ نے۔"

"تاکہ تم ڈسپلن سیکھو۔" میں نے کہا۔ "تمہاری ماما چاہتی ہیں کہ تم ہر شعبے میں کامیاب رہو... اور کامیابی کے لیے نظم و ضبط بہت ضروری ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" تمثیل میں بھی اپنی ماں کی طرح بحث کی عادت نہیں تھی۔

"آپ سے ایک بات کہوں؟" تمثیل نے کہا۔

"کہو۔" میں نے ساری توجہ اس پر مرکوز کر دی۔

"ہمارے ٹیچر ہیں ضیغم صاحب۔ وہ کہتے ہیں کہ بروقت اپنے احساسات کا اظہار کرنا چاہیے۔ جو اچھا لگے اسے بتا دینا چاہیے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔" تمثیل نے کہا۔ "مجھے آپ بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ نے کبھی مجھے ڈانٹا نہیں۔ غصہ نہیں کیا۔ مجھے آپ کا نرم مزاج ہونا بہت اچھا لگتا ہے۔"

میں نے تمثیل کو دیکھا۔ مجھے لگا جیسے میں اپنی ہی تصویر سے باتیں کر رہا ہوں۔

"پھر تو مجھے بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ تم مجھے بہت پیارے، بہت عزیز ہو۔" میں نے کہا۔

تمثیل نے پاؤں دباتے دباتے اچانک میرے پیروں کو بوسہ دیا۔

مجھے تمثیل بہت سمجھدار، بہت پیارا اور اعتماد سے بھرپور لگا۔ شاید میں اس کی عمر میں اتنا پُراعتماد نہیں تھا۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں باپ بیٹے میں۔" رابعہ نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس اور دوا تھی۔

تمثیل ہنستے ہوئے فریش ہونے چلا گیا۔

☆☆☆

رات کا کھانا بہت اچھا تھا۔ رابعہ نے بہت زیادہ اہتمام کر ڈالا تھا۔ واقعی اس نے سرپرائز دیا تھا ہم سب کے لیے۔ اور کھانے کے بعد بہت مزے دار ٹرائفل کسٹرڈ۔

اس رات کھانے کے بعد ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے، پہلی مرتبہ مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے سب کچھ بہت اچھا ہے۔

اس رات ہم بہت دیر سے لیٹے سونے کے لیے۔ رابعہ تھکی ہوئی تھی، لیٹتے ہی سو گئی۔ میں ابھی نیم غنودگی میں تھا کہ تمہاری آواز آئی۔

"کہاں ہو؟"

"یہیں۔ تمہارے پاس۔" میں نے جواب دیا۔

"کہاں ہو مجھے نظر نہیں آ رہے؟" تمہاری آواز میں ہیجانی کیفیت نمایاں تھی۔

"میں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا کون بلا رہا ہے اتنی رات میں؟" رابعہ نے سائڈ لیمپ جلایا اور مجھے دیکھا میں پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ میری سانس بہت تیز چل رہی تھی۔

رابعہ نے جلدی سے گلاس میں پانی مجھے دیا۔ میں پورا... گلاس لمحے بھر میں چڑھا گیا۔ وہ میرا ہاتھ سہلاتی رہی۔

کافی دیر کے بعد میری حالت سنبھلی۔

"کیا کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟" رابعہ نے دھیرے سے پوچھا۔

"اس نے مجھے بلایا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کس نے؟" رابعہ نے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے آپ کو؟"

میں جیسے چونک گیا۔

"نہیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میں کہاں جاؤں گا؟" میں دوبارہ لیٹ گیا۔

رابعہ بھی لیٹ گئی اور میری طرف چہرہ کر کے میرے سر کو سہلانے لگی۔

"تم بہت اچھی ہو۔" میں نے اس کی کلائی کو چھوا۔ "تمہاری اچھائی نے مجھے باندھ لیا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ بس میرا سر سہلاتی رہی۔ پتا نہیں کب میری آنکھیں دوبارہ بند ہو گئیں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی اور جگہ تھا۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔

رابعہ میرے پاس بیٹھی تھی۔ تمثیل کچھ دور صوفے پر بیٹھا میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر وہ تیزی سے میرے قریب آ گیا۔

"پاپا آپ کیسے ہیں؟" اس نے پوچھا اور میری

پیشانی پر ہاتھ رکھا۔
''اچھا۔'' میں نے زیرِ لب جواب دیا۔
رابعہ بھی چونک گئی۔
مجھے آنکھیں کھولے دیکھ کر مجھ پر جھک گئی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا۔''
''مجھے کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔
''بس آپ کا بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔ ہم تو گھبرا گئے تھے۔ آج آپ دوسرے دن ہوش میں آئے ہیں۔'' رابعہ کے لہجے میں بے حد طمانیت تھی۔
''اچھا۔'' مجھے حیرت ہوئی۔
تمثیل میرے پیروں کے قریب بیٹھ کر میرے پاؤں سہلانے لگا۔
''آپ کے دل میں جو ہے مجھ سے کہہ ڈالیے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''مجھے آپ سے وابستہ ہر چیز عزیز ہے۔ آپ جیسا چاہیں ویسا کریں۔ میں نہ کسی سے شکوہ کروں گی... نہ ہی لڑوں گی۔'' رابعہ نے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھے۔
''کوئی بوجھ نہیں۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔ ''تم پریشان نہ ہو۔''
''کیوں نہ پریشان ہوں میں؟'' دفعتاً اس کی آواز اونچی ہو گئی... مگر وہ تمثیل کی طرف دیکھ کر نیچی آواز میں بولی۔ ''مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں؟''
''تم اتنی اچھی ہو کہ مجھے تم سے کوئی شکایت ہو ہی نہیں سکتی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بس تم بہت اچھی ہو۔''
رابعہ چپ رہی... مگر اس کی آنکھوں سے آنسو گرتے رہے۔
''میں تمہارے ہی پاس ہوں تمثیل کی صورت میں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔
وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ پہلی مرتبہ اس کے انداز میں بے چینی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف نظر آیا۔
میں نے آنکھیں موند لیں۔
پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ مجھے تو بس ایک آواز آ رہی تھی۔ ''تم کہاں ہو؟ آتے کیوں نہیں؟''
''میں آ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور تم مجھے ہیولے کی صورت میں بہت دور نظر آئیں۔
میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ رابعہ میرے سامنے کھڑی تھی۔
''مجھے جانے دو۔'' وہ مجھے بلا رہی ہے۔ ''مجھے جانا ہو گا۔'' میں نے رابعہ سے کہا۔
''نہیں...... نہیں......'' اس نے سختی سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''آپ کے بغیر میں زندگی کا تصور نہیں کر سکتی۔''
''مجھے معاف کر دو۔ مجھے آزاد کر دو... اپنی ذمے داری سے۔ بس تھک گیا ہوں۔''
میں نے رابعہ کے ہاتھ کو زور سے ہلایا۔
''مجھے جانے دو۔ تمہیں تمثیل کی قسم۔'' میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔
پھر جیسے اچانک اس نے میرے ہاتھ چھوڑ دیے۔
میں ایک دم ہلکا ہو گیا۔
''میں تمہیں آزاد کرتی ہوں۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔ اس کے دو آنسو میرے ہاتھوں کی پشت پر گرے۔
میں نے تمثیل کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخری بار رابعہ کو دیکھا وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔
''خدا حافظ۔'' میں نے ان دونوں سے کہا۔
وہ بغیر کوئی جواب دیے مجھے دیکھتے گئے۔ یوں جیسے ساکت مجسمے کھڑے ہوں۔ مگر میں نہیں رکا۔ مجھے تمہاری آواز آ رہی تھی۔
تم مجھے پکار رہی تھیں۔ میرے پیر آزاد تھے۔ میں آزاد ہو چکا تھا۔
''اتنے برسوں بعد آئے ہو۔ مجھے چھوڑ مت دینا۔'' تم نے کہا۔
''چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' میں نے تمہارے ہاتھ تھام لیے۔
اچانک مجھے رابعہ کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا وہ مجھ سے لپٹ کر سسک رہی تھی اور تمثیل اسے پشت سے سہارا دیے ہوئے تھا۔
میں جب ان سے اجازت لے کر آیا ہوں تو پھر رونے کی کیا ضرورت؟ میں نے سوچا اور تمہارا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ تم میرے ساتھ آ گئیں۔
ہم دونوں ساتھ تھے۔
یہ 17 مئی 2010ء کی تاریخ تھی۔

☆☆☆

ارسل یعنی میرے پاپا مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کے اندر محبت ہی محبت تھی لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اگر محسوس کرو تو ان کی خاموشی بولتی تھی۔
میں نے ماما سے پوچھا۔ ''آپ سے پاپا نے شادی کیسے کر لی؟''
''انہوں نے نہیں، میں نے ان سے شادی کی تھی۔ تمہارے پاپا کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔'' ماما نے کہا۔ ہم پاپا

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016



COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

کے آفس میں تھے۔

میں نے پاپا کی میز کی دراز کھولی۔ اس میں ایک چابی تھی۔ میں نے وہ چابی سب درازوں میں لگائی۔ سب سے نچلی دراز میں چابی لگ گئی۔ میں نے دراز کھولی۔ اس میں سیاہ رنگ کی ایک ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ڈائری نکالی۔

ماما میرے نزدیک آئیں۔ میں نے ڈائری کھولی۔ ڈائری میں ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ وہ فون نمبر پاکستان سے باہر کا تھا۔

ڈائری میں ایک بینک اسٹیٹ منٹ رکھی ہوئی تھی جس میں درج آخری اماؤنٹ پینسٹھ لاکھ تھی، جو چھ مہینے پہلے کسی اکاؤنٹ میں منتقل ہوئے تھے۔

اگلے صفحے پر درج تھا۔ ''آج تمثیل کی سالگرہ ہے۔ میں اس کو کیا تحفہ دوں۔ سب کچھ تو اسی کا ہے۔ میں نے کیا دیا اس کو آج تک۔ یہ میرے آبائی مکان کی رقم ہے جو برسوں سے میرے اکاؤنٹ میں پڑی ہے۔ میں اس کو آج اپنے بیٹے کے اکاؤنٹ میں منتقل کر رہا ہوں۔''

آگے اکاؤنٹ نمبر لکھا تھا۔ وہ نمبر جانا پہچانا لگا۔ میں نے موبائل نوٹ بک میں دیکھا۔ یہ میرا اکاؤنٹ نمبر تھا.....

..... جو پاپا نے میرے نام سے کھلوایا تھا اور کہا تھا۔ ''میں اب پرسکون ہوں تم میری جگہ لے رہے ہو۔ سب کو تمہیں دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ میں جوان ہو گیا ہوں۔''

میں نے ان باکس دیکھا۔ بینک کی رقم منتقلی کا میسج موجود تھا جو میں دیکھ نہیں سکا تھا۔

اچانک مجھے عجیب سا احساس ہوا۔

''ماما! کیا پاپا کو معلوم تھا کہ وہ۔''

''ہاں۔'' ماما نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن انہوں نے تمہاری شادی طے کر دی تھی۔'' ماما نے بتایا۔

''کیا؟'' میں بھونچکا رہ گیا۔

''کب۔ کیوں۔ کیسے۔ مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' میں چیخ پڑا۔ ''کون ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' ماما نے کہا۔ ''لیکن ان کی خواہش یہی تھی۔ کیا تم ان کی خواہش پوری نہیں کرو گے؟''

ماما نے کہا اور خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگیں۔

میں جیسے سن سا رہ گیا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی تب ہی اچانک ایسے لگا کہ جیسے پاپا مجھے دیکھ رہے ہوں۔ میرے منہ سے نکلا جیسے پاپا کی مرضی۔

''سلامت رہو۔'' ماما نے بے ساختہ دعا دی۔

☆☆☆

ڈائری میں لکھا ہوا نمبر پاپا کے بڑے بھائی مرسل تایا کا تھا۔ وہ کینیڈا میں تھے لیکن دو ہفتوں کے بعد واپس پاکستان سیٹل ہو رہے تھے۔ انہیں پاپا کے چلے جانے کا بہت دکھ ہوا۔ وہ بے ساختہ رونے لگے۔

''میں تم لوگوں سے جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں۔ بس پاکستان پہنچتے ہی تم لوگوں کو اطلاع کروں گا۔ تم لوگ فوراً آ جانا۔'' انہوں نے کہا۔ وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اتنے طویل سالوں میں پاپا سے صرف دو مرتبہ بات ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا آبائی مکان بیچ دیا تھا اور ساری رقم پاپا کو بھجوا دی تھی۔

''تمہاری دادی تمہارے پاپا کو بہت چاہتی تھیں۔ اس نے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ کبھی سوال نہیں کیا۔ اپنے اخراجات تک اس نے ٹیوشن پڑھا کے پورے کیے۔ اللہ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اس لیے میں اس کے لیے یہ تو کر سکتا تھا کہ سارا مکان اس کے لیے ہی ہوتا مگر نہ جانے کیوں وہ نہ تو اپنے شہر واپس آنا چاہتا تھا اور نہ میرے پاس۔'' انہوں نے کہا۔

''جی پاپا کبھی کوئی سوال نہیں کرتے تھے؟'' میری آواز آنسوؤں سے بھرا گئی۔

''میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' تایا ابو نے کہا۔

''میں تمہیں ویڈیو کال کر رہا ہوں۔'' انہوں نے لائن کاٹ کر فوراً ویڈیو کال کی۔

جیسے ہی میں نے انہیں دیکھا، انہوں نے مجھے دیکھا۔ بے ساختہ بولے۔ ''تم تو ارسل ہو۔''

''جی تایا ابو۔''

تایا ابو رونے لگے۔ ہم دونوں رونے لگے۔ میرے پاپا کبھی ماضی نہیں بن سکتے تھے۔ وہ میرے اندر میرے حال میں موجود تھے۔

''تم تو مکمل ارسل ہو۔'' وہ بولے۔ تایا ابو میں بھی پاپا کی شباہت موجود تھی۔ انہوں نے ماما سے بات کی۔

رسمی سلام دعا کے بعد انہوں نے ماما کو آنے کی دعوت دی اور کہا۔ ''بس میں جیسے ہی پہنچوں گا۔ فوراً ہی تم لوگ آ جانا۔ بالکل بھی اجنبیت محسوس مت کرنا۔'' ان کے انداز میں گرم جوشی تھی۔

''میں بھی سب سے ملنا چاہتی ہوں۔'' ماما نے کہا۔

تھوڑی دیر مختلف باتوں کے بعد فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے ماما سے پوچھا۔ ''اتنے محبت کرنے والوں کو

پاپا نے کیوں چھوڑ دیا؟''
''تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے پاپا کو میری کون سی عادت پسند تھی؟''
میں نے ماما کو دیکھا۔''کون سی؟''
''نہ تو میں بحث کرتی ہوں اور نہ ہی کریدتی ہوں۔''
ماما نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ میں خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

تقریباً دو ہفتے کے بعد تایا ابو نے فون کیا۔''ہم لوگ آ چکے ہیں تم لوگ بھی فوراً آ جاؤ۔ سب تم کو دیکھنے کے منتظر ہیں۔ سب ملنا چاہتے ہیں۔''
ماما نے مجھ سے کہا۔''ہم تمہارے پاپا کے رشتے داروں کو نہیں جانتے۔ پہلی مرتبہ تمہارے تایا ابو سے رابطہ ہوا ہے۔ اس لیے بولنا کم اور سننا زیادہ۔''
''جی بہتر۔''میں نے جواب دیا۔
میں نے اسی وقت جہاز کی ٹکٹ بک کروائیں۔ ہم لوگ رات سوا آٹھ بجے والی فلائٹ سے کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔
میں پہلی مرتبہ کراچی جا رہا تھا۔ پہلی بار مجھے پاپا کے رشتے داروں سے ملنا تھا۔ میں بہت جذباتی ہو رہا تھا۔
میں بار بار ماما کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا مگر وہاں ایک گہری خاموشی تھی۔
تایا ابو ائر پورٹ کے لاؤنج میں ہمارے منتظر تھے۔ ہم سامان کنویئر بیلٹ سے لے کر ٹرالی پر رکھتے ہوئے باہر کی طرف آئے تو سول ایوی ایشن کی شاندار وردی میں ملبوس ایک جوان پر میری نگاہیں جم گئیں۔
اس نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں مارے حیرت کے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا میں آئینہ دیکھ رہا تھا؟ وہ نوجوان میرا ہم شکل تھا۔
''تمثیل کیا ہو گیا ہے۔ آگے بڑھو۔'' ماما نے میرا ہاتھ پکڑا۔
''ماما وہ دیکھیں۔''میں نے کہا۔
ماما کی نظریں بھی اس پر جمی رہ گئیں۔
انہوں نے بے یقینی سے پہلے مجھے پھر اسے دیکھا۔
وہ چلتا ہوا میرے بہت نزدیک آ گیا تھا۔
''آپ......''
''آپ؟'' بیک وقت ہم دونوں کے منہ سے نکلا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین حد تک فلمی سچویشن تھی۔
''میں تمثیل ہوں۔''میں نے کہا۔
''میں شمائل ہوں۔''اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔
''غالباً آپ لاہور سے آ رہے ہیں۔''
اس نے ہمارے لگیج ٹیگ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
''جی ہاں۔''میں نے جواب دیا۔
''آپ کہاں جائیں گے؟''اس نے پوچھا۔
''ہم گلشن اقبال جائیں گے۔ میرے تایا ہمیں لینے آئے ہیں۔''میں نے بتایا۔
''آیئے میں آپ کو باہر تک چھوڑ دوں۔''اس نے کہا۔
میں سامان کی ٹرالی لے کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس سے بالکل بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔
''میں اکثر ماما سے پوچھتا تھا کہ میں کس پر پڑا ہوں تو وہ کہتی تھیں تم بس اپنے آپ پر گئے ہو۔ میں اپنی ماما سے کہتا تھا کہ کہتے ہیں دنیا میں ایک شکل کے سات لوگ ہوتے ہیں۔ چلو آج دو تو مل گئے۔''شمائل نے کہا اور ہنسا۔
ابھی ہم دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔
''کہاں بھاگے جا رہے ہو شمائل' میں یہاں ہوں۔''
شمائل رکا۔ پلٹا اور اس کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ آ گئی۔
''تم آ گئیں۔ پندرہ منٹ پہلے؟''اس نے مسرت سے اپنے بازو وا کیے۔
''ہاں میری فلائٹ کچھ جلدی آ گئی۔''اس نے جواب دیا۔۔اور حیرت سے ہمیں دیکھنے لگی۔
''یہ...... یہ کون ہیں؟''اس کی آواز میں بے پناہ حیرت تھی۔
''یہ تمثیل ہیں۔ ابھی ابھی لاہور کی فلائٹ سے آئے ہیں۔ میں انہیں باہر چھوڑنے جا رہا تھا۔''
''تمہارے دوست۔''
''نہیں۔ ابھی ابھی ملاقات ہوئی ہے۔ دیکھو دنیا میں سات آدمیوں میں سے دو تو مل گئے۔''
شمائل نے کہا اور پھر ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا۔''یہ میری بہن ہے مجھ سے ایک سال بڑی۔ دبئی سے آ رہی ہے۔ لاہور رکتے ہوئے۔ اس لیے یہ فلائٹ اس طرف آئی ہے۔''
ہم باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے تو تایا ابو باہر ہمارے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ ان کے دونوں بچے اور تائی امی بھی تھیں۔
اچانک تایا ابو کی نظر ہمارے ساتھ کھڑے شمائل اور اس کی بہن پر پڑی۔ انہوں نے غور سے انہیں دیکھا پھر

بولے۔ ''ارے نہال تم بالکل بھی نہیں بدلیں۔''
شمائل نے انہیں چونک کر دیکھا۔ ''آپ کون؟'' شمائل نے پوچھا۔
''میں مرسل ہوں۔ ہم لوگ پہلے وہاں رہتے تھے جہاں تم لوگ بھی رہتے تھے۔''
''انکل میں نہال نہیں۔ ان کی بیٹی رائما ہوں۔'' اس نے بتایا۔
''اوہ'' مرسل تایا خاموش ہو گئے۔
پھر بولے۔ ''اچھا بھئی جوان۔ تمہارا کیا نام ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔
''شمائل۔''
''بھئی اپنا فون نمبر دو۔ قسمت سے بچھڑے مل رہے ہیں تو اب ملتے رہنا چاہیے۔'' انہوں نے شمائل کا نمبر لیا اور اپنا نمبر میسج کر دیا۔ مرسل تایا کے انداز میں گرم جوشی تھی۔
وہ دونوں ہمیں خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ تایا ابو بولے۔ ''بھئی کتنے خوش قدم ہو تم لوگ، برسوں کے بچھڑے مل گئے۔''
''جی۔'' میں نے کہا۔
تایا ابو کے بیٹے کا نام اسجد اور بیٹی کا نام نائمہ تھا۔ وہ دونوں ہی مجھ سے کچھ چھوٹے تھے۔
جلد ہی ہمارے درمیان بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ تایا ابو دو گاڑیوں میں آئے تھے۔ ایک میں ڈرائیور تھا اور دوسری وہ خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ گاڑیوں اور تایا ابو کے رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کافی خوشحال ہیں۔ راستے بھر وہ پاپا کی باتیں کرتے رہے۔
پچھلی سیٹ پر تائی امی، ماما اور نائمہ تھیں۔ میں اگلی سیٹ پر تایا ابو کے ساتھ جبکہ اسجد پچھلی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ۔
کراچی بہت بڑا تھا۔ بے پناہ ٹریفک۔ وسیع سڑکیں لیکن لاہور کے مقابلے میں سبزہ کم اور گندگی زیادہ۔
''بھئی کراچی کا لاہور سے تقابل نہ کرنا۔'' تایا ابو خوش دلی سے بولے۔ ''ہم کراچی والے ہر بات کے جواب میں دوسروں کو کراچی کے ٹیکس کے اعداد و شمار سنا کے چپ کروا دیتے ہیں۔''
انہوں نے قہقہہ لگایا۔
تھوڑی دیر میں تایا ابو کی وسیع و عریض کوٹھی آ گئی۔ اسجد ہم سے پہلے پہنچ کر کار پورچ میں ہمارا منتظر تھا۔
تایا ابو بہت خوش بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ بار بار میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اپنے قریب کر لیتے۔ ان کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ جاتے۔ واضح طور پر وہ مجھے نہیں اپنے بھائی ارسل کو محسوس کر رہے تھے۔
''شمائل، خدا کی قسم تم بالکل ارسل ہو۔'' انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ مجھے بہت اچھا لگا ان کا لمس۔ یوں جیسے پاپا میرے بدن سے لپٹے کھڑے ہوں۔
''بس تم جیتے رہو۔'' ان کی آواز آنسوؤں سے بھرا گئی۔ مجھے بھی اپنی آنکھیں نم ہوتی محسوس ہوئیں۔
''چلیں اب کھانا تو کھا لیں ابو۔'' نائمہ نے کہا۔ ''سچی بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''
ہم لوگ کھانا کھانے لگے۔ بہت اہتمام تھا کھانے میں۔
ماما نے پوچھا۔ ''یہ جو ہمیں ائرپورٹ پر ملے تھے دو بہن بھائی یہ کون تھے؟''
''ہمارے پرانے محلے دار۔ اماں نے ان کی والدہ کو بہن بنایا ہوا تھا۔ بہت گہرا تعلق تھا ہم سب کا۔ میں تو خیر کم آتا جاتا تھا۔ ارسل اور اماں کے زیادہ تعلقات تھے۔ وہ بھی چار بہن بھائی تھے۔ پھر اماں کا انتقال ہو گیا تو آنا جانا کم ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد ارسل لاہور چلا گیا۔ میں دبئی پھر کینیڈا۔'' تایا ابو نے تفصیل بتائی۔ ''رائما بالکل نہال کی ہم شکل ہے۔ میں تو دھوکا کھا گیا تھا۔''
''آپ لوگ ان سے نہیں ملتے؟'' ماما نے پوچھا۔
''ارے کہاں۔ اماں نہیں رہیں تو کیا ملنا ہوتا۔ پھر ہم نے مکان فروخت کر دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ بھی مکان شفٹ کر چکے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ سب کی شادیاں ہو گئیں۔ ملنا کہاں سے ہو گا۔ سب بکھر گئے لیکن اب ملیں گے، تمہیں بھی ملوائیں گے۔ تمہارے پاپا کی کلاس فیلو نہال سے بھی۔'' تایا ابو اپنی رو میں بولے جا رہے تھے۔
میں نے ماما کو دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے تایا ابو کی بات سن رہی تھیں۔
کھانا کھانے کے بعد تایا ابو نے مجھے اپنا بیڈ روم دکھایا۔ جہاں پر ان دونوں کے بچپن کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ تایا ابو کو پاپا سے بڑی محبت تھی۔
شاید دور ہو جانے یا ناقابلِ حصول ہو جانے کے بعد محبت کی شدت بڑھ جاتی ہے۔

☆☆☆

دوسرے دن ماما نے کہا کہ وہ شمائل کے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ تایا ابو فوراً ہی تیار ہو گئے۔ وہ خود بھی ملنا چاہتے تھے اتنے برسوں کے بعد۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ اسی لیے وہ سب گھر ہی پر تھے۔

شمائل نے سب کو رات کے کھانے پر مدعو کرلیا۔
شام کو ہم لوگ شمائل کے ہاں پہنچے۔ ان کے والد ایک معروف بینک میں وائس پریذیڈنٹ تھے۔ ان کا گھر بھی بہت خوبصورت تھا۔
ہمارا استقبال شمائل اور ان کی بہن رائمہ نے کیا۔ تھوڑی دیر میں ان کے والد افتخار صاحب بھی آ گئے۔ وہ بھاری بھر کم جثے کے آدمی تھے۔ خوش مزاج، پرتپاک۔ ڈرائنگ روم میں رائمہ کی بہت خوبصورت تصویر لگی تھی۔
ماما نے کہا۔ ''بہت پیاری تصویر ہے۔''
رائمہ نے جواب دیا۔ ''میری ماما کی تصویر ہے۔''
''ماما کو تو بلاؤ۔'' ماما نے کہا۔ ''مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔''
''وہ...... وہ نہیں ہیں۔'' رائمہ نے آہستہ سے کہا۔
''کہیں گئی ہیں؟'' تائی امی نے پوچھا۔
''ہاں......'' شمائل نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ بہت پہلے چلی گئیں۔ ہمیں چھوڑ کر۔ اب بس ان کی یادیں ہیں۔''
اچانک جیسے سب چپ ہو گئے۔ ڈرائنگ روم میں سفاک خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے یوں لگا کہ جیسے ساری فضا سوگوار ہوگئی۔
پھر ماما نے کہا۔ ''بہت معذرت۔ دراصل ہمیں بالکل بھی معلوم نہیں تھا۔ ورنہ اس تکلیف دہ سوال کو نہ کرتی۔''
''کوئی بات نہیں۔'' افتخار انکل نے کہا۔ ''رائمہ کو جو بھی دیکھتا ہے، نہاں کو ضرور یاد کرتا ہے۔'' پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور مسکرائے۔
شمائل نے کہا۔ ''بابا دیکھیے تمثیل بالکل مجھ سے ملتا ہوا ہے۔''
''ہاں چلو اچھی بات ہے۔''
اچانک باہر کچھ لوگوں کی آواز آئی۔ اندر ایک خاتون بھاری بدن، چھوٹے قد کی داخل ہو رہی تھیں اور ان کے پیچھے قدرے فربہ شخص۔
''آیئے ماموں جان۔'' شمائل اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا... اور ہماری طرف گھوم کے بولا۔ ''یہ ہمارے بڑے ماموں اظہر ہیں اور ہماری لبنیٰ مامی۔''
''ارے بھئی پہلے مجھے بیٹھنے دو پھر تعارف کروانا۔''
لبنیٰ مامی آگے بڑھ کر صوفے پر براجمان ہوگئیں۔ گیٹ سے ڈرائنگ روم تک کے فاصلے کو طے کرتے ہوئے ان کی سانس پھول گئی تھی۔
اظہر ماموں کی نظریں مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ کبھی وہ مجھے اور کبھی شمائل کو دیکھتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔ ''تم ارسل کے بیٹے ہو نا؟''
''جی۔'' میں نے جواب دیا۔
تایا ابو بھی بڑے پرتپاک انداز سے اظہر ماموں سے ملے لیکن میں نے محسوس کیا اظہر ماموں بجھے بجھے سے ہیں۔
وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔
اتنی دیر میں لبنیٰ مامی اور ماما کے درمیان باہمی طور پر نمبروں کا تبادلہ بھی ہو گیا تھا۔ لبنیٰ مامی خوش مزاج خاتون تھیں۔
مجھے دیکھ کر بولیں۔ ''تم دونوں تو ایک دوسرے کا عکس ہو۔ ارسل کا بیٹا تو ارسل پر گیا ہے لیکن ہمارا شمائل بھی ارسل سے ملتا جلتا ہے۔''
شاید انہوں نے ہمشکل کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔
ان کے جانے کے بعد ہم لوگ باتوں میں لگ گئے۔
رائمہ بڑی سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ نرم مزاج، دھیمی سی۔
تایا ابو نے پوچھا۔ ''افتخار بچے چھوٹے تو نہیں تھے۔ آپ دوسری شادی کر لیتے؟''
افتخار انکل بولے۔ ''کوئی دوسری عورت نہاں تو نہیں ہوسکتی تھی۔'' ان کے انداز میں نہاں آنٹی کے لیے بہت زیادہ محبت تھی۔
''میں اپنے بچوں کو غیریت کا سامنا بھی نہیں کرنے دے سکتا تھا۔ شاید جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے۔ جب ذرا فاصلہ ہوتا ہے تو تعلق کی شدت اور نوعیت دونوں کو ہی سمجھنے کا موقع ملتا ہے مگر!'' وہ گہری سانس بھر کے چپ ہو گئے۔
''مگر کیا؟'' ماما نے کہا۔
''مگر یہ کہ اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے اور کسی بھی ازالے کا وقت ہی نہیں رہتا۔''
''کیا ہوا تھا انہیں؟'' ماما نے پوچھا۔
''معلوم نہیں۔'' شمائل نے جواب دیا۔ ''بس خاموش رہیں۔ انتقال سے دو دن پہلے کہہ رہی تھیں۔ مجھے سب یاد آ رہے ہیں۔ امی، ابو، سب بلا رہے ہیں۔ رات میں طبیعت خراب ہوئی، ہاسپٹل لے کر گئے۔ دوسرے دن انتقال ہو گیا۔''
''کب؟'' میرے منہ سے نکلا۔
''وہ دن اور تاریخ میرے دل پر لکھی ہوئی ہے۔''
رائمہ نے دھیمے سے کہا۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے گرے اور گالوں سے ہوتے ہوئے نیچے ڈھلک گئے۔ ''17 مئی

"2010، دن کے ساڑھے گیارہ بجے۔"

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا۔ ماما اور میری نگاہیں ملیں۔

اسی دن، اسی وقت پاپا نے ہمیں چھوڑا تھا۔ کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟

اچانک جیسے وہ سب کچھ ہماری سمجھ میں آگیا... جو مدھم مدھم نقوش کی صورت، ایک سائے کی صورت تھا۔

کیا محبت اس درجہ شدت، اس درجہ طاقت ور ہوسکتی ہے۔ کہ دور سیکڑوں کلومیٹر دور تک دو انسانوں کو اپنے سحر میں ایسا جکڑے کہ ان کی روحیں ایک ہوجائیں۔

لیکن اس کا پس منظر کیا تھا۔ یہ ہمیں نہیں معلوم تھا پھر اس کا جواب مل گیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن ماما نے مجھے لیا اور ہم اظہر ماموں کے گھر جا پہنچے۔ وہ گھر پر ہی تھے۔ لبنیٰ مامی ہمیں دیکھ کر حیران ہوگئیں۔ تاہم انہوں نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔

ماما نے اظہر ماموں سے براہِ راست پوچھا۔ ''آپ کیا جانتے ہیں؟''

لبنیٰ مامی نے ان کا سوال سن کے حیرت سے ماما کی طرف دیکھا مگر وہ مسلسل اظہر ماموں کی طرف متوجہ تھیں۔

اظہر ماموں تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے۔

''میں ارسل اور نہاں دونوں کا ہی مجرم ہوں۔ کاش ارسل مجھ سے لڑ لیتا۔ غصہ کرلیتا۔ ایک بار مل لیتا... مگر وہ تو شہر ہی چھوڑ کے چلا گیا۔ میں نے ہی اسے اپنے گھر آنے سے منع کیا تھا۔ حالانکہ میری بہن نے مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کو تو آخر لمحے تک معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ انہیں الگ کرنے کا اصل قصور وار میں ہوں۔'' اظہر ماموں چپ ہوگئے۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے۔ ''مجھے شروع میں بالکل احساس نہیں تھا کہ میں نے کیا کردیا لیکن جب شمائل پیدا ہوا اور جوں جوں بڑا ہوتا گیا وہ ارسل کے رنگ روپ میں ڈھلتا گیا۔ توں توں مجھے احساس ہوتا رہا کہ میں نے انہیں جسمانی طور پر تو علیحدہ کردیا مگر دل سے، دماغ سے، اس کے احساسات سے، ارسل کو علیحدہ نہ کرسکا۔ میں تو بس کسی حادثے کو روکنا چاہتا تھا۔ میں ان کے تعلق کو ایک عام سی محبت سمجھ بیٹھا اور انہیں جدا کردیا۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ دوریاں تعلق کو اور مضبوط کردیتی ہیں۔ میری بہن نے مجھ سے کبھی گلہ نہیں کیا۔ اس نے تو کبھی شاید اپنے آپ کو بھی نہ بتایا ہو کہ اس کو محبت ہوگئی ہے۔''

اظہر ماموں چپ ہوگئے۔ ان کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

''جنہیں ہم جسمانی طور پر دور کردیتے ہیں وہ ذہنی اور جذبات کے تعلق کی مضبوط ڈور سے بندھ جاتے ہیں۔ ارسل نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کی خواہش تھی کہ نہاں کی بیٹی سے تمثیل کی شادی ہو۔''

''مگر آپ تو کہہ رہی ہیں کہ ارسل نے کچھ نہیں بتایا۔ اسے کیسے معلوم نہاں کی بیٹی ہے؟'' اظہر ماموں نے چونک کر پوچھا۔

''میں نہیں جانتی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ یہ بات جانتے تھے۔ کیسے، کس طرح، کچھ نہیں پتا۔'' ماما نے جواب دیا۔

لبنیٰ مامی نے کہا۔ ''ہاں تو اس میں کیا مشکل۔ تمثیل اچھا لڑکا ہے۔ ہم تو جانتے ہیں ان کو۔ خالہ کا انتقال ہمارے سامنے ہی ہوا تھا۔''

اظہر ماموں تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے۔ ''مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ افتخار سے میں بات کرلوں گا۔''

☆☆☆

واپسی پر میں نے ماما سے پوچھا۔ ''ماما! آپ سے پاپا نے کب کہا تھا؟''

''انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔'' ماما نے جواب دیا۔

''جب رات ہوتی تھی۔ تب تمہارے پاپا سوتے میں باتیں کرتے تھے، تب میں ان کے لیے رابعہ نہیں، نہاں ہوتی تھی۔ تب انہوں نے کہا تھا کہ کیا ہوا اگر ہم مل نہ سکے۔ ہمارے بچے ملیں گے۔ ہم ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔'' ماما نے دھیرے سے کہا اور اپنا رخ تبدیل کرکے کھڑکی سے باہر دوڑتے ہوئے ٹریفک کو دیکھنے لگیں۔

''کیا پاپا کو کبھی معلوم ہوا کہ آپ کچھ جانتی ہیں؟''

''جو اپنی محبت کے راز میں اتنا حساس ہو کہ بغیر احتجاج کے اپنا شہر، اپنا گھر، سب کچھ ترک کردئے کیا میں اس کے بھرم کو توڑ سکتی تھی؟'' ماما نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ پاپا، نہاں اور میری ماما... کس نے محبت کی تھی؟

کیا محبت ایسی ہوتی ہے؟

یہ 595ھ کا واقعہ ہے۔ پانی پت میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوا جو خاندانی اعتبار سے سید نہیں تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب حضرت عثمانؓ بن عفان سے جا ملتا تھا۔ باپ نے بچے کا نام خواجہ محمد رکھ دیا۔ کسی نے پوچھا۔ ''خواجہ محمد؟ بس اور کچھ نہیں؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''کیا محمدؐ کے بعد بھی کچھ باقی رہتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس نام سے یہ بچہ بڑا ہو کر کوئی بلند

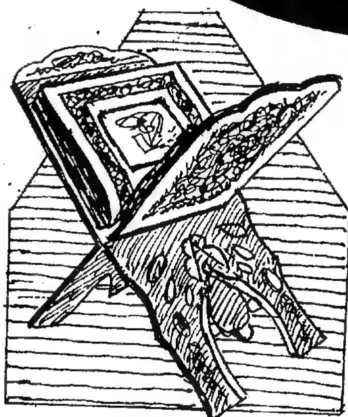
کبیرالاولیا

ضیا تسنیم بلگرامی

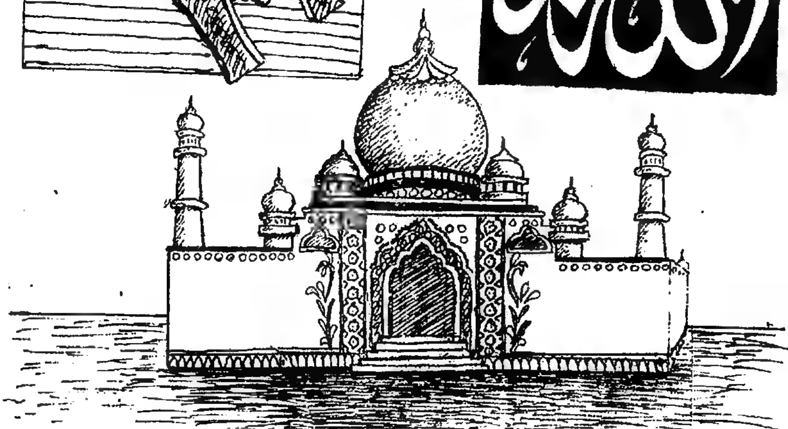
اللہ کو معصوم بچے بہت پسند ہیں کیونکہ ... ممتا کا تقاضا بھی یہی ہے مگر جس بچے کے منہ سے کچھ نکلے اور وہ پورا ہو جائے نہ صرف یہ بلکہ آنے والے وقت کی بھی خبر قبل از وقت مل جائے تو وہ بچہ اپنے رب کو کتنا محبوب ہوگا اس کا اندازہ لگانا شاید عام انسان کے بس کی بات نہیں ... بہرحال اللہ نے مختلف ادوار میں ایسی برگزیدہ ہستیاں پیدا کی ہیں جن کے دم سے کئی نسلوں نے فیض اٹھایا۔

کبیرالاولیا کا لقب پانے والے ایک ولی کا

زندگی نامہ







مقام حاصل کرے گا۔"

کچھ عرصے بعد ماں کا اور پھر باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا اور یہ اپنے چچا کے زیر سایہ چلے گئے۔ چچا کو آپ کی پیشانی میں ایک برگزیدہ انسان کی چمک محسوس ہوئی تھی۔ بچے کے عادات واطوار ایسے تھے کہ دیکھنے والے چونک جاتے۔ آپ کی زبان میں ایسا اثر تھا جو کہتے ہو جاتا۔ یہ ایسی خصوصیات واوصاف تھے کہ قریب اور دور کے لوگ جلد ہی ان سے واقف ہوگئے۔ آس پاس سے لوگ اس لیے اس بچے کی خدمت میں حاضری دیتے کہ اس سے اپنے ان معاملات میں آگاہی حاصل کریں جو ہنوز پردۂ اخفا میں ہوتے۔

پڑوس میں ایک خاتون بہت پریشان تھیں۔ ان کا شوہر پردیس میں تھا اور دو سال سے بالکل لاپتا تھا۔ خاتون نے اس بچے کی خدمت میں حاضری دی اور نہایت عاجزی سے کہا۔ "بیٹے! خدا نے تیری زبان میں بڑی تاثیر دی ہے۔ میں ایک دکھی عورت ہوں، جس کا شوہر دو سال سے لاپتا ہے۔ خدا کے لیے یہ بتا دو کہ میرا شوہر کب تک واپس آئے گا اور یہ کہ واپس آئے گا بھی یا نہیں؟"

بچے نے خاتون کو سرسری نظروں سے دیکھا اور آنکھیں بند کر کے خاموشی اختیار کی، پھر لمحاتی مراقبے کے بعد آنکھیں کھول دیں اور جواب دیا۔ "میں نے تیرے شوہر کو تلاش کیا۔ وہ قافلے میں موجود ہے اور یہ قافلہ یہاں سے دو دن کی مسافت پر ہے۔ تو پرسوں دوپہر کے بعد کسی کو پڑاؤ پر بھیج دے کیونکہ اس وقت تک تیرا شوہر آچکا ہوگا۔"

خاتون کو آپ کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اگر اس کو یقین آجاتا تو شاید مارے خوشی کے اس کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی۔ عورت نے اپنے گھر جاتے ہی اپنے بھائی کو مطلع کیا۔ "بچے نے دو دن بعد شوہر کی واپسی کی خوش خبری سنائی ہے لیکن مجھ کو یقین نہیں آتا۔ آپ پرسوں دوپہر بعد پڑاؤ پر چلے جایئے۔ جھوٹ سچ ظاہر ہو جائے گا۔"

عورت نے دو دن بڑے اضطراب میں گزارے۔ تیسرے دن اس کا بھائی بے یقینی سے پڑاؤ پر پہنچ گیا۔ عین اس وقت مغرب سے گرد وغبار کے بادل اٹھتے دکھائی دیے اور یہ بادل لحہ بہ لحہ قریب آتے گئے، یہاں تک کہ ان میں سے ایک عظیم الشان قافلہ نمودار ہوا۔ قافلہ پڑاؤ پر آکر رک گیا۔ اس شخص نے قافلے میں اپنے بہنوئی کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور آخر پالیا۔ بہنوئی سالے کو پڑاؤ پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا کسی نے آپ کو میری آمد سے مطلع کر دیا تھا؟"

سالے نے جواب دیا۔ "ہاں! ہمارے پڑوس میں خواجہ محمد نامی ایک بچہ ہے۔ اس بچے نے تیری بیوی کو دو دن پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تو آج کے دن دوپہر کے بعد پڑاؤ پر آجائے گا اور میں اس بچے کا بھیجا ہوا یہاں آیا ہوں۔"

آنے والے نے اس عجیب وغریب بات پر حیرت کا اظہار کیا۔

عورت نے اپنے سامنے شوہر کو دیکھ کر فرطِ خوشی میں کہا۔ "بیٹے! آخر تو کیا ہے۔ خدا نے تجھ کو وہ کون سا علم عطا کیا ہے جس کی مدد سے تو آنے والے دنوں کی باتیں بتا دیتا ہے؟"

اس دن شام کو دونوں میاں بیوی خواجہ محمد کی خدمت میں پہنچے اور ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

خواجہ محمد نے وقت سے پہلے ہی وہ شہرت حاصل کرلی جو دوسرے ایک عمر گزار کر بھی حاصل نہ کر سکے۔

انہی دنوں پانی پت میں بوعلی شاہ قلندر کی صوفیانہ عظمت وجلال کا بڑا چرچا تھا اور پورا ملک ان کا نام بڑے احترام سے لیتا تھا۔ خواجہ محمد نے ان کی خدمت میں جانا شروع کر دیا۔ ہر روز صبح نمازِ فجر کے بعد خواجہ محمد، بوعلی شاہ قلندر کی خدمت میں پہنچ جاتے اور ان کی باتیں سنتے اور ان کے اطوار ذہن نشین کر لیتے۔ بوعلی شاہ ان پر بہت زیادہ توجہ دیتے اور ان کی تربیت کرتے رہتے۔

ایک دن آپ گھوڑے پر سوار بوعلی شاہ قلندر کی خدمت میں جا رہے تھے۔ انہوں نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ بوعلی شاہ دیوار پر بیٹھے ان کو آتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ قریب پہنچنے پر دونوں کی نظریں ملیں اور بوعلی شاہ نے بے اختیار کہا۔ "زہے اسپ زہے سوار۔"

خواجہ محمد کے کانوں میں آپ کی آواز پڑی تو پورا جسم لرز گیا۔ دل کی حالت غیر ہوگئی۔ ایک ایک عضو بے خودی میں مبتلا ہو گیا۔ آپ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور گھوڑے سے گر پڑے۔

بوعلی شاہ قلندر نے مسکرا کر دیکھا اور فرمایا۔ "اب وقت آگیا ہے کہ تو خود کو مجلا کرے اور خدا نے جو کچھ تجھے دیا ہے

اس کو ترقی دے اور خود کو آلائش دنیا سے پاک کرلے۔"

کچھ دیر بعد جب خواجہ محمد کو ہوش آیا تو ان پر اتنا جوش اور جذبہ طاری ہوچکا تھا کہ انہوں نے گریبان کو چاک کرلیا اور ویرانے کی راہ لی۔ انہوں نے جنگل میں قیام کیا اور اللہ سے لو لگائی۔ رشتے داروں، عزیزوں نے تلاش کرنا شروع کردیا لیکن ان کا کہیں پتا نہ چلا۔

جنگل کے قیام میں انہیں پریشانیوں اور دشواریوں سے واسطہ پڑا لیکن ان پر جو وجدانی کیفیت طاری تھی، اس نے کچھ محسوس ہی نہیں ہونے دیا۔ جنگل کے درندے ان کے پاس سے یوں گزر جاتے تھے گویا وہ نابینا ہوں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین دور جنگلوں میں گزار دیا۔ اب ان میں وہ کمال اور روحانی برکات پیدا ہوچکی تھیں، جن کی بوعلی شاہ نے تلقین کی تھی اور بشارت دی تھی۔ انہوں نے یہیں سے حج بیت اللہ کا سفر اختیار کیا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس سفر میں ان کی ملاقات حضرت جمال الدین قطب عالم ہانسوی سے ہوئی اور انہوں نے جلال الدین کبیرالاولیاء کہہ کر مخاطب کیا۔ گویا اب آپ خواجہ محمد جلال الدین کبیرالاولیاء ہوچکے تھے۔ جمال الدین ہانسوی نے انہیں حکم دیا کہ وطن واپس جاؤ اور جو کچھ کرنا ہے وہیں سکونت پذیر ہوکر کرو۔

اس سفر میں ان کی ملاقاتیں دوسرے علماء کرام اور مشائخ سے ہوئیں اور ان ملاقاتوں اور صحبتوں نے انہیں بہت زیادہ فیض پہنچایا۔ آپ وطن پہنچے تو لوگوں نے شاندار استقبال کیا اور آپ نے وعظ و تلقین اور رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کردیا۔ مقام رشد و ہدایت پر فائز ہونے کے باوجود آپ کے دل میں بوعلی شاہ قلندر کا دبدبہ بدستور قائم تھا اور ان کا دل بوعلی شاہ کی طرف کھنچا رہتا تھا۔ کچھ عرصے تک انہوں نے برداشت سے کام لیا اور بوعلی شاہ سے نہیں ملے لیکن ایک دن بے اختیار ہوگئے اور غیر ارادی طور پر بوعلی شاہ کی خدمت میں روانہ ہوگئے۔

بوعلی شاہ جیسے ان کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی مسکرا کر فرمایا۔ "جلال الدین! تو آگیا؟"

جلال الدین نے کہا۔ "حضرت! جلال الدین نہیں، خواجہ محمد، وہی خواجہ محمد جس کے لیے آپ نے فرمایا تھا کہ زہے اسپ زہے سوار۔"

بوعلی شاہ نے دریافت کیا۔ "اب کس لیے آیا ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اک نگاہِ کرم، نظرِ فیض اور خاص توجہ کا طالب ہوں۔"

بوعلی شاہ نے کہا۔ "بیٹے! میں تیرے لیے جو کچھ کرسکتا تھا، کرچکا ہوں لیکن اب مزید جو کچھ تو چاہتا ہے اس کے لیے خدا نے ایک دوسرے شخص کو مقرر فرمایا ہے، اس لیے میرے پاس تیرا اس مقصد سے آنا بے کار ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "حضرت! میں اس مردِ خدا کو کہاں تلاش کروں؟"

بوعلی شاہ نے جواب دیا۔ "تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جس خدا نے ان بزرگ کو تیری کشائش پر مقرر کیا ہے وہی تیری ان سے ملاقات بھی کرادے گا۔"

جلال الدین جس بے چینی اور اضطراب میں مبتلا تھے، وہ انہیں اس مردِ خدا سے فوراً ملاقات کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ انہوں نے عاجزی سے پوچھا۔ "حضرت! میرے دل پر ایک بوجھ سا رکھا ہوا ہے اور اس وقت تک موجود رہے گا جب تک کہ مذکورہ مردِ خدا سے میری ملاقات نہیں ہوجاتی۔"

بوعلی شاہ نے تسلی دی۔ "جلال الدین! عجلت اور بے چینی فضول ہے۔ ان سے مشیت ایزدی تو بدلنے سے رہی۔ صبر و ضبط سے کام لے اور وقت کا انتظار کر۔"

جلال الدین نے پھر سوال کیا۔ "حضرت! ایک بات اور بتادیجیے۔"

بوعلی نے جواب دیا۔ "پوچھ، کیا معلوم کرنا چاہتا ہے؟"

جلال الدین نے کہا۔ "جس شخص کی آپ بشارت دے رہے ہیں اس کی بابت اتنا اور بتادیجیے کہ میں اس سے کیا کچھ حاصل کرسکوں گا؟"

بوعلی شاہ نے جواب دیا۔ "جلال الدین! تُو مجھ سے آنے والے کل کی باتیں پوچھ رہا ہے حالانکہ خدا نے تجھ کو وہ خوبی عطا کی ہے کہ تُو خود آنے والے دنوں کی بابت جان سکتا ہے۔ کیا تو بچپن میں لوگوں کو آنے والے واقعات کی خبریں نہیں دے دیا کرتا تھا؟"

جلال الدین نے عرض کیا۔ ''آپ نے بجا فرمایا، لیکن صورت حال یہ ہے کہ میں پیش آنے والے انہی واقعات کی آج خبر دے سکتا ہوں جن کی خدا مجھے توفیق دے دیتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں کل کی بابت کچھ جاننا چاہتا ہوں اور مراقبے میں زمانہ مستقبل کو دیکھنا چاہتا ہوں تو میرے سامنے کہر کی ایک چادر سی آجاتی ہے۔ دھوئیں یا بادلوں کی موٹی دبیز چادر۔ اتنی دبیز کہ میں اس کی دوسری طرف نہیں دیکھ سکتا اور میں ایک بے بس اور عاجز انسان کی طرح اپنی کم مائیگی پر آنسو بہانے لگتا ہوں۔''

بوعلی نے جواب دیا۔ ''جلال الدین! میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جس مردِ خدا کا میں نے ذکر کیا ہے، جب وہ تجھے مل جائے گا تو تُو نورِ باطن سے مالا مال ہو جائے گا اور تیری یہ ساری مشکلات رفع ہو جائیں گی۔''

جلال الدین کے اضطراب میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، پوچھا۔ ''اچھا! آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ میں ان بزرگ سے جلدی ہی ملوں گا یا اس میں کچھ وقت لگے گا؟''

بوعلی شاہ نے جواب دیا۔ ''ملاقات میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ چند دنوں میں یہ ملاقات ہو جائے گی۔''

جلال الدین نے سکون کی سانس لی، کہا۔ ''اگر ملاقات میں زیادہ دیر نہیں لگے گی تو میں صبر و ضبط سے کام لوں گا اور بے چینی اور اضطراب کو دل سے رخصت کر دوں گا۔''

آپ نے بوعلی شاہ کی خدمت میں کافی وقت گزارا اور جب واپس ہوئے تو مذکورہ مردِ خدا کا دل میں شدید خیال لیے ہوئے۔

آپ کے شب و روز اس مردِ خدا کے انتظار میں بسر ہو رہے تھے جس کے ذمے اللہ تعالیٰ نے جلال الدین کی کشائش مقرر کی تھی۔ کچھ دنوں بعد جنوبی ہند سے وہ لشکری وارد دہلی ہوئے جو ایک عرصے سے وہاں مصروفِ پیکار تھے۔ انہی میں شمس الدین ترک پانی پتی بھی شامل تھے اور شمس الدین ترک پانی پتی کی وہ ذات تھی جن کی دعاؤں اور شرکت سے جنوبی ہند کی مہم سر ہوئی تھی۔ پورا لشکر اور غیاث الدین تغلق ان کی عظمت اور کرامت کے معترف تھے۔

شمس الدین ترک پانی پتی اپنے گھر تشریف لے گئے اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر جلال الدین کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت جلال الدین کے جذبے و شوق کا یہ حال تھا کہ وہ عالمِ تصور میں شمس الدین ترک پانی پتی کو اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ وہ جیسے ہی دروازے پر رکے، جلال الدین نے دروازہ کھول دیا اور فرطِ شوق سے عرض کیا۔ ''اے وہ برگزیدہ انسان جس کے انتظار میں، میں نے خواب و خورش کو حرام کر لیا تھا..... خوش آمدید، خوش آمدید!''

شمس الدین ترک نے جلال الدین کو بہ نظرِ غائر دیکھا اور سینے سے لگا لیا، فرمایا۔ ''خدا بھلا کرے بوعلی شاہ قلندر کا۔ اس شخص نے مجھ کو پریشان کر دیا۔ جب تک میں دکن میں رہا، بوعلی شاہ مجھے تنگ کرتے رہے۔ بار بار یہی کہتے، جلال الدین کے پاس چلا جا کیونکہ اس کو جو فیض اور تکمیلِ شوق ہو گا اس کے لیے خدا نے تیری ذات کو مقرر فرمایا ہے اور میں ہر بار ان سے یہی کہتا تھا کہ بوعلی! تو محرمِ راز اور واقفِ اسرار ہے۔ تُو جانتا ہے کہ میں دکن میں کیوں رکا ہوا ہوں۔ چنانچہ جب تک یہاں کی مہم سر نہیں ہو جاتی، میں پانی پت کیسے واپس جا سکتا ہوں۔''

جلال الدین نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔ ''پھر حضرت بوعلی شاہ نے کیا فرمایا؟''

شمس الدین نے جواب دیا۔ ''بوعلی شاہ نے زور دیا کہ میں اپنا کام جلد از جلد ختم کروں کیونکہ جلال الدین کے شوق اور انتظار کا جو حال ہے، وہ صبر و ضبط سے آگے جا چکا ہے۔''

جلال الدین نے بڑی ندامت سے کہا۔ ''اور اس انتظار اور شوق نے میرے دل سے پاسِ ادب اور خیالِ احترام کو نکال دیا ہے۔ میں آپ کو دروازے پر لیے کھڑا ہوں اور اندر تشریف لے جانے کے لیے نہیں کہتا۔ افسوس صد افسوس کہ جس کا میں اتنی شدومد سے انتظار کر رہا تھا، جب وہ میرے پاس آ گیا تو میں نے اس کو دروازے پر کھڑا کر رکھا ہے۔''

آپ نے شمس الدین ترک کا ہاتھ پکڑا اور نہایت ادب و احترام سے اندر لے گئے۔

اندر تشریف رکھنے کے بعد شمس الدین ترک نے پوچھا۔ ''جلال الدین! تیری بیوی کہاں ہے؟''

جلال الدین نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں نے شادی نہیں کی۔''

''کیوں! شادی کیوں نہیں کی؟''

جواب دیا۔ ''اس لیے کہ مجھ کو شادی کا ہوش نہیں تھا۔''
شمس الدین نے فرمایا۔ ''جلال الدین! شادی کر لے کیونکہ یہ سنتِ رسول اللہؐ ہے۔ اس سنت کو کیوں چھوڑتا ہے؟''
جلال الدین نے جواب دیا۔ ''اگر آپ فرماتے ہیں تو شادی بھی کرلوں گا۔''
شمس الدین ترک نے کہا۔ ''یہ میں نہیں فرمارہا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے۔''
جلال الدین نے عرض کیا۔ ''اب میں شادی کرلوں گا، آپ کو دوبارہ لب کشائی کا موقع نہیں ملے گا۔''
شمس الدین ترک نے جلال الدین کے پاس بڑا وقت گزارا اور اس وقت سے تعلیم و تلقین شروع کر دی۔ دورانِ تعلیم فرمایا۔ ''جلال الدین! تو کبیرالاولیاء ہے کیونکہ جمال الدین قطب عالم ہانسوی نے کبیرالاولیاء کہا ہے۔ اگر خدا نے مجھ کو تیری تعلیم و تربیت پر مقرر فرمایا نہ ہوتا تو میں یہی کہتا کہ تجھ کو ان باتوں کی ضرورت نہیں۔''
جلال الدین نے عاجزی سے کہا۔ ''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ جس ذاتِ اقدس کی بوعلی شاہ بشارت دیں، اس کے فیضان اور توجۂ خاص کے بغیر میں اس مقام اور مرتبے کا اپنے دل میں خیال تک نہیں لاسکتا جس کا میں جویا اور متلاشی ہوں۔''
اب شمس الدین ترک نے کبھی انہیں بلالیا اور کبھی خود تشریف لے گئے۔

☆☆☆

آپ نے شادی کرلی اور آپ کی اولاد بھی ہوئی۔ اب آپ پر بڑی ذمے داریاں تھیں۔ خدا کے فرائض، بندوں کے فرائض، حقوق اللہ اور حقوق العباد، دونوں کی بجا آوری میں بڑی مستعدی اور شوق دکھاتے۔
اب آپ کے پاس لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔ دوسری طرف شمس الدین نے تعلیم و تربیت کا سلسلہ بند کر دیا۔
شمس الدین ترک کے مریدوں کا سلسلہ بہت بڑا تھا اور ان میں کئی ایسے تھے جو سجادگی اور خلافت کی توقع میں ہم نشینی اختیار کیے ہوئے تھے۔ شمس الدین ترک ان کی حرص و طمع سے خوب واقف تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''جب بادشاہوں اور حاکموں کا یہ اصول رہا ہے کہ وہ اپنی نیابت اور سیادت کے لیے کسی ایسی ذات کا انتخاب کرتے ہیں جس میں اس کی نیابت اور سیادت کے اوصاف بھی موجود ہوں تو پھر میں کس طرح کسی نااہل کو اپنی جانشینی اور نیابت اور خلافت کے لیے چنوں گا۔''
اس صریح ارشاد اور واضح کلام کے بعد بھی نااہل امیدواروں کی شمعِ امید نہیں بجھی اور وہ اپنی صلاحیت اور اہلیت سے بالاشے کی توقع میں ہم نشینی اختیار کیے رہے۔
ایک دن شمس الدین ترک نے اپنے تمام مریدوں کی موجودگی میں ارشاد فرمایا۔ ''میرے ارادت مندو! میں نے لوحِ محفوظ میں اپنے دنیوی مدتِ قیام کا مطالعہ کیا تو وہاں قلیل مدت کو دیکھ کر میں چونک گیا اور فوراً ہی یہ فیصلہ کرلیا کہ ابھی سے میں اپنی خلافت اور سجادگی کے لیے کسی کا انتخاب کرلوں۔''
امیدواروں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے، سانسیں زور زور سے لی جانے لگیں۔
آپ نے ارشاد فرمایا۔ ''دوستو! تم مجھ کو نادان اور کم علم انسان نہ سمجھو اور تم میں جو بھی خلافت اور سجادگی کا خود کو اہل اور مستحق سمجھتا ہے، ذرا آگے میرے قریب آجائے۔''
آپ کا جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ آٹھ مرید آپ کے پاس جا بیٹھے لیکن ان میں جلال الدین شامل نہیں تھے۔
شمس الدین نے ان امیدواروں کو غور سے دیکھا اور دریافت کیا۔ ''دوستو! ذرا خود کو ٹٹولو اور ٹٹول کر مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم لوگ واقعی خود کو اس منصب اور مقام کا اہل سمجھتے ہو؟''
ان میں سے ہر شخص نے بڑے زور و شور سے یہ اعلان کیا۔ ''ہم ہر طرح خود کو خلافت اور سجادگی کا مستحق اور اہل سمجھتے ہیں اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، اس سے خود آپ بھی واقف ہیں۔''
شمس الدین ترک نے کہا۔ ''لیکن افسوس کہ میں ایک آدمی چاہتا ہوں۔ میں آٹھ آدمیوں کو اپنا خلیفہ اور سجادہ نشین تو نہیں بنا سکتا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تم میں سے سات تو دستبردار ہوجائیں اور باقی بچا ایک، تو اس کو آگے بڑھ کر مجھ سے وہ مقام حاصل کرلینا چاہیے ورنہ یہ طے ہے کہ میں نے کسی شخص کو بھی اپنی نیابت اور سجادگی کے لیے منتخب نہیں کیا لیکن اگر

مجھ پر یہ دباؤ ڈالا گیا کہ میں ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرلوں تو میں یہ نہیں کروں گا۔“
پھر آپ نے پوچھا۔”ارے بھائی! یہ جلال الدین کہاں گیا؟ وہ کہیں نظر نہیں آرہا۔“
جلال الدین نے ایک گوشے سے جواب دیا۔”حضرت میں یہاں اس کونے میں موجود ہوں۔“
شمس الدین ترک نے کہا۔”یہاں میرے پاس آجا، گھبرا مت۔“
جلال الدین اٹھ کر بے چون و چرا شمس الدین ترک کے پاس چلے گئے۔
آپ نے آٹھوں آدمیوں سے کہا۔”دوستو! تم میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں اس جگہ کا زیادہ مستحق ہوں۔“
آٹھوں نے باری باری جواب دیا۔”میں خود کو سب سے زیادہ اس مقام اور منصب کا اہل سمجھتا ہوں اس لیے دوسروں پر مجھ کو ترجیح دی جائے۔“
لیکن جلال الدین پھر خاموش رہے۔
شمس الدین نے انہیں مخاطب کیا۔”جلال الدین! یہی بات تُو کیوں نہیں کہتا؟“
جلال الدین نے انکساری سے جواب دیا۔”جب میں خود کو اس مقام اور منصب کا اہل ہی نہیں پاتا تو اتنی بڑی بات کس طرح کہہ دوں؟“
شمس الدین ترک نے آٹھوں میں سے ایک کو اپنے پاس بلایا اور اس کو حکم دیا۔”میں نے تیرے کہنے سے تیرا دعویٰ قبول کرلیا۔ اب تو بوعلی شاہ کے پاس چلا جا اور ان سے بھی اپنے قول کی تصدیق کرالا۔“
وہ شخص اٹھا اور بوعلی شاہ کی خدمت میں روانہ ہوگیا۔
آپ نے بقیہ سے کہا۔”اور تم لوگ بھی یہی کرو۔ اور جو شخص تصدیق کے ساتھ پہلے واپس آجائے گا، میں اسی کو اس منصب اور مقام کا مستحق قرار دوں گا۔“
اس ارشاد کے بعد بقیہ سات بھی بوعلی شاہ قلندر کی خدمت میں روانہ ہوگئے۔
جلال الدین اس وقت بھی آپ کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ شمس الدین ترک نے پوچھا۔”جلال الدین تم کیا سوچ رہے ہو؟ خیریت تو ہے؟“
جلال الدین نے جواب دیا۔”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مسئلہ آپ کی نیابت اور سجادگی کا ہے اور آپ اس کی تصدیق اور اجازت بوعلی شاہ سے طلب کر رہے ہیں۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“
شمس الدین ترک نے مسکرا کر دیکھا اور جواب دیا۔”جلال الدین! تو میرا محرمِ راز ہے اور خوب جانتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے؟“
جلال الدین نے عرض کیا۔”پھر مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں اس کا بقیہ حصہ پورا کردوں۔“
شمس الدین ترک نے جواب دیا۔”میں نے اجازت دی۔“
جلال الدین نے وہیں کھڑے کھڑے آنکھیں بند کیں اور بہ آوازِ بلند جانے والوں سے کہا۔”دوستو! تم کہاں جارہے ہو؟ ادھر آؤ میرے پاس۔ میں بھی ساتھ چلوں گا اور یہ فیصلہ سب کے سامنے ایک ہی دفعہ میں ہوجانا چاہیے۔“
جب جلال الدین نے یہ کلمات ادا کیے تھے، اس وقت جانے والے کہیں سے کہیں پہنچ چکے تھے لیکن اس کے باوجود لوگوں نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ آٹھوں امیدوار واپس بھاگے چلے آرہے ہیں اور وہ سب آکر جلال الدین کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ارادت مندوں کے ہجوم میں نعرۂ شوق بلند ہوا۔
جلال الدین ان سب کو اپنے ساتھ ہجوم کے باہر لے گئے اور ایک کھلی جگہ پر کھڑے ہو کر پوچھا۔”کیا تم لوگوں کو اس کا کچھ اندازہ ہے کہ بوعلی شاہ تک پہنچنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا؟“
آٹھوں نے مختلف جواب دیے۔ کسی نے کہا۔”کل تک تو پہنچ ہی جائیں گے۔“
دوسرے نے کہا۔”کل تک کیا معنی، میں انہیں آج رات ہی کو پکڑ لوں گا۔“
تیسرا بولا۔”خوب! گویا گھوڑے پر نہیں، آپ دونوں کچھوے پر سفر کریں گے۔ مجھ کو وہاں تک پہنچنے میں تین چار ساعتیں لگیں گی۔“
چوتھے نے اس کا بھی مذاق اڑایا۔”تو گویا آپ بھی پیدل تشریف لے جائیں گے۔“

پانچویں نے کہا۔ ”دوساعتوں میں بہ آسانی پہنچا جاسکتا ہے۔“
چھٹا بولا۔ ”بھائیو! میں حیران ہوں کہ تم سب کی عقلیں کہاں چلی گئیں۔ میں اس مسافت کے فاصلے سے زیادہ اچھی طرح واقف ہوں۔ ہم کتنے ہی تیز رفتار گھوڑے پر اس طرح سفر کریں کہ راہ میں کہیں بھی نہ رکیں تو بھی صبح تک ان کے پاس پہنچ سکیں گے۔“
ساتواں زور سے ہنسا اور بولا۔ ”بتانا تو سہی کہ ان دنوں بوعلی شاہ ہیں کہاں؟ تم سب ان کے پاس کہاں پہنچو گے؟“
آٹھویں نے ساتویں کا مذاق اڑایا۔ ”حالانکہ اس سوال کا جواب تو، تُو خود بھی نہیں دے سکتا، دوسروں سے کیا پوچھتا ہے۔“
ساتویں نے بُرا مان کر کہا۔ ”میں اس سوال کے جواب سے اچھی طرح واقف ہوں، اس لیے یہ سوال کیا۔“
آٹھویں نے پوچھا۔ ”تب پھر بتاؤ تو سہی کہ ان دنوں بوعلی شاہ کہاں اقامت رکھتے ہیں؟“
ساتویں نے جواب دیا۔ ”ضرور سونی پت تشریف لے گئے ہیں۔“
جلال الدین نے ان سب سے خاموش رہنے کے لیے کہا تو ایک نے ان سے بھی پوچھا۔ ”بھائی جلال الدین! تم نے کیوں سکوت اختیار کر رکھا ہے۔ ذرا بتانا تو سہی کہ ان دنوں بوعلی شاہ کا کہاں قیام ہے؟“
جلال الدین نے جواب دیا۔ ”دوستو! میرے پاس تمہارے اس سوال کا جواب موجود ہے اور میں اس کا جواب دوں گا۔ تم سب حسبِ عادت اس کا بھی مذاق اڑاؤ گے اس لیے میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ بوعلی شاہ جہاں بھی موجود ہیں، ہم سب ایک ساتھ ان کی خدمت میں حاضری دیں۔“
ایک نے کہا۔ ”بات تو معقول کہی لیکن یہ بھی تو معلوم ہو کہ وہ ان دنوں ہیں کہاں اور ہم سب ان کے پاس کب تک پہنچ جائیں گے؟“
جلال الدین نے جواب دیا۔ ”وہ کہیں بھی ہوں لیکن یہ میرا ذمہ کہ میں تم سب کو اسی وقت اور اسی لمحے وہاں پہنچادوں گا۔“
سب نے بیک آواز تعجب سے پوچھا۔ ”اسی وقت، اسی لمحے! کیا مطلب؟ کیا وہ یہیں کہیں ہمارے آس پاس موجود ہیں؟“
جلال الدین نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“
کسی نے حیرت سے پوچھا۔ ”پھر ہم کس طرح اسی وقت اور اسی لمحے ان کے پاس پہنچ جائیں گے؟“
جلال الدین نے ان سب کو ایک قطار میں کھڑا کیا اور ان کے گھوڑے ایک طرف ہانک دیے، پھر ان سب کو حکم دیا۔ ”دوستو! تم سب ولایت اور خلافت کے امیدوار ہو، جس کا یہ مطلب ہوا کہ تم سب روحانی ارتقا میں اتنے آگے جا چکے ہو کہ اس کی مثال اور نظیر نہیں ملتی۔“
تقریباً سبھی نے دبی آواز میں کہا۔ ”اس میں کیا شک ہے!“
جلال الدین نے کہا۔ ”میں کب شک کر رہا ہوں۔“ پھر انہیں حکم دیا۔ ”براہِ کرم اپنی آنکھیں بند کر کے اس جگہ کو تلاش تو کرو، جہاں اس وقت بوعلی شاہ تشریف رکھتے ہیں۔“
سب نے اپنی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو ہر ایک کے پاس سوال کے مختلف جواب تھے۔
جلال الدین نے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے مراقبے میں جو کچھ بھی دیکھا ہے، کیا وہ مجھ کو بھی دکھا سکتے ہو؟“
اب سبھی بغلیں جھانکنے لگے اور کسی نے بھی ہنکاری نہیں بھری۔
جلال الدین نے کہا۔ ”دوستو! جو کام تم نہیں کر سکتے اس کو میں انجام دینا چاہتا ہوں، یعنی میں تمہیں وہ جگہ دکھا دینا چاہتا ہوں جہاں اس وقت بوعلی شاہ قلندر تشریف رکھتے ہیں۔“
چند نے خندہ بنایا اور دو نے خوشی سے اجازت دے دی۔ ”جلال الدین! مجھے اس جگہ کی سیر کرادو۔“
جلال الدین نے کہا۔ ”دوستو! میں تمہیں حکم نہیں دے رہا ہوں بلکہ درخواست کر رہا ہوں کہ اپنی اپنی آنکھیں ایک بار پھر بند کر لو تاکہ میں تمہیں بوعلی شاہ کے پاس پہنچادوں۔“

آٹھوں نے بے چون وچرا اپنی اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحوں بعد جلال الدین نے کہا۔ ''اب آنکھیں کھول دو اور دیکھو کہ اس وقت تم سب کس کے سامنے کھڑے ہو؟''

ان سب نے اپنی اپنی آنکھیں جو کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئے کہ وہ ایک جنگل میں کھڑے ہیں اور وہیں ایک جھونپڑی میں بوعلی شاہ آرام فرما ہیں۔

پلک جھپکتے میں اتنی دور آجانا ہر ایک کے لیے حیران کن تھا۔ بات ختم ہو چکی تھی۔ اسی وقت بوعلی شاہ جھونپڑی سے باہر تشریف لائے اور ان سب سے فرمایا۔ ''کیا جلال الدین کے استحقاق کے لیے کچھ کہنے کی اب بھی ضرورت باقی ہے؟''

آٹھوں نے بالاتفاق کہا۔ ''حضرت! ہم سب اپنی زندگی اور زیادتی پر نادم ہیں۔'' پھر پوچھا۔ ''حضرت! اس جنگل کا کیا نام ہے؟''

بوعلی شاہ نے جواب دیا۔ ''اس کو بوڑھ کھیڑہ کا جنگل کہتے ہیں۔ کرنال شہر یہاں سے قریب ہی واقع ہے۔''

ہر شخص نے سراسیمہ ہو کر دوسرے کو دیکھا۔

جلال الدین نے بوعلی شاہ سے عرض کیا۔ ''حضرت! یہاں سے واپس جانے کو تو جی نہیں چاہتا لیکن پانی پت میں حضرت شمس الدین ترک ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر اجازت دیں تو ہم لوگ واپس چلے جائیں۔''

بوعلی شاہ نے جواب دیا۔ ''تم لوگ واپس جا سکتے ہو۔''

جلال الدین نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''حضرات! اپنی اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جب تک میں اجازت نہ دوں، آنکھیں بند رکھیں۔''

انہوں نے اپنی اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ذرا دیر بعد جلال الدین نے کہا کہ اپنی اپنی آنکھیں کھول دیں۔

انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور خود کو شمس الدین ترک کی مجلس کے باہر موجود پا کر ایک بار پھر ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔ جلال الدین ان سب کو اپنے پیر و مرشد کی مجلس میں لے گئے۔ شمس الدین ترک نے پوچھا۔ ''کیا فیصلہ ہوا؟ کس کو فضیلت ملی؟''

سب نے بالاتفاق جواب دیا۔ ''حضرت! جلال الدین ہمارے سرخیل ہیں اور ہم سب اس پر شرمندہ ہیں کہ ہم نے اتنی جسارت کیوں کی۔''

شمس الدین ترک نے اعلان کر دیا۔ ''میں جلال الدین کو اپنا خلیفہ اور سجادہ نشین مقرر کرتا ہوں۔''

اہلِ مجلس نے خوشی میں نعرۂ تحسین بلند کیا اور سب کی موجودگی میں آپ کو خرقۂ خلافت عطا کیا گیا۔

☆☆☆

آپ نے شمس الدین ترک کی وفات کے بعد اپنا کام اور تیز کر دیا اور انسانوں کی ہدایت اور خدمت میں مشغول ہو گئے۔ لنگر جاری رہا اور ضرورت مندوں کی مال و زر سے بھی مدد کی جانے لگی۔ آپ کی سخاوت اور دریا دلی کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔

آپ کے بچے سیانے ہو رہے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا تھا۔ آپ کے پاس دوسروں کے لیے تو بہت کچھ تھا لیکن خود غربت میں گزر بسر کرتے۔ آپ کے دسترخوان پر دونوں وقت سیکڑوں آدمی کھانا کھاتے تھے۔ آپ کسی کو بھوکا یا پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آپ کے حاسدوں کا آپ پر کوئی بس نہ چلا تو آپ کے لڑکے کو ورغلانا شروع کر دیا۔

ایک کائیاں اور حاسد شخص نے آپ کے صاحبزادے سے دوستی کرلی اور بہت زیادہ آنے جانے لگا۔ آپ نے اپنے بیٹے کو سمجھایا کہ اس شخص سے ہوشیار رہنا کیونکہ مجھ کو اس کی نیت میں فتور دکھائی دیتا ہے لیکن بیٹے پر باپ کی نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ بات حاسد شخص کو بھی معلوم ہو گئی۔ اس نے آپ کے صاحبزادے سے کہا۔ ''پیرزادے! میں آپ کے باپ کا بے حد ادب کرتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ ان کا دل میری طرف سے صاف نہیں ہے۔''

صاحبزادے نے جواب دیا۔ ''تو میرے باپ پر الزام نہیں لگا سکتا کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ خدا کی مخلوق سے ان کو جتنی محبت ہے، دوسرا کوئی اس میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

حاسد شخص نے کہا۔ ''واہ مرشد زادے! آپ تو بُرا مان گئے۔ حالانکہ میں نے کوئی ایسی بات تو کہی نہیں جو آپ کو یا کسی کو بُری لگے۔ میں نے تو ایک حقیقت بیان کر دی ہے۔''

صاحبزادے نے جواب دیا۔ ''تُو جس بات کو حقیقت کہہ رہا ہے، میں اس کو تیری زیادتی اور الزام سمجھ رہا ہوں۔''
حاسد نے عرض کیا۔ ''اچھا مرشد زادے! اگر آپ کے والد واقعی مخیر اور سخی ہیں تو میں ان کی سخاوت اور مخیری کا امتحان لے لیتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ آپ کے باپ کتنے پانی میں ہیں۔''
یہ شخص یہاں سے اٹھ کر آپ کی خدمت میں جا بیٹھا اور دل میں جو خواہش تھی اس کے اظہار کے لیے پیرایہ بیان سوچنے لگا۔ آپ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور پوچھا۔ ''اے شخص! تو یہاں کس لیے آیا ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! چھل فریب، عیاری اور مکاری تو مجھ کو آتی نہیں اس لیے جو کچھ کہوں گا زبان سے صاف صاف کہوں گا۔ آپ کے در سے سیکڑوں کو کھانا اور حاجت مندوں کو مال و زر مل جاتا ہے۔ میں کئی دن سے اپنے بیس عدد مہمانوں سمیت پریشان ہوں۔ مالی حالت اتنی سقیم ہے کہ خود مجھ کو اپنا کھانا کھانے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! اس طولانی تمہید سے کیا حاصل، آخر اپنی گفتگو میں وہ بات کیوں نہیں لیتا جس کے لیے تو مارا مارا پھر رہا ہے؟''
اس شخص نے کہا۔ ''تب پھر آپ مجھ پر یہ کرم کر دیجیے کہ میں اپنے عزیزوں، رشتے داروں کی خدمت کر سکوں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اچھا، آج تو جس کام سے آیا ہے اس کو پورا کر، بقیہ کے لیے دو دن بعد دیکھا جائے گا۔''
اس شخص نے مکاری سے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ نے جو کچھ فرمایا سر آنکھوں پر۔ میں اپنے مہمانوں کو یہاں کب تک لے آؤں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''میں نے کہہ دیا کہ جب جی چاہے، مجھ کو کوئی اعتراض نہیں۔''
وہ شخص بھاگا بھاگا گیا اور چند ساعتوں میں پچاس آدمیوں کو لے آیا اور آتے ہی عرض کیا۔ ''حضرت! میں اپنے مہمانوں کو لے آیا۔''
آپ نے اس شخص سے کہا۔ ''تب پھر دیکھتا کیا ہے۔ ان سب کو دسترخوان پر بٹھا دے کیونکہ ان میں سے کئی نے کئی وقت سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔''
اس شخص نے آپ کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے میرے آدمیوں پر ایک قسم کا الزام لگایا ہے حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرے لائے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے بھی فاقہ نہیں کیا۔''
آپ نے خاموشی اختیار کی۔ اس شخص نے آپ کو دوبارہ چھیڑا۔ ''حضرت! آپ خدا کی بارگاہ میں زیادہ قربت رکھتے ہیں۔ کیا خدا آپ سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ آپ اپنے بندوں پر الزام کیوں لگاتے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''افسوس کہ میں نے کوئی الزام نہیں لگایا۔''
اس شخص نے کہا۔ ''کیا ابھی ابھی آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ان میں سے کئی، کئی وقتوں کے بھوکے ہیں؟''
''ہاں! میں نے یہ بات کہی تھی اور اس لیے کہی تھی کہ یہ ایک واقعہ ہے۔''
اس شخص نے ہٹ دھرمی اختیار کی۔ ''اس مجلس کے جس شخص نے کئی وقتوں سے کچھ نہیں کھایا، کیا آپ اس کو یہاں ہم دونوں کے پاس بلوا سکتے ہیں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ ابھی لے۔''
اس کے بعد آپ نے مجلس کی طرف اپنا منہ کیا اور زیرِ لب، ارشاد ہوا۔ ''اے لوگو! تم میں کئی نے کئی کئی وقتوں سے کچھ نہیں کھایا، پس ایسے تمام افراد پہلے میرے پاس آئیں اس کے بعد کھانا کھائیں۔''
اسی وقت تقریباً بائیس آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عرض کیا۔ ''حضرت! ہم آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ہم سب تین وقتوں کے بعد یہ کھانا کھا رہے ہیں۔''
حاسد نے ان میں سے چند کو سرگوشی میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تمہاری غیرت کہاں چلی گئی کہ اپنے فاقوں کا اعلان کر رہے ہو؟''
ایک نے جواب دیا۔ ''اے شخص! اگر اس وقت تُو ہماری جگہ ہوتا تو تُو بھی یہی روش اختیار کرتا اور یہی کہتا جو ہم کہہ رہے ہیں۔''
وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور جب سب کھانا کھا چکے تو اس نے منافقت سے درخواست کی۔ ''حضرت! جب آپ نے

ان کے حال پر اتنا کرم کیا ہے تو ان سب کی کچھ مالی مدد بھی فرما دیجیے گا کہ یہ اپنے کھانے پینے کی ضروریات کے علاوہ بعض دوسری ضرورتیں بھی پوری کر لیں۔''

آپ نے سکوت اختیار کیا۔ وہ شخص سمجھا کہ آپ مالی مدد دینے کے لائق نہیں اس لیے خاموشی اختیار کر لی۔ چنانچہ وہ بہت خوش ہوا اور دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں سے نکلتے ہی لوگوں کو بتائے گا کہ جلال الدین کسی نہ کسی طرح بھوکوں کا پیٹ تو بھر سکتے ہیں لیکن ان کے اس دعوے میں کوئی صداقت نہیں کہ وہ حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور اہلِ غرض کی مالی مدد کیا کرتے ہیں۔ وہ یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ نے اعلان کیا۔ ''اے شخص! تو اس وقت کہاں ہے؟''

اس نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''حضرت! اس وقت تو میں آپ کے پاس ہی موجود ہوں اور آپ کے سوال پر حیرت زدہ ہوں۔''

آپ نے کہا۔ ''نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ تُو جو کچھ سوچ رہا ہے، میرے رب نے اس کو میرے قلب میں منعکس کر دیا ہے۔''

اس کے بعد آپ نے حکم دیا۔ ''وہ تمام حضرات جو کھانا کھا رہے تھے، رخصت ہونے سے پہلے اپنے حصے کی رقم بھی لیتے جائیں۔''

چنانچہ آپ نے ان سب کو خانقاہ کے باہر ایک نامکمل دیوار کی طرف بھیجتے ہوئے کہا۔ ''اس دیوار کی اینٹوں کو ہٹاؤ اور جو کچھ اس کے نیچے پاؤ، لے لو۔''

ان لوگوں نے حکم کی تعمیل میں باری باری اینٹیں جو ہٹائیں تو انہیں چار چار طلائی سکے ملے اور یہ زرد سکے یوں چمک رہے تھے گویا ابھی ابھی دارالضرب سے لائے گئے ہوں۔ کھانا کھانے کے بعد سونے کے سکوں کی دریافت نے انہیں باغ باغ کر دیا اور وہ سب آپ کا قصیدہ پڑھتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

حاسد کو اپنی شکست کا بڑا صدمہ ہوا اور اس نے ایک بار پھر یہ فیصلہ کیا کہ مایوسی کی ضرورت نہیں، میں ان کو شکست ضرور دوں گا۔

اس شخص کے آپ کے بیٹے سے تعلقات تو تھے ہی۔ اتفاق سے اسی دوران اس شخص کی ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہو گئی جو اس بات کا مدعی تھا کہ وہ کیمیا گر ہے اور سونا بنا لیتا ہے۔ اس شخص نے کیمیا گر سے دوستی کر لی اور ایک دن جلال الدین کے صاحبزادے سے کہا۔

''مرشد زادے! میں آپ کے والد کے حسنِ اخلاق اور مخیری کا دل سے قائل ہوں لیکن ایک بات مجھے اور میری طرح دوسرے لوگوں کو بہت دکھ پہنچاتی ہے اور ایک مدت سے میں فکر میں تھا کہ اس کا ازالہ کر دوں۔''

آپ کے صاحبزادے نے پوچھا۔ ''میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''بات کوئی خاص نہیں ہے۔ آپ کے والد کو خدا نے کیا نہیں دیا۔ سب کچھ موجود ہے۔ اگر وہ چاہیں تو آپ کو آپ کی ماں اور بھائی بہنوں کو سونے کے محل میں آباد کر دیں لیکن معلوم نہیں کیوں انہیں آپ لوگوں کی فکر نہیں۔''

مرشد زادے نے کہا۔ ''میرے والد صاحب جو سلوک کرتے ہیں، وہ وہی ہوتا ہے جس کے ہم سب مستحق ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہم لوگ عیش و عشرت اور آرام کے عادی ہو کر خدا کو بھول جائیں، ورنہ اگر وہ چاہیں تو ہم سب کو ایسا عیش کرا دیں کہ شاید شہزادے تک اس سے محروم رہتے ہوں۔''

حاسد نے عرض کیا۔ ''مرشد زادے! معاف کرنا، میں آپ کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس لیے میں آپ کو ایک کیمیا دان سے ملانا چاہتا ہوں۔ یہ کیمیا دان آپ کو سونا بنا کر دکھائے گا۔ آپ اس سونے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں جس سے آپ کے والد نے آپ کو اب تک محروم رکھا ہے۔''

مرشد زادے نے پوچھا۔ ''کیا وہ کیمیا دان واقعی سونا بنا لیتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو عملاً دکھا بھی دوں گا۔''

مرشد زادے نے کہا۔ ''کیا وہ اپنا ہنر ہمیں بھی سکھا سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔'' حاسد بے حد خوش تھا کہ اس کا وار کارگر پڑا۔

مرشد زادے نے اضطراب سے کہا۔ ''تب پھر اس کو مجھ سے جلد از جلد ملا دو۔ میں کیمیا دان بننا چاہتا ہوں۔''

انمول موتی

☆ خواہش اگر پرندہ ہوتی تو ہر شخص جیب میں رومال رکھنے کے بجائے جال رکھتا۔
☆ اگر خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں میں خوشیاں بانٹو۔
☆ کسی کا دل توڑو گے تو خدا ناراض ہو جائے گا کیونکہ خدا دلوں میں رہتا ہے۔
☆ خدا ہر طائر کو خوراک دیتا ہے لیکن گھونسلے میں نہیں رکھتا۔ یہی مثال انسان کی ہے۔ اسے روزی روٹی کی تلاش میں صبح گھر سے نکلنا پڑتا ہے۔
☆ دنیا کی کوئی تفریح اتنی سستی نہیں جتنی مطالعے کی عادت ہے۔
☆ بہادر وہ نہیں جو بدلہ لے بلکہ معاف کر دینا اصل بہادری ہے۔
☆ روشنائی جلد خشک ہو جاتی ہے، آنسو نہیں۔
☆ معالج اور گورکن ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔
☆ بے وقوف کی نشانی یہ ہے کہ وہ بول کر سوچتا ہے جبکہ عقلمند اصل میں وہ ہے جو سوچ کر بولتا ہے۔
☆ ہنرمند کبھی بھوکا نہیں مرسکتا۔
☆ لالچی اور ہوس کا رشخص اس پھٹی ہوئی بوری کے مانند ہے جو بھری نہیں جاسکتی۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

دو دن بعد وہ شخص آیا اور مرشد زادے کو مطلع کیا کہ وہ کیمیادان کل آئے گا اور آپ کو کیمیا گری سکھانے لگے گا۔

مرشد زادے پر حیرت طاری تھی کہ آدمی کیا نہیں کرسکتا۔ سونا بنانے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو زیادہ محنت مشقت کی ضرورت نہیں، بس سونا بنانا شروع کردے اور مالدار انسان بن جائے۔ دو دن گزارنا دشوار ہوگئے۔ معلوم نہیں کیوں اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کیمیا گر کا ذکر باپ سے بھی کردیا جائے اور انہیں یہ بتایا جائے کہ اس دنیا میں ایسے باکمال لوگ بھی موجود ہیں۔

بیٹا، باپ کے سامنے اس وقت پہنچا جب کہ وہ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو نصیحتیں اور ہدایتیں فرما رہے تھے۔

بیٹا، باپ کے دائیں طرف بیٹھ گیا۔ وعظ کے خاتمے پر آپ نے بیٹے سے پوچھا۔ ”مجھ سے کوئی کام؟ کچھ کہنا سننا ہے؟“

صاحبزادے نے رک رک کر جواب دیا۔ ”باوا جان! اگر آپ اجازت دیں تو آج میں آپ سے ایک ایسے موضوع پر بات کرلوں، جس پر آج تک کوئی بات نہیں ہوئی۔“

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں تیرا انتظار کر رہا تھا کیونکہ جس موضوع پر تو بات کرنے آیا ہے، اس پر میں خود بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔“

بیٹے نے پوچھا۔ ”باوا جان! گستاخی تو ضرور ہوگی لیکن میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو خدا نے جو مرتبہ عطا فرمایا ہے اور جو کچھ مرحمت فرمایا ہے، کیا اس میں ہمارے لیے کچھ بھی نہیں؟“

باپ نے بڑی مشفقانہ نظر سے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”رک کیوں گئے؟ بات پوری کرلو۔ میں جواب بعد میں دوں گا۔“

بیٹے نے کہا۔ ”باوا جان! ہم بھائی بہن یہ دیکھتے ہیں کہ آپ دوسرے حاجت مندوں کی تو خوب مدد کرتے ہیں لیکن گھر کے ماحول سے پریشانی اور عسرت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کیا ہم لوگ اس آسودگی اور عیش و آرام کے مستحق نہیں جو دوسروں کو میسر ہے؟“

آپ نے کہا۔ ”یہ تو نہیں، کوئی اور بول رہا ہے۔ خیر! اور کیا کہنا ہے؟ جلدی بتا۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باوا جان! ہم سب آپ کے دست نگر ہیں اس لیے آپ سے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ آپ ہمیں دنیاوی آسودگی سے محروم کیوں رکھے ہوئے ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو اتنی اجازت دے دیں کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کروں۔''

باپ نے پوچھا۔ ''اچھا، اگر میں تجھ کو پاؤں پر کھڑا ہونے کی اجازت دے دوں تو تُو اپنے لیے کس پیشے کو پسند کرے گا؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''باوا جان! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نہ تو میں کسی قسم کی ملازمت کروں گا اور نہ کسی قسم کی تجارت میں حصہ لوں گا۔''

''پھر کیا کرے گا؟''

''باوا جان! میں کیمیا گری کرنا چاہتا ہوں۔ میں سونا بناؤں گا اور دنیا کو یہ بتاؤں گا کہ انسان کتنا عظیم ہے اور یہ سب کچھ کر سکتا ہے کیونکہ کیمیا گری کوئی آسان اور معمولی کام نہیں ہے۔''

باپ کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ فرمایا۔ ''بیٹے! میں نے جو کچھ تیری زبان سے سنا، اس کا پہلے سے علم تھا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ تیری زبان میں جو شخص باتیں کر رہا ہے، وہ میرا حاسد ہے۔ خدا اس کو ہدایت دے اور راہِ راست پر لائے۔ وہ مجھے تو شرمندہ کر نہیں سکا، اب اس نے تیرے ذریعے سے مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن انشاء اللہ وہ اس میں بھی ناکام رہے گا۔''

بیٹے نے ایک بار پھر اصرار کیا۔ ''باوا جان! اگر میں کیمیا گری سیکھ جاؤں تو کیسا رہے گا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''کیمیا گری کر کے کیا کرو گے؟ اگر تُو سونے چاندی سے محبت کرتا ہے تو تیرا باپ تیرے لیے، تو جس چیز کو چاہے اس کو سونا بنا دے۔''

بیٹے نے معصومیت سے پوچھا۔ ''کیا آپ بھی کیمیا گر ہیں؟''

باپ نے جواب دیا۔ ''میں کیمیا گر نہیں۔ مجھ کو کیمیائے سعادت آتی ہے۔'' اس کے بعد پتھر کے ایک ٹکڑے پر تھوک دیا اور بیٹے سے کہا۔ ''پتھر کو اٹھا لے کیونکہ میں نے اپنے تھوک سے اس کو سونا بنا دیا ہے۔''

بیٹے نے پتھر کا ٹکڑا جو اٹھایا تو وہ واقعی سونے کا ہو چکا تھا۔ اس کا حیرت سے برا حال ہو گیا۔

باپ نے اس کے حیرت زدہ دل پر ایک تازیانہ رسید کیا، فرمایا۔ ''صاحبزادے! کیمیا گری سے تجھ کو کیا حاصل ہوگا؟ میں تو تجھے کیمیائے سعادت بخشوں گا۔ کیمیا گری شعبدہ بازی ہے جو انسان کو خوار بھی کر دیتی ہے۔''

حاسد نے جب کیمیا گر کو مرشد زادے سے ملایا تو اس نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''جناب والا! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کیمیا گر نہیں بنوں گا کیونکہ اس شعبدے کی اب میرے دل میں پہلے جیسی عزت نہیں رہی۔''

حاسد نے حیرت سے پوچھا۔ ''شعبدہ؟ کیسا شعبدہ؟''

مرشد زادے نے جواب دیا۔ ''ہاں! اب میں کیمیا گری کو شعبدہ ہی سمجھنے لگا ہوں۔''

کیمیا گر کو غصہ آ گیا۔ اپنے ساتھی سے کہا۔ ''کیا تو یہاں مجھ کو ذلیل و خوار کرنے لایا تھا؟''

حاسد نے جواب دیا۔ ''میری سمجھ میں یہ بات خود نہیں آ رہی کہ اس وقت مرشد زادے کو کیا ہو گیا ہے؟''

مرشد زادے نے پتھر کا سونا بن جانے والا ٹکڑا ان دونوں کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ''اس ٹکڑے کو دیکھ۔ پہلے یہ پتھر تھا مگر اب سونا بن چکا ہے۔''

کیمیا گر نے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ پوچھا۔ ''میاں صاحبزادے! میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس پتھر کے ٹکڑے کو سونا کس نے بنا دیا؟''

مرشد زادے نے جواب دیا۔ ''میرے باوا جان نے۔''

کیمیا گر نے پوچھا۔ ''ذرا اس کی ترکیب تو پوچھ لینا باوا جان سے۔ شاید اس طرح سونا سستا پڑ جائے۔''

مرشد زادے نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے باوا نے اس پتھر پر تھوک دیا تھا۔ اس تھوک سے یہ سونے کا ٹکڑا بن گیا لیکن اب میں یہ نہیں یقین کرتا کہ لوگ کیمیا گر بن کر خود کو دولت مند بنانے کی کوشش کریں گے اور اس میں کامیاب بھی ہو جائیں گے۔''

اب کیمیا گر اور اس کا حاسد اور سازشی دوست بھی جلال الدین سے مرعوب و متاثر ہو چکے تھے۔ دونوں ہی نے درخواست کی۔ ''مرشد زادے! تم ہم پر یہ کرم کرو کہ اپنے باوا جان کے پاس لے چلو تاکہ ہم ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کریں۔''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''پہلے میں باوا جان سے اجازت تو لے لوں کہ وہ تم دونوں سے ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں۔''

کیمیا گر نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ چلوں گا اور اس وقت تک خانقاہ کے باہر کھڑا رہوں گا جب تک کہ مجھے اذنِ باریابی نہیں مل جائے گا۔''

دونوں آدمی مرشد زادے کے ساتھ خانقاہ پہنچے اور بیٹے نے دونوں کو تو باہر ہی کھڑا کیا اور خود باپ کے پاس چلا گیا اور عاجزی سے کہا۔ ''باوا جان! کیمیا گر اور اس کا ساتھی دونوں آپ کی ملاقات کو حاضر ہوئے ہیں اور باریابی کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔''

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں تو ان کے آنے کا انتظار ہی کر رہا ہوں۔ انہیں فوراً میرے پاس لاؤ۔''

بیٹا باہر گیا اور دونوں کو ساتھ لے کر اندر داخل ہوا۔

دونوں نے جلال الدین کو دور سے دیکھا تو بے قابو ہو گئے اور لڑکھڑاتے ہوئے ان کے قدموں میں جا گرے۔

آپ نے دونوں کو اٹھایا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم دونوں پریشان کیوں ہو؟''

حاسد نے جواب دیا۔ ''پیر و مرشد! میں نے آپ کے خلاف زبان بھی کھولی ہے اور کام بھی کیا ہے۔ اگر آپ چاہتے تو بددعا دے کر مجھ کو تباہ و برباد کر دیتے لیکن آپ نے ہمیشہ شفقت اور محبت سے کام لیا ہے۔ میں اپنی کینہ توزی اور حسد پر شرمندہ ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''چونکہ میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تیری اصلاح ہو جائے گی اور تُو اپنی حرکتوں سے باز آجائے گا اس لیے میں نے ہمیشہ ہی تیرے حق میں ہدایت کی دعا کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو گئی۔''

کیمیا گر نے کہا۔ ''اور حضرت! میرے بارے میں کیا ارشاد ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو کیمیا گری چھوڑ دے اور کیمیائے سعادت حاصل کر۔''

کیمیا گر نے عرض کیا۔ ''آپ جو کچھ فرمائیں گے، میں اس پر عمل کروں گا۔''

ان دونوں نے آپ کا تقرب اختیار کیا اور تصوف میں بڑا مرتبہ پایا۔ آپ بھی ہمیشہ ان دونوں پر بہت مہربان رہے۔



انہی دنوں بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں شیخ احمد عبدالحق کا نام بڑی عزت سے لیا جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی مزید تعلیم و تربیت کے لیے پانی پت کا سفر کیا تاکہ جلال الدین سے مدد لے کر کوئی اعلیٰ منصب حاصل کریں۔ آپ کو شیخ عبدالحق کی آمد کا پہلے سے پتا چل چکا تھا چنانچہ اسی دن سے آپ نے عبدالحق کا انتظار شروع کر دیا۔ جس دن عبدالحق نے اپنا سفر شروع کیا تھا، آپ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اللہ کا ایک برگزیدہ بندہ آرہا ہے۔ اس کا شاندار استقبال کیا جائے۔

جس وقت احمد عبدالحق نے پانی پت میں قدم رکھا، آپ نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ چند گھوڑوں پر ساز اور زینیں کس دی جائیں اور نہایت پُرتکلف دسترخوان بھی لگا دیا جائے کیونکہ آنے والا ابھو کا بھی دکھائی دیتا ہے۔

آپ کے مریدوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کس آنے والے کی بات کر رہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''آنے والا جب آئے گا تو اس کو سبھی دیکھ لیں گے۔ بس وہ آنے ہی والا ہے۔''

اس دن آپ نے نہ صرف یہ کہ دروازے پر دو گھوڑے کھڑے کروا دیے اور نہایت شاندار کھانے پکوا کر تیار رکھے بلکہ خانقاہ اور مکان کو دلہن بنا دیا۔ احمد عبدالحق جب خانقاہ کے در پر پہنچے تو یہاں کی شان و شوکت دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئے۔ اپنے دل میں کہا کہ میں کس کے پاس آ گیا ہوں۔ جو شخص شان و شوکت کا اتنا دلدادہ ہو، وہ محبتِ الٰہی کا کیا دم بھرے گا لیکن پھر بھی اندر داخل ہو گئے۔ ان کو فوراً ہی دسترخوان کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ شاندار لذیذ کھانوں کی خوشبو نے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی اور اسی لمحے ایک بار پھر دل میں یہی خیال آیا کہ دنیاوی شان و شوکت کا دلدادہ اللہ سے کس طرح محبت کرے گا۔ انہوں نے کراہت سے منہ پھیر لیا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر باہر نکل گئے۔

سارا دن چلتے رہے اور شام سر پر آ گئی۔ کسی سے پوچھا۔ ''بھائی! یہ کون سی جگہ ہے؟''

جواب ملا۔ "پانی پت۔"

"پانی پت؟" وہ حیرانی سے بولے۔ "میں صبح سے شام تک مسلسل چلتا رہا ہوں اور ابھی تک پانی پت ہی میں موجود ہوں۔"

انہوں نے رات وہیں بسر کی اور دوسرے دن پھر چل پڑے۔ چند ساعتوں بعد انہیں شبہ گزرا کہ وہ راستہ بھول چکے ہیں اور پتا نہیں کدھر اور کہاں جا رہے ہیں۔ انہوں نے اِدھر اُدھر اس نیت سے دیکھا کہ اگر کوئی شخص نظر آجائے تو اس سے پتا معلوم کریں۔ سامنے ایک خشک درخت پر ایک شخص کو بیٹھے دیکھا جس کے سر پر کلاہ رکھی تھی۔ آپ نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ "جناب! میں راستہ بھول چکا ہوں۔ میری راہنمائی کریں تاکہ میں اپنا راستہ پا جاؤں۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "نوجوان! تُو نے اپنا راستہ تو اسی وقت اور اسی لمحے گم کر دیا تھا جب تُو نے جلال الدین کی خانقاہ کو چھوڑا تھا۔ تجھ کو ان کا در نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔"

احمد عبدالحق نے کہا۔ "میں نے جس در کو چھوڑا تھا، وہاں امارت کے نشانات تھے۔ میں اس جال سے باہر آ گیا۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "میں پھر یہی کہوں گا کہ تُو نے غلطی کی ہے اور اگر میری باتوں کی تائید چاہتا ہے تو ان دو آدمیوں سے پوچھ لے جو ادھر ہی چلے آ رہے ہیں۔"

احمد عبدالحق نے آنے والوں کو دیکھا۔ یہ دونوں مشائخ نظر آ رہے تھے۔ وہ ان دونوں کے پاس گئے اور پوچھا۔ "بھائیو! میں راستہ بھول گیا ہوں، میری راہنمائی فرمائیے۔"

ان دونوں نے بیک آواز دبنگ زبان میں جواب دیا۔ "جلال الدین کا در اپنی مرضی سے چھوڑنے کے بعد راہ کے گم ہو جانے کا شکوہ وملال کیوں۔ تیرا ہر راستہ تجھ کو جلال الدین کے در پر پہنچائے گا۔"

اب تو احمد عبدالحق کو یقین ہو گیا کہ انہوں نے جلال الدین کا در چھوڑ کر سخت غلطی کی ہے۔ انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا اور آخرکار جلال الدین کی خانقاہ کی طرف چل پڑے۔ تھوڑا سا شک اب بھی ان کے دل میں موجود تھا چنانچہ انہوں نے اپنے دل میں کہا۔ "میں ان کو اس وقت بزرگ مانوں گا جب وہ اپنی کلاہ کو شمس الدین ترک کے مزار سے چھو کر میرے سر پر رکھیں گے اور کھانے میں حلوا ضرور شامل کریں گے۔"

آخر ایک دن یہ دوبارہ جلال الدین کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جلال الدین انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھے اور شمس الدین ترک کے مزار پر لے گئے۔ پھر اپنی کلاہ سر سے اتار کر مزار سے مس کی اور احمد عبدالحق کو پہنا دی۔ ابھی اس سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک شخص روضے میں داخل ہوا۔ اس کے شانے پر حلوے کی طشت رکھی ہوئی تھی۔ اس نے طشت جلال الدین کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "حضرت! یہ نیاز دلوائی گئی تھی اس لیے میں یہ حلوا آپ کے لیے لے آیا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میں حلووں کا شوق رکھتا تو ہوں لیکن اس قدر بھی نہیں کہ ندیدے پن کا مظاہرہ کروں۔"

احمد عبدالحق نے کہا۔ "حلوے کے لیے بہت زیادہ بے چین میں خود تھا۔ ورنہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس وقت یہاں حلوا کیوں آیا؟ نہ آتا، لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ یہ چکر کس کی ایما پر چل رہا ہے۔"

جلال الدین نے کہا۔ "اللہ بڑی شان والا ہے۔"

حلوا کھا چکنے کے بعد جلال الدین نے حق حق کا نعرہ بلند کیا اور اس نعرے میں احمد عبدالحق نے بھی ساتھ دیا۔

کچھ دیر بعد احمد عبدالحق نے پوچھا۔ "جناب! آپ تو میرے حق میں چند نعرے لگوا سکتے ہیں؟"

جلال الدین نے جواب دیا۔ "میں نے تیرے حق میں جو دعا کی ہے، اس کے نتیجے میں میرا سلسلہ تجھ سے چلے گا اور تُو بلند مرتبہ پائے گا۔"

بعد میں احمد عبدالحق نے گزارش کی۔ "حضرت! جب تک میں یہاں موجود رہوں گا، آپ سے یہ خواہش کروں گا کہ آپ میرے حق میں یہی دعا فرمائیں کہ میں مال وزر سے متنفر رہوں۔"

آپ نے دعا مانگی اور جواب دیا۔ "مال وزر سے تنفر تو تیری سرشت ہے۔ تو مطمئن رہ، خدا تجھ کو ہمیشہ سرخرو رکھے گا۔"

جلال الدین کبیر الاولیاء نے بڑی لمبی عمر پائی۔ کہتے ہیں 595ھ میں پیدا ہوئے اور 765ھ میں وصال فرمایا۔ گویا ایک سو ستر سال کی عمر پائی۔ آپ نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں وفات پائی اور پانی پت میں آپ کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔

☆☆☆

احساس

شاہ زین رضوان

اسے بچوں کی فطرت کا قطعی اندازہ نہیں تھا کیونکہ ... اپنا بچپن گزرے تو زمانہ بیت گیا تھا اور خود اپنی کوئی اولاد بھی نہ تھی مگر اسے پھر بھی بچوں کو سنبھالنے کی ذمے داری سونپ دی گئی لہٰذا اسے مشکل سے تو گزرنا ہی تھا مگر ... اسے یہ اندازہ ہرگز نہ تھا کہ اتنا خونی واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

بچوں کی شرارتوں میں گم ایک حسینہ کے اعتبار کا فسانہ

مارسیلا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس نے اپنی بھانجی کی دیکھ بھال کرنے کی ذمے داری لے کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ وہ ایک ماہر مکینک تھی اور گاڑی کی بڑی سے بڑی خرابی دور کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انجن کی اوور ہالنگ وہ اس مہارت سے کرتی کہ گاڑی کا ڈرائیور بھی اش اش کر اٹھتا اور اسے لگتا کہ وہ زیرو میٹر گاڑی چلا رہا ہے لیکن بچوں کے مسائل حل کرنے کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔

''صرف چھ مہینے کی تو بات ہے لیکن یہ عرصہ کتنا بھاری ہوسکتا ہے؟''

''صرف چھ مہینے۔'' اس کی بھانجی لوسی نے کہا۔ اس کی گھٹی ہوئی آواز دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ وہ ماسٹر بیڈروم کی الماری میں دبک کر بیٹھی ہوئی تھی تا کہ اسے



اسکول نہ جانا پڑے۔ مارسیلا اس کی وجہ نہیں جانتی تھی، سوائے اس کے کہ اس کی ماں کو حال ہی میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں افغانستان جانا پڑ گیا اور لوسی اس کی کمی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ ماں کی موجودگی میں وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتی لیکن مارسیلا کے لیے اس کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

''دروازہ تو کھولو میری بچی۔'' مارسیلا کی نظر باتھ روم کے سنک کے اوپر لگے ہوئے ہلکے سبز رنگ کے ٹائلوں پر گئی اور اسے گیراج میں کھڑی ہوئی اسی رنگ کی ماورک کار یاد آ گئی جس کے بریک کا کام کرانا تھا۔ اگر یہ سلسلہ طویل ہو گیا تو اسے اپنے کام اور لوسی کو اسکول جانے میں دیر ہو جائے گی۔

''لوسی!''

اس کی بھانجی نے ناک سے آواز نکالی اور بالآخر دروازہ کھول دیا۔ اس کی ٹانگیں سینے سے لگی ہوئی تھیں اور اس نے ہاتھ میں باربی ڈول پکڑی ہوئی تھی جو کبھی اس کی ماں کے پاس ہوا کرتی تھی۔

''تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ کم از کم تمہیں نانی کے ساتھ نہیں رہنا پڑا۔'' مارسیلا نے کہا۔ ''تمہیں ڈبوں میں بند کھانے نہیں مل رہے اور نہ ہی نانی کے ساتھ بزرگوں کے مرکز جانا پڑ رہا ہے۔'' اس نے آنکھ ماری اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

لوسی کی نظریں گڑیا پر جمی ہوئی تھیں جس نے ڈینم کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ لوسی کا نچلا ہونٹ کانپنے لگا۔

مارسیلا کے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹنے لگی۔ وہ باتھ روم کے فرش پر لوسی کے برابر میں بیٹھ گئی۔ اسے الماری سے اتار کر اپنی گود میں بٹھایا اور اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔

''اس آٹھ سالہ لڑکی کو کیسے خوش کیا جائے؟''

وہ اپنے بچپن میں جھانک کر اس سوال کا جواب تلاش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ لوسی سے بہت مختلف ہوا کرتی تھی۔ شرمیلی، خاموش طبع اور تنہائی پسند۔ اسے اسکیٹ بورڈ پر سواری کرنا اور کارٹ چلانا اچھا لگتا تھا لیکن لوسی ان بچوں میں سے نہیں تھی جو ایسی چیزوں کو پسند کرتے ہوں۔

''مجھے افسوس ہے میری بچی، صورتِ حال ٹھیک نہیں ہے۔'' مارسیلا کو سچ بولنا پڑا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے علاوہ کیا کہے۔

لوسی کے گال پر ایک آنسو پھسل پڑا۔ مارسیلا کا دل ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ اس کے علاوہ اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ بھانجی پر نہیں بلکہ اپنی بہن پر کہ وہ لوسی کو کیوں اس کے پاس چھوڑ کر گئی۔ مارسیلا بچوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

تاہم اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس وقت مسئلہ لوسی کا تھا۔ اسے اسکول جانے سے پہلے لوسی کو خوش کرنے کا طریقہ سوچنا تھا۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ اس موقع پر اس کی بہن کیا کرتی۔ اس کا ذہن ان تصویروں کی طرف چلا گیا جو اس نے فیس بک پر دیکھی تھیں۔ لوسی کے لیے سب سے زیادہ خوشی کے لمحات وہ تھے جب وہ اپنی عمر کے بچوں میں گھری ہوئی تھی۔

''تم اپنے چند دوستوں کو چھٹی کے بعد گھر پر بلا لو۔ ہم سب مل کر آئس کریم کھائیں گے اور کچھ تفریح کا سامان بھی ہو جائے گا۔''

لوسی کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''کیا واقعی؟''

ان آٹھ سال کے بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے مارسیلا کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ ''بالکل!'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔ وہ شکر کر رہی تھی کہ لوسی نے رونا بند کر دیا تھا۔ اس نے لوسی کو گود سے اتارا اور وہ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ اس نے باتھ روم سنک پر رکھے ہوئے باکس میں سے ٹشو پیپر نکالا اور لوسی کے گال صاف کرنے لگی۔

''اب جلدی کرو ورنہ تمہاری بس نکل جائے گی۔''

وہ دونوں لوسی کا بیگ تلاش کرنے لگیں۔ مارسیلا نے ہال کی الماری کھولنے کے لیے لائٹ کا سوئچ آن کیا۔ اسے ہلکا سا جھٹکا لگا اور اس کا منہ بن گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس پرانے مکان میں بجلی سمیت کوئی مرمت کا کام نہیں ہوا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ پہلی فرصت میں الیکٹریشن کو بلائے گی۔

اس نے الماری کا نچلا خانہ دیکھا اور اسے جم بیگ کے پیچھے رکھا ہوا اسکول بیگ مل گیا۔ وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھیں۔ باہر ہسپانوی طرز کے مکان ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ بچوں نے نیکر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بس پہلے سے وہاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی اور بچے اس میں بھرے ہوئے تھے۔

''لوسی کو دیکھو۔ ابھی تک گڑیوں سے کھیل رہی ہے۔'' ایک لڑکے نے ہنستے ہوئے باربی ڈول کی طرف اشارہ کیا جو اب بھی لوسی کے ہاتھ میں تھی۔

مارسیلا نے لڑکے کو گھورا، پھر لوسی کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں لوسی کا موڈ دوبارہ خراب نہ ہو جائے لیکن لوسی پر لڑکے کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ مسکرا رہی تھی۔

مارسیلا کے دل میں امید کی روشنی ٹمٹمانے لگی۔ صبح کا آغاز کچھ ٹھیک نہیں ہوا تھا لیکن اس نے کسی حد تک صورت حال کو بہتر کرلیا تھا۔ لوسی اب ٹھیک لگ رہی تھی بلکہ تقریباً خوش تھی۔ مارسیلا نے سوچا کہ شاید وہ اس لڑکی کو سنبھالنے میں کامیاب ہوجائے۔

لوسی نے بس میں جاتے ہوئے پلٹ کر مارسیلا کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنے دوستوں کو پارٹی کے بارے میں بتادوں گی۔''

''پارٹی!'' مارسیلا چونک گئی۔ ''کیسی پارٹی؟''

اس کا ذہن آٹھ سال کے بچوں کے ہجوم کی طرف چلا گیا۔ ان کے مسائل، ضروریات، سب اس کی ذمے داری تھی۔ وہ لوسی کو بتانا چاہ رہی تھی کہ گھر میں چند دوستوں کو بلانے کو پارٹی نہیں کہا جاتا لیکن لوسی پہلے ہی بس میں سوار ہوچکی تھی اور مارسیلا وہاں کھڑی منہ کھولے بس کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

عام طور پر مارسیلا کو گیراج کی مشینوں اور آلات کے شور میں سکون ملتا تھا۔ یہ آوازیں اس کے لیے جانی پہچانی تھیں۔ وہ اپنے چہرے کو ہڈ میں چھپالیتی اور اس کا ذہنی دباؤ ختم ہوجاتا لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا۔

سکون کی جگہ پریشانی نے لے لی اور یہ پریشانی پارٹی کی تھی جو دوپہر میں ہونے والی تھی۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ بچوں کی کس طرح خاطر تواضع کی جائے۔ زیادہ بچوں کی وجہ سے زیادہ مسائل ہوتے اور اس کی ناکامی کے امکانات بڑھ جاتے۔

مارسیلا نے اس پارٹی کو منسوخ کرنے کے بارے میں سوچا۔ وہ لوسی کو اپنی بیماری کا کہہ سکتی تھی اور اس میں کسی حد تک سچائی بھی تھی۔ اس پارٹی کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے تاہم وہ ایسا نہ کرسکی۔ لوسی کو چھوٹی سی عمر میں کئی مرتبہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ اس میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے دو گاڑیوں کا آئل تبدیل کرنے کے بعد ایک گاڑی کے بریک کا کام کیا۔ اس کے بعد اس کے پاس کوئی اور کام نہیں تھا۔ اس نے تکمیل شدہ ورک آرڈر اپنے سپروائزر روسو کی میز پر رکھ دیا۔ وہ گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کرسی کو تھوڑا سا آگے کھسکایا اور وہ کاغذ اٹھالیا لیکن اسے پڑھنے کے بجائے اس کی نظریں مارسیلا کے چہرے پر جم گئیں۔

''یہ کیا ہوا؟'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

مارسیلا نے ورک آرڈر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا کوئی غلطی ہوگئی؟''

''میں کام کی نہیں، تمہاری بات کررہا ہوں، لڑکی!'' اس نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بھوؤں کے درمیان ایک گہری لائن نظر آرہی ہے۔''

مارسیلا نے اس جگہ کو چھوا اور اس کی گہرائی محسوس کرکے اس کا منہ بن گیا۔

''یہ اچھا نہیں لگ رہا۔ مجھے بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں۔''

اس نے غور سے روسو کی جانب دیکھا اور سوچنے لگی کہ کیا اس پر بھروسا کرنا چاہیے؟ عام طور پر ان کے درمیان نئی کاروں یا ساؤتھ ویسٹ یونیورسٹی کے موٹر پلیکس میں ہونے والی کار ریس کے بارے میں گفتگو ہوا کرتی تھی لیکن انہوں نے کبھی ذاتی مسائل پر بات نہیں کی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ کام کے دوران اپنے مسائل میں الجھی رہے۔

وہ روسو کے سوال کو نظر انداز کرکے نیا ورک آرڈر اٹھانے لگی۔ روسو نے اپنا ہاتھ کاغذوں پر رکھ دیا۔ ''کم آن بے بی۔'' اس نے اصرار کیا۔

اچانک ہی مارسیلا کی نظروں کے سامنے صبح کا منظر گھوم گیا جب لوسی الماری میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ اسے منا رہی تھی۔ اب اس نے اپنے آپ کو لوسی کی جگہ دیکھا اور وہ بولنے پر مجبور ہوگئی۔

''ٹھیک ہے۔'' مارسیلا نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا پھر اس نے روسو کو لوسی اور دوپہر کو ہونے والی پارٹی کے بارے میں بتایا۔

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''کیا واقعی؟ اسی لیے تم اتنی پریشان ہو؟''

''یہ مذاق نہیں ہے مسٹر۔''

''مجھے تو یہ مذاق ہی لگتا ہے۔''

''تم نہیں سمجھتے۔'' بچوں نے اسے پریشان کردیا تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ شاید بچوں کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ کچھ بھی کرسکتے تھے اور وہ ڈرتی تھی کہ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ انہیں ہینڈل نہ کرسکے۔

''روسو......'' اس نے کہنا شروع کیا۔

لیکن اب اس کی توجہ مارسیلا پر نہیں تھی۔ اس نے اپنی گھنی خم دار مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور خلا میں دیکھنے لگا۔ یہ وہی انداز تھا جب وہ کسی انجن کی خرابی تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

''پیناٹا'' وہ بالآخر بول پڑا۔

''پیناٹا؟'' مارسیلا نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''تم پیناٹا کے بارے میں نہیں جانتیں؟ یہ ایک کپڑے، پلاسٹک یا مٹی کا بنا ہوا جانور کی شکل کا تھیلا ہوتا ہے جس میں مختلف تحائف مثلاً کھلونے اور کینڈیز وغیرہ بھری ہوتی ہیں۔ اسے کسی اونچی جگہ پر لٹکا دیا جاتا ہے، پھر ایک چھڑی سے اس پر ضرب لگائی جاتی ہے اور اس میں رکھی ہوئی سب چیزیں نیچے گر جاتی ہیں۔'' روسو نے کہا اور تالیاں بجاتے ہوئے گانا گانے لگا۔

''ہٹ، ہٹ، ہٹ، ڈونٹ یوز مائنڈ۔''

مارسیلا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہاں کوئی ساتھی ورکر موجود نہیں تھا۔

''میں پیناٹا کے بارے میں جانتی ہوں روسو۔''

''پھر تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ بچے انہیں کتنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں آئس کریم کھلاؤ اور پیناٹا پر ضرب لگانے کا موقع دو۔ اس طرح تم ہیرو بن جاؤ گی۔''

مارسیلا کو اعتراف کرنا پڑا کہ یہ برا آئیڈیا نہیں ہے۔

''میری بہن اینی کا پارٹی اسٹور ہے۔ میں اس سے کہہ کر تمہارے لیے ایک پیناٹا کا انتظام کرسکتا ہوں۔ وہ میری طرف سے تحفہ ہوگا۔''

''کیا واقعی؟''

''ایسی کوئی چیز ہے جس سے تمہاری یہ لائن صاف ہوسکے؟''

مارسیلا نے اپنے ماتھے کو چھوا۔ بھوؤں کے درمیان وہ لائن اب بھی موجود تھی۔

''میری ایک کزن ہے جو میری کے، کی کاسمیٹکس بیچتی ہے۔''

''وہ تمہاری مدد کرسکتی ہے۔'' مارسیلا نے اسے تیز نظروں سے دیکھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے صبح لوسی کا مذاق اڑانے والے لڑکے کو دیکھا تھا۔

روسو نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بھانجی کیسی چیزیں پسند کرتی ہے؟''

''ایسی چیزیں جن سے لڑکیاں لطف اندوز ہوں۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' روسو نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''میں بہترین کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے میری پائنز جیسی پرفارمنس دینے کے لیے نہیں کہا تھا۔''

''میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی لیکن میری پائنز کے جسم پر کوئی ٹیٹو نہیں تھا۔''

اس نے اپنے بازو پر بنے ہوئے ٹیٹوز کو دیکھا۔ ''اس میں کیا برائی ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' روسو نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ تم میری پائنز نہیں ہو۔''

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو، لوسی ایک اچھی بچی ہے جو میرے مقابلے میں بہتر سلوک کی مستحق ہے۔''

''تم پریشان مت ہو۔'' روسو نے کہا۔ اس بار اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک تھی۔

''اینی کے پاس اس طرح کا بہت سامان ہے۔ وہ تمہارے لیے الگ کردے گی۔'' پھر وہ اپنا گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''اب کچھ کام کی بات ہوجائے۔''

''کیوں نہیں۔''

وہ اس کی طرف ایک ورک آرڈر بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''گاہک چاہتا ہے کہ اس کی کار کے بمپر پر لگے ہوئے اسٹیکر ہٹا دیے جائیں۔''

''بس یہی کام ہے؟''

''تم نے ابھی کار نہیں دیکھی ہے۔''

☆☆☆

مارسیلا کو ٹویوٹا کار کے بمپر کا اسٹیکر اتارنے میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اس نے چپکانے والے مادے کو پگھلانے کے لیے انڈسٹریل ڈرائر کا استعمال کیا تاکہ اسٹیکر کو آسانی سے اتارا جاسکے، پھر اس نے گھسی ہوئی جگہ پر سفید ٹوتھ پیسٹ لگایا تاکہ نشانات زائل ہوجائیں۔ یہ کام کافی تھکا دینے والا تھا اور اس میں توقع سے زیادہ وقت لگ گیا۔ اب اسے اینی سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ اینی کا اسٹور اس کے ورکشاپ کے قریب ہی تھا۔ اس کے ایک جانب پان شاپ اور دوسری طرف لانڈری تھی۔ اس نے اسٹور کا دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھتے ہی الارم بجنے لگا لیکن اس کی آواز کچھ خوشگوار نہیں تھی۔ یوں لگا جیسے کسی جیل کا سائرن بج رہا ہو۔ اسٹور کے محل وقوع کے برعکس وہ جگہ اندر سے کافی بہتر لگ رہی تھی۔ ایک دیوار پر میکسیکو کے بنے ہوئے ہٹ، مراکا ساز اور دف آویزاں تھے اور دوسری دیوار رنگ برنگے غباروں سے بھری ہوئی تھی۔ درمیانی راستے پر رکھے ہوئے ریک کینڈیز، کاغذ کے کھلونوں اور پارٹی کے لوازمات سے بھرے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر پر ایک رجسٹر رکھا ہوا تھا لیکن اینی وہاں نہیں تھی۔

مارسیلا کی نظر چھت پر لگے ہوئے کیمرے پر گئی اور وہ انتظار کرنے لگی۔ اسے امید تھی کہ اینی اسے دیکھ کر اسٹور کے عقبی حصے سے باہر آجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

مارسیلا نے کیمرے سے مایوس ہوکر اندر کی جانب

قدم بڑھایا اور زور سے آواز لگائی۔ ''ہیلو۔'' لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور دوبارہ آواز لگائی۔ اس مرتبہ اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ ایک مرد اور عورت میں جھگڑا ہو رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم دونوں میں اس بات پر اتفاق ہو گیا تھا کہ تم اب یہ کام نہیں کرو گی۔'' مرد نے کہا۔ ''اس میں بہت خطرہ ہے۔ تم گرفتار بھی ہو سکتی ہو۔''

''بھوکے مرنے سے بہتر ہے کہ گرفتار ہو جاؤں۔''

مارسیلا اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ اس نے سوچا یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان دونوں میں بحث جاری تھی۔ مارسیلا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اینی کو ایک بار پھر آواز دے یا پیناٹا کو بھول کر واپس چلی جائے لیکن وہ اس خیال سے ہی خوف زدہ ہو گئی کہ وہ پارٹی میں آنے والے بچوں کو کوئی تفریح مہیا نہیں کر سکے گی۔ مشکل یہ تھی کہ اس نے جو گفتگو سنی وہ بے حد تکلیف دہ تھی۔

وہ بیرونی دروازے کی جانب مڑی۔ وہ آوازیں اب بھی اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔

''میں تمہاری قمار بازی کی وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوئی۔'' اینی نے کہا۔

''یعنی یہ بھی میری غلطی ہے؟''

''تم مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' اینی چلائی۔

اسٹور کے عقبی حصے میں ایک دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی اور ان کی آوازیں غائب ہو گئیں۔

وہ اسٹور کے سامنے والے حصے میں میز پر رکھے ہوئے رجسٹر کے پاس گئی۔ اس کے ساتھ غباروں کے بوکے اور دو عدد پیناٹار کھے ہوئے تھے۔ دونوں سپر ہیروز کی شکل کے تھے۔ وہ لڑکیوں کے مزاج کے مطابق تو نہیں لیکن مارسیلا کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ روسو نے کہا تھا کہ وہ فون کر دے گا کہ اینی اس کے لیے ایک پیناٹا الگ رکھ دے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ایک لوسی کے لیے ہو۔

اس نے پیناٹا کے نیچے رکھے ہوئے آرڈر فارم دیکھے لیکن ان میں سے کسی پر بھی اس کا یا روسو کا نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ وہ مایوس ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ ان میں سے ایک اپنے ساتھ لے جائے گی لیکن وہ ایسا نہ کر سکی کیونکہ وہ کسی اور کے لیے رکھے ہوئے تھے۔

ایک بار پھر اس نے چشم تصور سے دیکھا کہ آٹھ سال کی عمر کے بچوں کا ایک گروپ اس کے گھر آ رہا ہے اور مارسیلا نہیں جانتی تھی کہ ان کے لیے کیا اہتمام کرے۔ اس نے صبح جو خوف محسوس کیا تھا، وہ ایک بار پھر لوٹ آیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا لوسی ان کے ساتھ کوئی گیم کھیل سکتی ہے؟ کیا وہ بچے اب بھی آنکھ مچولی کھیلتے ہوں گے؟ اسے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اس کا پتا تو بعد میں چلے گا۔

مارسیلا واپس جانے کے لیے مڑی، تبھی اس کی نظر کاؤنٹر کے نیچے فرش پر رکھے ہوئے دو عدد پیناٹا پر گئی۔ ان میں سے ایک سینگوں والے گھوڑے کی شکل کا تھا اور دوسرے پر قوس قزح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی آرڈر فارم نہیں تھا۔ مارسیلا کو یقین ہو گیا کہ ان میں سے ایک اس کے لیے ہے۔

مارسیلا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں سے کون سا لوسی کے مزاج کا ہو سکتا ہے لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے ایک سینگ والے گھوڑے کی شکل کا پیناٹا اٹھایا اور اس کا وزن دیکھا۔ وہ بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ مارسیلا نے قلم نکالا۔ رجسٹر کے نیچے سے ایک آرڈر فارم کھینچا اور اس پر اینی کے لیے شکریے کی چند لائنیں لکھ دیں۔

باہر جاتے ہوئے فرنٹ ڈور کا الارم بجا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سفید اور نیلے رنگ کے نائک شوز پہن رکھے تھے اور اس کے بازوؤں پر ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ دونوں پر ایک پیچیدہ ڈیزائن کی شکل میں تین اور ایک لکھا ہوا تھا۔ وہ مارسیلا کے لیے دروازہ پکڑے کھڑا رہا اور پیناٹا کو دیکھ کر سرگوشی میں گنگنانے لگا۔ ''ہٹ ہٹ ہٹ۔ اپنے مقصد سے پیچھے مت ہٹو۔''

روسو بھی یہی گانا گا رہا تھا۔ گو کہ دھن مختلف تھی لیکن کسی حد تک شوخ تھی۔ وہ تیزی سے اس شخص کے پاس سے گزری۔ اچانک ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

مارسیلا نے ڈرائیو وے میں گاڑی کھڑی کی۔ وہ گانا ابھی تک اس کے دماغ میں گونج رہا تھا اور وہ ابھی تک اس بے چینی سے نجات نہیں حاصل کر سکی تھی جو اس گانے کی وجہ سے اسے ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے کام پر توجہ مرکوز رکھی۔ اسے لوسی اور اس کے دوستوں کے لیے بہترین تفریح کا انتظام کرنا تھا۔

اس نے فریزر میں آئس کریم رکھی اور لوسی کی کودنے والی رسی کے ذریعے پیناٹا کو عقبی صحن میں شاہ بلوط کے درخت میں لٹکا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔

بچے پہلے ہی بس سے اتر کر فٹ پاتھ پر آچکے تھے۔
وہ سوچ رہی تھی کہ کتنے بچے اس کے گھر آئیں گے۔ اس نے ان کی تعداد کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اس نے کسی کے چہرے پر جوش نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ لوسی کے انتظار میں ایک جگہ جمع ہوئے۔ بالآخر اس کی بھانجی بس سے باہر آئی، لیکن وہ اکیلی تھی۔
''تمہارے دوست کہاں ہیں؟''
''وہ نہیں آرہے۔'' لوسی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
مارسیلا پُرسکون ہوگئی لیکن یہ کیفیت عارضی تھی۔ اس نے لوسی کو دیکھا، وہ پہلے سے زیادہ افسردہ تھی۔ ''کیا ہوا؟'' مارسیلا نے پوچھا۔
لوسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے کندھے ڈھلک گئے۔ وہ گھر کی طرف جانے لگی۔ گڑیا اس کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے اور گال پچکے ہوئے تھے۔ گڑیا کی جیکٹ غائب تھی۔
''تمہاری گڑیا......؟''
''میں اس بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔'' لوسی نے اپنا بیگ اوپر اٹھایا تو اس کی کہنی پر ایک موٹی بینڈ ایج نظر آئی۔
مارسیلا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ''لوسی! یہ کیا ہے؟''
لوسی فٹ پاتھ پر چلتی رہی۔ ''ایک لڑکے نے اس گڑیا کی وجہ سے میرے ساتھ مذاق کیا۔ اس نے مجھ سے گڑیا لینے کی کوشش کی تو میں گر پڑی۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں رونے لگی اور میری کہنی بری طرح چھل گئی۔ اس نے مجھے بے بی کہہ کر پکارا۔ اس کے بعد میں نے دوستوں سے کچھ نہیں کہا۔''
لوسی کے کلاس فیلوز کے چہرے مارسیلا کے دماغ میں گھومنے لگے۔ اس نے کہا۔ ''کیا یہ وہی لڑکا تھا جس نے صبح تم سے چھیڑ خانی کی تھی؟''
''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' لوسی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''مجھے اس اسکول سے نفرت ہے۔ میں اپنے پرانے دوستوں کو یاد کر رہی ہوں۔ کاش ہم یہاں نہ آتے۔''
مارسیلا نے اس کے کندھے پر اپنا بازو رکھا اور بولی۔ ''صورت حال بہت خراب ہے میری بچی۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح سچ بولا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے علاوہ کیا کہے۔
جب مارسیلا اور لوسی واپس آئیں تو وہ عقبی صحن میں رکھی ہوئی ایک پکنک ٹیبل پر بیٹھ گئیں اور آئس کریم کھانے لگیں۔
مارسیلا نے اپنی آئس کریم ختم کردی لیکن لوسی چمچہ ہلاتی رہی یہاں تک کہ وہ پگھل کر سرخ اور نیلے رنگ کے محلول میں تبدیل ہوگئی۔ پھر اس کی نگاہ پیناٹا پر گئی جو ابھی تک درخت میں لٹکا ہوا تھا۔ ''بہت پیارا گدھا ہے۔'' اس نے کہا۔
''گدھا؟'' مارسیلا نے اپنا ہونٹ کاٹ لیا۔ ''میں سمجھ رہی تھی کہ یہ ایک گھوڑا ہے۔''
''اس گھوڑے کا ایک سینگ ہوتا ہے۔''
مارسیلا اپنی غلطی کے باوجود مسکرادی۔ ''کیا تم اس پر ہٹ لگانا چاہوگی؟'' اس نے سوچا کہ شاید اس طرح لوسی اپنی تکلیف بھول جائے۔
''چھڑی کہاں ہے؟''
مارسیلا نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ اسے ایک چھڑی بھی خریدنی چاہیے تھی۔ اس نے صحن میں نظر دوڑائی تو باڑ کے ساتھ ایک جھاڑو رکھی دیکھی۔ ''اس سے کام چل جائے گا۔'' اس نے کہا، پھر وہ صحن پار کر کے گئی۔ اس نے جھاڑو اٹھائی اور واپس لوسی کے پاس آگئی۔
لوسی نے جھاڑو نہیں گھمائی۔ اس کے بجائے اس نے اپنی گڑیا اٹھائی اور اس کے بالوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرنے لگی جس میں اسے ناکامی ہوئی۔ اس کے کندھے جھک گئے اور مارسیلا کے حلق میں ایک گولا سا اٹک گیا۔
وہ سوچنے لگی کہ اسے کچھ کرنا چاہیے۔ وہ آن لائن آرڈر دے کر بھی دوسری گڑیا منگوا سکتی تھی لیکن جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ کوئی دوسری باربی اس کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ اس گڑیا میں اس کی جان تھی۔ وہ اس کی ماں کی نشانی تھی۔ دوسری گڑیا کے آنے سے لوسی خوش نہیں ہوگی البتہ اگر اسی گڑیا کو ٹھیک کردیا جائے تو وہ مطمئن ہوسکتی ہے۔
''نہانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' مارسیلا نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ ''گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد میں ہمیشہ اپنے آپ کو بہتر محسوس کرتی ہوں۔''
اس نے سوچا کہ جب لوسی نہانے جائے گی تو وہ اس کی گڑیا کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرے گی۔
''ٹھیک ہے۔'' لوسی نے کہا۔ اس کے جواب میں گرمجوشی نہیں تھی۔ اس نے گڑیا کو میز پر چھوڑا اور اندر چلی گئی۔ مارسیلا بھی اس کے پیچھے گئی۔ وہ کچن سے گزرتی ہوئی ہال کی طرف گئی جہاں ان کے بیڈروم تھے لیکن اپنے باتھ روم میں جانے کے بجائے لوسی اپنی ماں کے بیڈروم میں چلی گئی جس کے ساتھ ماسٹر باتھ روم تھا۔ اسی جگہ صبح ان کے درمیان معاملہ شروع ہوا تھا۔

اس باتھ روم میں ایک دیوار کے ساتھ الماری، سنک اور ٹب جبکہ دوسری دیوار کے ساتھ ٹوائلٹ تھا۔ مارسیلا نے شاور کا پردہ برابر کیا اور نل کھول دیا۔ جب پانی گرم ہو گیا تو اس نے نل کا پائپ ٹب میں لگا دیا اور وہ بھرنا شروع ہو گیا۔

وہ وہاں سے جانا چاہ رہی تھی تا کہ لوسی کو تنہائی میسر آ جائے لیکن پہلے اسے لوسی کا زخم دیکھنا تھا۔ ''کیا خیال ہے، میں تمہاری کہنی پر ایک نظر ڈال لوں؟''

لوسی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔''

''ہمیں اس کی صفائی کرنی ہوگی۔''

لوسی نے الماری کی طرف دیکھا۔ مارسیلا سوچنے لگی کہ کیا وہ اسے نظر انداز کر کے الماری میں چڑھنا چاہ رہی ہے، وہی صبح والی حرکت۔

لیکن لوسی نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سر ہلا دیا۔ مارسیلا نے بینڈ ایج کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس کا ایک کنارہ کھینچنے لگی۔

لوسی کا منہ بن گیا۔ ''اس میں تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔

مارسیلا نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور بینڈ ایج کو زور سے کھینچا لیکن لوسی کی چیخیں اس سے برداشت نہ ہو سکیں اور اس نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''ہم کوئی دوسرا طریقہ دیکھتے ہیں۔''

لوسی اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی۔ مارسیلا نے آگے بڑھ کر دواؤں کا کیبنٹ کھولا لیکن وہاں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ جس طرح اس نے ورکشاپ میں کار کے بمپر سے اسٹیکر اتارے تھے، اسی طرح وہ گرم کر کے لوسی کی بینڈ ایج کو ڈھیلا کر سکتی ہے۔

اس نے ایک ڈرائر تلاش کیا اور اس کی لمبی تار دیوار میں نصب ساکٹ میں لگا دی۔ پھر اس نے نیٹ پر لوسی کا پسندیدہ شو تلاش کیا اور اپنا سیل فون باتھ روم کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ڈرائر چلا کر اس نے گرم ہوا لوسی کے ہاتھ پر پھینکی۔

''اس سے بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔ جب تم شو دیکھ رہی ہوگی تو میں تمہاری بینڈ ایج کو گرم ہوا لگاؤں گی۔ جب اس کا گوند گرم ہو جائے گا تو یہ آسانی سے اتر جائے گی۔''

لوسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی پوری توجہ شو پر تھی۔ چند منٹ بعد اس کی بینڈ ایج اتر چکی تھی۔ مارسیلا نے اس جگہ کا معائنہ کیا، وہ اب ٹھیک تھی البتہ لوسی کو جس مذاق کا نشانہ بننا پڑا وہ غالباً زیادہ تکلیف دہ تھا۔

مارسیلا نے ڈرائر کو سنک پر رکھا، پانی کا نل بند کیا اور شاور کا پردہ کھینچ کر برابر کر دیا۔ پھر اس نے کیبنٹ سے ایک تولیا نکالا اور بولی۔ ''اگر تمہیں میری ضرورت ہو تو آواز دے لینا۔'' اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تا کہ لوسی کی آواز سن سکے، پھر وہ عقبی صحن میں آئی اور اپنے دوسرے کام میں مصروف ہو گئی۔

اس نے گڑیا کو میز پر رکھ کر کام شروع کر دیا۔ پہلے ٹوتھ پیسٹ لگا کر اس کے کانوں پر سے رگڑ کے نشان صاف کیے البتہ اس کے بالوں کو سنوارنا کافی مشکل تھا۔ وہ بار بار برش سے انہیں سیدھا کرتی لیکن وہ پہلے سے زیادہ خراب ہو جاتے۔ اس نے گڑیا میز پر رکھ دی اور دوسرے امکانات کے بارے میں سوچنے لگی لیکن کسی نئے آئیڈیا کے بجائے اسے غصہ آنے لگا۔ اسے اپنی بہن پر غصہ تھا جو لوسی کو اس کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ وہ اس لڑکے پر بھی غصہ کر رہی تھی جس نے اسکول میں لوسی کو تنگ کیا۔ یہاں تک کہ اسے اس بغیر سینگ کے گھوڑے پر بھی غصہ آ رہا تھا جو درخت پر لٹکا ہوا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

مارسیلا نے جھاڑو اٹھائی اور اسے گھما کر پیناٹا پر زوردار ضرب لگائی، پھر دوسری، تیسری۔ وہ مسلسل جھاڑو گھماتی رہی جب تک کہ پیناٹا پھٹ نہیں گیا۔ وہ امید کر رہی تھی کہ اس میں سے کینڈی اور کھلونے نکلیں گے لیکن اس کے بجائے پاؤڈر کی چھوٹی تھیلیاں زمین پر بکھر گئیں۔

مارسیلا نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ پارٹی اسٹور میں اس نے جو گفتگو سنی تھی وہ اس کے دماغ میں گونجنے لگی۔ اپنی کسی ایسے کام میں ملوث تھی جس میں بہت زیادہ خطرہ تھا، جو اسے جیل پہنچا سکتا تھا یا اس کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

''اوہ میرے خدا!'' وہ منشیات کی اسمگلنگ کر رہی تھی اور مارسیلا کے صحن میں بھی منشیات بکھری ہوئی تھی۔

اسے پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ اس نے فون کرنا چاہا لیکن وہ اس کی جیب میں نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنا سیل فون لوسی کو دیا تھا۔ وہ ابھی تک اس کے پاس ہی تھا۔ مارسیلا فون لینے مکان میں گئی۔ جب وہ کچن میں پہنچی تو اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کون ہو سکتا ہے؟ کوئی وکیل یا بدمعاش جو اس منشیات کی تلاش میں ہو۔

اسے اس گھنٹی کو نظر انداز کر دینا چاہیے اور باتھ روم سے فون اٹھا کر پولیس کو کال کرے، پھر اچانک ہی اسے

خیال آیا کہ کیا پولیس کو فون کرنا درست ہوگا؟
کیا پولیس اس کی کہانی پر یقین کرے گی؟
اگر نہیں تو پھر لوسی کا کیا ہوگا؟
گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ دروازے کی طرف گئی اور کی ہول سے جھانکا۔ وہاں روسو کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس کے برابر ہی ایک اور پیناٹا رکھا ہوا تھا۔
کیا روسو، اپنی کا پیغام لے کر آیا تھا یا وہ بھی منشیات کے کاروبار میں شامل تھا؟
''میڈم!'' روسو نے دروازہ بجایا۔ ''میں نے تمہاری کار ڈرائیو وے میں دیکھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم گھر میں موجود ہو۔''
مارسیلا نے دروازہ کھول دیا۔ جیسے ہی روسو نے اندر قدم رکھا تو مارسیلا نے دیکھا کہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ وہی جسے اس نے پارٹی اسٹور میں دیکھا تھا اور جس کی کلائیوں پر ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔
مارسیلا کی سانس رکنے لگی اور اس آدمی کا تعلق سمجھ میں آ گیا۔ مارسیلا نے غلطی سے وہ پیناٹا اٹھا لیا جو اس کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس کی بانہوں پر جو ہندسے لکھے ہوئے تھے، وہ تین اور ایک نہیں بلکہ ایک اور تین تھے۔ وہ شخص ایم ایس تیرہ گینگ کا رکن تھا جو منشیات کا کاروبار کرتا تھا۔
وہ روسو سے مخاطب ہوا۔ ''اگر اس نے پولیس کو فون کر دیا ہو؟''
''کیا تم نے کسی پولیس والے کو دیکھا؟''
''اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے پولیس کو فون نہ کیا ہو۔'' اس آدمی نے کہا اور ایک چاقو نکال کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن روسو نے اس کا راستہ روک لیا۔
''اس طرح نہیں دوست۔ اندر ایک بچی بھی ہے۔''
''تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے بچوں کی پروا نہیں؟''
''میں جانتا ہوں۔ میں اور مارسیلا اس کا حل نکال سکتے ہیں۔'' روسو نے گہری سانس لی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس آدمی نے چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔
مارسیلا کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ برآمد ہوئی۔
اس آدمی نے روسو کو ایک طرف دھکیلا۔ اپنی گن نکالی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔
''لوسی!'' مارسیلا نے ہال کی طرف دوڑ لگائی۔ اس کے قدم بھاری ہو رہے تھے۔ باتھ روم اسے کوسوں دور لگ رہا تھا۔ دروازہ چرچرانے کی آواز آئی۔ اس کے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ وہ وقت پر لوسی تک پہنچ سکے۔ وہ آدمی کسی بھی لمحے اندر آ سکتا تھا اور وہ ہال میں بھی نہیں رک سکتی تھی۔ اس کے لیے ایک مسلح شخص سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسے کہیں چھپ جانا چاہیے تاکہ لوسی کی حفاظت کے لیے کوئی دوسرا طریقہ سوچ سکے۔ اس نے ہال کی الماری کھولی اور اس میں دبک کر بیٹھ گئی۔ الماری کا دروازہ اس نے مضبوطی سے بند کر دیا۔
ایک اور آواز آئی۔ بیرونی دروازہ کھل گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ شخص عقبی صحن میں پیناٹا کو دیکھ لے۔ منشیات کی تھیلیاں اٹھائے اور چلا جائے لیکن وہ شخص عقبی صحن میں جانے کے بجائے اس کی طرف آ رہا تھا۔
مارسیلا کے پورے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس وقت اسے ایک ہتھیار کی ضرورت تھی جس سے وہ لوسی کا دفاع کر سکے۔ اس نے الماری کا جائزہ لیا لیکن اسے وہاں صرف اپنی بہن کا جم بیگ نظر آیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈال کر اسے ٹٹولنا شروع کیا۔ اس میں جوتے، موزے اور ایک تالا رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک موزہ نکالا اور اس میں تالا ڈال دیا۔
اس کے قدموں کی آواز بالکل قریب آ گئی تھی۔ الماری اور فرش کے درمیانی خلا سے اس کے جوتے نظر آ رہے تھے۔ مارسیلا نے موزے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی لیکن اس شخص نے کوئی حرکت نہیں کی۔
مارسیلا نے اپنی سانس روک لی۔ اس کی آنکھیں اس کے جوتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ شخص کس بات کا انتظار کر رہا ہے۔ پھر اس کے کانوں میں ایک گانے کی آواز آئی جو اس کے سیل فون پر بج رہا تھا۔
وہ شخص ہال میں آگے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کا رخ ماسٹر بیڈ روم کی طرف تھا جس کے باتھ روم میں لوسی موجود تھی۔ مارسیلا نے موزہ اپنے ہاتھ کے گرد لپیٹا اور آہستہ سے الماری کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔
اس کے سامنے ماسٹر بیڈ روم تھا اور وہ آدمی پہلے ہی دروازے سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھتی رہی۔ اس نے اپنی سانس روک رکھی تھی۔ اس کے پاس ایک ہی موقع تھا کہ وہ اس آدمی پر اچانک حملہ کر دے۔
اس شخص نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور شاور کے پردے کی جانب بڑھا۔ مارسیلا نے پوری قوت سے موزہ گھمایا اور تالا اس آدمی کے سر پر جا کر لگا۔ وہ لڑکھڑایا اور اس کے ہاتھ سے گن گر گئی۔ مارسیلا نے ایک بار پھر موزہ

گھمایا۔ وہ شخص آگے کی جانب گرا۔ شاور کا پردہ الگ ہو گیا اور وہ ٹب میں جا گرا۔

مارسیلا توقع کر رہی تھی کہ لوسی کی چیخ سنائی دے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے موزہ ایک طرف پھینکا اور ٹب کی جانب بڑھی۔ وہ شخص اوندھے منہ شاور کے پردے پر پڑا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ پانی میں نیچے جا رہا تھا۔ مارسیلا نے اس کی جینز کی بیلٹ پکڑی اور پوری قوت سے اسے ایک طرف کھینچنے لگی لیکن اسی وقت کیبنٹ کا دروازہ کھلا۔ لوسی اس کی پشت پر کھڑی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"شکر ہے خدا کا۔" مارسیلا نے اس آدمی کو چھوڑ دیا اور لوسی کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"

لوسی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مارسیلا کا سیل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ "میں اس ایپی سوڈ کا اینڈ دیکھنا چاہ رہی تھی۔ یہ میرا پسندیدہ شو ہے۔ پھر میں نے آواز سنی اور ڈر گئی......"

"تم اب بالکل محفوظ ہو۔" مارسیلا نے اسے یقین دلانا چاہا لیکن اسے خود اس بات کی سچائی پر یقین نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ اس شخص کے دوسرے ساتھی بھی آ رہے ہوں۔ وہ جلد از جلد لوسی کو یہاں سے نکالنا چاہ رہی تھی۔

اس نے اس شخص پر پھینکنے کے لیے نہانے کا تولیا اٹھایا تاکہ اس کی لاش چھپ جائے لیکن وہ شخص زندہ تھا اور اس نے ابھی تک اپنے ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا تھا۔ اس نے ٹب سے اٹھنے کی کوشش کی۔

مارسیلا نے لوسی کو کیبنٹ سے باہر نکالا اور اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ "بھاگو!"

لوسی نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کے پاؤں زمین پر جم گئے تھے۔ وہ شخص تقریباً اوپر اٹھ چکا تھا۔ لوسی نے ایک چیخ ماری۔ مارسیلا کی نظر سنک پر رکھے ہوئے ڈرائر پر گئی۔ اس کا پلگ ابھی تک ساکٹ میں لگا ہوا تھا۔ مارسیلا نے اسے اٹھایا اور سوئچ آن کر دیا۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ اس کی تار ٹب تک پہنچ جائے۔ پھر اس نے وہ ڈرائر پانی میں اچھال دیا۔ سوئچ چلتے ہی اس آدمی کے جسم کو جھٹکا لگا۔ اس کے بازو اور ٹانگیں اکڑ گئیں۔ چند لمحوں میں وہ بے جان ہو گیا تھا۔

مارسیلا نے لوسی کا ہاتھ پکڑا اور ہال کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے دور جانا چاہ رہی تھی۔ وہ دونوں بیرونی دروازے تک پہنچیں جو تقریباً چوکھٹ سے الگ ہو چکا تھا۔ روسو ابھی تک پورچ میں موجود تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ چاقو پر تھے اور اس کی انگلیوں سے خون بہہ کر زمین پر گر رہا تھا۔

مارسیلا یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ وہ لوسی سے کہنا چاہ رہی تھی کہ اپنی آنکھیں بند کر لے لیکن وہ پہلے ہی اپنا چہرہ اس کے کندھے پر رکھ چکی تھی۔

"مارسیلا!" روسو نے اسے پکارا۔

وہ سوچنے لگی کہ یہ شخص اس پر کتنا مہربان ہے۔ اس نے کس طرح اس بدمعاش کو روکنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ اس کے حلق میں ایک گولا سا پھنس گیا۔ وہ اس کے پاس سے گزری اور ڈرائیو وے کی طرف جانے لگی۔

اس نے لوسی کو کار میں بٹھا کر پولیس کو فون کیا تاہم اس نے وہاں رکنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے اس نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور کار ڈرائیو وے سے باہر جانے لگی۔ اس نے پیچھے مڑ کر پورچ کی طرف دیکھا۔ روسو تکلیف کی شدت سے دہرا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو قصوروار محسوس کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اس کو مرنے دیا تو وہ اس احساس کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکے گی۔

اس نے کار کھڑی کر دی۔ "کیا ہوا؟" لوسی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے کار کا دروازہ کھولا۔

"وہاں مت جاؤ آنٹی......" لوسی نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ پولیس پہنچنے والی ہے۔"

وہ پورچ کی طرف جانے لگی۔ روسو اسی پوزیشن میں تھا جس میں وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کی سانس ناہموار ہو گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے جھک گئی اور اس کی قمیص اتارنے لگی۔ اس کے باوجود کہ چاقو ابھی تک اس کے جسم میں پیوست تھا۔ وہ خون روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"مجھے افسوس ہے۔" وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس نے اپنی کو دھمکی دی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہم پینانا تبدیل کر لیتے ہیں۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ ایسا ہو۔"

"مجھے تم پر یقین ہے۔" مارسیلا نے کہا۔

پولیس سائرن کی آواز قریب آ گئی تھی۔ مارسیلا نے ڈرائیو وے کی طرف دیکھا۔ لوسی کار کی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔

"مارسیلا!" روسو نے کہا۔ اس کی آواز اب سرگوشی میں بدل گئی تھی۔

وہ اس کے اور قریب ہو گئی۔ "میری پائنز کے جسم پر ٹیٹوز نہیں تھے لیکن شاید ہونے چاہییں تھے۔"

مارسیلا نے دوبارہ لوسی کی طرف دیکھا۔ وہ کار میں محفوظ تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ ایمبولینس بلانے کے لیے فون کرنے لگی۔

⌘⌘⌘⌘

ٹوٹی کرچیاں سمیٹنے والی ایک شعلہ صفت حسینہ کے

بکھرتے خوابوں اور بڑھتے عذابوں کی دلگداز داستان

ویسے تو انسان کا دل بہت بڑا ہوتا ہے... محبت کرنے والوں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے ڈالتا ہے مگر عشق میں وہ کسی طور شراکت قبول نہیں کرپاتا کیونکہ ... محبتوں کے اتنے رشتوں میں وہ ایک رشتہ صرف اپنے لیے مخصوص کرلیتا ہے مگر ... جب دوسری جانب سے اس چاہت کا حسبِ خواہش نتیجہ نہیں نکل پاتا تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس نے کیا ... وہ جو کبھی خوابوں اور وعدوں پر یقین نہیں کرتی تھی جانے کیسے بہ زبانِ خاموشی وہ اسے اپنے من مندر کا دیوتا بنا بیٹھی ... وہ خونخوار مزاج کی مالک جانے کیسے چپکے سے دل ہار بیٹھی ... ایسے میں بے وفائی کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے لیکن وہ بھنورا صفت اس کے گمان سے بھی پہلے اپنے نئے راستوں کا تعین کر بیٹھا اور بھول گیا کہ اس کا ساتھ ہی تو اس کی زندگی بن گیا تھا ... جب ساتھ نہ رہا تو سانس کیسے باقی رہ جاتی۔

دوسرا فائر

نشور ہادی





شارق کو اچانک اپنی اسکوٹر میں بریک لگانے پڑے ورنہ حادثہ ہو جاتا۔ اپارٹمنٹس کی عمارت سے ایک لڑکی نکل کر اچانک سامنے آ گئی تھی۔ نہایت خوب رو اور اسمارٹ، جینز اور شرٹ میں ملبوس تھی۔ شارق کو وہ عجوبہ سی لگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہاکی بھی تھی لیکن اس کا انداز جارحانہ نہیں تھا یعنی اس کے انداز سے یہ نہیں لگا تھا کہ وہ ہاکی سے شارق کا سر پھاڑ دے گی۔

''اچانک سامنے آ گئی تھیں آپ!'' شارق نے کہا۔

''میرا کوئی قصور نہیں ہے اس میں۔''

''آپ کا قصور دوسرا ہے۔'' وہ اسکوٹر کے پہلو میں آ گئی۔ ''اتنی سی اسکوٹر ہے۔''

شارق کو اس لڑکی کی دلکشی اور اسمارٹنس نے متاثر کیا تھا۔ وہ اسکوٹر سے اترا لیکن ایک ہینڈل پکڑے رہا۔

اس علاقے میں تیسرے پہر کے قریب تقریباً سناٹا رہتا تھا۔ شارق کے اترتے ہی لڑکی اسکوٹر کی گدی پر بیٹھ گئی۔

''پیچھے بیٹھ جایئے۔'' وہ بولی۔

''کیا ارادہ ہے محترمہ؟'' شارق مسکرایا۔

''میں آپ کو آپ کا قصور بتانا چاہتی ہوں۔''

شارق نے بے پروائی سے اپنے شانے جھٹکے اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''ذرا یہ سنبھالیں۔'' اس نے ہاکی شارق کی طرف بڑھائی۔ شارق نے ہاکی سنبھال لی۔ اب وہ بہرحال دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خوب صورت لڑکی آخر کرنا کیا چاہتی ہے۔ اسکوٹر کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔

''سنبھل کر بیٹھ گئے؟'' [illegible] بولی۔

''جی!'' شارق کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اسکوٹر اتنی تیزی سے حرکت میں آئی کہ شارق اگر سنبھل کر نہ بیٹھا ہوتا تو گر ہی پڑتا۔

''مائی گاڈ!'' شارق کے منہ سے نکلا۔ ''اسکوٹر کو اتنی تیزی سے حرکت میں نہیں لانا چاہیے۔''

''تو پھر آدمی کو اسکوٹر کے بجائے گدھا گاڑی خریدنا چاہیے۔''

اسکوٹر کی رفتار بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

شارق اس وقت فرصت سے تھا۔ اسے عجلت نہیں تھی پھر ایک خوب صورت لڑکی کا قرب۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے۔

''یہ علاقہ بڑا بے ہودہ ہے۔'' لڑکی بولی۔ ''میں پانچ چھ منٹ سے بالکونی میں کھڑی تھی کہ کوئی ٹیکسی نظر آئے تو اسے رکنے کا اشارہ کروں لیکن نظر ہی نہیں آئی۔ پھر جناب کی اسکوٹر دکھائی دی۔ ایسی اسکوٹر جو گدھا گاڑی سے کچھ ہی تیز چل رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں تیزی سے اتروں گی تو اسکوٹر یہاں سے آگے نہیں نکلی ہو گی۔''

''تو آپ لفٹ لینا چاہتی تھیں؟'' شارق لڑکی کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''میں لفٹ لینے یا دینے کی قائل ہی نہیں ہوں۔'' لڑکی کا لہجہ خشک تھا۔ شاید اس نے منہ بھی بنایا ہو۔

لڑکی پھر بولی۔ ''میں آپ کو آپ کا قصور بتانا چاہتی تھی۔''

''وہ کیا ہے؟'' شارق نے لطف لیا۔

''اسکوٹر اور گدھا گاڑی کا فرق سمجھ میں آیا آپ کو......؟ اسکوٹر ہو تو اس طرح چلانا چاہیے۔''

''یہ اسکوٹر ہے جس کے پھسلنے میں دیر نہیں لگتی۔''

''کیا اب تک پھسلی؟''

''آپ کو خاصی مہارت ہے۔''

''جب اتنی مہارت حاصل کر لیں تو اسکوٹر چلائیں ورنہ گدھا گاڑی خرید لیں۔''

''مشورے کا شکریہ، لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ مجھے لے جا کہاں رہی ہیں؟''

''بس، قریب آ گئی میری منزل۔'' لڑکی نے کہا۔ ''ایک پنتھ دو کاج کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟''

''جی!''

''تو بس یہ ہوا ہے۔ آپ کو اسکوٹر کے بارے میں بھی سمجھا دیا اور اپنی منزل پر بھی آ گئی۔'' اس نے بریک لگائے۔ اب شارق نے دیکھا کہ وہ اس ہاکی کلب کے سامنے رکی تھی جو حال ہی میں کھولا گیا تھا۔

''بس۔'' وہ اسکوٹر سے اترتے ہوئے بولی لیکن ایک ہینڈل پکڑے رہی۔ ''اب سنبھالیے آپ اپنی اسکوٹر اور میری ہاکی مجھے دیجیے۔''

شارق نے اس کی ہاکی دیتے ہوئے اسکوٹر سنبھال لی۔

لڑکی تیزی سے ہاکی کلب کی طرف بڑھی۔

شارق نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ ''میری اسکوٹر سے آپ اپنی منزل پر آئیں لیکن شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔''

اس نے رک کر صرف سر پیچھے گھمایا اور بولی۔ ''شکریہ تو آپ کو ادا کرنا چاہیے۔ اسکوٹر اور گدھا گاڑی کا فرق سمجھایا ہے آپ کو میں نے۔''

وہ دوبارہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اب اگر شارق کچھ کہتا تو درمیانی فاصلہ زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اس کو بہت بلند آواز میں بولنا پڑتا جو اس لیے بھی مناسب نہیں تھا کہ

دو چار لڑکیاں وہاں اور بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

'اس سے دوبارہ ملنا چاہیے۔' شارق نے اسکوٹر حرکت میں لاتے ہوئے سوچا۔'اس کا اپارٹمنٹ بھی دیکھ لیا ہے اور ہاکی کلب بھی ...... یہاں کے دو ایک چکر لگائے جائیں گے تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔'

وہ تین میل کا فاصلہ طے کر کے شہر کے ایک پوش علاقے میں داخل ہوا اور پھر ایک خوب صورت بنگلے کے سامنے اسکوٹر روکی۔

''سلام صاب!'' چوکیدار اسے پہچانتا تھا۔''لیکن سلامت صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔''

شارق نے لاحول پڑھ کر جیب سے موبائل نکالا اور سلامت سے رابطہ کیا۔

''ہاں شارق!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کہاں ہو؟''

''میں تو تمہارے گھر کے پھاٹک پر ہوں۔ یہ بتاؤ کہ چھٹی کے دن میرے بغیر کہاں بھٹک رہے ہو؟''

''یار، وہ کار میں کچھ خرابی ہوگئی تھی،ٹھیک کرانے لایا تھا۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ اس میں تو بہت کام ہے۔ کل شام سے پہلے ٹھیک نہیں ہوگی۔''

''ستیا ناس...... ارے اس کھٹارا سے جان چھڑاؤ اب۔ انکل سے کہو کہ نئی کار دلوائیں۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا واقف نہیں ہو ڈیڈی کے مزاج سے؟ اتنے لمبے خرچ کی بات کرو تو انہیں اچھو لگ جاتا ہے...... ویسے یہ کار ہی دھوکے باز نکلی۔ جب فرسٹ ائر میں تھا تب ہی تو نئی لی تھی۔ اب اتنی جلدی تو......''

''اچھا چھوڑو۔'' شارق نے اس کی بات کاٹی۔ ''آج کا پروگرام تو گیا بھاڑ میں...... اب کل کہاں ملاقات ہوگی؟''

''کل مجھے یونیورسٹی بھی ٹیکسی سے جانا پڑے گا۔ پھر واپسی پر بھی......''

''میں آجاؤں تمہیں لینے؟'' شارق نے پھر اس کی بات کاٹی۔

''اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے...... پھر نکل چلیں گے کہیں۔''

شارق نے ماؤتھ پیس چوما اور موبائل جیب میں ڈال کر اسکوٹر اسٹارٹ کی۔ تفریحی پروگرام میں وہ اور سلامت ساتھ ہی ہوتے تھے۔ بچپن کی دوستی تھی۔ دونوں کے والد بزنس مین تھے لیکن شارق کے والد کو ایمان داری کا ایسا مالیخولیا ہوا کہ وہ ترقی نہ کر سکے لیکن سلامت کے والد نے ''وقت کے تقاضوں'' کو خوب سمجھا۔ خوب ترقی کی لیکن کنجوس بھی خوب تھے۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں جا لیٹا۔ وہ ایک ناول مکمل کرنا چاہتا تھا جو ادھورا رہ گیا تھا۔ جیسے ہی ناول میں ایک نئی لڑکی کے کردار کا اضافہ ہوا، اسے وہ تیز طرار لڑکی یاد آگئی جس نے اسے گدھا گاڑی اور اسکوٹر کا فرق سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

شارق کافی دیر تک اس کے خیالوں میں کھویا رہا اور سوچتا رہا کہ اب اس سے کہاں اور کس طرح آمنا سامنا کیا جائے۔

ان دنوں امتحانات نہ صرف ختم ہو چکے تھے بلکہ دو دن پہلے نتائج بھی آ گئے تھے۔ تمام درس گاہیں بند تھیں لیکن اگلے دن سلامت کی یونیورسٹی میں کوئی فنکشن تھا۔ سلامت کو اس میں شرکت کرنا تھی۔ اس کی یونیورسٹی میں ویسے بھی ڈیڑھ دو مہینے میں کوئی نہ کوئی فنکشن ہوا کرتا تھا۔

شارق سیکنڈ ائیر کلیئر کر چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سلامت ہی کی یونیورسٹی میں داخلہ لے۔

☆☆☆

سلامت بتا چکا تھا کہ فنکشن کس وقت ختم ہوگا لہٰذا اس سے دو چار منٹ پہلے ہی شارق اسے لینے پہنچ گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے آدھے گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ فنکشن کچھ دیر سے ختم ہوا تھا۔

لڑکے لڑکیاں باہر نکلنے لگے۔ اس ہجوم میں شارق کو نہ صرف سلامت بلکہ گدھا گاڑی اور اسکوٹر کا فرق بتانے والی لڑکی بھی نظر آ گئی۔

زیادہ تر لڑکے لڑکیاں باتیں کرتے ہوئے نکل رہے تھے لیکن وہ لڑکی کسی سے بات نہیں کر رہی تھی۔ اس کی چال میں بھی انداز تفاخر تھا۔ وہ بڑی تمکنت سے قدم اٹھا رہی تھی۔

شارق خوش ہو گیا کہ داخلے سے پہلے ہی اس لڑکی کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لے گا۔ وہ سلامت کے دائیں ہاتھ کی طرف چل رہی تھی لیکن نہ سلامت اس کی طرف دیکھ رہا تھا، نہ لڑکی اس کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے خبر رہے ہوں۔

سلامت نے شارق کو دیکھا اور تیر کی طرح اس کی طرف آیا۔ فوراً ہی گدی پر بیٹھا اور شارق کے کندھے پر تھپکی دے کر بولا۔''نکل چل پیارے!''

''وہ لڑکی کون ہے؟'' شارق نے جاتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ!'' سلامت ہنسا۔ ''مینٹل کیس ہے۔ مغرور بھی بہت ہے حالانکہ اس کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے نہیں ہے۔''

''مینٹل کیس کس اعتبار سے؟'' شارق نے پوچھا۔

''اسکوٹر تو آگے بڑھا۔ کسی ریسٹورنٹ میں ملک شیک پیتے ہوئے سوچیں گے کہ آج کیا پروگرام بنایا جائے۔''

شارق اسکوٹر حرکت میں لایا۔ وہ لڑکی بھی ہجوم میں غائب ہو چکی تھی۔

ایک ریسٹورنٹ میں ملک شیک کا آرڈر دینے کے بعد شارق نے سلامت سے کہا۔ ''ہاں اب بتا اس گدھا گاڑی اور اسکوٹر والی کے بارے میں۔''

''کیا!'' سلامت حیرت سے بولا۔ ''اسکوٹر اور گدھا گاڑی؟''

''لاحول۔'' شارق نے اپنا سر جھٹکا۔ ''کل کا واقعہ ذہن پر سوار ہو گیا ہے میرے۔''

''صاف صاف بات کر و میری جان۔''

''یار! کل ہی میرا اس لڑکی سے پھڈا ہو چکا ہے۔''

''کیسے؟''

شارق نے ہنس ہنس کر سارا واقعہ دہرا دیا۔

واقعہ سن کر سلامت بھی ہنس پڑا اور بولا۔ ''پھر بھی تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مینٹل کیس کا کیا مطلب......؟ کیا یہ سارا واقعہ ہی ظاہر نہیں کرتا کہ روحی کا دماغ کھسکا ہوا ہے؟''

''کھسکا ہوا دماغ؟'' شارق نے سوالیہ انداز میں کہا پھر نفی میں سر ہلا کر کہنے لگا۔ ''نہیں......! یہ تو میں نہیں مانتا۔'' پھر ہنسا۔ ''میں اسے بس ایک ایکسٹرا گرل کہوں گا۔''

''خیر! تم جو چاہو کہو۔ جیسی ایکٹیویٹی اس نے تمہارے ساتھ کی ہے، ویسی ہی ایکٹیویٹی اس نے میرے ساتھ بھی کی تھی۔''

''وہ کیسے؟''

''ایک دن میں یونیورسٹی سے روانگی کے لیے کار اسٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور مجھ سے بولی، ذرا دوسری سیٹ پر کھسکیں آپ! میں نے چپ چاپ اس کی بات مان لی اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے انجن اسٹارٹ کرنے کے ساتھ ہی دروازہ بھی بند کر دیا۔''

''تم نے کچھ نہیں کہا اس سے؟'' شارق نے مزہ لینے کے سے انداز میں مسکرا کر کہا۔

''شامت بلواتا اپنی؟''

''کیوں؟ کیسے؟''

''اگر میں کچھ کہتا تو بات بڑھتی اور شاید مجھے اپنی پیشانی پر فنگر ڈیگر ریسیو کرنی پڑتی۔''

''فنگر ڈیگر......؟ یہ کیا چیز ہے؟''

''مارشل آرٹ کی ایک اصطلاح ہے۔'' سلامت نے بتایا۔ ''دو انگلیاں سیدھی اور سخت کر کے مخالف کی آنکھوں پر ماری جائیں تو اس کی آنکھیں ہی پھوٹ جائیں۔ خیر وہ میری آنکھوں پر تو نہیں لیکن پیشانی پر تو مار ہی دیتی اور میں کئی دن تک دردِ سر کا شکار رہتا۔''

''مار پیٹ بھی کرتی ہے......؟ مارشل آرٹ بھی......''

''جوڈو کراٹے میں اس نے بلیک بیلٹ تو نہیں لیکن کوئی بیلٹ ضرور لی ہے۔ دو مرتبہ ہم لوگ اس کو فلائنگ کک چلاتے ہوئے بھی دیکھ چکے ہیں۔ دو لڑکوں کی پٹائی اس نے اس لیے کی تھی کہ انہوں نے اس سے اظہارِ محبت کرنے کی کوشش کی تھی...... اور تو اور ہمیشہ ٹاپ کرتی رہی ہے لیکن تھرڈ ائیر میں فیل بھی ہوئی ہے۔''

''جب تعلیمی میدان میں اتنی تیز ہے تو فیل کیسے ہو گئی......؟''

''زیادہ تر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر فیل ہوئی تھی۔''

''کیوں؟''

''وہ زیادہ سے زیادہ وقت تعلیمی چار دیواری میں رہنا چاہتی ہے تاکہ اس کی شادی کے سلسلے میں اس کے والدین اس پر زیادہ دباؤ نہ ڈال سکیں۔ ابھی تو وہ یہ کہہ کر ٹالتی رہتی ہے کہ پہلے تعلیم تو مکمل کر لوں۔''

''یعنی وہ شادی بھی نہیں کرنا چاہتی؟''

''سنا تو یہی ہے۔''

''اچھا ان باتوں میں تمہاری بات تو رہ گئی۔''

''کون سی بات؟''

''اس نے تمہاری کار سنبھال لی تھی۔''

''ارے ہاں! بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ اس دن تو میری جان ہی آدھی نکل گئی تھی۔ اتنی فاسٹ ڈرائیونگ کرتی ہے کہ خدا کی پناہ......! نہ صرف فاسٹ بلکہ ریش بھی...... کئی مرتبہ مجھے ایسا لگا کہ بس ہوا اب ایکسیڈنٹ لیکن ہر مرتبہ وہ بڑی صفائی سے کار نکال لے گئی۔ اسپیڈومیٹر کی سوئی پچاس ساٹھ سے کم پر تو میں نے دیکھی ہی نہیں، البتہ نوّے سے آگے بڑھتی ہوئی کئی بار دیکھی تھی۔''

''بات کہاں جا کر ختم ہوئی؟'' شارق مزے لے رہا تھا۔

''اپارٹمنٹس کی ایک عمارت کے سامنے کار روکی تھی اس نے اور یہ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی تھی کہ ایسے چلاتے ہیں

کار...... مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ▪ رہتی بھی اسی عمارت کے ایک اپارٹمنٹ میں ہے۔"

"واہ!" شارق نے بے ساختہ کہا۔ "اس قسم کی ایکٹیویٹی میں اس کا ایک مقصد بھی ہوتا ہے۔ اس دن وہ کسی وجہ سے گھر پہنچنے کی جلدی میں ہوگی، سو یہ حرکت کر بیٹھی اور میرے معاملے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے ہاکی کلب جانے کے لیے ٹیکسی نہیں مل رہی تھی اس لیے اس نے مجھے اسکوٹر اور گدھا گاڑی کا فرق سمجھا ڈالا۔"

"ہاکی کی ▪ اچھی کھلاڑی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ معمولی کھلاڑی ہے لیکن کلب پابندی سے جاتی ہے۔ اسے لڑکیوں کی ٹانگوں میں ہاکی اڑا کر انہیں گرانے کا شوق بھی ہے لیکن یہ حرکت وہ کرتی بڑی صفائی سے ہے۔ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔"

"انٹرسٹنگ۔" شارق نے سر ہلایا۔ "تب تو یہیں داخلہ لوں گا ہر قیمت پر۔"

"روحی کی وجہ سے؟"

"یوں سمجھو کہ اب وہ بھی ایک وجہ بن گئی ہے ورنہ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہیں داخلہ لینے کا ارادہ ہے۔"

"تو کیا روحی سے......؟"

"چھوڑو اب یہ موضوع...... آج کا پروگرام بناؤ...... کہاں چلا جائے؟"

سلامت ویٹر کو بل ادا کرنے لگا۔

☆☆☆

ریاض احمد اور بیگم ریاض ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

ریاض احمد ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے مالک تھے۔ اگرچہ اس ایجنسی کا شمار بڑی ایجنسیوں میں نہیں ہوتا تھا لیکن خاصی معقول آمدنی ہوجاتی تھی۔ ان کی بیٹی روحی ایسی ہی زندگی گزار رہی تھی جیسے اس کا تعلق کسی امیر کبیر گھرانے سے ہو۔ کیونکہ باپ کی بہت لاڈلی تھی اس لیے اس کی ہر فرمائش بھی پوری ہوتی تھی سوائے اس فرمائش کے کہ اسے کار دلادی جائے۔

"وہ میں تمہیں شادی کے موقع پر دوں گا۔" ریاض احمد کا جواب ہوتا تھا اور روحی زیرِ لب بڑبڑا کر رہ جاتی تھی۔

بیگم ریاض اسے سخت سست بھی کہا کرتی تھیں لیکن اس کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ اس وقت بھی روحی کو چائے کے لیے دوبار پکارا جا چکا تھا لیکن جواب میں "ابھی آئی مام" ہی سننا پڑتا تھا۔

"کہیں جانے کی تیاری کر رہی ہوگی۔" ریاض احمد نے بیٹی کی حمایت کی۔ "تیار ہونے میں کچھ وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔"

"آپ کی انہی باتوں نے اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔" بیگم ریاض بڑبڑائیں، پھر روحی کو اس کا نام لے کر پکارا اور کہا۔ "چائے اب بالکل ٹھنڈی ہوجائے گی۔ ہم دونوں تو آدھا آدھا کپ پی بھی چکے۔"

"بس ابھی آئی مام!" جواب ملا۔

لیکن اس کی "ابھی" اس وقت ہوئی جب میاں بیوی چائے پی چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی تو اس کے ہاتھ میں ہاکی بھی تھی۔

"آج اس وقت ہاکی؟" ریاض احمد نے مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ ہی دن بعد ایک کالج کی ٹیم سے ہمارا میچ ہونے والا ہے ڈیڈ!" روحی قریب آتے ہوئے بولی اور کرسی پر بیٹھ کر ہاکی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "پریکٹس کے لیے زیادہ وقت دینا پڑتا ہے۔"

بیگم ریاض نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ "ڈیڈ...... مام...... ہونہہ!" انہوں نے سر جھٹکا۔ "بہت ہی ماڈرن بننا ہے تو ڈیڈی یا ممی کہہ لیا کرو۔"

"مجھے ڈیڈ اور مام کہنا ہی اچھا لگتا ہے۔" روحی نے چائے بنانے کے لیے ایک پیالی اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

بیگم ریاض نے جلے کٹے انداز میں کہا۔ "اس ٹھنڈی چائے میں برف کا ایک کیوب اور ڈال لینا۔"

"ٹھنڈی چائے جلدی پی لی جائے گی مام......! دیر ہو رہی ہے مجھے۔"

"اس کم بخت ہاکی ہی نے تمہیں تھرڈ ائیر میں فیل کرایا ہے۔ کیا پھر فیل ہونے کا ارادہ ہے؟"

"ارادہ تو یہی ہے۔" روحی نے ہنس کر کہا اور پیالی میں چائے انڈیلنے لگی۔

ریاض احمد مسکراتے ہوئے ماں بیٹی کی باتیں سنتے رہے تھے۔

"سنا آپ نے!" بیگم ریاض شوہر سے بولیں۔ "آپ کی بیٹی نے فیل ہونے کا ارادہ بھی کرلیا ہے......!"

"مذاق کر رہی ہے تم سے۔" ریاض احمد ہنس کر بولے۔ "کوئی بھی جان بوجھ کر فیل نہیں ہوتا۔"

"میں تو جان بوجھ کر ہی ہوئی تھی۔" روحی نے چائے کا بڑا سا گھونٹ لے کر کہا۔

"یہ آج تم تیسری بار کہہ رہی ہو۔" بیگم ریاض نے

اسے گھورا۔
"چوتھی بار بھی کہوں گی۔" روحی نے اطمینان سے کہا۔ "جب تک مجھے کار نہیں دلائی جائے گی، میں ہر کلاس میں دو دو، تین تین بار فیل ہوتی رہوں گی۔"
"میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں روحی!" ریاض احمد بولے۔ "شادی پر تمہیں کار مل جائے گی۔"
"شادی مجھے کرنی ہی نہیں ہے۔" روحی نے کہا۔ "آج میں پہلی بار مکمل سنجیدگی سے بتا رہی ہوں کہ آپ میرے اکاؤنٹ میں جو پیسے جمع کرا رہے ہیں، وہ سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔"
"کیا!" بیگم ریاض کو اچنبھا ہوا۔ "شادی نہیں کرو گی تو کیا زندگی بھر......"
ریاض احمد نے ان کی بات کاٹی۔ "ارے وہ مذاق کر رہی ہے بھئی۔"
"آج میں اس معاملے میں قطعی سنجیدگی سے بات کر رہی ہوں ڈیڈ!" روحی نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور کھڑی ہوگئی۔
اب ریاض احمد بھی سنجیدہ ہوئے۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم......؟ کیوں نہیں کرو گی شادی؟"
"کسی وقت اطمینان سے بات کروں گی اس معاملے میں......اس وقت تو جلدی میں ہوں۔" روحی کھڑی ہوگئی۔
"سن لیا آپ نے؟" بیگم ریاض نے شوہر کی طرف دیکھا۔
اب ریاض احمد بھی کچھ سنجیدہ نظر آئے تھے لیکن پھر یکایک مسکراتے ہوئے بولے۔ "تم نے سمجھا نہیں ہے اپنی بیٹی کو......اس کا مزاج ہی ایسا ہے کہ مذاق بھی بڑی سنجیدگی سے کرجاتی ہے۔"
روحی دروازے تک پہنچ چکی تھی۔
"یہ ہرگز مذاق نہیں ہے ڈیڈ!" وہ بولی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔
"اب کیا کہیں گے آپ؟" بیگم ریاض نے شوہر کو گھورا۔ "ذرا نرمی سے بات کرو اس سے کسی وقت۔"
ریاض احمد نے اس مرتبہ مسکرائے بغیر کہا۔ "شاید یہ کسی سے محبت کرنے لگی ہو۔ جب شادی کے لیے ہماری طرف سے دباؤ پڑے گا تو لے دے گی وہ کسی کا نام کہ شادی کروں گی تو بس اس سے۔"
"ایسا ہرگز نہیں ہے۔" بیگم ریاض نے کہا۔ "وہ جو کبھی کبھی ایک لڑکی آتی ہے نا اس سے ملنے......اس نے ہنس کر مجھے بتایا تھا کہ یہ کالج میں ان لوگوں کا مذاق اڑاتی ہے جو محبت وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں۔"
"فی الحال وہ یہی ظاہر کرنا چاہتی ہوگی کہ اسے کسی سے محبت نہیں ہے۔"

☆☆☆

شارق کو یونیورسٹی میں آئے چار دن گزر چکے تھے۔ اسے شارق نے اپنی خوش قسمتی سمجھا تھا کہ اسے وہی کلاس ملی تھی جس میں روحی تھی۔ سلامت اس کلاس میں نہیں تھا۔ شارق کو ان چار دنوں میں کوئی ایسا موقع نہیں ملا تھا کہ روحی سے کسی قسم کی بات کرسکتا لیکن وہ اس تاک میں ضرور رہا تھا۔ اسے تنہائی میں بھی روحی کا خیال آتا رہتا تھا اور ایسے موقعوں پر اسے کچھ بے چینی بھی ہوجاتی تھی اور کبھی کبھی ذہن میں یہ شعر بھی ابھرتا۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

وہ اپنا سینہ ٹٹولتا تو کچھ تپش سی ضرور محسوس ہوتی۔
دو دن پہلے ہی سلامت نے اس سے کہا تھا۔ "کہیں تمہیں روحی سے محبت تو نہیں ہوگئی؟"
"شاید۔"
شارق نے ہنس کر اس موضوع کو ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن سلامت نے کہا تھا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوگئی ہے تو سمجھ لو کہ تم نے اپنی شامت کو دعوت دی ہے۔ ارے وہ ان لوگوں کا بے حد مذاق اڑاتی ہے جو پیار محبت کی باتیں کرتے ہیں۔"
شارق نے اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھنے دی تھی۔
یونیورسٹی کے پانچویں دن اسے روحی کو سمجھنے کا تھوڑا سا موقع اور ملا۔
یونیورسٹی شروع ہونے سے قبل روحی ایک اور کالج کی ٹیم سے ہاکی میچ بھی کھیل چکی تھی جس میں اس کے کھیل کو ذرا بھی نہیں سراہا گیا تھا جس پر اس کا موڈ خاصا آف تھا لیکن سلامت کہہ چکا تھا کہ وہ واقعی ہاکی کی ایک خراب کھلاڑی ہے۔
پانچویں دن کلاس میں پروفیسر کے ساتھ پرنسپل بھی آیا۔ اس نے آتے ہی ہاکی میچ کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس وقت سبھی طلبا کی نظریں روحی کو دیکھنے لگی تھیں۔
روحی کے انداز سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اسے اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ابتدا میں اسے صرف اونگھتے ہوئے دیکھا گیا تھا لیکن ایک منٹ بعد ہی ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ سوگئی ہو۔
پرنسپل کہہ رہا تھا۔ "اس میچ میں اگرچہ روحی نے بھی اچھا کھیل پیش کیا تھا لیکن اسے سراہا نہیں گیا جس کا مجھے بہت

افسوس ہے۔''

کئی طلبا شاید اس خیال سے مسکرادیے کہ پرنسپل روحی کی دل آزاری ختم کرنا چاہتا تھا۔ اپنا نام آنے پر بھی روحی کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ واقعی سوچکی تھی یا محض ظاہر کررہی تھی۔

''اسی لیے.....'' پرنسپل کہہ رہا تھا۔''یونیورسٹی کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ روحی کو ایک خصوصی انعام دیا جائے۔''

روحی کے انداز میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اس وقت ایک لڑکی اپنی سیٹ سے اٹھ کر تیزی سے روحی کے قریب گئی اور اس کا شانہ تھپکا۔

روحی چونکی اور شانہ تھپکنے والی لڑکی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ لڑکی نے پروفیسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا جو شارق نہیں سن سکا البتہ اس نے روحی کو منہ بناتے ہوئے دیکھ لیا۔

''پرائز لایا جائے۔'' پرنسپل نے کلاس کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

فوراً ہی ایک چپراسی ایک گول ٹرے سنبھالے کلاس میں داخل ہوا۔ ٹرے میں ایک چھوٹی سی ہاکی رکھی ہوئی تھی جو غالباً کسی دھات سے ڈھالی گئی تھی۔ ٹرے میز پر رکھ دی گئی۔ چپراسی واپس چلا گیا۔

روحی نے پھر اونگھنا شروع کردیا تھا لیکن جب پرنسپل نے اس کا نام پکارا تو وہ چونکی یا اس نے چونکنے کی اداکاری کی۔

''یس سر!'' وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

پرنسپل نے کہا۔''ہاکی میچ کے سلسلے میں تمہیں نہ سراہ کر زیادتی کی گئی تھی۔ میں یہ بات دہرارہا ہوں۔ اس زیادتی کے ازالے کے لیے ہم نے تمہیں ایک خصوصی انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں آکر اپنا انعام وصول کرو۔''

شارق کا خیال تھا کہ روحی شاید ٹس سے مس نہ ہو لیکن اس کے برخلاف وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر آگے بڑھی۔ شارق کو حیرت ہوئی تھی۔

روحی نے اپنا انعام وصول کیا اور بولی۔''میں اس قسم کے انعام کو بھیک سمجھتی ہوں اور بھیک لینا مجھے گوارا نہیں۔''

پھر اس نے وہ چھوٹی سی ہاکی اتنی زور سے فرش پر ماری کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گئی۔

پرنسپل اور پروفیسر ہی نہیں، کلاس کے سارے طلبا دم بخود رہ گئے تھے اور سبھی کی نظریں روحی پر جمی ہوئی تھیں۔ سکوت تو ایسا چھا گیا تھا جیسے وہ قبرستان کی خاموش رات ہو۔ خود شارق بھی دو ایک لمحوں کے لیے حیرت سے منہ کھولے رہ گیا تھا لیکن پھر اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ شاید اسے روحی کا یہ جارحانہ انداز پسند آیا تھا۔

اس سکوت کو توڑنے والی آواز روحی کے قدموں کی تھی جو بہت تیزی سے اپنی سیٹ کی طرف لوٹی تھی اور بیٹھ کر اپنی کتابیں الٹ پلٹ کرنے لگی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی خاص واقعہ نہ ہوا ہو۔

پرنسپل صاحب کچھ بڑبڑاتے ہوئے کلاس سے باہر نکل گئے۔

''اب یہ کلاس آج نہیں ہوگی۔'' پروفیسر نے کہا اور وہ بھی کلاس سے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی لڑکے لڑکیاں اتنی زور سے سرگوشیاں کرنے لگے جیسے ساری کلاس میں مکھیاں بھر گئی ہوں۔ زیادہ تر اٹھ کر کلاس سے باہر جانے لگے تھے۔

شارق نے روحی کو اطمینان سے اٹھتے اور دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ نہ تو کوئی اس سے مخاطب ہوا تھا، نہ وہ کسی سے بولی تھی۔

شارق قدرے تاخیر سے اٹھا۔ کلاس سے نکلنے والا وہ آخری طالب علم تھا۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا کہ راہداری میں طلبا الگ الگ گروپ بنائے باتیں کررہے تھے۔ ان سبھی کا موضوع گفتگو روحی کی حرکت ہی ہوگی۔

شارق نے ہر طرف نظر دوڑائی لیکن جب روحی کہیں دکھائی نہیں دی تو وہ عمارت سے باہر نکلا اور ٹھٹک گیا۔ وہاں تین چار سیڑھیاں تھیں۔ روحی آخری سیڑھی پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ یکایک اس کی نظر اس طالب علم پر پڑی جو لان کی دو فٹ اونچی منڈیر پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ روحی اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کا انداز کچھ جارحانہ تھا۔ یہ محسوس کرکے شارق بھی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر روحی کے پیچھے لپکا۔

طالب علم لڑکا اس وقت چونکا جب روحی اس کے سر پر پہنچ گئی۔ اس وقت سگریٹ لڑکے کی انگلیوں میں نہیں بلکہ ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ روحی نے ایک جھٹکے سے اس کے منہ سے سگریٹ نکالا اور زمین پر پھینک کر اسے کچلتے ہوئے بولی۔''کیا تمہیں پتا نہیں کہ درس گاہوں میں سگریٹ نہیں پینا چاہیے؟''

شارق روحی کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے لقمہ دیا۔''بلکہ سگریٹ پینی ہی نہیں چاہیے۔''

روحی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

شارق نے بات آگے بڑھائی۔''سگریٹ پینے سے پھیپھڑے تباہ ہوجاتے ہیں۔'' اس کی دخل اندازی اس لیے تھی کہ روحی سے بات کرنے کا موقع ملے۔

''تم.....!'' روحی بولی۔''تم وہی ہونا.....؟''

''جس کے پاس گدھا گاڑی جیسی اسکوٹر ہے۔'' شارق نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ روحی ہنس پڑی۔

جس لڑکے کے منہ سے سگریٹ چھینی گئی تھی، وہ کھڑا ہو کر تیزی سے عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے روحی کی حرکت پر احتجاج کرنے کے بارے میں شاید سوچا بھی نہ ہو یا یہ سوچ کر راہ فرار اختیار کی ہو کہ روحی سے الجھنے کا مطلب اپنی شامت کو دعوت دینا تھا۔

روحی نے ہنس کر مزید کچھ نہیں کہا اور آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔

''صرف یہ کلاس ختم کی گئی ہے۔'' شارق اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ ''بعد کی کلاسز تو ہوں گی۔''

''میں آج کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کروں گی۔'' روحی نے رکے بغیر کہا۔

''یقیناً تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہوگا۔'' شارق کہتا ہوا روحی کے برابر میں پہنچ گیا۔ ''موڈ خراب ہونے کی بات ہی ہے۔ وہ انعام نہیں......''

''بھیک تھی۔'' روحی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''لیکن تم میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہے ہو؟''

''میں بھی آج باقی کلاسز اٹینڈ نہیں کروں گا۔ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

یکایک روحی رک گئی اور بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی۔ اس نے شارق کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے بات کرنا چاہتے ہو کہ اسکوٹر کے بارے میں تمہارا جواب سن کر میں ہنس پڑی تھی؟''

''باتیں کرنے کی خواہش کا ہنسی سے کیا تعلق؟''

''ہوتا ہے نا ایسا...... لڑکی مسکرا کر بھی بات کرنے لگے تو لڑکے سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ان سے محبت کرنے لگی ہے حالانکہ یہ محبت وحبت کچھ نہیں، صرف کوئی گھناؤنا جذبہ ہوتا ہے۔''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' شارق نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم آج کی لڑکیوں کے لیے ایک ماڈل بن سکتی ہو۔ ہمارے معاشرے کی ہر عورت خود پر مرد کی فوقیت تسلیم کرتے ہوئے زندگی گزار دیتی ہے جبکہ زندگی پر پچاس فیصد حق عورت کا بھی ہوتا ہے۔'' یہ سب باتیں بنا کر شارق بس دوستانہ مراسم بڑھانا چاہتا تھا۔

''تم حقیقت پسند معلوم ہوتے ہو۔ یہ بات میں اپنے ڈیڈ سے بھی کہوں گی کہ عورت کے حقوق مرد کے مساوی ہونے چاہئیں۔'' روحی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ورنہ شادی ایک مضحکہ خیز بندھن بن کر رہ جاتی ہے۔''

''کیوں نہ ہم کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر باتیں کریں؟''

روحی نے کچھ سوچا اور پھر شارق کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''میرے پاس تو کوئی نہیں ہے لہٰذا ٹیکسی......''

''میری اسکوٹر جو ہے۔'' شارق نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

روحی ہنس پڑی۔ ''گدھا گاڑی!''

''آج میں تمہیں یہ کہنے کا موقع نہیں دوں گا۔''

''چلو! دیکھ لیتے ہیں۔''

یونی کے دو ایک لڑکوں اور لڑکیوں نے دیکھا کہ روحی، شارق کے اسکوٹر پر اس کے پیچھے بیٹھ رہی تھی۔ یہ ان طلبا کے لیے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔

اس دن اسکوٹر چلانے میں شارق اپنی جان پر کھیل گیا۔ اس نے کبھی اتنی تیز رفتاری سے اسکوٹر نہیں چلائی تھی۔

جب ایک ریسٹورنٹ کے سامنے اسکوٹر رکی تو روحی نے اترتے ہوئے کہا۔ ''آج تو میں واقعی اسے گدھا گاڑی نہیں کہہ سکتی۔'' اس کا اشارہ اسکوٹر کی طرف تھا اور وہ مسکرائی بھی تھی۔

انہوں نے نصف گھنٹا ریسٹورنٹ میں گزارا۔ گفتگو میں شارق، روحی کی ہر بات سے اتفاق کرتا رہا، خواہ اسے اتفاق رہا ہو یا نہ رہا ہو۔

وہاں سے روحی ٹیکسی میں اپنے گھر روانہ ہو گئی حالانکہ شارق نے پیشکش کی تھی کہ وہ اسے اس کے گھر تک بھی اسکوٹر پر چھوڑ آئے گا۔

اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے شارق سوچ رہا تھا کہ بیوی تو ایسی ہی ہونی چاہیے جو کٹھ پتلی بن کر نہ رہے۔

اپنی اس سوچ پر شارق خود بھی چونکا۔ کیا وہ واقعی روحی سے اتنی محبت کرنے لگا ہے کہ اس کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھنے کا خیال آ گیا؟

☆☆☆

رات کا کھانا کھانے کے بعد ریاض احمد نے روحی سے کہا۔

''اب لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ خبریں بھی سن لیں گے، کچھ گپ شپ بھی ہو جائے گی۔''

روحی سمجھ گئی کہ ریاض احمد دراصل کیا باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں جا بیٹھی۔

ریاض احمد ہنس ہنس کر خبروں پر تبصرے بھی کرتے رہے لیکن بیگم ریاض کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری رہی۔ آخر خبریں ختم ہونے پر ٹی وی بند کر دیا گیا۔

''ہاں تو روحی بیٹا!'' ریاض احمد بولے۔ ''میں تمہارے

اس خیال سے اتفاق کیے لیتا ہوں کہ محبت وغیرہ لڑکے لڑکی میں نہیں ہوتی لیکن شادی کے لیے محبت کوئی شرط نہیں ہوتی۔ میں نے شادی سے پہلے انہیں کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔'' انہوں نے اپنی بیگم کی طرف اشارہ کیا۔ ''بس ہمارے والدین نے طے کیا اور شادی ہوگئی۔ ہاں، ہماری رائے ضرور لی گئی تھی اور ہم نے اپنے والدین کی خواہش کا احترام کیا تھا۔''

''جی ہاں، یہ بھی ہوتا ہے۔'' روحی نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور اگر یہ نہ ہو تو دنیا کیسے چلے؟ لڑکی ہو یا لڑکا، انہیں شادی تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ تمہیں بھی اس بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''میں نے سوچا ہے ڈیڈ!'' روحی کی سنجیدگی برقرار رہی۔ ''لیکن میں یہ ضروری سمجھتی ہوں کہ بیوی کے حقوق بھی اتنے ہی ہونے چاہئیں جتنے شوہر کے ہوتے ہیں۔''

''ہمارے معاشرے میں ایسا دیکھا تو نہیں گیا یا شاید میری نظر سے ایسا کچھ نہیں گزرا۔ ہاں اگر تمہاری نظر میں ایسا کوئی ہو تو ہمیں بتاؤ، ہم اس کے بارے میں غور کرلیں گے۔ ہمیں یہ اصرار تھوڑی ہے کہ تم ہماری مرضی کے مطابق شادی کرو۔''

''میں بس یہ سوچ رہی ہوں کہ شوہر کو بیوی پر فوقیت حاصل نہیں ہونی چاہیے۔''

''تو ایسا لڑکا تمہارے لیے کہاں تلاش کیا جائے؟''

''یہ سوچنا آپ دونوں کا کام ہے۔'' روحی نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ ''مجھے اسٹڈی کرنی ہے۔''

حالانکہ اسے اسٹڈی نہیں کرنی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہتی تھی اور وہ بھی اس لیے کہ پہلی بار شارق جیسے لڑکے سے ملی تھی اور اس کے خیالات کو اپنے خیالات سے ہم آہنگ پایا تھا۔

تاہم اس نے یہ بھی سوچا کہ شارق کی باتیں محض بناوٹ تو نہیں تھیں؟ شاید وہ صرف اس کے قریب ہونے کے لیے بناوٹ سے کام لے رہا ہو...... ضروری تھا کہ اسے آزمایا جائے لیکن کس طرح آزمایا جائے؟ یہ روحی کے لیے ایک اہم سوال تھا۔

☆☆☆

اتفاق تھا کہ ایک ہی دن بعد جب شارق اور روحی تعلیم ہی کے بارے میں عام سی باتیں کرتے ہوئے پرنسپل کے کمرے کے سامنے سے گزر رہے تھے تو انہیں ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ پرنسپل کے کمرے سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی جھگڑا کر رہا ہو۔ باتیں بہت تیز لہجے میں کی جارہی تھیں۔

''ہرگز نہیں خرم!'' نسوانی آواز سنائی دی۔ ''میں استعفا ہرگز نہیں دوں گی۔''

یہ جملہ یقیناً پرنسپل سے نہیں بلکہ خرم نام کے کسی آدمی سے کہا گیا تھا۔

''تو پھر تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' مرد کی آواز آئی۔

''کیا ہو رہا ہے، دیکھا تو جائے۔'' روحی تیزی سے بولی۔

پرنسپل کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینی ضروری تھی لیکن روحی دروازہ کھول کر تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔ اس کی وجہ سے شارق کو بھی کمرے میں داخل ہونے کی ہمت ہوگئی۔

اس دوران میں انہوں نے یہ نسوانی جملہ بھی سنا تھا۔

''کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا مجھے؟''

''یہ تمہیں آج سے ہی معلوم ہونا شروع ہوجائے گا، نازیہ!'' مردانہ آواز اس شخص کی تھی جس کی عمر تیس سال یا اس سے کچھ زیادہ ہوسکتی تھی۔

دوسری کرسی پر نازیہ بیٹھی ہوئی تھی جو بے حد خوب صورت تھی۔ ساڑی میں ملبوس وہ باوقار بھی معلوم ہو رہی تھی۔

پرنسپل صاحب غصے میں نظر آرہے تھے۔ ''بہتر ہوگا کہ آپ دونوں اپنے گھر جاکر لڑیں...... میرے کمرے کو اکھاڑا نہ بنائیں۔''

''کیا معاملہ ہے سر؟'' روحی نے پرنسپل سے پوچھا۔

''یہ نازیہ ہیں۔ تم جانتی ہی ہوگی...... یونیورسٹی کی بہترین لیکچرار! اور یہ ان کے شوہر ہیں خرم۔ آتے ہی مجھ سے بولے کہ نازیہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اب خرم صاحب کا اصرار ہے کہ نازیہ یہاں سے استعفا دیں جبکہ نازیہ اس کے لیے تیار نہیں۔''

شارق بول پڑا۔ ''تو یہ ان کا حق ہے کہ استعفا دیں یا نہ دیں۔ شادی کے بعد بیوی کے بھی اتنے ہی حقوق ہوتے ہیں جتنے شوہر کے ہوتے ہیں۔''

''تم کون ہوتے ہو دخل اندازی کرنے والے؟'' خرم، شارق پر الٹ پڑا۔

''ویسے تو میں یہاں کا طالب علم ہوں لیکن ایک انسان بھی ہوں جو عورت اور مرد کے مساوی حقوق دیکھنے کا خواہش مند ہے۔''

''تم اپنی خواہش کہیں اور جاکر پوری کرو۔'' خرم نے تیز لہجے میں کہا اور پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر نازیہ کی

طرف بڑھا جیسے اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں سے زبردستی لے جائے گا۔
شارق تیزی سے ان دونوں کے بیچ میں آ گیا۔ ''یہاں آپ کسی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر سکتے۔ اپنے گھر جا کر لڑیے گا۔''
''میں اب گھر جاؤں گی ہی نہیں۔'' نازیہ نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے کسی ہوٹل کا رخ کروں گی۔ میرا سامان وہیں بھجوا دینا۔ میں بہت دن سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے طلاق دے دو۔''
''ہرگز نہیں دوں گا۔'' خرم نے بپھر کر کہا۔ ''اگر تم ہوٹل جاؤ گی تو میں وہاں آ کر تمہاری خبر لوں گا۔''
''میں اب پولیس کو یہ اطلاع دے کر ہوٹل جاؤں گی کہ تم نے تین افراد کے سامنے مجھے دھمکی دی ہے۔''
''خرم صاحب!'' پرنسپل بولے۔ ''بہتر ہوگا کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ پھر جو آپ کا دل چاہے، کرتے رہیے گا۔''
''میں اسے لے کر جاؤں گا۔'' خرم نے پھر نازیہ کی طرف بڑھنا چاہا۔
شارق نے اسے دھکا دے دیا۔ ''چلے جاؤ مسٹر!''
خرم، شارق پر جھپٹا۔ اس نے شارق کے منہ پر گھونسا مارنا چاہا تھا لیکن روحی نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی کلائی اپنی کلائی پر روکی اور خرم کے پیٹ پر گھٹنا مارا۔ خرم کراہ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔
روحی بولی۔ ''زور سے مارتی تو تم دیوار سے جا ٹکراتے۔''
خرم کے منہ سے کچھ غصیلی آوازیں نکلیں اور اس نے کہا۔ ''اس یونیورسٹی کی لڑکیاں بھی غنڈا گردی کرتی ہیں۔''
''غنڈا گردی دکھاؤں تمہیں؟'' روحی نے غصے سے کہا اور خرم کے سینے پر فلائنگ کک مارتے ہوئے پرنسپل کی میز پر ہاتھ ٹیک کر خود کو گرنے سے بچا لیا۔
اس مرتبہ ضرب اتنی شدید تھی کہ خرم کی چیخ نکل گئی لیکن اس نے سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔
اسی وقت چپراسی کمرے میں داخل ہوا جو پرنسپل صاحب ہی کے کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کمرے کا منظر دیکھا۔
''سر!'' شارق نے پرنسپل سے کہا۔ ''ویسے تو میں بھی ان صاحب کو یہاں سے نکال سکتا ہوں لیکن ان کی عزت افزائی اس طرح کی جائے کہ انہیں چپراسی ہی دھکے دے کر اس کمرے سے اور یونی سے باہر نکالے۔''
''ٹھیک ہے۔'' پرنسپل نے کہا اور پھر چپراسی کو اشارہ کیا۔
''دیکھ لوں گا، میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔'' خرم نے مکا لہراتے اور ہانپتے ہوئے کہا اور پھر دروازے کا رخ کیا۔
''اب تم دونوں جا سکتے ہو۔'' پرنسپل صاحب نے اس وقت کہا جب خرم کمرے سے جا چکا تھا۔
''ایک منٹ۔'' نازیہ نے شارق اور روحی سے کہا اور پھر پرنسپل سے بولی۔ ''سر......! میں ان دونوں سے ایک منٹ بات کرنا چاہوں گی۔''
پرنسپل صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔
''بیٹھو!'' نازیہ نے روحی اور شارق سے کہا۔
وہ دونوں بیٹھ گئے۔ روحی کے چہرے پر سوچ بچار کی کیفیت تھی۔ سوالیہ نظروں سے اس کے ساتھ شارق بھی نازیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''روحی! تم تو مجھے پہلے سے جانتی ہو۔'' نازیہ بولی۔
''جی میڈم!'' روحی کا لہجہ سپاٹ تھا۔
''تمہارے تیوروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔'' نازیہ اگر ذہنی دباؤ میں نہ ہوتی تو یہ جملہ مسکرا کر کہتی۔
''تم غالباً نئے ہو؟'' نازیہ نے شارق سے کہا۔
''جی!''
''کس ائیر میں ہو؟''
''روحی کا کلاس فیلو ہوں۔ ہمارے سبجیکٹ بھی ایک ہیں۔''
''دراصل میں تم دونوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔''
''میں نے تو صرف اس لیے اس کی تھوڑی سی مرمت کی کہ اس نے شارق کو مارنا چاہا تھا۔ شکریہ آپ کو صرف شارق کا ادا کرنا چاہیے جس نے آپ کی حمایت میں پہل کی۔''
وہ دونوں جانے لگے۔
''ایک منٹ۔'' اس مرتبہ پرنسپل صاحب نے ان دونوں کو روکا پھر نازیہ سے کہا۔ ''تم واقعی اپنے گھر نہیں، ہوٹل جاؤ گی؟''
''جی سر......! آپ تو جانتے ہیں کہ میں بہت دن سے برداشت کر رہی تھی۔ اب اگر وہ طلاق نہیں دے گا تو میں عدالت میں خلع کی درخواست دوں گی۔ مہر لینے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ اتنا پیسا میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''
''یہ تو میں جانتا ہوں کہ یہ ملازمت تم نے محض وقت گزاری کے لیے کی ہے۔''
''تو اب اجازت!'' نازیہ نے کھڑا ہونا چاہا۔

''مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہیں راستے میں بھی تنگ کرے گا۔ مناسب ہوگا کہ تم روحی اور شارق کو ساتھ لے کر جانا۔ تم کس ہوٹل میں ٹھہرو گی......؟ یہ تو ظاہر ہے کہ تم کسی فائیو اسٹار میں ٹھہرو گی۔''

''میں فوری طور پر فیصلہ نہیں کر سکی ہوں کہ کس ہوٹل میں جاؤں گی۔ ویسے تو میری حفاظت کے لیے اکیلی روحی کافی ہے لیکن آپ کہتے ہیں تو میں شارق کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ ہوٹل جانے سے پہلے مجھے پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔ خرم کے خلاف رپورٹ کرنا ضروری ہے ورنہ وہ مجھے ہوٹل میں پریشان کرے گا۔ روحی اور شارق کو میں ہر وقت تو ساتھ نہیں رکھ سکتی نا!''

''ٹھیک ہے، جو مناسب سمجھو!'' پرنسپل صاحب نے کہا پھر روحی اور شارق سے بولے ''تم دونوں کو تو ان کے ساتھ جانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے؟''

''اس میں ہچکچاہٹ کی کیا بات ہے سر!'' شارق نے کہا۔

روحی نے اثبات میں سر ہلا دینا کافی سمجھا تھا۔ پھر وہ دونوں ہی کمرے سے نکل آئے۔

اس ہنگامے کی خبر پوری یونی میں پھیل چکی تھی اس لیے کمرے کے باہر خاصے طلبا کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے روحی اور شارق پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ دونوں کچھ نہ کچھ بتا کر ہی اپنی جان چھڑا پائے۔

ایک خالی پیریڈ میں شارق اور سلامت کی ملاقات ہوئی اور وہی قصہ چھڑ گیا۔

''شی از گریٹ شارق!'' سلامت نے کہا۔ ''بڑی حماقت ہوئی اس سے کہ خرم سے شادی کر بیٹھی۔ خرم تو...... میں نے یہی سنا ہے شارق...... وہ تو ازدواجی تقاضے پورے کرنے کے قابل بھی نہیں ہے لیکن یہ شکایت نازیہ کی زبان پر کبھی نہیں آئی۔''

''یہ تم نے بڑی عجیب بات بتائی کہ وہ ازدواجی تقاضے پورے کرنے کے قابل نہیں ہے!''

''بھئی میں نے کسی سے سنا تو یہی ہے۔''

''جب نازیہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی تو جھگڑا کس بات پر ہو رہا ہے؟'' شارق نے کہا۔ ''کیا محض خرم کا احساس کمتری ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے ڈر ہوگا کہ نازیہ اس سے علیحدگی نہ اختیار کرلے۔ اس کی پُرتعیش زندگی نازیہ ہی کے دم سے ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''نازیہ کو اپنے مرحوم باپ سے ترکے میں کروڑوں روپے نقد اور خاصی جائداد بھی ملی ہے۔ ماں کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اب وہ سب کچھ نازیہ کے قبضے میں ہے۔ خرم چاہتا ہے کہ نازیہ اپنا اکاؤنٹ، جوائنٹ اکاؤنٹ کرلے۔ نازیہ کی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے یہ اس کا پہلا قدم ہوسکتا ہے۔ نازیہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوگی اگرچہ کروڑوں کی جائداد اس کے پاس بھی ہے لیکن نازیہ نے اپنا ذہنی انتشار کم کرنے یا ختم کرنے کے لیے یہ ملازمت کی ہے۔''

''ذہنی انتشار کیسا؟''

''وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود اب تک دوشیزہ ہے۔''

''ہوں!'' شارق نے طویل سانس لی پھر یکایک بولا۔ ''وہ ہے تو بہت خوب صورت۔ مجھے ایسا بھی لگا تھا کہ میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔''

''تصویریں دیکھی ہوں گی اس کی۔'' سلامت نے کہا۔ ''کیونکہ تمہیں کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لیے بھول گئے۔ ارے وہ شادی سے پہلے ہمارے ملک کی ٹینس چیمپئن تھی۔''

''ارے ہاں......! اب یاد آگیا۔ ہاں، میں نے اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔''

''ہوٹل میں قیام کرنا اس کے لیے پریشانی کا سبب بنے گا۔''

''کیوں؟''

''سب تمہاری طرح تھوڑی ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اسے پہچانیں گے اور آٹوگراف کے لیے اس کی طرف لپکیں گے۔''

''یہ اندازہ تو اسے خود بھی ہونا چاہیے!''

''میرا خیال ہے کہ ہوگا۔ اس کو فوری طور پر ہوٹل ہی کا خیال آسکتا تھا۔ شاید چند ہی دن میں وہ کوئی بنگلا خرید لے۔''

''تم نے اس کی جائدادوں کا بھی ذکر کیا ہے۔''

''وہ دوسرے شہروں میں ہیں۔ ایک آدھ شاید لندن میں بھی ہے۔''

ان دونوں میں اس سے زیادہ باتیں نہیں ہوسکیں۔

یونی ختم ہونے پر روحی اور شارق، نازیہ کے ساتھ اس کی قیمتی کار میں تھے۔

سب سے پہلے پولیس میں رپورٹ کرائی گئی۔ ایس ایچ او نازیہ سے مرعوب ہوگیا تھا یا بہت متاثر تھا۔ اس نے نازیہ سے خرم کا فون نمبر لے کر اس سے رابطہ کیا اور اسے

فوری طور پر طلب کرلیا۔

نصف گھنٹے بعد وہ پولیس اسٹیشن میں تھا۔ چہرے سے شدید غصے کا اظہار ہورہا تھا۔ اس وقت اس نے نازیہ سے زیادہ روحی اور شارق کو کینہ توز نظروں سے دیکھا۔

ایس ایچ او نے خرم سے انڈر ٹیکنگ لی کہ وہ ذاتی طور پر نازیہ کے لیے کوئی پریشانی نہیں کھڑی کرے گا اور معاملے کے حل کے لیے عدالت سے رجوع کرے گا۔

حالات دراصل یہ تھے کہ خرم سے پہلے نازیہ ہی عدالت سے رجوع کرتی۔

پولیس اسٹیشن سے نکل کر نازیہ نے روحی اور شارق سے کہا۔ ''پولیس کو انڈر ٹیکنگ دینے کے بعد خرم مجھے کہیں بھی پریشان نہیں کرسکتا۔ اب اس کی ضرورت نہیں کہ میں تم دونوں کے لیے پریشانی کا سبب بنوں۔ تم دونوں اگر واپس جانا چاہو تو جاسکتے ہو .... میں تم دونوں کو واپس لے چلتی ہوں۔ وہاں ڈراپ کرنے کے بعد ہوٹل چلی جاؤں گی۔''

''خرم صاحب آپ کا سامان تو بھیجیں گے نہیں۔'' شارق نے کہا۔ ''آپ کو کپڑوں وغیرہ کی تو فوری ضرورت ہوگی؟''

لہٰذا سب نے مل کر ضروری اشیا کی شاپنگ کی اور خریداری کے بعد نازیہ نے ان دونوں کو واپس یونیورسٹی لے جا کر ڈراپ کیا۔ ڈراپ کرتے وقت وہ مسکرا کر بولی۔

''اب تم دونوں میرے لیے صرف شاگرد نہیں رہے ہو، اس لیے اپنے اپنے فون نمبرز مجھے دے دو۔''

فون نمبرز لینے کے بعد اس نے اپنا ایک کارڈ شارق کو اور ایک روحی کو دیا تھا۔

وہ چلی گئی تو شارق نے روحی کو اسکوٹر پر بٹھایا اور اس کے گھر کی طرف چلا۔

''آج تم پھر گدھا گاڑی چلا رہے ہو۔'' روحی نے منہ بنایا۔

''تیز چلاؤں گا تو ہم باتیں نہیں کرسکیں گے۔''

''کیا باتیں کرنی ہیں؟''

''نازیہ کے چکر میں ہم نے خرم کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ محسوس نہیں کیا تم نے؟ پولیس اسٹیشن میں وہ ہمیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کچا چبا جائے گا۔''

''دانت توڑ دوں گی اس کے۔''

''بہتر ہوگا کہ چند دن محتاط رہا جائے۔ وہ کرائے کے غنڈوں کی خدمات بھی حاصل کرسکتا ہے۔''

''تم خوف زدہ ہو گیا؟''

''خوفزدہ ہونے اور احتیاط کرنے میں فرق ہوتا ہے روحی!''

''میں یہ سب نہیں سوچ رہی ہوں۔ مجھے تو آج یہ خوشی ملی ہے کہ تم نے ایک عورت کی حمایت میں قدم بڑھایا۔''

شارق کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ روحی اب اس سے متاثر ہوچکی تھی۔ شارق نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے حالات سامنے آجائیں گے جو روحی کو اس کی شخصیت کا وہ روپ دکھا دیں گے جو وہ دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن سے یہ معمول بن گیا کہ شارق اپنی اسکوٹر پر روحی کو یونیورسٹی لے جاتا اور واپس بھی پہنچاتا تھا۔ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کے لیے یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ وہ ان دونوں کی آنکھوں میں محبت کے جذبات دیکھ رہے تھے۔ جو لڑکی عشق و محبت کو بے کار قرار دیتی تھی اس میں یہ تبدیلی طلبا کے لیے تعجب خیز ہونی ہی چاہیے تھی۔

یونیورسٹی کی ایک لڑکی فرزانہ پہلے ہی دن سے شارق سے متاثر ہوچکی تھی اور اس کے قریب ہونے کی کوشش میں ناکام ہوتی رہی تھی کیونکہ شارق تو ابتدا ہی سے روحی پر فدا ہوچکا تھا۔

یونیورسٹی میں ایک بار تنہائی ملی تو فرزانہ نے شارق سے کہا۔ ''وہ سرپھری لڑکی پسند آئی ہے تمہیں؟''

''ارے بس دوستی ہوگئی ہے۔'' شارق ہنس کر ٹال گیا تھا اور سلامت کی طرف بڑھ گیا تھا۔ فرزانہ کی ان کوششوں کو روحی ابتدا ہی سے تاڑتی رہی تھی اور اس کے لیے اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی لیکن شارق سے قریب ہونے کے بعد اسے فرزانہ کی حرکتیں کھلنے لگیں۔

''وہ بہت کوشش کر رہی ہے تم سے قریب ہونے کی!'' یونیورسٹی سے واپسی پر روحی نے شارق سے کہا۔

''میں کیا کرسکتا ہوں روحی!'' شارق نے ہنس کر کہا۔ ''میں تو اس کے قریب ہونے کی کوششیں نہیں کر رہا ہوں۔''

''مجھے اب وہ کھلنے لگی ہے۔''

''ارے دفع کرو!''

''لیکن مجھے برا لگتا ہے..... کل دیکھنا۔''

''لڑو گی اس سے؟'' شارق مسکرایا۔

''بس دیکھنا۔''

''کیا ہے تمہارے دماغ میں؟''

لیکن روحی نے وضاحت نہیں کی۔

اسی دن شام کی چائے پر ریاض احمد نے روحی سے کہا۔ ''تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟''

''شادی کے سلسلے میں؟'' روحی نے سرسری انداز

میں پوچھا۔
''ہاں۔''
''یونیورسٹی ہی کا ایک لڑکا مجھے کچھ ٹھیک لگ رہا ہے۔''
''گڈ۔'' ریاض احمد خوش ہوئے۔ ''خوش خبری کب دوگی؟''
''گریجویشن کے بعد۔''
روحی چائے پی چکی تھی۔ وہ جواب دے کر اٹھ گئی۔
اپنے کمرے میں آکر اس نے موبائل سنبھالا اور فرزانہ کے نمبر ڈائل کیے جو وہ کسی طرح ایک لڑکی سے پوچھ چکی تھی۔
''ہیلو!'' دوسری طرف سے فرزانہ کی آواز آئی۔
''میں روحی بول رہی ہوں۔''
دوسری طرف یک لخت سناٹا چھا گیا۔
''سنا نہیں؟'' روحی تیز لہجے میں بولی۔
''کیا بات ہے؟'' فرزانہ کا لہجہ دھیما تھا۔
''آئندہ میں تمہیں شارق کے قریب نہیں دیکھنا چاہتی۔'' روحی کا لہجہ بڑا فیصلہ کن تھا۔
فرزانہ نے سنبھالا لیا۔ ''تم میرے کسی معاملے میں دخل اندازی نہ کرو۔ تم جانتی ہو میں کس کی بیٹی ہوں؟''
''ڈی...... ایس...... پی......'' روحی نے ایک ایک لفظ جما کر ادا کیا۔
''لہٰذا مجھ سے دھمکانے کے انداز میں بات نہ کرو۔''
''اوکے۔'' روحی نے بڑے سکون سے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
فرزانہ کو واقعی یہ زعم تھا کہ وہ ڈی ایس پی کی بیٹی تھی۔
وہ دوسرے ہی دن روحی کے سامنے ہی شارق کے قریب جا کر اس سے بولی۔ ''میرا پین آج نہ جانے کہاں گر گیا۔ ایک منٹ کے لیے اپنا پین دو۔''
''یہ لو!'' روحی نے جھپٹ کر اس کے بال پکڑے اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ گر ہی پڑی۔ اس کی کتابیں بھی ادھر ادھر بکھر گئیں۔
''ارے ارے!''
''کیا ہوا؟''
''کیا بات ہے؟''
کئی آوازوں کے ساتھ کچھ طلبا و طالبات قریب آ گئے۔
''پیر پھسل گیا بے چاری کا۔'' روحی نے بڑے سکون سے کہا اور دوسری طرف مڑ گئی۔
شارق کو دو ایک پل کے لیے سکتہ سا ہو گیا تھا۔
فرزانہ بڑے غصے سے اٹھی اور اپنے موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگی۔
''بات کیا ہوئی تھی فرزانہ؟'' ایک لڑکی نے پوچھا۔
لیکن فرزانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ موبائل پر اس نے کہا۔
''یونیورسٹی میں مجھ پر ایک لڑکی نے ہاتھ اٹھایا ہے ڈیڈی!''
شارق سمجھ گیا کہ وہ اپنے ڈی ایس پی باپ سے شکایت کر رہی تھی۔
شارق کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ لڑکے لڑکیاں اب اس سے بھی سوال کر سکتے ہیں لہٰذا وہ بھی وہاں سے کھسک لیا۔
کلاس شروع ہونے ہی والی تھی۔ وہ اور روحی ساتھ ہی ساتھ کلاس میں داخل ہوئے۔
شارق نے بہت دھیمی آواز میں بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ڈی ایس پی ہے اس کا باپ! بات بڑھ سکتی ہے۔''
روحی کچھ بولی نہیں، بے پروا انداز میں شانے جھٹک کر رہ گئی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد چپراسی کے ذریعے ان دونوں کو کہا گیا کہ میڈم نازیہ ریٹائرنگ روم میں ان دونوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ دونوں وہاں پہنچے۔
''وہی...... فرزانہ کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔'' ریٹائرنگ روم میں قدم رکھنے سے پہلے شارق نے کہا تھا۔
نازیہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ اس نے ان دونوں سے بیٹھنے کے لیے کہا اور ان کے بیٹھنے کے بعد بولی۔
''کیوں روحی......! فرزانہ کے معاملے میں کیا ہوا تھا؟''
''کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔'' روحی نے معصومیت سے کہا۔ ''فرزانہ نے شارق سے پین مانگا تھا۔ فرزانہ مجھ سے خاصی بے تکلف رہی ہے۔ میں نے مذاقاً اس کے بال پکڑ کر کہا کہ وہ مجھ سے لے لے پین......! اتفاق ہے کہ اسی وقت اس کا پیر پھسل گیا۔''
شارق جانتا تھا کہ اصل بات کیا تھی لیکن وہ خاموش رہا۔
نازیہ نے چند لمحے روحی کو گھورنے کے بعد کہا۔
''تمہارے ماضی کے رویوں کو سامنے رکھتے ہوئے جی تو نہیں چاہتا کہ تمہارے جواب کو درست مان لوں لیکن میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ بس یہ مشورہ دوں گی کہ پرنسپل صاحب کے سامنے بھی اسی جواب پر ڈٹ جانا۔ شارق کو میں نے اس لیے بلایا تھا کہ اس معاملے میں واحد گواہ یہی ہے۔''
''کیا پرنسپل صاحب مجھے بلائیں گے؟'' روحی نے پوچھا۔
''جس طرح میں نے تم دونوں کو بلایا ہے، اسی طرح پرنسپل صاحب بھی دونوں ہی کو بلائیں گے۔ ابھی وہ مجھ سے اس بارے میں بات کر چکے ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ

فرزانہ کا باپ کچھ ہی دیر میں پرنسپل صاحب کے پاس آرہا ہے شکایت کرنے۔"

شارق ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ روحی نے اس موقع پر بھی بے پروائی سے شانے جھٹکے۔

"بس۔" نازیہ نے اس طرح کہا جیسے ان دونوں سے جانے کے لیے کہہ رہی ہو۔

"آپ کے معاملے کا کیا ہوا؟" شارق نے پوچھا۔

"اس دوران میں موقع نہیں ملا تھا کہ آپ سے پوچھتا۔"

"میرا معاملہ......؟ اچھا وہ، خرم کی بات کر رہے ہو؟"

"جی۔"

"میرا کیس مضبوط تھا، خلع لے چکی ہوں میں......! ابھی ہوٹل ہی میں مقیم ہوں لیکن ایک بنگلا خرید لیا ہے۔ دو ایک دن میں کام مکمل ہو جائے گا۔" پھر وہ مسکرائی۔ "وہاں میں پرنسپل صاحب کے علاوہ تم دونوں کو بھی چائے پر بلاؤں گی۔"

"پرنسپل صاحب کے ساتھ نہ بلائیے گا۔" شارق نے جلدی سے کہا۔ "آپ سے تو کسی حد تک بے تکلفی محسوس ہونے لگی ہے لیکن پرنسپل صاحب کے سامنے بات چیت میں محتاط رہنا پڑ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تم دونوں کو الگ سے مدعو کروں گی۔"

"لیکن اس کی ضرورت کیا ہے؟" روحی بول پڑی۔

"تم دونوں میرے کام آچکے ہو۔ اچھا بس!" وہ کھڑی ہو گئی۔

شارق اور روحی ریٹائرنگ روم سے نکلے تو روحی بڑی سنجیدگی سے بولی۔ "تم نے چائے کی دعوت پر کچھ نہیں کہا بلکہ کچھ خوش نظر آئے تھے۔ خیریت تو ہے؟"

"کیا مطلب!"

"پہلے پہل تو مجھے خوشی ہوئی تھی کہ تم ایک عورت کی حمایت میں کھڑے ہوئے لیکن آج سے پہلے بھی مجھے ایک بار کچھ محسوس ہوا تھا۔"

"کیا محسوس ہوا تھا؟"

"تم اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوئے ہو۔ دیکھو شارق......! یہ پہلا موقع ہے کہ میری پسند بننے والے صرف تم ہو۔ میرے اعتبار کو ٹھیس نہ پہنچے۔"

"کیسی باتیں کرنے لگیں تم!"

"جو دل میں تھا، وہ کہہ دیا۔ ایسی کوئی بات ہوئی تو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔"

"ارے وہ ہماری ٹیچر ہے۔"

روحی نے خاموشی اختیار کر لی اور اس موضوع پر بات آگے نہیں بڑھ سکی۔

ذرا ہی دیر بعد انہیں پرنسپل صاحب کے کمرے میں طلب کیا گیا۔ وہاں فرزانہ بھی موجود تھی۔ اس کے ساتھ جو شخص تھا، وہ وردی میں تھا اور اس کا باپ ہی ہو سکتا تھا۔ فرزانہ نے روحی کو بڑی کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا اور بولی تھی۔

"اب مظاہرہ کرنا تم اپنے مارشل آرٹ کا!"

"تم چپ رہو۔" باپ نے فرزانہ سے کہا۔

"تمہارے بارے میں ایک شکایت آئی ہے روحی!" پرنسپل صاحب بولے اور پھر شارق سے کہا۔ "کیونکہ تم بھی اس معاملے سے متعلق ہو اس لیے تمہیں بھی بلایا ہے۔"

"فرزانہ کی غلط فہمی کا قصہ ہے شاید۔" روحی نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"غلط فہمی نہیں تھی وہ میری۔" فرزانہ نے تیز لہجے میں کہا۔ "میرے بال پکڑ کر کھینچے تھے تم نے......! کل فون پر دھمکی بھی دی تھی کہ......"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں فرزانہ؟" روحی نے حیرت ظاہر کی۔ "فون پر دھمکی کا الزام بھی لگا ڈالا۔"

"دونوں میں سے کوئی بات بھی غلط نہیں ہے۔" فرزانہ دبنگ لہجے میں بولی۔ آخر ڈی ایس پی کی بیٹی تھی۔

"پرنسپل صاحب!" ڈی ایس پی بول پڑا۔ "اس لڑکی کو سمجھا دیں کہ آئندہ یہ فرزانہ کے معاملے میں محتاط رہے ورنہ مجھے کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔"

"سخت قدم؟" پرنسپل صاحب کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ "یہ مت بھولیے ڈی ایس پی صاحب کہ یہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں جو گڑبڑ ہو گی اس کی تفتیش میں ذاتی طور پر ہی کر سکتا ہوں۔ جب تک کوئی سنگین مسئلہ نہ ہو، قانون یہاں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔"

ڈی ایس پی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ غرایا۔ "گویا روحی کو سرزنش نہیں کی جا سکتی؟"

"میں دیکھوں گا کہ اس معاملے کی حقیقت کیا ہے۔ جو کچھ فرزانہ نے کہا ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ روحی نے بھی اپنی ایک استاد کو جو کچھ بتایا ہے، اپنی صفائی میں جو کچھ کہا ہے، اس کا ثبوت روحی کے پاس بھی نہیں ہے۔ مجھے اس معاملے کی چھان پھٹک کرنی پڑے گی، پھر جو بھی غلطی پر ہو گا اسے قرار واقعی سزا دی جائے گی۔"

ڈی ایس پی جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ "فرزانہ! تم کسی

اور اچھی جگہ ..... داخلہ لے لو تمہارا ..... کہوگی داخلہ کروادوں گا۔ چلو اٹھو!''

پرنسپل صاحب کو ڈی ایس پی کی بات بری تو لگی ہوگی لیکن انہوں نے بات نہ بڑھانا ہی مناسب سمجھا ہوگا۔

ڈی ایس پی اور فرزانہ کمرے سے نکل گئے۔

''روحی!'' پرنسپل صاحب سخت لہجے میں بولے۔ ''حقیقت تو میں معلوم کرلوں گا لیکن عموماً بھی تمہارے بارے میں اچھی رائے نہیں پائی جاتی۔ تمہیں جو انعام دیا گیا تھا ہاکی کے سلسلے میں، وہاں بھی تم نے انعام کی توہین کی تھی۔ اگر تمہارا تعلیمی ریکارڈ یہاں سب سے بہتر نہ ہوتا تو تمہیں نکال باہر کردیا جاتا۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنے رویوں پر نظر ثانی کرو۔''

روحی کوئی سخت جواب دے سکتی تھی اس لیے شارق نے اس کا پیر دبا کر خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔

کمرے سے نکلتے وقت روحی کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

تین دن بعد نازیہ نے شارق اور روحی کو اپنے نئے گھر پر چائے کے لیے بلایا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے بنگلے میں کیا تبدیلیاں کرائی ہیں۔

''بہت اچھا بنا دیا ہے آپ نے بنگلے کو۔'' شارق نے کہا۔ ''ٹینس کورٹ بھی شاید آپ ہی نے بنوایا ہوگا۔''

''نہیں، وہ تھا..... اسے ٹھیک میں نے کروایا ہے۔''

''گویا آپ کا شوق باقی ہے؟''

''شوق عموماً ختم نہیں ہوتا۔ میں شادی سے پہلے ٹینس سے ریٹائر ہوگئی تھی لیکن شوق تو ختم نہیں ہوا تھا۔ اب بھی میں خاصا وقت دیتی ہوں اس کھیل کو..... ٹینس کے کچھ شوقین ہیں جو مجھ سے سیکھنے آتے ہیں۔''

''کتنے شاگرد ہیں آپ کے؟''

''آٹھ ہیں۔'' نازیہ نے جواب دیا۔

''کتنا وقت دیتی ہیں آپ انہیں؟''

''ایک شاگرد کو ایک گھنٹا۔ ایک دن میں دو شاگرد آتے ہیں شام کو۔ میں نے ان کے لیے چار دن وقف کیے ہیں۔ میرا مطلب ہے دو شاگردوں کی باری تین دن بعد آتی ہے۔ ان تین دنوں میں وہ اپنے گھروں پر مشق کرتے ہیں۔''

''گویا کوچنگ سینٹر ہے آپ کا ٹینس کورٹ؟''

''ہرگز نہیں.....! میں ان سے کوئی فیس نہیں لیتی۔''

''شاگرد تو بڑھتے جائیں گے!''

''بڑھ چکے ہوتے لیکن میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔''

وہاں سے واپسی پر روحی نے کہا۔ ''تم میڈم سے کچھ زیادہ ہی مرعوب ہوتے جارہے ہو۔''

''وہ کیسے؟''

''ہر چیز کی تعریف کررہے تھے۔''

''کیا کسی چیز کی غلط تعریف کی؟''

''غلط تو نہیں لیکن انداز بڑا والہانہ تھا۔''

''یہ محض احساس ہے تمہارا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم انہیں پسند نہیں کرتیں۔''

''ناپسند بھی نہیں کرتی۔'' روحی نے مبہم سا جواب دیا۔

''یہ تو سیاسی جواب ہوا۔''

اس بات پر روحی نے خاموشی اختیار کی۔ شارق نے بھی اس موضوع پر بات آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ روحی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھ رہا تھا کہ اس نے روحی کے دل میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ ابھی عہد و پیماں کی نوبت تو نہیں آئی تھی لیکن آنکھوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

روحی کو اس کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے دروازے پر چھوڑ کر شارق نے اپنے گھر کی راہ لی۔

پھر دو ہی دن گزرے تھے کہ ایک شاپنگ مال میں نازیہ اور شارق کا آمنا سامنا ہوگیا۔

''ہیلو شارق!'' نازیہ ہی نے اسے مخاطب کرکے چونکایا تھا۔

''ہیلو!'' شارق چونک کر مسکرایا اور پھر ٹرالی پر نظر ڈال کر بولا۔ ''خاصی شاپنگ کرڈالی۔''

''ہاں.....! ابھی دو ایک چیزیں اور بھی خریدنی ہیں لیکن تھکن بہت ہوگئی ہے۔ سوچ رہی تھی کہ یہاں کے کیفے میں کافی پی لوں۔''

شارق نے اسے اس کی آواز سے پہچانا تھا کیونکہ وہ حجاب میں تھی۔

وہ بولا۔ ''اگر آپ مجھے یہ اعزاز بخشیں کہ کافی کی دعوت میری طرف سے ہو تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔''

''اگر تم ایسا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

وہ دونوں کیفے میں جا بیٹھے۔

''میں عموماً ہفتے ہی کے دن شاپنگ کرتی ہوں اور یہی شاپنگ مال مجھے پسند ہے۔'' نازیہ نے کہا۔ ''اتوار کا دن کوکنگ میں گزر جاتا ہے۔''

شارق نے کافی کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔ ''کوکنگ کا شوق بھی ہے آپ کو؟''
''مجھے کسی خانساماں کے ہاتھ کا کھانا پسند ہی نہیں آتا۔''
''شاگرد بھی تو آتے ہوں گے شام کو؟''
''نہیں۔'' نازیہ نے جواب دیا۔ ''اتوار کو میں شاگردوں کی چھٹی کرتی ہوں۔''
''ایک زمانے میں مجھے بھی ٹینس کا شوق تھا۔''
''کھیلتے تھے؟''
''نہیں! سیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ اس کے لیے وقت نہیں نکال سکا۔ آپ نے بتایا تھا کہ آپ کچھ شاگردوں کو سکھاتی ہیں تو میرے دل میں آیا تھا کہ آپ سے شاگرد بننے کی درخواست کروں لیکن پھر آپ کی اس بات پر چپ ہو گیا کہ آپ مزید شاگرد نہیں بنانا چاہتیں۔''
''ارے نہیں۔'' نازیہ بولی۔ ''کم از کم تمہارے لیے تو میں وقت نکال سکتی ہوں۔ اتوار کو آجایا کرو۔''
''میری خوش قسمتی کہ آپ نے یہ پیشکش کی لیکن اس وقت تو آپ تھکی ہوئی ہوتی ہیں۔''
''پہاڑ تو نہیں توڑتی سارا دن۔'' نازیہ نے ہنس کر کہا۔ ''گھنٹا بھر آرام کر کے غسل کرتی ہوں اور فریش ہو جاتی ہوں۔ تم ساڑھے پانچ بجے آجایا کرو۔ کل ہی سے شروع کر دو۔''
کافی آگئی تھی۔ نازیہ نے ٹرے اپنی طرف کھسکائی۔
''ایک بات کا خیال رکھنا۔'' نازیہ نے پیالیوں میں شکر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم کتنی شکر لو گے؟''
''چائے میں تو ڈیڑھ چمچہ لیتا ہوں لیکن کافی میں دو چمچے۔ آپ نے کس بات کا خیال رکھنے کے لیے کہا تھا؟''
''ہاں۔'' نازیہ نے جواب دیا۔ ''یونی میں کسی کو معلوم نہ ہو۔'' پھر بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ''میں کیونکہ خلع لے چکی ہوں اس لیے یونی میں باتیں بننے لگیں گی۔''
''ٹھیک۔'' شارق نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''بالکل ٹھیک سوچا آپ نے۔ اب آپ کو بہت محتاط زندگی گزارنی ہوگی۔ میں خیال رکھوں گا۔''
''روحی کو بھی نہ بتانا حالانکہ تم اس سے بہت قریب ہو۔ میں ہرگز یہ نہیں سمجھتی کہ وہ ڈھنڈورا پیٹ دے گی لیکن انسان کے منہ سے کسی وقت کچھ بھی نکل جاتا ہے۔''
''درست کہا آپ نے۔''
شارق نے جواب تو دے دیا لیکن سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ نازیہ کی اس تاکید کے پس منظر میں کوئی خیال نہ ہو جو اس کے دماغ میں چکرا گیا ہو۔
نازیہ نے کافی بنا کر ایک پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔
شارق بولا۔ ''کیا آپ مجھے وہ البم دکھانا پسند کریں گی جس میں آپ کی ٹینس کھیلتی ہوئی تصویریں ہوں!''
''ضرور دیکھنا، ویسے گوگل پر بھی میری ایسی بہت سی تصویریں ہیں اور میرے بارے میں باتیں بھی۔''
''ہونی بھی چاہئیں۔ آخر آپ چیمپئن رہ چکی ہیں۔ کیا کوئی نازیبا بات ہے؟''
''ارے نہیں۔'' نازیہ ہنس پڑی۔ ''بس دو ایک باتوں میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے لیکن میں بے جا تعریف سے خوش نہیں ہوتی۔''
''تو وکی پیڈیا ہی پر آپ ان باتوں کی تردید بھی کر سکتی ہیں۔''
''سوچا تو دو ایک بار لیکن کسی نہ کسی وجہ سے لکھ نہیں سکی۔''
''میں آپ کے حوالے سے لکھ دوں کہ یہاں لکھنے والے نے مبالغے سے کام لیا ہے۔''
''تم تو بہت سنجیدہ ہو گئے۔'' نازیہ ہنسی۔ ''خیر......! تم جو کچھ لکھو، وہ وکی پیڈیا پر دینے سے پہلے مجھے دکھا دینا۔''
''آپ نہ کہتیں تو بھی دکھاتا۔''
کافی پینے کے دوران میں ٹینس پر ہی بات ہوتی رہی۔ شارق کو کیونکہ واقعی ٹینس کا شوق رہا تھا جو پورا نہیں ہو سکا لیکن اسے ٹینس کے بارے میں اور اس کھیل کے بڑے ناموں کے بارے میں خاصی واقفیت تھی۔
اپنے گھر واپس لوٹ کر شارق نے لیپ ٹاپ کھولا۔ گوگل پر جا کر اس نے نازیہ کا پورا نام لکھا جو شاپنگ مال سے چلتے وقت وہ نازیہ سے پوچھ کر آیا تھا۔ گوگل کے ذریعے وہ وکی پیڈیا پر پہنچا اور نازیہ کے بارے میں لکھی جانے والی تحریر پڑھنے لگا۔ اسے اس تحریر میں صرف یہ بات گراں گزری کہ نازیہ کی ایک ایسی تصویر کا حوالہ دیا گیا تھا جس میں وہ گھٹنوں سے اوپر تک ایکسپوز ہو گئی تھی۔ ایسا ایک کٹھن شاٹ کا جواب دیتے ہوئے ہوا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ ''سرچ'' میں جا کر نازیہ کی وہ تصویر دیکھی جا سکتی تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ جب تک وہ کھیل کے میدان میں رہی، اس تصویر کے حوالے سے بات ہونے پر شرمندہ ہو جاتی تھی۔
شارق نے ''سرچ'' میں جا کر نازیہ کی تصاویر دیکھیں۔ ان میں وہ تصویر بھی مل گئی جس کا ذکر کیا گیا تھا۔
شارق کو تحریر لکھنے والے پر بہت غصہ آیا۔ بات اس نے صحیح لکھی تھی لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ اس تصویر کا حوالہ

دیا جاتا۔

شارق واپس وکی پیڈیا پر گیا اور مضمون پڑھنے کے بعد اس کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے مختلف کھلاڑیوں کے حوالے سے یہ بات لکھی کہ نازیہ نے جس قسم کے شاٹ کا جواب دیا تھا، اس میں کوئی بڑے سے بڑا کھلاڑی اسی طرح ایکسپوز ہو جاتا، دوسرے یہ کہ اس میں فوٹو گرافر کی بدنیتی یقیناً شامل تھی۔

مضمون میں کوئی اور ایسی بات نہیں تھی جس کی وضاحت کی جاتی۔

اس سارے کام میں شارق کے تین گھنٹے سے زیادہ لگے۔ جب وہ مضمون لکھ کر سونے کے لیے لیٹا تو اچانک اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ وہ نازیہ کے معاملے میں اتنا حساس کیوں ہو گیا تھا؟

کوشش کے باوجود شارق کے دماغ میں کوئی حتمی جواب نہیں آسکا۔

☆☆☆

صبح اس نے ناشتا کیا ہی تھا کہ روحی کا فون آگیا۔

”فوراً میرے گھر آؤ۔ میں نیچے ہی مل جاؤں گی۔ اسکوٹر لے کر مت آنا، ٹیکسی کر لینا۔“

”اسکوٹر کیوں نہیں؟“

”کوئی وجہ ہے۔ یہاں آؤ گے تو جان لو گے......! ہاں اتنا اور بتا دو کہ دن میں کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے؟“

”نہیں، لیکن......“ شارق کا جملہ پورا نہیں ہوسکا کیونکہ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

شارق کے جی میں آیا کہ روحی کو فون کر کے اسکوٹر نہ لانے کی وجہ پوچھنی چاہیے لیکن پھر یہ خیال دل سے نکال دیا۔ اس کی اس حرکت پر روحی جھنجلا بھی سکتی تھی۔

شارق ٹیکسی کر کے روحی سے ملنے پہنچا۔ وہ نیچے ہی موجود تھی، جیسا اس نے کہا تھا۔ شارق نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور پھر مڑا ہی تھا کہ روحی نے بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آؤ!“ وہ ایک طرف بڑھی۔

”کہاں جانا ہے؟“ شارق بولا۔ ”اب تو کچھ بتاؤ!“

”آج لمبی ڈرائیو اور تفریح کا موڈ ہے۔“ روحی نے ایک کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”کچھ خاص بات بھی کرنی ہے۔“

”کار کہاں سے آگئی؟ کس کی ہے؟“

”سوالات کیے جاؤ گے یا بیٹھو گے بھی۔“

بین الاقوامی کہاوتیں

1- بے شرمی انسان کی آنکھوں میں نظر آجاتی ہے۔
2- بیمار کو دیوار پر بیٹھی مکھی بھی ستاتی ہے۔
3- پوچھتے پوچھتے انسان ساری دنیا گھوم آتا ہے۔
4- پیسا سونگھ کر انسان نہیں بتا سکتا کہ اسے کیسے کمایا گیا ہے۔
5- جو شخص گھر سے نہیں نکلتا وہ لوٹ کر بھی نہیں آتا۔
6- خدا کی طرف لوگ لنگڑاتے ہوئے جاتے ہیں اور شیطان کی طرف دوڑتے ہوئے۔
7- دن کی تعریف شام ہونے سے قبل نہیں کرنی چاہیے۔
8- دوسرے ملکوں میں بھی لوگ کھانا ہی کھاتے ہیں۔
9- غربت میں انسان دوستوں کو پہچان لیتا ہے۔
10- ضرورت سے زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ بے وقوفی ہے۔
11- صحت مند نہیں جانتا کہ وہ کس قدر امیر ہے۔
12- جہاں پیسا ہوتا ہے وہاں شیطان موجود ہوتا ہے اور جہاں پیسا نہیں ہوتا وہاں دوبارہ موجود ہوتا ہے۔

چند پند سود مند

● جملہ بہت چھوٹا ہے لیکن اس کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ ”اللہ کی طرف آجاؤ اس سے پہلے کہ اللہ تمہیں اپنی طرف بلا لے۔“

■ گناہ کر کے کہاں چھپاؤ گے، یہ زمین و آسمان اُسی کا ہے۔

● انسان کا سب سے بہترین دوست اللہ ہے، بہت جلدی مان جاتا ہے۔ پرانی باتیں یاد نہیں کرواتا۔ اپنے پاس سے کبھی مایوس نہیں لوٹاتا۔

■ انسان مضبوط اتنا ہے کہ پہاڑوں کا سینہ چیر دے اور کمزور اتنا کہ لفظوں اور لہجوں سے ٹوٹ جاتا ہے۔

● حق تلفی و ناانصافی ایسے ہی قابلِ نفرت عوامل ہیں جیسے کسی مسلمان کے نزدیک حرام گوشت کا لقمہ۔

■ اپنی ذات کے جن پہلوؤں کو آپ دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی تگ و دو میں رہتے ہیں دراصل وہی آپ کی حقیقت ہوتی ہے۔

● ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کی چالوں سے پردہ اٹھایا جائے تو الٹا آپ سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

شارق ایک طویل سانس لے کر کار میں بیٹھ گیا۔

روحی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری ایک دوست کی ہے۔ ایک دن کے لیے مانگ لی ہے۔''

''وہی دوست جو فرسٹ ائیر میں ہے؟''

''ہاں...... بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ خود صرف اسی کے پاس دو کاریں ہیں۔''

''چلنا کہاں ہے؟''

''آج موسم بہت خوب صورت ہے۔ ایسے موسم میں تفریح کی نہیں سوجھے گی تو کس بات کی سوجھے گی!''

''لیکن کہاں؟''

''ہاکس بے۔''

''مائی گاڈ......! اتنی لمبی ڈرائیو؟''

''اس موسم میں ہاکس بے بہت رومانٹک لگے گا۔''

''واپسی کب تک ہوگی؟'' شارق کو خیال تھا کہ ساڑھے پانچ بجے نازیہ کے گھر پہنچنا ہے۔

''تم نے کہا تھا کہ آج تمہیں کوئی خاص کام نہیں ہے۔''

''یہ تو ہے، لیکن کچھ معلوم تو ہو۔''

''جب فرصت ہو، موسم بھی دلبرانہ ہو تو وقت کے بارے میں سوچنا غیر شاعرانہ بات ہے۔'' شارق کو معلوم ہوا کہ روحی کا شاعرانہ ذوق بہت اچھا تھا۔ اسے شارق سے زیادہ اور بہت اچھے شعر یاد تھے۔

شارق کو تعجب بھی ہوا۔ جو لڑکی عشق محبت کو بیکار قرار دیتی تھی اسے اتنے رومانی شعر یاد تھے جتنے شارق کو بھی یاد نہیں تھے۔

ہاکس بے پر وہ ایک نہایت خوب صورت ہٹ تھی جس کے اونگھتے ہوئے چوکیدار نے چونک کر ان کا استقبال کیا۔

''یہ تم نے دن دہاڑے اونگھنا کب سے شروع کر دیا؟'' چوکیدار سے روحی کے اس سوال نے ظاہر کیا کہ وہ پہلے بھی یہاں آ چکی تھی یا آتی رہی تھی۔ بہر حال وہ اس کی دوست کی ہٹ تھی جہاں اس کا آنا جانا ہوتا ہی رہا ہوگا۔

''بس ایسے ہی بیگم صاب!'' چوکیدار نے جواب دیا۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے ناک میں بول رہا ہو۔ بولتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں اونگھنے کا تاثر تھا۔

''جلدی سے چائے بناؤ......! پروین نے تمہیں فون نہیں کیا تھا کہ میں آ رہی ہوں؟''

''کیا تھا بیگم صاب......! میں ابھی بس اٹھ ہی رہا تھا چائے بنانے کو۔''

''نہیں تم رہنے دو۔ ہم خود بنا لیں گے۔'' شارق نے کہا اور پھر انگریزی میں بولا۔ ''نہ جانے یہ کیا بنا لائے......! مجھے تو لگتا ہے کہ یہ افیونی ہے۔ پنک میں معلوم ہو رہا ہے۔''

روحی نے سر ہلا کر اس کے خیال کی تائید کی۔

ہٹ کا کچن بھی بہت خوبصورت تھا۔ روحی نے ہی چائے بنائی۔ خورونوش کا سامان وہ ایک باسکٹ میں رکھ کر لائی تھی۔

چائے پیتے ہوئے اس نے فون پر اپنی دوست پروین سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ ''تمہارا چوکیدار تو اب شاید افیونی ہو گیا ہے...... نہیں، وہ اس وقت بھی پنک میں تھا۔ کوئی دوسرا چوکیدار رکھو۔ یہاں بہت قیمتی سامان ہے۔ یہ کیا خاک چوکیداری کرے گا۔''

پھر دوسری طرف سے کوئی جواب سن کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور شارق سے بولی۔ ''وہ کہہ رہی تھی کہ یہ لت اسے حال ہی میں لگی ہوگی۔ گزشتہ ماہ تو وہ لوگ یہاں آ چکے ہیں۔ اب وہ اس بارے میں اپنے ڈیڈی سے بات کرے گی۔''

''خیر! اب لعنت بھیجو اس پر۔ وہ بات بتاؤ جو کرنے کے لیے تم مجھے یہاں لائی ہو۔''

''وہ بات!'' روحی مسکرائی۔ ''اتنی جلدی کیوں ہے تمہیں؟ کوئی خوفناک بات نہیں کرنا ہے۔ ابھی ذرا ساحل پر چل کر پانی کے جھاگ اڑاتے ہیں۔ آج سمندر پُرجوش بھی نہیں ہے۔''

روحی کی ضد پر شارق کو اس کی بات ماننا ہی پڑی۔ روحی نے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت پانی میں گزارا۔ شارق اس کے پیچھے رہا تھا۔ پتلون ایک حد سے زیادہ تو اوپر نہیں چڑھائی جا سکتی تھی۔

''آج سیپیاں بہت بکھری ہوئی ہیں۔'' روحی نے ساحل کی طرف لوٹتے ہوئے کہا۔ ''پچھلی بار میں آئی تھی تو اتنی نہیں تھیں۔ کچھ سیپیاں لیتی چلوں گی۔''

''آج تم بہت ہی کھلنڈرے موڈ میں ہو!''

''کیا تم نے آج محسوس کیا ہے کہ میں بہت بدل گئی ہوں؟''

''بہت تو نہیں، کچھ ضرور بدل گئی ہو۔''

روحی ہنسنے لگی۔ ہٹ میں آ کر اس نے دوسرے حصے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ شارق نے تولیے سے پیر خشک کر کے جوتے پہن لیے۔

''چائے کا ایک دور اور چل جائے؟'' روحی نے تجویز پیش کی۔

''بنالو۔ ویسے یہ ہٹ تمہاری دوست کے والد نے دوسروں سے بہت الگ تھلگ بنوائی ہے۔ آس پاس بالکل سناٹا ہے۔''

''پسند ہوتی ہے اپنی اپنی۔'' روحی نے کہا اور چائے بنانے چلی گئی۔

شارق بے چین تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرنا چاہتی ہے، اس لیے چائے پینے کے دوران میں اس نے پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔

''ہاں۔'' روحی کچھ سنجیدہ نظر آئی۔ ''تم نے ساحل پر بات کی تھی کہ میں صرف تمہارے معاملے میں بہت بدل گئی ہوں۔''

''حقیقت تو یہی ہے۔''

''تم نے کیا محسوس کیا ہے؟''

''میں نے؟'' شارق سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔ ''میں نے بس پتا نہیں کیا محسوس کیا ہے۔''

''زبان پر لاتے ہوئے ڈر رہے ہو؟'' روحی ہنسی۔ ''حالانکہ ابھی کہہ چکے ہو کہ میں تمہارے معاملے میں بدل گئی ہوں۔''

''وہ تو ہے لیکن......'' شارق متذبذب ہی رہا۔

''لیکن میں......'' روحی نے اس کی بات کاٹی۔ ''تمہارے ہی منہ سے کچھ سننا چاہتی ہوں۔ میں وہ لڑکی ہوں شارق، جو محبت کو کسی طرح ماننے کے لیے تیار دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن ایک عجیب سی بے کلی محسوس کرتی تھی، جیسے کچھ بھول رہی ہوں۔ پھر تم ملے اور دھیرے دھیرے میری بے کلی ختم ہونے لگی۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ محبت اگر انسان کے دل میں پیدا نہ ہو تو وہ اندر سے کھوکھلا ہی رہتا ہے۔ تم ملے تو میرا وہ کھوکھلا پن ختم ہوتا چلا گیا۔ میں نے اپنے اندر زندگی محسوس کی۔ آخر ایسا کیوں ہوا شارق؟''

دھیرے دھیرے روحی کی آواز بھراتی چلی گئی اور آخر میں اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''روحی!'' شارق جیسے تڑپ کر اٹھا اور اس نے سامنے بیٹھی ہوئی روحی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''آخر تم نے مجھے ہمت دلا ہی دی۔ ہاں روحی...... تمہیں پا کر میں نے سب کچھ پا لیا ہے۔ اب یہ آنسو ان آنکھوں میں کبھی نظر نہ آئیں۔'' اس نے انگلیوں سے وہ دو آنسو صاف کیے جو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے تھے۔

''اب اور دیکھ لیا۔ میں کتنی بدل گئی ہوں۔'' روحی کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''اس لیے کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔'' روحی نے کہا اور اپنا سر شارق کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''چلو! اب ذرا ساحل پر گھومیں۔''

''میں بار بار پانی میں نہیں بھیگنا چاہتا۔'' شارق نے منہ بنایا۔

''میں پانی میں بھیگنے کی نہیں، ساحل پر چہل قدمی کی بات کر رہی ہوں۔''

''ہاں! اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' شارق کھڑا ہو گیا۔

ساحل پر ٹہلتے ہوئے وہ اتنی دور نکل گئے جہاں زیادہ تر ہٹس تھیں اور لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے۔

چہل قدمی کرتے ہوئے ان میں پیار محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر شارق نے کہا۔ ''اب واپس چلو۔ ریت پر ٹہلنے سے مجھے تھکن ہونے لگتی ہے۔''

''چلو۔'' دونوں واپسی کے لیے مڑے۔ ''ایک وعدہ کرو۔''

''کیا؟''

''اس بدلی ہوئی روحی کو تم پھر نہ بدل دینا۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہاری بے وفائی مجھے وحشی بنا دے گی۔ میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔''

''ایسی باتیں نہ سوچو۔''

''ارے لو!'' روحی کو کچھ خیال آ گیا۔ ''اتنی دیر ٹہلتے رہے اور میں نے ایک بھی سیپی نہیں چنی۔ میں بہت سی سیپیاں لے کر جاؤں گی۔'' اس نے جھک کر ایک سیپی اٹھائی۔

''اب اس میں تم اور وقت لگاؤ گی۔ میں تھک گیا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا تم چل کر لیٹو! میں سیپیاں چنتی ہوئی آتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' شارق آگے بڑھ گیا۔

وہ ہٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ موبائل پر نازیہ کی کال آ گئی جو شارق کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔

''خیریت؟'' شارق نے بے ساختہ پوچھا۔

''ایک بات کہنا بھول گئی تھی۔'' نازیہ نے کہا۔ ''ساڑھے پانچ سے پندرہ منٹ پہلے آ جانا۔ میں اس وقت چائے پیتی ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ پی لینا۔''

''صرف چائے کی دعوت کے لیے فون کر ڈالا۔'' شارق مسکرایا۔

''فون تو اس لیے کیا کہ سوا پانچ بجے آ جانا۔''

''اچھی بات ہے۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

شارق نے موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے سوچا کہ روحی کو اس کال کے بارے میں نہیں بتائے گا۔ وہ ویسے ہی نازیہ کو کسی نہ کسی حد تک ناپسند کرتی تھی۔ کال کی بات سن کر اس کا موڈ کچھ خراب ہو سکتا تھا۔

ہٹ کا چوکیدار اونگھ رہا تھا۔ ہٹ کے کمرے میں شارق کو بستر پر لیٹے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس نے روحی کی چیختی ہوئی آواز سنی۔ اس نے شارق کو پکارا تھا۔ شارق بوکھلا کر اٹھا اور ہٹ سے نکلا۔ چوکیدار بدستور اونگھ رہا تھا۔ شارق نے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر چار سوٹڈ بوٹڈ آدمیوں کو دیکھا جو روحی کو گھسیٹتے ہوئے سڑک کی طرف لے جا رہے تھے۔ روحی کے گھسٹنے کا سبب ایک ہی ہو سکتا تھا کہ وہ اس وقت کسی طرح بے ہوش کی جا چکی تھی۔ جب اس نے شارق کو پکارنا چاہا تھا لیکن بے ہوشی کی وجہ سے پورا نام نہیں لے سکی تھی۔

روحی اپنے مارشل آرٹ کی مدد سے شاید ان چاروں کو مزہ بھی چکھا دیتی لیکن بہ ظاہر شریف نظر آنے والے ان چاروں کی طرف اس نے توجہ ہی نہیں دی ہوگی۔

''روحی!'' شارق چیختا ہوا دوڑا۔ حالانکہ وہ ننگے پیر تھا لیکن اس دوڑ سے شارق کو کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ ویسے اگر وہ روحی اور ان چاروں آدمیوں کے قریب بھی پہنچ جاتا تو کیا کر پاتا۔ روحی کو اس طرح اغوا کرنے والے چاروں آدمیوں سے روحی کو چھڑانا اس کے بس کی بات نہ ہوتی۔ اس کے پاس ریوالور بھی نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں پر فائر کر دیتا۔

سڑک پر ایک بند ٹرک کھڑا تھا۔ روحی کو اس میں دھکیل کر وہ چاروں بھی ٹرک پر سوار ہو چکے تھے۔ شارق سڑک سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ جب وہ سڑک پر پہنچا تو ٹرک اسٹارٹ ہو کر کچھ دور نکل چکا تھا۔

شارق پاگلوں کی طرح اس کار کی طرف دوڑا جس میں وہ اور روحی آئے تھے۔ خوش قسمتی سے چابی اگنیشن میں ہی لگی ہوئی تھی۔ شارق نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر انجن اسٹارٹ کیا۔ اس وقت تک ٹرک ایک میل سے زیادہ آگے نکل چکا تھا۔ شارق نے دیوانگی کی حد تک کار کی رفتار بڑھائی اور جلد ہی ٹرک کے خاصا قریب بھی پہنچ گیا لیکن اسی وقت ٹرک سے پے در پے گولیاں چلائی گئیں۔ ان میں سے دو گولیوں نے کار کے دو پہیے برسٹ کر دیے۔ بے حد تیز رفتاری کے سبب شارق کار کو کنٹرول نہیں کر سکا۔ کار الٹ کر گھسٹتی ہوئی خاصی دور تک گئی۔ شارق کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور اتنی شدت سے ٹکرایا کہ شارق کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے اور پھر وہ تارے اندھیرے میں مدغم ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

روحی کو جب ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں بستر پر پڑی ہوئی تھی اور اس کا دماغ اب بھی اس بو سے سنسنا رہا تھا جو اسے سونگھائی گئی تھی۔

سیپیاں چنتے ہوئے اس نے ان چاروں آدمیوں کو دیکھا تو تھا جو ٹہلتے ہوئے آگے آ رہے تھے لیکن اس نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔ چونکی تو وہ اس وقت تھی جب وہ چاروں اس پر جھپٹے تھے اور اسے بہت تیزی سے جکڑ لیا تھا۔ اسے اپنی مدافعت میں کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا ورنہ وہ ان چاروں کو ناکوں چنے چبوا دیتی۔ وہ بس اتنا کر سکی کہ پوری قوت سے شارق کو پکارنا چاہا لیکن اس کے منہ پر ایک ایسا بھیگا ہوا رومال رکھ دیا گیا جس کی بو نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا۔

اب وہ ہوش میں آئی تھی تو بھی منظر کچھ دھندلایا ہوا سا تھا۔ جب وہ دھند صاف ہوئی تو اس نے وہاں خرم، فرزانہ کے باپ اور ایک اجنبی کو دیکھا۔ فرزانہ کا باپ اس وقت وردی میں نہیں تھا۔

روحی کو سب کچھ یاد آ چکا تھا اس لیے وہ تیزی سے اٹھی۔

خرم چیخا۔ ''یہ مارشل آرٹ جانتی ہے۔''

ڈی ایس پی نے فوراً ریوالور نکال لیا اور گرجا۔ ''خبردار جو قریب آنے کی کوشش کی ورنہ گولیوں سے تمہاری ایک ٹانگ تو چھلنی کر ہی دوں گا۔''

روحی جو ان پر جھپٹنے کے لیے پر تول چکی تھی، ٹھٹک کر رک گئی۔

''اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟'' ڈی ایس پی کا سوال تھا۔

روحی کیا جواب دیتی۔ وہ اسے گھورتی رہ گئی۔ یہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ اس وقت اپنے دو دشمنوں کے گھیرے میں ہے۔ ڈی ایس پی اپنی بیٹی فرزانہ کی وجہ سے، جس کو روحی نے اس کے بال کھینچ کر گرایا تھا اور خرم اس لیے کہ شارق کے ساتھ مل کر اس نے نازیہ کا ساتھ دیا تھا۔

ہا کس بے پر اس کی پکار شارق تک پہنچی ہوگی یا نہیں؟ روحی کے دماغ میں ایک سوال یہ بھی تھا اور وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ اس کی پکار کا شارق پر کیا ردعمل ہوا ہوگا اور اگر اس نے اس کی آواز نہ سنی ہوگی تو اس کو غائب پا کر اس پر

بوکھلاہٹ طاری ہوئی ہوگی یا نہیں.....

"جواب کیوں دیا تم نے؟" ڈی ایس پی غرایا۔

"میں ایسا جواب دے سکتی ہوں۔" روحی نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اغوا تم لوگوں نے کیا ہے۔ تم ہی جانتے ہو کہ اس اغوا کا مقصد کیا ہے؟"

"انتقام ہے اس کا مقصد!" ڈی ایس پی نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم نے بھرے کالج میں میری بیٹی کی بے عزتی کی تھی اور خرم کا معاملہ یہ ہے کہ تم نے اس کی بیوی کا سامنا کیا تھا۔ یہ میرا دوست ہے لہٰذا اس کا معاملہ بھی میرا ہی معاملہ ہے۔"

"تو پھر؟" روحی نے اپنا سکون برقرار رکھا۔

"تم یہ بتاؤ کہ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

"گولی ماردو!"

"کسی کو جان سے ماردینا تو انتقام کی بہت ہی بھونڈی شکل ہے۔"

"تو پھر؟"

"تم کو ذلیل کیا جائے گا۔"

"تو کرو!"

ڈی ایس پی کی باتیں روحی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ سوالات کر کے وہ محض وقت ضائع کررہا تھا۔

"خرم کا انتقام تو یہ ہوگا کہ تمہیں اور اسے کمرے میں بند کردیا جائے گا، پھر یہ تمہارے ساتھ کچھ بھی سلوک کرے۔"

"عورت سے مرد کا بدترین انتقام، بلکہ گھناؤنا انتقام ایک ہی ہوتا ہے اور اس کی سکت خرم میں ہے نہیں۔" روحی نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "یہ تو اپنی بیوی کے ساتھ بھی کچھ نہیں کرسکا تو کسی اور کے ساتھ کیا کرے گا۔"

"کیوں خرم؟" ڈی ایس پی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

خرم اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اسے روحی کی فلائنگ کک بھی یاد تھی اور گھٹنے کی ضرب بھی جو اسے پرنسپل کے کمرے میں لگی تھی۔

"بولو!" ڈی ایس پی نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم یہی تو چاہتے تھے کہ اس سے اپنا انتقام لو...... تو انتقام کی صورت میں نے بتادی ہے۔"

"میں اس حد تک آگے نہیں جانا چاہتا۔"

"اور یہ جو کہہ رہی ہے کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ بھی۔"

"بکواس کررہی ہے یہ۔" خرم نے غصے سے کہا۔

"تو بتاؤ نا، تم کیا چاہتے ہو؟"

"یہ میرے پیروں پر گر کر مجھ سے معافی مانگے۔"

"یہ کیسا انتقام ہوا؟"

"کسی کو ذلیل کرنا بھی انتقام ہی ہے۔"

"اس طرح تو میں ذلیل کرنا چاہتا ہوں اسے۔" ڈی ایس پی نے کہا اور پھر روحی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تمہیں بھرے کالج میں فرزانہ سے معافی مانگنی ہوگی۔"

"میں نہ مانگوں تو؟"

"تو پھر تمہیں بہت ہی ذلیل کیا جائے گا۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ "تمہیں دوبارہ اغوا کرنا بھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مارشل آرٹ کے چار ماہروں کی خدمات حاصل کرنا میرے لیے دشوار نہیں ہوگا۔ چار کا مقابلہ تم نہیں کرسکوگی۔ وہ تمہیں مار مار کر ادھ موا کردیں گے اور پھر تمہیں ایک کمرے میں ایک حبشی کے حوالے کردیا جائے گا۔"

اب روحی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "تم نے جو یہ باتیں کی ہیں، یہی بہت ہے مجھے ذلیل کرنے کے لیے۔"

"لیکن میں اس پر معاملہ ختم نہیں کروں گا۔ ہوگا وہی جو میں ابھی کہہ چکا ہوں۔"

"تو کر کے دیکھ لینا۔ معافی تو میں نہیں مانگوں گی۔"

"تم کیا چاہتے ہو خرم؟" ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"جو سلوک تم اس کے ساتھ کروگے، وہی میرا انتقام بھی ہوگا۔"

"تو کیا فائدہ ہوا اغوا کرنے کا۔" ڈی ایس پی نے منہ بنایا۔ "وقت برباد کیا ہے تم نے میرا۔" ڈی ایس پی نے خشک لہجے میں کہا، پھر روحی کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔ "تمہیں ایک گھنٹے بعد چھوڑ دیا جائے گا۔ جب تم یہاں آئی تھیں تو بے ہوش تھیں اور جاؤ گی تو تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہوگی۔ تم اس عمارت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاسکوگی اور اگر تمہارا ارادہ یہ ہوا کہ تم میرے محکمے کو میرے بارے میں کچھ بتاؤ تو یہ تمہاری حماقت ہوگی۔ کوئی تمہاری بات پر یقین نہیں کرے گا کیونکہ تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" روحی نے اپنے دل میں کہا۔ "لیکن تمہاری باتوں سے میں نے جو ذلت محسوس کی ہے، اس کا میں تم سے کس طرح انتقام لوں، اس بارے میں مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔"

روحی کو چھٹکارے کا اشارہ مل گیا تھا اس لیے اس نے ترکی بہ ترکی جواب نہ دینا ہی مناسب سمجھا لیکن خرم کو بڑی تیز نظروں سے دیکھا۔ نہ جانے کیا بات تھی اس کی آنکھوں

میں کہ خرم گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔
ایک گھنٹے بعد اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر کار میں بٹھایا جا رہا تھا تو اس نے ڈی ایس پی کی آواز سنی۔ ”اور ہاں......! اب تم شارق سے دور ہی رہا کرو۔“
روحی نے اب بھی خاموشی اختیار کی۔
کار چل پڑی اور تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے برابر میں بھی کوئی بیٹھا ہے۔ وہی شخص ہنس کر بولا۔
”تم سے کہا گیا ہے کہ شارق سے دور رہنا لیکن وہ شاید ہی زندہ بچا ہو۔“
”کیا مطلب؟“ روحی چونکی۔
”جب اس نے ٹرک کا تعاقب کیا تھا تو ٹرک سے اس پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔ اس کے دو پہیے برسٹ ہو گئے تھے۔ کار الٹ گئی تھی۔ اب وہ کسی اسپتال میں زخمی پڑا ہو گا یا مردہ خانے پہنچا دیا گیا ہو گا۔“
روحی کا دل دہل گیا۔ وہ شارق کی موت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔
”اگر ایسا ہوا تو......“ اس نے بپھر کر سوچا۔ ”ڈی ایس پی اور خرم کو زندگی ہی میں جہنم کا مزہ چکھنا ہو گا۔“
کار کی رفتار سست ہونے لگی۔ روحی کو ایک سڑک کے کنارے اتار دیا گیا۔ روحی نے پٹی اتار دی اور دیکھا کہ وہ ایک بھری پری سڑک پر تھی۔ اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ اس نے موبائل لے لیا جو ان لوگوں نے اس کی بے ہوشی کے بعد اپنے قبضے میں لے کر بند کر دیا تھا۔ روحی کا ذہن شارق میں الجھا ہوا تھا اس لیے فوری طور پر اسے موبائل کھولنے کا خیال بھی نہیں آیا۔
روحی کے اترتے ہی کار تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ روحی نے اس کا نمبر ذہن نشین کر لیا لیکن یہ بھی سوچا کہ نمبر پلیٹ جعلی ہی ہو گی۔
شام ہو چکی تھی اس لیے روحی کو ٹیکسی ذرا دیر سے ملی۔
”پولیس ہیڈ کوارٹر۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔
ایک بار اس کے جی میں آئی تھی کہ اپنے والد سے رابطہ کرے لیکن اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ سب سے پہلے شارق کے بارے میں جاننا چاہتی تھی اور اس کا علم اسے پولیس ہی سے ہو سکتا تھا۔
جواب یہ ملا کہ ▪▪ اس سلسلے میں فلاں تھانے سے رجوع کرے۔
روحی نے ٹیکسی روک رکھی تھی۔ وہ فوراً اس پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی جس کے بارے میں بتایا گیا تھا۔
پولیس اسٹیشن سے معلوم ہوا کہ حادثے کا شکار ہونے والی کار پولیس نے وہاں سے ہٹوا دی تھی اور اس میں جو زخمی تھا، اسے سرکاری اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ پولیس تفتیش کر رہی تھی کہ کار پر کس نے گولیاں چلائی تھیں؟ روحی سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔

☆☆☆

شارق کو پولیس ہی نے اسپتال پہنچایا تھا۔ شارق اس وقت بے ہوش تھا۔ پولیس نے اس کے بارے میں جاننے کے لیے اس کی تلاشی لی تھی تو شناختی کارڈ کے علاوہ اس کا یونی کارڈ بھی ملا تھا۔
ٹریٹمنٹ کے بعد شارق کو ہوش آ گیا تھا اس لیے پولیس نے اس کا بیان درج کر لیا تھا۔ بیان یہ تھا کہ اس کے ساتھ اس کی ایک دوست تھی جسے کچھ لوگوں نے اغوا کیا تھا۔
ساری باتیں شارق نے جوں کی توں بتا دی تھیں۔ روحی کے گھر کا پتا اور روحی کا موبائل نمبر بھی بتا دیا تھا۔ روحی کے باپ کا موبائل نمبر اسے معلوم نہیں تھا۔
روحی کے موبائل سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ بند ملا تھا۔ اس کے بعد پولیس یقیناً روحی کے گھر کی طرف روانہ ہوئی ہو گی۔
اس کے بعد شارق کو جنرل وارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کی چوٹ بہت زیادہ تشویش ناک نہیں تھی لیکن زیادہ ہلنے جلنے سے ... ٹانکوں کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس لیے اسے ایک ایسا انجکشن دے دیا گیا تھا جس سے اس پر غنودگی طاری رہے۔
”یہ کچھ گھنٹے بھی آرام کر لیں تو پھر اگر انہیں گھر پر آرام مل سکتا ہے تو یہ اسپتال سے جا بھی سکتے ہیں۔“
”میں انہیں ابھی اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔“ ایک نسوانی آواز نے ڈاکٹر اور اس کے ساتھیوں کو چونکا دیا تھا۔

☆☆☆

شارق کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک سجے سجائے بیڈ روم میں پایا۔ ہلکی سی بڑبڑاہٹ نے اسے چونکا دیا۔ آواز نسوانی تھی۔ اس طرف دیکھنے کے لیے شارق کو سر نہیں گھمانا پڑا۔ اس نے آنکھیں ترچھی کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھی اس ہستی کو دیکھ لیا جس کی بڑبڑاہٹ نے اسے چونکایا تھا۔ وہ نازیہ تھی جسے دیکھ کر شارق حیران رہ گیا۔
”سچ سچ بتانا شارق!“ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ ”روحی

تمہاری صرف دوست ہے یا بات کچھ آگے نکل گئی ہے......؟ ارے......تم چپ کیوں سادھے ہوئے ہو......؟ نہ جانے کیوں میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔''

اس بڑبڑاہٹ کے بیچ میں کچھ اور الفاظ بھی تھے جو شارق کی سمجھ میں نہیں آسکے۔

روحی کا نام آتے ہی شارق چونک گیا تھا اس لیے کچھ الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔ اس کا دماغ جو پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا، یک بارگی جھنجھنا سا گیا۔ اسے یاد آیا کہ کار ایکسیڈنٹ کی وجہ وہ ٹرک تھا جس میں روحی کو اغوا کیا جا رہا تھا۔

''روحی!'' اس کے منہ سے نکلا اور وہ یک لخت اٹھا جس سے اس کے سر میں ٹیس اٹھی۔

اس کی آواز نے نازیہ کو چونکا دیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر تیزی سے شارق کے قریب آئی اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''لیٹے رہو!'' اس نے دوسرا ہاتھ شارق کی پشت پر بھی رکھ دیا تھا کہ وہ جھٹکے سے نہ لیٹ سکے۔

''روحی کو...... اغوا کیا گیا ہے۔'' شارق کی سانس پھولنے لگی۔

''مجھے معلوم ہو چکا ہے۔''

''میرا موبائل......؟''

''یہ رکھا ہے۔'' نازیہ نے اس کے سرہانے کی طرف اشارہ کیا۔ شارق نے فوراً موبائل اٹھا کر روحی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔

''اوہ شارق!'' روحی کی پُرمسرت آواز سنائی دی۔ ''بہت دیر سے تمہارا موبائل بند مل رہا تھا۔ میں بس آتی ہوں تمہارے پاس...... مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ تم کہاں ہو۔ میڈم نازیہ کے گھر پر ہو نا؟''

''ہاں۔''

''میں بس آرہی ہوں۔''

دوسری طرف سے رابطہ ختم کیے جانے پر شارق نے بھی موبائل رکھ دیا۔

''شکر ہے کہ اس سے رابطہ ہو گیا۔'' نازیہ بولی۔ ''روحی تھی نا؟''

''جی!''

''اس کا مطلب ہے کہ پولیس نے اسے بہت جلدی بازیاب کر لیا۔''

''اسے پتا چل چکا ہے کہ میں یہاں ہوں۔ وہ آرہی ہے۔''

''چلو اچھا ہے۔ مطمئن ہو جائے گی تمہیں دیکھ کر...... یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا اور اس کی بازیابی کیسے ممکن ہوئی!''

''اسے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں؟''

''اسے کسی طرح حادثے کا علم ہو گیا ہوگا۔ شاید اس نے کئی اسپتالوں کی خاک چھانی ہو اور آخر میں سرکاری اسپتال پہنچ گئی ہو۔ اسے وہیں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تم کہاں ہو۔''

''آپ وہاں کیسے پہنچ گئی تھیں اور مجھے یہاں کیوں لے آئیں؟''

''پولیس نے کسی طرح پرنسپل صاحب سے رابطہ کر لیا ہوگا۔ وہ اس وقت ایک اہم میٹنگ میں تھے اس لیے انہوں نے مجھے فون کیا کہ تم اس وقت اسپتال میں ہو اس لیے میں جا کر تمہاری خبر لوں۔ وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ تمہیں جنرل وارڈ میں منتقل کیا گیا ہے۔ میں نے ڈاکٹروں سے بات کی اور ان سے یہ بات منوالی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں۔ خود انہوں نے ایک ایمبولینس کا بندوبست کروایا۔''

''شکر ہے کہ روحی بازیاب ہو گئی!''

''تمہارے ذہن پر روحی مسلط ہے۔ اپنی کوئی فکر نہیں ہے تمہیں......! اس کا مطلب ہے کہ روحی تمہاری صرف دوست نہیں، بات کچھ آگے نکل گئی ہے۔''

شارق نے نازیہ کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی جس کی وجہ سے اس کے دماغ میں بہت سے خیالات چکرانے لگے تھے، اس لیے اس نے جھوٹ بولا۔

''وہ میری دوست ہے، صرف دوست! بہت اچھی دوست!''

شارق بہت گہری نظر سے نازیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جواب سے نازیہ نے کچھ طمانیت محسوس کی تھی۔

یہ تو ایک اور امتحان شروع ہونے والا ہے، شارق کو خیال آیا۔

''آپ مجھے اپنے ہی گھر کیوں لے آئیں؟'' اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ''میرے ہی گھر پہنچا دیتیں۔''

''وہاں تمہارا خیال کون رکھتا؟ یونی میں شاید کافی لوگ جانتے ہیں کہ تم صرف تعلیم کی غرض سے کراچی آئے ہو اور اکیلے رہتے ہو، دیگر عزیز پنجاب کے اندرون میں رہتے ہیں جہاں ان کی زمینیں ہیں۔ تمہیں بھی اپنے والد سے ورثے میں خاصی زمین ملی تھی جس کی آمدنی تمہیں ملتی رہتی ہے۔ اسی سے تم اپنے ذاتی اور تعلیمی اخراجات پورے کرتے ہو۔''

نازیہ نے کچھ زیادہ ہی وضاحت کر دی جبکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مزید کہا۔ ''ڈاکٹر نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہیں کم از کم دو گھنٹے تو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

''ہوں۔'' شارق نے اپنے سر پر بندھی بینڈج پر ہاتھ پھیرا۔

''فی الحال تم ٹینس بھی نہیں سیکھ سکتے۔'' نازیہ مسکرائی۔

''میں روحی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''اس کے دشمن تو بہت ہوں گے۔ یونی میں بھی وہ کئی کو مار پیٹ چکی ہے۔ باہر بھی لوگوں سے اس کے جھگڑے چلتے ہی رہتے ہوں گے۔ کوئی بھی اس کے ساتھ ایسی کوئی حرکت کر سکتا ہے۔ مجھے بس یہ خدشہ ہے کہ اسے......'' نازیہ بہت سنجیدہ نظر آئی۔ ''اسے کوئی جسمانی گزند نہ پہنچی ہو۔''

نازیہ کے آخری جملے میں احتیاط کا عنصر تھا۔

شارق نے کہا۔ ''اس کے اتنے قریب تو کوئی نہیں جا سکتا۔ زبردست پٹائی کر ڈالے گی وہ۔''

ان میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ روحی آگئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرے سے بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت تھک گئی تھی اور پریشان تو وہ ہوگی ہی۔

''اسپتال میں اتنا شاندار کمرا نہیں ملتا۔'' روحی نے کمرے پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہ بتاؤ کہ تم پر کیا گزری؟'' شارق نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کون لوگ تھے وہ؟''

''ان میں ایک تو فرزانہ کا باپ تھا اور دوسرا خرم۔'' روحی نے دانت پیستے ہوئے بے کم و کاست سب کچھ بتا دیا۔ یہ لحاظ بھی نہیں رکھا کہ اپنی ٹیچر کے سامنے اسے بعض باتیں کھل کر نہیں بتانا چاہیے تھیں۔

''شکر ہے کہ بات صرف دھمکی پر ٹل گئی۔'' نازیہ نے کہا۔

''ان دھمکیوں میں جو ذلت آمیز جملے استعمال کیے گئے، میں وہ کبھی نہیں بھولوں گی۔'' روحی نے غصے سے کہا۔

''ایسے معاملات میں درگزر سے کام لینا زیادہ بہتر ہوتا ہے ورنہ بات بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔'' روحی نے شانے جھٹکے، پھر شارق سے بولی۔ ''یہاں کب تک مہمان بنے رہنے کا ارادہ ہے؟''

اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ نہ چاہتی ہو کہ شارق وہاں رکے۔

نازیہ بولی۔ ''شاید تم ابھی تک اپنے گھر نہیں گئی ہو۔''

''دماغ تو شارق میں الجھا ہوا تھا۔ میں ابھی ڈیڈ کو

دوسرا افائر

فون کرتی ہوں۔"

"ایک بات اور سن لو۔" نازیہ نے کہا۔ "پولیس پہنچ چکی ہوگی وہاں۔ شارق نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے تمہارے اپارٹمنٹ کا نام بھی بتا دیا تھا۔ اپارٹمنٹ کا نمبر شارق کو بھی نہیں معلوم لیکن پولیس پتا لگا لے گی۔"

روحی کے چہرے پر تشویش کے آثار دکھائی دیے۔

وہ کچھ بولے بغیر موبائل پر نمبر ملانے لگی۔

گفتگو تین منٹ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ پھر روحی نے شارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پولیس نے ان سے خاصی پوچھ گچھ کی تھی لیکن وہ کیا بتا سکتے تھے۔ وہ کیا جانیں کہ میرا دشمن کون ہوسکتا ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ پہلے پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ لکھواؤں اور اپنا پورا بیان دوں۔"

"مناسب مشورہ ہے۔" شارق نے کہا۔

نازیہ نے سر ہلا کر اس کی تائید کی پھر پوچھا۔ "بیان کیا دو گی؟"

"یہی سوچ رہی ہوں۔"

"میں اس سلسلے میں یہ مشورہ دوں گی کہ فرزانہ کے باپ اور خرم کا حوالہ مت دینا۔ بس اتنا کہنا کہ تمہیں حبس بے جا میں رکھا گیا اور پھر کسی قسم کی بات کیے بغیر چھوڑ بھی دیا جس پر تم حیران ہو کہ آخر ان کا مقصد کیا تھا!"

"بالکل صحیح مشورہ ہے۔" شارق بول پڑا۔ "ہاں اگر تم بات بڑھانا ہی چاہتی ہو تو اس بارے میں بعد میں سوچ لینا۔ فی الحال یہی بیان ٹھیک رہے گا۔"

"تم یہاں کب تک مہمان رہو گے؟"

شارق کا نازیہ کے گھر میں رہنا روحی کو بہت کھٹک رہا تھا۔

"اگر تم انہیں اپنے گھر میں رکھ سکتی ہو تو......"

"اپنے گھر میں تو نہیں رکھ سکتی۔" روحی نے نازیہ کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر یہیں رہنا ہوگا۔ انہوں نے اپنے فلیٹ میں کوئی ملازم بھی نہیں رکھا اور پھر ملازمین پر بھروسا بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

"آپ کے گھر میں تو ملازم ہوں گے لیکن ابھی آپ ہی کہہ چکی ہیں کہ ملازمین کسی مریض کی دیکھ بھال نہیں کرسکتے۔"

"میں اس بارے میں سوچتی رہی ہوں۔"

"ان کے سر کے ٹانکے کب کھلیں گے؟"

"شاید پرسوں یا اس کے اگلے دن۔" پھر مزید کہا۔ "طبیعت بہتر ہوجائے تو اس کے بعد یہ اپنے گھر جاسکیں گے۔"

"تو میں تین دن کی چھٹی لے لیتی ہوں یونی سے۔" روحی نے جلدی سے کہا۔ "صبح جب آپ یونی جاتی ہیں، اس سے پہلے آجایا کروں گی۔"

"ہاں! یہ بھی ہوسکتا ہے۔ جب میں یونی سے آجایا کروں تو تم اپنے گھر جاسکتی ہو۔"

"نہیں، میں رات تک رہا کروں گی۔"

"تمہارے والدین......؟"

"وہ میرا مسئلہ ہے۔ میں سنبھال لوں گی۔"

"ان باتوں میں اور وقت گزر گیا۔ تمہیں جلد از جلد پولیس اسٹیشن جانا چاہیے۔"

"ہاں میں چلتی ہوں۔" روحی کھڑی ہوئی۔ "صبح آجاؤں گی، بارہ ایک بجے تک تمہیں ایک فون بھی کرلوں گی۔" آخری جملہ اس نے شارق سے کہا تھا۔

"بہتر ہوگا کہ اسے آرام کرنے دو۔ اس کے لیے آرام بہت ضروری ہے۔"

روحی کے جانے کے بعد نازیہ نے ملازم کو آواز دے کر اسے کھانا لانے کی ہدایت کی اور پھر شارق سے کہا۔ "ابھی تمہیں نقل و حرکت نہیں کرنی چاہیے۔"

"آپ نے کھالیا؟"

"تمہاری پریشانی میں مجھے بھوک ہی نہیں لگی۔ اب تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گی۔"

"بہت زحمت اٹھائی آپ نے میرے لیے۔"

"کوئی زحمت نہیں ہوئی۔"

"تھکن کی وجہ سے آپ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئی تھیں اور کچھ بڑبڑا بھی رہی تھیں۔"

"کیا بڑبڑا رہی تھی؟" نازیہ نے کچھ گھبرا کر پوچھا۔

"میں ٹھیک سے نہیں سن سکا۔" شارق نے جھوٹ بولا پھر اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے جواب سے نازیہ نے کچھ اطمینان محسوس کیا تھا۔

بعد میں اس نے باتیں کرتے ہوئے بھی شارق سے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ روحی اور وہ ایک دوسرے سے محبت تو نہیں کرتے......؟ یہ سوال اس نے واضح طور پر نہیں کیا تھا لیکن جو کچھ کہا تھا، اس کا مطلب یہی تھا۔

شارق نے اس سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، وہ یہی تھا کہ غالباً نازیہ اسے پسند کرنے لگی تھی۔

کھانے کی ٹرالی آئی جو اس نے ملازم ہی سے بستر کے

قریب لگوادی اور بستر سے اٹھنے میں شارق کو سہارا بھی دیا۔
شارق کو اس کا یہ انداز بھی محبت آمیز لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ نازیہ کو ٹٹولے۔
کھانے کے دوران میں اس نے کہا۔ ''خرم سے علیحدگی کے بعد آپ صرف ملازمین کے ساتھ رہنے پر کیوں مجبور ہیں؟''
''تمہارے ہی جیسا معاملہ میرا بھی ہے۔'' نازیہ نے کھانے میں اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا بھی کوئی قریبی عزیز نہیں ہے اور جو ہیں وہ دور دراز کے شہروں میں رہتے ہیں۔ کچھ امریکا اور لندن میں بھی ہیں لیکن میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے خرم سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔''
''اس طرح اپنی زندگی کب تک گزاریں گی؟''
''کچھ سوچ رہی ہوں لیکن ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔'' نازیہ نے کہا، پھر ہنس کر بولی۔ ''ہم دونوں بہت دوستانہ انداز میں باتیں کررہے ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا بھی ہے۔ شاگرد اور استاد دوست بن جاتے ہیں۔ کیا میں سمجھ لوں کہ ہم دونوں دوست بن گئے ہیں؟''
''اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے۔'' شارق نے دھیمی آواز میں کہا۔
ایک بار پھر اسے وہ خیال آیا جو ایک بار آچکا تھا کہ یہ تو اس کا ایک اور امتحان شروع ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے۔ ایک طرف روحی تھی اور دوسری طرف نازیہ کا کردار ایک مخصوص انداز میں ابھر کر سامنے آرہا تھا۔
''تو اب۔'' نازیہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم بھی مجھے آپ کہنا چھوڑ دو۔ تم کہا کرو۔''
''یہ شاید آسان نہ ہو میرے لیے۔''
''دھیرے دھیرے عادت پڑ جائے گی لیکن فی الحال دوسروں سے یہ بات چھپانا ہوگی ورنہ لوگ باتیں بنانے لگیں گے۔''
''فی الحال سے آپ کی کیا مراد ہے؟''
''آگے چل کر شاید اس کی ضرورت نہ رہے۔''
معنی خیز جملہ تھا جس پر بات آگے بڑھانا شارق نے مناسب نہیں سمجھا۔
نازیہ پھر بولی۔ ''امکان ہے کہ میں پاکستان چھوڑ دوں۔ کسی مغربی ملک میں چلی جاؤں۔''
''پاکستان سے دل بھر گیا ہے کیا؟''
''یہ بات نہیں۔'' نازیہ نے کہا۔ ''شاید باہر جانا وقت کی ضرورت بن جائے۔''
''وقت کی ضرورت'' بھی معنی خیز الفاظ تھے۔
''یوں بھی زندگی سے دل بھی بھر گیا ہے۔'' نازیہ پھر بول پڑی۔ ''خود پر جبر کرنا پڑتا ہے یونی جانے کے لیے۔ شاید اس جبر کی وجہ سے ہی بیمار پڑی تھی۔ اس کے علاوہ دنیا گھومنے کا دل بھی کرتا ہے۔''
انہی باتوں میں کھانا کھالیا گیا۔ اس کے بعد نازیہ نے شارق کو ایک ٹیبلٹ کھلائی اور کہا۔ ''اب سونے کی کوشش کرو۔''
''جی۔'' شارق نے مختصر جواب دیا۔
آنکھیں بند کرنے کے بعد وہ فوراً نہیں سوسکا۔ روحی اور نازیہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگرچہ نازیہ نے کھل کر کچھ نہیں کہا تھا لیکن پھر بھی بہت کچھ تو کہہ دیا تھا۔ سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔
جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ نازیہ اسی کمرے میں تھی۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔
''ارے!'' شارق کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
نازیہ غالباً بہت ہوشیار نیند سوتی تھی۔ شارق کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔
''اٹھ گئے؟'' وہ مسکرائی۔
''آپ بھی یہیں سوگئیں؟''
''آپ؟'' نازیہ نے تیوری چڑھائی۔
شارق نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''عادت بدلنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔''
''میں فریش ہو جاؤں۔'' نازیہ اٹھی اور اسی کمرے کے باتھ روم میں چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے ملازم کو آواز دے کر ناشتے کے لیے کہہ دیا تھا۔
وہ دونوں ناشتا کررہے تھے کہ روحی آگئی۔
''بروقت آگئیں تم!'' نازیہ نے اس سے کہا۔ ''اب میں یونی جانے کی تیاری کروں گی۔ آؤ ناشتا کرلو۔''
''کر کے آئی ہوں۔''
''ایک کپ چائے ہی پی لو۔ ہمارے ساتھ شریک تو ہو جاؤ۔''
روحی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''پولیس اسٹیشن پر کیا بیتی؟'' نازیہ نے اس سے پوچھا۔
''جیسا آپ نے کہا تھا، میں نے ویسا ہی کہا۔ پولیس نے اپنے معمول کے مطابق کہا کہ جلد ہی اغوا کرنے والوں کا سراغ لگالیں گے۔''

''اور گھر پر...... والدین سے کیا کہا؟''
''انہیں تو میں نے سب کچھ سچ سچ بتادیا۔''
''پریشان ہوگئے ہوں گے؟''
''فطری بات ہے میڈم!''
ناشتا کر کے نازیہ کمرے سے چلی گئی۔ روحی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔
''کہاں ہو؟'' شارق نے اسے ٹوکا۔
وہ چونکی، پھر بولی۔ ''میڈم سے کیا باتیں ہوتی رہیں؟''
''کوئی خاص نہیں۔'' شارق اس کے علاوہ کیا کہتا۔
''موضوع زیادہ تر تو تمہارے اغوا کا رہا۔ انہیں تشویش ہے کہ آئندہ فرزانہ کے باپ کا رویہ کیا رہے گا۔''
''ایسی کی تیسی اس کی۔'' روحی نے سر جھٹکا۔
''مناسب ہوگا کہ یونی میں تم مجھ سے قریب نہ ہونا۔''
''ڈی ایس پی کی وجہ سے؟''
''ہاں۔''
اس نے پھر ڈی ایس پی کی ''ایسی کی تیسی'' کی اور بتایا۔ ''میں نے ڈیڈ سے کہا کہ مجھے ریوالور کا لائسنس دلادیں۔ عام حالات میں شاید وہ میری یہ بات نہ مانتے لیکن انہوں نے وعدہ کرلیا کہ احتیاط ضروری ہے۔ بہت جلد لائسنس بھی دلوادیں گے اور ریوالور بھی خرید لیا جائے گا۔''
''تم ریوالور چلانا جانتی ہو؟'' شارق نے ہنس کر پوچھا۔
''تو کیا نہیں جانتی!''
''کہاں سیکھا تھا؟''
''کہیں تو سیکھا ہی ہوگا۔ تم ان باتوں میں کہاں پڑ گئے؟''
''پھر کن باتوں میں پڑوں......؟''
سوال در سوال میں کچھ وقت گزرا تھا کہ نازیہ آگئی' وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نازیہ نے روحی سے کہا۔ ''تم اس کے ساتھ کچن کا ایک چکر لگالو۔ دیکھ لو کہ کہاں کیا ہے۔ کسی وقت کسی بھی چیز کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ ویسے تم اس سے بھی مدد لے سکتی ہو۔''
''بہتر میڈم!'' روحی کھڑی ہوگئی۔

☆☆☆

شارق کے سر پر ضرب تو شدید لگی تھی جس نے اسے بے ہوش کردیا تھا لیکن معجزانہ طور پر زخم اتنا گہرا نہیں لگا تھا کہ زیادہ وقت لیتا۔ دو دن بعد وہ نازیہ کے گھر سے اپنے فلیٹ میں منتقل ہوگیا۔
خود نازیہ اپنی کار میں شارق اور روحی کو وہاں چھوڑنے آئی تھی۔
''مائی گاڈ!'' روحی کے منہ سے نکلا۔ ''یہ تمہارا گھر ہے یا کباڑ خانہ؟ کوئی چیز بھی ڈھنگ سے نہیں رکھی۔''
''اکیلے رہنے والے ہر مرد کا گھر تمہیں ایسا ہی ملے گا۔''
''دو تین گھنٹے تو لگ جائیں گے سب ٹھیک کرنے میں مجھے۔''
''ارے چھوڑو۔ سب ٹھیک ہے۔''
لیکن روحی نے اس کی بات نہیں مانی۔ فلیٹ کی صفائی اور چیزوں کو ڈھنگ سے رکھنے میں اسے ڈھائی گھنٹے لگ گئے تھے۔
''اب واپسی پر میں سب کچھ اسی طرح دیکھوں!'' وہ بولی۔
''واپسی؟ کیا مطلب؟''
''مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے۔'' روحی نے کہا۔ ''ڈیڈ کے ایک بھائی لاہور میں رہتے ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ ان کی طبیعت تشویش ناک حد تک خراب ہوگئی ہے۔ ڈیڈ اور مام کا وہاں جانا تو ضروری ہے ہی لیکن وہ مجھے یہاں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد فلائٹ ہے۔ ڈیڈ نے تین سیٹیں بک کروالی ہیں۔''
''واپسی کب ہوگی؟''
''اس کا انحصار تو انکل کی حالت پر ہے لیکن تم سے میں فون پر رابطہ رکھوں گی۔ میری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر بہک نہ جانا۔''
''میں کیا بہک سکتا ہوں۔''
''میڈم کی طرف سے ذرا محتاط رہنا۔''
''کیا کہہ رہی ہو؟'' شارق نے تعجب کا اظہار کیا۔
''صحیح کہہ رہی ہوں۔'' روحی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے تمہارے معاملے میں میڈم کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔''
''وہم ہے تمہارا۔'' شارق نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ بس محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ ہم دونوں نے ان کا ساتھ دیا تھا اس لیے وہ ہم دونوں کے قریب ہوگئی ہیں۔''
''بس زیادہ قریب نہ ہوجائیں۔''
''اپنے دماغ سے یہ خیال نکال دو۔''
''اچھا اب میں چلتی ہوں، بتایا ہے نا ابھی کہ فلائٹ کا وقت قریب ہے۔ گھر پہنچ کر میں اپنے ایک ملازم کو یہاں بھیج دوں گی۔ اسلم نام ہے اس کا۔ وہ ہر طرح تمہارا خیال رکھے گا اور فلیٹ کی صفائی وغیرہ بھی اسی کی ذمے داری ہوگی بشرطیکہ تم نے اسے روکا ٹوکا نہیں۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے روحی......! میں خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔ کل سے یونی بھی جاؤں گا۔''

''چند دن کے لیے آئے گا وہ یہاں۔'' روحی نے کہا۔ ''مجھے اگر جانا نہ پڑتا تو میں اس بارے میں نہیں سوچتی۔ بس اب چلتی ہوں۔ بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس معاملے میں۔ وہ تو تمہارا خیال رکھے گا ہی لیکن تم بھی اپنا خیال رکھنا۔''

''بڑے بوڑھوں کی طرح نصیحت کر رہی ہو مجھے!''

''اچھا بس...... بائے!''

روحی چلی گئی اور شارق سوچتا رہ گیا کہ یہ اچھا ہوا ہے یا برا......! روحی بہت تیز بین تھی۔ اس نے نازیہ کی آنکھوں ہی میں کچھ پڑھ لیا ہوگا۔ شارق کو تو ان دو دنوں میں نازیہ کے رویے سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اسے محبت کرنے کی حد تک پسند کرنے لگی تھی۔

اس اچھی عورت کا دل توڑنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ شارق ان دنوں میں سوچتا رہا تھا لیکن اس معاملے کو وہ کس طرح سنبھالے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ بہت دیر تک اس معاملے پر غور کرتا رہا اور مختلف النوع خیالات اس کے دماغ میں ہجوم کرتے رہے۔ اسے گزشتہ روز کی بات بھی یاد آئی۔ نازیہ نے اس کی عمر پوچھی تھی اور بتایا تھا کہ وہ اس سے دو سال بڑی ہے۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' اس نے یہ بھی کہا تھا۔

''دوستوں میں عمروں کا فرق تو ہوتا ہی ہے۔''

شارق نے اس بات سے بھی کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کی تھی۔

دوسرے دن وہ یونیورسٹی گیا تو سلامت نے اس سے کہا۔ ''مجھ سمیت یونی کے کئی ساتھی تمہیں دیکھنے اسپتال گئے تھے لیکن معلوم ہوا تھا کہ میڈم نازیہ تمہیں اسپتال سے لے گئی تھیں۔ روحی بتا چکی ہے کہ وہ بھی میڈم کے گھر جا کر تمہاری دیکھ بھال کرتی رہی ہے۔ ہمیں میڈم کے گھر آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ روحی سے معلوم بھی ہوتا رہا کہ تمہاری حالت خراب نہیں ہے۔''

''ہاں! ان دونوں نے میرا بہت خیال رکھا۔''

''روحی کو تو اب خیال رکھنا ہی چاہیے لیکن میڈم اب تم پر بہت مہربان ہو گئی ہیں۔'' اس کے لہجے میں سنسنی خیزی تھی جو اس جملے سے اور بڑھی کہ میڈم اب خلع بھی لے چکی ہیں۔ شارق یہ بات ٹال گیا۔

اگرچہ زیادہ گرمیوں کا زمانہ نہیں تھا لیکن یونیورسٹی سے واپسی پر کسی وجہ سے شارق نے زیادہ گرمی محسوس کی......

''کھانا لاؤں صاب؟'' ملازم اسلم نے پوچھا جو روحی کے کہنے کے مطابق گزشتہ شام ہی آ گیا تھا۔

''کھانا بھی بنا لیتے ہو؟''

''اگر کبھی خانساماں چھٹی کر جاتا ہے تو میں اس کے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔''

''میرے لیے کھانا کیسے بنا لیا؟ گھر میں کوئی سامان تو نہیں تھا۔''

''آپ یونی گئے تھے تو میں سب کچھ بازار سے خرید لایا تھا۔ بی بی روحی مجھے پیسے دے گئی تھیں۔''

''اچھا خیر! میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے لسی بنا دو۔ کچن کا سامان تو تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا!''

''بہت تیز اے سی چلا لیا ہے آپ نے۔'' اسلم نے اسپلٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''موسم بدل رہا ہے۔ ایسے میں احتیاط برتنی چاہیے۔'' روحی اسے ہدایت کر گئی تھی کہ وہ شارق کا ہر طرح خیال رکھے۔ ''اس موسم میں لسی بھی......؟'' اس نے مزید کہنا چاہا۔

''تم سے جو کہا جا رہا ہے، وہ کرو۔'' شارق نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے اسلم کی بات کاٹ دی۔

''جی بہتر۔'' اسلم چلا گیا۔

لسی پی کر وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا تو اسے نیند آ گئی۔

کئی گھنٹے بعد وہ اٹھا تو اس نے کچھ بخار محسوس کیا۔ اس نے فوراً اے سی بند کر کے چادر اوڑھ لی اور ایک دراز سے تھرما میٹر نکال کر اپنا ٹمپریچر چیک کیا۔ معلوم ہوا کہ معمولی سی حرارت تھی جس کو اس نے زیادہ محسوس کیا تھا۔ اس نے دو ٹیبلٹ نکال کر کھا لیں۔ اس قسم کے چھوٹے موٹے امراض کی دوائیں وہ ضرور رکھا کرتا تھا۔

اسلم کو آواز دے کر اس نے چائے بنانے کے لیے کہا۔

چھ بجے کے قریب روحی کا فون آیا۔ ''سب ٹھیک ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔ ''اسلم خیال رکھ رہا ہے نا ہر بات کا؟''

''کچھ زیادہ ہی خیال رکھ رہا ہے۔'' شارق نے منہ بنایا۔

''وہ کیسے؟''

''ارے چھوڑو۔ تم بتاؤ، تمہارے انکل کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''زیادہ خراب ہوئی ہے۔ اس لیے دن میں تمہیں فون نہیں کر سکی۔ ڈیڈ نے انہیں ہاسپٹلائز کر دیا ہے، اسی میں خاصا وقت گزر گیا۔ میں اس وقت بھی اسپتال میں ہوں۔''

روحی جلدی میں تھی اس لیے اس نے زیادہ بات کیے

بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔
رات تک بھی شارق نے اپنی طبیعت بہتر محسوس نہیں کی لیکن اس نے اس کی پروا کیے بغیر کھانا کھالیا۔ دوپہر کو نہ کھانے کی وجہ سے شدید بھوک تھی۔
لیکن اس حالت میں کھانا ہی اسے نقصان دے گیا۔ صبح اسے تیز بخار نے آلیا۔ اسلم سے اس نے کچھ نہیں کہا ورنہ اس کی بک بک سننی پڑتی۔ اس نے سلامت کو فون کیا۔
''یار! میں آج یونی نہیں آسکوں گا۔ خاصا بخار ہو گیا ہے اچانک۔''
''ڈاکٹر کو دکھایا؟'' سلامت نے جلدی سے پوچھا۔
''اتنی صبح ڈاکٹر کہاں ملتے ہیں۔ ویسے قریب میں ایک کلینک ہے۔ ڈاکٹر دس بجے آتا ہے۔ اس سے اچھی خاصی واقفیت ہے۔ اسلم کو بھیج کر اسے بلوالوں گا۔''
''یہ اسلم کون ہے؟''
''روحی اپنے گھر کا ایک ملازم مسلط کر گئی ہے مجھ پر۔''
''احتیاط برتنا، کوئی اوندھی سیدھی چیز نہ کھالینا۔ میں یونی کے بعد گھر سے ہو کر آؤں گا تمہارے پاس۔''
شارق نے قریبی کلینک سے ڈاکٹر کو بلوالیا۔ جس نے نسخہ لکھ کر دیا اور چند ہدایت بھی کی۔
اسلم دوائیں لے آیا جو شارق نے نسخے میں درج ہدایات کے مطابق استعمال کرنی شروع کر دیں۔ دوپہر کے بعد اس نے طبیعت میں کچھ بہتری محسوس کی۔
کال بیل کی آواز سن کر اس نے سمجھا کہ سلامت آیا ہوگا لیکن اسلم نے آکر اطلاع دی کہ یونیورسٹی ... کی کوئی ٹیچر آئی ہیں اور اپنا نام نازیہ بتا رہی ہیں۔
مارے گئے۔ شارق نے دل میں کہا۔ روحی کو ملازم کے ذریعے اس کا علم ہو جائے گا۔
بخار کم ہونے کے باوجود شارق نقاہت محسوس کر رہا تھا اس لیے ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے نازیہ کو بیڈ روم میں ہی بلالیا۔
''کیسے ہو شارق؟'' نازیہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تیزی سے آگے آتے ہوئے بولی تھی۔ ''یونی میں معلوم ہوا تھا کہ تمہاری طبیعت کچھ ناساز ہے۔ یونی ختم ہوتے ہی سیدھی یہاں آگئی۔'' اس نے بستر کے بالکل قریب آکر شارق کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''اب تو سو سے زیادہ ٹمپریچر نہیں معلوم ہوتا۔''
نازیہ نے اپنا وینٹی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے لیے اوٹس بھی لیتی آئی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ویسے بھی زیادہ مفید ہوتا ہے۔ یہ ملازم تم نے کب رکھا؟''
''روحی نے اپنے گھر کا ملازم بھیج دیا ہے۔''
''ہاں! معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی عزیز کی بیماری کی وجہ سے اچانک لاہور چلی گئی ہے۔''
''جی، اس وقت آپ...... سوری...... میڈ...... میرا مطلب ہے نازیہ......! تم نے خوامخواہ اتنی زحمت کی۔''
شارق خفیف سا مسکرا دیا۔
نازیہ پھر بولی۔ ''ملازم کا ہونا اچھا ہوا۔ کوئی تو ہو خبر گیری کرنے والا۔ روحی واقعی تمہاری بہت ہی اچھی دوست ہے۔'' نازیہ نے ملازم کو اوٹس بنانے کی ہدایت کی۔
شاید اب کسی شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ شارق نے سوچا۔ نازیہ یقیناً اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ اتنے میں کال بیل کی آواز سنائی دی۔
''اب سلامت آیا ہوگا۔'' شارق کے لہجے میں تشویش تھی۔
''یہ تو ٹھیک نہیں ہوگا کہ وہ مجھے یہاں دیکھے۔'' نازیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نہیں چاہتی تھی کہ ابھی یہ بات کھلے۔''
اس وقت بھی شارق نے لفظ 'ابھی' کو خاصا معنی خیز سمجھا۔
''خیر!'' نازیہ پھر بولی۔ ''مجبوری ہے۔''
لیکن خیریت ہی رہی۔ ملازم اسلم نے آکر بتایا کہ کسی نے غلطی سے گھنٹی بجادی تھی۔ اسے کسی اور فلیٹ میں جانا تھا۔
''شکر ہے۔'' نازیہ نے اطمینان کی سانس لی۔ ''کیا سلامت آنے والا ہے؟''
''ہاں۔ اس نے فون پر کہا تھا کہ اپنے گھر سے ہو کر آئے گا۔''
''بس تو اب میں چلتی ہوں۔ شام کو چکر لگاؤں گی۔ فون کرلوں گی آنے سے پہلے۔''
وہ فوراً چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ملازم نے آکر کہا۔
''صاحب! اس وقت میں نے جھوٹ بولا تھا۔ دراصل آپ کے دوست سلامت صاحب آئے تھے کوئی۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ آپ کی کوئی ٹیچر بھی آئی ہوئی ہیں تو وہ کچھ گھبرا گئے۔ مجھ سے کہا کہ جا کر یہ جھوٹ بول دو۔ میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔''
شارق ایک طویل سانس لے کر رہ گیا پھر پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ سلامت آگیا۔
''پہلے بھی میں ہی آیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''معلوم ہو چکا ہے مجھے!''
''میں قریب ہی ایک جگہ چھپا کھڑا رہا تھا کہ میڈم رخصت ہوں تو آؤں۔'' سلامت نے کہا۔ ''اب تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے۔''
''ہاں سلامت۔'' شارق نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یقیناً نازیہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔''
''اوہ!'' سلامت نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ''اب تمہاری زبان پر میڈم کا نام بھی آ گیا۔''
''بات اسی حد تک بڑھ گئی ہے۔'' شارق نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر اس نے سلامت کو سب کچھ بتا دیا۔
سلامت کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''روحی کو معلوم ہو گا تو نہ جانے کیا ہو......! تم جانتے ہو کہ وہ عجیب ہی مزاج کی لڑکی ہے۔''
''میں خود پریشان ہوں۔ شاید مجھ سے ہی غلطی ہوئی ہے۔ میں نے نازیہ پر ظاہر کیا تھا کہ روحی میری صرف دوست ہے۔ مجھے چاہیے تھا کہ حقیقت بتا دیتا۔ اس صورت میں شاید حالات مختلف ہوتے۔''
''تو اب ازالہ کرو اس غلطی کا۔ بتا دو میڈم کو کہ پہلے تم نے جھوٹ بولا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم اور روحی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔''
''تمہارا مشورہ درست ہے لیکن مجھے اب یہ بات کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔''
''تمہیں ہمت کرنا پڑے گی شارق!'' سلامت نے زور دے کر کہا۔ ''ورنہ آگے چل کر معاملات کسی بھی اعتبار سے خراب ہو سکتے ہیں۔ یہ میں روحی کے مخصوص کردار کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔''
شارق سوچ میں پڑ گیا۔ ''ہاں یار یہ بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''
''روحی فون کر کے اپنے ملازم سے پوچھ سکتی ہے کہ تم سے ملنے کون کون آ رہا ہے۔ اسے میڈم کے بارے میں معلوم ہو سکتا ہے۔''
شارق نے کچھ سوچا، پھر نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''اسلم سے تو اسے معلوم نہیں ہو گا۔ میں نے روحی کو جس حد تک سمجھا ہے اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ ملازمین کو منہ نہیں لگاتی ہو گی۔''
''اچھا ہے اگر ایسا ہو۔''
''تم بھی اس معاملے سے پریشان ہو گئے ہو؟''
''پریشانی کی بات تو ہے شارق......! روحی کے کردار کو سامنے رکھو تو پریشانی ضرور ہو گی۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ تو نہ جانے کیا گل کھلے......! تمہیں جلد از جلد میڈم کو صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔''
''دیکھوں گا۔'' شارق نے سوچتے ہوئے کہا۔
ان دونوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ روحی کا فون آ گیا۔ اس سے چند منٹ بات کرنے کے بعد شارق نے سلامت کو بتایا۔ ''اس کے چچا کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اسے کچھ زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں واپسی میں......اور ہاں! اس نے یہ خاص طور پر پوچھا تھا کہ میڈم تو نہیں آئیں تم کو دیکھنے؟''
''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔ شکی مزاج ہے روحی کا۔''
''دیکھو کیا ہوتا ہے۔''
''تم اس معاملے میں مجھے کچھ کنفیوژ معلوم ہو رہے ہو۔''
''میں سمجھا نہیں۔''
''تم فیصلہ نہیں کر پا رہے ہو کہ روحی کو قبول کرو یا نازیہ کو!''
''میں اس معاملے میں واقعی پریشان ہو گیا ہوں۔''
''مبہم جواب ہے تمہارا۔''
''کیا تم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟''
شارق نے منہ بنایا۔
''کیا فلموں پر تبصرے کروں؟'' سلامت نے بھی منہ بنایا۔
''کوئی حرج نہ ہو گا۔'' شارق نے ہنس کر کہا۔
کچھ دیر بعد سلامت چلا گیا۔ تیسرے پہر کے قریب نازیہ کا فون آیا۔
''رات کو تم عموماً کس وقت کھانا کھاتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''نو دس بجے کے درمیان۔۔۔۔ کیوں؟''
''میں اسی وقت آؤں گی۔ ایک خاص مغل ڈش بنائی ہے میں نے۔ لے کر آؤں گی، ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔''
''ٹھیک ہے۔''
دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
شارق پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ روحی اور نازیہ کا موازنہ کر رہا تھا۔ نازیہ اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک نو بجے آ گئی۔
جب دونوں کھانا کھا رہے تھے تو روحی کا فون آیا۔ اس کے لہجے میں کچھ افسردگی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے چچا کا انتقال ہو گیا ہے اس لیے اب وہ سوئم یا دسویں کے بعد

آسکے گی۔ شارق اس سے کبھی ملا بھی نہیں تھا لیکن رسماً اسے تعزیتی الفاظ تو کہنا ہی تھے۔
بات ختم کرنے کے بعد اس نے نازیہ کو بھی بتادیا۔
"اس کا فون آیا تھا میرے پاس...... کسی وقت تعزیت کرلوں گی۔"
"کم از کم میرے حوالے سے نہ بتانا۔"
"کیا نہ بتانا؟"
"یہی کہ اس کے چچا کا انتقال ہوگیا ہے۔"
"کیوں؟"
"بہتر یہی ہوگا۔"
نازیہ چپ ہوکر کچھ سوچنے لگی۔
"موتی پلاؤ میرے لیے ایک بالکل نئی چیز ہے۔"
"مزے کا لگا؟"
"بہت۔"
"میں تمہیں اور بھی نئی نئی چیزیں کھلاتی رہوں گی۔"

☆☆☆

اور پھر بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ کبھی کسی بڑے ہوٹل میں ڈنر کیا جاتا تو کبھی کسی اچھے ڈھابے پر پائے کھائے جاتے...... کبھی چھٹی کے دن پکنک منائی جاتی تو کبھی لانگ ڈرائیو پر نکل لیا جاتا۔ نازیہ نے شارق کی تصویریں بھی بہت کھینچیں، سیلفیز بھی بنائی گئیں۔ غرض ہر طرح سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ بس یونی میں احتیاط برتی جاتی تھی۔ وہاں وہ شارق سے بہت ریزرو رہتی۔ باہر نکلنا ہوتا تو وہ حجاب میں ہوتی تھی تاکہ پہچان لینے والوں سے بچی رہے۔

روحی کا فون آچکا تھا کہ وہ چچا کے دسویں کے بعد ہی واپس آسکے گی اس لیے شارق کو بہت آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ نازیہ کے معاملے میں وہ بھی سنجیدہ ہوتا چلا گیا تھا۔ اس کی دانست میں کچھ باتیں نازیہ کو روحی پر فوقیت دیتی تھیں۔ وہ امیر تو تھی ہی لیکن اس کا اسٹیٹس بہت اچھا تھا۔ جہاں جاتی تھی، ہاتھوں ہاتھ لی جاتی تھی۔

دس دن اسی طرح گزر گئے اور وہ اس سے بے خبر رہے کہ کئی موقعوں پر دو آنکھیں ان کی نگراں رہی تھیں۔

دسویں دن شارق نے اپنے ہی گھر میں نازیہ سے کہا۔ "روحی شاید کل یا پرسوں آجائے۔"

"وہ تمہاری بہت اچھی دوست ہے۔ اس سے کچھ چھپانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ایسا تو ہے کہ ابھی تک ہم نے ایک دوسرے سے اظہارِ محبت نہیں کیا لیکن جو وقت ساتھ گزارا ہے، کیا وہ محبت کا اظہار نہیں تھا۔ آج میں تم سے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ میں تمہیں بہت شدت سے چاہنے لگی ہوں۔"

نازیہ نے پہلی مرتبہ اتنی صاف گوئی اختیار کی تھی لیکن شارق بالکل چپ رہ گیا تھا۔
"کیوں؟" نازیہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔
"کچھ...... کچھ نہیں۔" شارق کے لہجے میں لکنت آگئی۔
نازیہ سنجیدہ نظر آئی، پھر بولی۔ "میں نے ان دنوں میں محسوس کیا ہے کہ میں تمہارے دل میں گھر کرچکی ہوں۔ اسی لیے آج اتنی صاف صاف بات کر بیٹھی۔ کیا میں غلط فہمی کا شکار ہوگئی ہوں شارق؟"
"یہ بات نہیں۔" شارق نے آہستہ سے کہا۔ "پریشانی کچھ اور ہے۔"
"بات تم نے روحی کی چھیڑی تھی لیکن تم بتا چکے ہو کہ تم اس کے صرف دوست ہو۔"
"لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔"
"اوہ!" نازیہ کے منہ سے نکلا۔
"اسی لیے مجھے خطرہ ہے کہ وہ تمہاری دشمن بن جائے گی۔ اس کے مزاج سے تو تم واقف ہی ہو۔"
"یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"
"ضروری نہیں سمجھا تھا۔" شارق کی نظریں جھک گئیں۔
"ضروری تھا شارق! عین ممکن تھا کہ میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی لیکن اب میرے جذبات سب حدیں پار کرچکے ہیں۔ میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کیا تم میری زندگی کھنڈر بنانا پسند کروگے؟"
"نہیں، ہرگز نہیں۔"
"وعدہ؟" نازیہ پہلی مرتبہ شارق کے بالکل قریب آبیٹھی اور اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر دوسرا ہاتھ شارق کی طرف بڑھا کر دوبارہ بولی۔ "وعدہ؟"
شارق نے کوئی لفظ کہے بغیر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
"اب ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔" نازیہ بولی۔
"میں نے ابھی تمہیں ایک خطرے سے آگاہ کیا تھا۔"
"روحی کے؟"

’’ہاں! وہ تمہاری دشمن بن جائے گی۔‘‘
’’کیا مجھے گولی ماردے گی؟‘‘
’’یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کرے گی لیکن مجھے یہ گوارا نہیں کہ تم کسی خطرے میں پڑو۔‘‘
’’اگر تمہیں اس بارے میں زیادہ پریشانی ہے تو اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔‘‘
شارق سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
نازیہ بولی۔ ’’میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں پاکستان چھوڑنا چاہتی ہوں۔ کسی مغربی ملک میں مجھے شہریت مل جائے گی۔ میں خاصا بڑا سرمایہ وہاں منتقل کرسکتی ہوں۔ ابھی ابھی میرے ذہن میں یہ خیال آیا ہے کہ میرے ساتھ تم بھی پاکستان چھوڑ دو۔ میرے ساتھ چلے چلو۔ مجھے تو روحی سے کوئی خوف نہیں ہے لیکن تم پریشان رہو گے۔ اس پریشانی سے بچنے کے لیے تم میرے ساتھ جاسکتے ہو۔ کسی مغربی ملک میں روحی میرا کیا بگاڑ سکتی ہے!‘‘
’’بات تو تمہاری سمجھ میں آتی ہے لیکن اس میں وقت تو لگے گا۔ روحی کل یا پرسوں آجائے گی۔‘‘
’’پاسپورٹ بنوایا ہے تم نے؟‘‘
’’ایک بار کچھ دوستوں نے بنکاک کی تفریح کا پروگرام بنایا تو میں نے پاسپورٹ بنوالیا تھا۔‘‘
’’ویزا میں ایک دن میں لگوا سکتی ہوں۔ شہریت حاصل کرنے کے سلسلے میں کچھ کارروائیاں ہوں گی لیکن میں وہ بھی جلد از جلد کرانے کی کوشش کروں گی۔‘‘
’’چند دن تو لگ ہی جائیں گے۔‘‘
’’کہا نا کہ جلد از جلد کرانے کی کوشش میری ذمے داری ہے۔‘‘
’’ان چند دنوں میں بھی میرا ذہن بہت منتشر رہے گا۔‘‘
’’اس سے بچنے کے لیے تم چند دن کے لیے اپنے عزیزوں سے ملنے چلے جانا۔ تم نے بتایا تھا شاید کہ وہ بھی لاہور ہی کے مضافات میں کہیں رہتے ہیں۔ وہاں جاکر تم اپنی وہاں کی زمین بھی بیچ آؤ۔‘‘
شارق نے پُرتفکر انداز سے اثبات میں سر ہلادیا۔
اگرچہ نازیہ کی منصوبہ بندی میں کوئی جھول نہیں تھا لیکن چند دن کا وقفہ ہی شارق کو خاصا پریشان کن محسوس ہورہا تھا۔ نازیہ کے جانے کے بعد بھی شارق خاصی دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب وہ سونے کے ارادے سے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ سلامت کی کال آگئی۔
’’خیریت! اتنی رات کو؟‘‘ شارق کے منہ سے نکلا۔
’’کل چھٹی ہے نا ـــ! تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ کل صبح دس بجے کے قریب۔ کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ـــ؟ میرا مطلب ہے اس وقت کوئی اور تو آنے والا نہیں ہے؟‘‘
سلامت کا اشارہ صریحاً نازیہ کی طرف تھا لیکن شارق نے اس پر توجہ نہیں دی اور کہا۔ ’’تم آسکتے ہو۔‘‘
دوسرے دن دس بجنے میں دو چار منٹ باقی ہی تھے کہ سلامت آگیا۔
’’مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے۔‘‘ شارق نے اس سے کہا۔ ’’چند دن کے لیے یونی سے چھٹی کررہا ہوں۔ اپنی زمینوں پر جاؤں گا۔‘‘
’’خوب!‘‘ سلامت عجیب سے انداز سے مسکرایا۔
’’شاید روحی واپس آنے والی ہے۔‘‘
’’یہ کیا بات ہوئی؟ میرے جانے کا روحی کی آمد سے کیا تعلق؟‘‘
’’اس کا میں کوئی مضبوط جواب نہیں دے سکتا۔ بس یوں ہی گمان ہوا کہ تم چند دن کے لیے روحی سے بچنا چاہتے ہو اور کیوں بچنا چاہتے ہو، یہ میں نہیں جانتا۔‘‘
’’تم کچھ عجیب سی باتیں کررہے ہو!‘‘
’’ہاں۔‘‘ سلامت نے ٹھنڈی سانس لی۔ ’’عجیب ہوں گی میری دو باتیں تمہارے لیے۔‘‘
’’معموں میں بات نہ کرو، سیدھی بات کرو۔‘‘
’’میں روحی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ سلامت نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’میں نے آج تک تم سے ایک بات اس لیے پوشیدہ رکھی کہ تم نے روحی کو جیت لیا تھا۔‘‘
’’کیا بات پوشیدہ رکھی؟‘‘
’’میرے دل میں روحی کی محبت تھی اور ہے۔‘‘
شارق چونک گیا۔
’’لیکن......‘‘ سلامت نے بات جاری رکھی۔ ’’یہ میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ اس کے دل میں اپنے لیے جگہ میں کیسے بنا سکتا ہوں۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ تم نے روحی کو جیت لیا۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے تم دونوں کے بیچ میں آنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ اپنی محبت میں اپنے سینے ہی میں دبائے ہوئے زندگی گزار دوں گا لیکن اب مجھے دکھ ہورہا ہے کہ تم روحی کو دھوکا دے رہے ہو۔‘‘
شارق نے پہلو بدلا۔ ’’کیا کہہ رہے ہو تم؟‘‘
’’میں وہی کہہ رہا ہوں جو سچ ہے۔ مجھے شبہ تو پہلے ہی ہوگیا تھا مگر ان دنوں میں نے کئی موقعوں پر تم دونوں پر نظر رکھی۔ تم اس

سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے ہو۔ مجھے جھٹلانے کی کوشش مت کرنا شارق!''

شارق چپ رہ گیا۔ سلامت پھر بولا۔

''کوئی ٹیچر اپنے شاگرد کے ساتھ اتنا وقت اسی صورت میں گزار سکتی ہے جب معاملہ کچھ آگے بڑھ گیا ہو۔''

شارق اب بھی خاموش رہا۔

''تم نے یہ اچھا نہیں کیا شارق!'' سلامت نے کہا۔ ''روحی اپنی شخصیت کے دو ایک جارحانہ پہلوؤں سے قطع نظر بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم خوش قسمت تھے کہ اس نے تمہیں قبول کرلیا تھا لیکن یہ اس کی بد قسمتی بھی ہے کہ اس نے تمہیں قبول کرلیا تھا۔''

شارق بولا۔ ''تم نے اب بھی وہ بات صاف طور پر نہیں کہی جو تم دراصل کہنا چاہتے ہو۔''

''صحیح کہا تم نے......! سیدھی سی بات یہ ہے کہ تم اب نازیہ سے محبت کرنے لگے ہو۔''

''تو اس میں کیا برائی ہے......؟ انسان ایک سے زیادہ چیزوں سے محبت کرسکتا ہے۔''

''چیزوں سے یا لڑکیوں سے؟''

''لڑکیوں کو بھی شامل سمجھو!''

''تو تم روحی سے بھی محبت کرتے ہو اور نازیہ سے بھی......! اب کیونکہ میرے اندر ایک تلخی گھل گئی ہے اس لیے اب میں نازیہ کو میڈم نہیں کہہ رہا ہوں۔''

''تم اسے جو چاہو کہو، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے!''

''میرے سوال کا جواب دو۔ تم روحی سے بھی محبت کرتے ہو اور نازیہ سے بھی؟''

''ہاں۔'' شارق نے اعتراف کرلیا۔

''ترجیح کسے دوگے؟ میرا مطلب ہے اگر بات شادی تک پہنچ جائے تو تم کس کا انتخاب کروگے؟''

اب شارق سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''ایک وعدہ کروگے مجھ سے؟''

''کیسا وعدہ؟''

''اب میں جو کچھ کہوں گا، وہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔''

''تم نہ جانے کیا بتانے والے ہو۔ جو بات بتائی جائے اس کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے کہ اسے چھپایا جاسکتا ہے یا نہیں۔ بعض باتیں انسان کسی کو بتانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔''

''وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تم کسی کو بتانے کے لیے مجبور ہوجاؤ۔''

''اگر ایسا ہے تو میں رازداری کا وعدہ کرتا ہوں۔''

''تو پھر میرا صاف صاف جواب سن لو۔ میں نازیہ کو اپنانا چاہوں گا۔''

''وجہ؟'' سلامت نے فوراً پوچھا۔

''اسٹیٹس۔'' شارق نے کہا۔ ''نازیہ سے شادی کی صورت میں مجھے جو اسٹیٹس مل جائے گا، وہ روحی سے شادی کرکے نہیں مل سکتا۔''

''تو تم اپنا اسٹیٹس بنانے کے لیے ایک لڑکی کا دل توڑ دوگے؟ اس لڑکی کا دل جس نے تمہاری خاطر خود کو بہت بدل لیا ہے۔''

''کسی کی خاطر خود کو بدلنے والے یہ عمل اپنے لیے کرتے ہیں۔''

''شارق!'' سلامت اس کا منہ تکنے لگا۔ ''یہ تم کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، اور میں یہ بھی کہوں گا کہ معاشرے میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ کوئی کسی سے محبت کرتا ہے اور جس سے محبت کرتا ہے اسے کسی اور سے محبت ہوتی ہے۔''

''یہ تم نے ناولوں اور فلموں کی بات کی ہے۔''

''ناولوں اور فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے لیکن ایسا ہوتا ہے۔'' شارق نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ یہ بحث آگے نہ بڑھاؤ۔ ابھی تم بتا چکے ہو کہ تمہیں روحی سے محبت ہے لیکن تم فیصلہ نہیں کرسکے یا سوچ نہیں سکے کہ اس کے دل میں اپنے لیے جگہ کیسے بناؤ۔ میں تمہیں اس سلسلے میں کچھ مشورے دے سکتا ہوں۔ میں نے روحی کے دل میں جگہ اس طرح بنائی تھی کہ اس کے خیالات سے اتفاق کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ بس یہی چاہتی ہے کہ عورتوں کے حقوق مردوں کے برابر ہونے چاہئیں۔ تم اس کی بات مان لو اور کسی طرح اس کا ثبوت بھی دے دو تو اس کے دل میں تمہارے لیے جگہ بن جائے گی۔ میری طرف سے مایوس ہونے کے بعد اسے کسی سہارے کی ضرورت ہوگی۔ تم اسے وہ سہارا دے سکتے ہو۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' سلامت نے کہا اور کچھ خفگی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''میرے مشورے پر کسی وقت ٹھنڈے دل سے غور کرنا۔''

''روحی کو مایوس کب کررہے ہو؟'' سلامت نے تلخی سے پوچھا۔

''دراصل تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میں نازیہ سے شادی کب کررہا ہوں۔''

''ٹھیک سمجھے تم!''

''اس کا انحصار حالات پر ہے۔'' شارق نے جواب

دیا۔ وہ سلامت کو بھی اپنی اور نازیہ کی منصوبہ بندی سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سلامت کا اس وقت کا رویہ اسی کا متقاضی تھا کہ شارق اپنے سارے پتے اس کے سامنے کھول کر نہ رکھ دے۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' سلامت کھڑا ہوگیا۔ ''اور ہاں......! ایک بات بتاتا چلوں، بعد میں ہوسکتا ہے تم مجھ پر الزام لگادو کہ میں نے رازداری سے کام نہیں لیا۔ میرا خیال ہے کہ روحی واقف ہو چکی ہے تمہاری اور نازیہ کی قربت سے۔''

''وہ تو ابھی لاہور میں ہے!'' شارق نے جلدی سے کہا۔

''میں ابھی بتا چکا ہوں کہ میں نے جب تم دونوں پر نظر رکھی تھی تو روحی کی وہ دوست بھی تمہاری طرف متوجہ رہی تھی۔ وہی دوست جس کی کار کے ایکسیڈنٹ میں تم زخمی ہوئے تھے۔ وہ بھی روحی کو بہت کچھ بتا سکتی ہے یا شاید فون پر بتا چکی ہو۔''

شارق پریشان ہوگیا لیکن بولا۔ ''اس کا نظر آنا اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ روحی نے اس کی یہ ڈیوٹی لگائی ہو۔''

''لگا سکتی ہے۔ نازیہ سے تمہارا ملنا جلنا روحی کو پسند نہیں تھا اس لیے وہ حالات سے باخبر رہنے کے لیے ایسا کرسکتی ہے۔''

''تم مجھے پریشان کر کے جارہے ہو۔''

''تمہیں ہر پہلو سے آگاہ کر کے جارہا ہوں۔'' سلامت نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی ناراضگی صاف ظاہر تھی۔

شارق کی پریشانی ختم نہیں ہوسکی۔ اس کے دل میں آیا کہ نازیہ کو بھی فون کر کے ان باتوں سے آگاہ کردے لیکن اس سے پہلے روحی کا فون آگیا۔

''کیا آگئیں کراچی؟'' شارق نے جلدی سے پوچھا۔

''ابھی کہاں! کل آنے کا ارادہ تھا لیکن انکل کے انتقال کے بعد کچھ خاندانی مسائل کھڑے ہوگئے۔ ڈیڈ چونکہ بڑے ہیں اس لیے منصف انہیں بنادیا گیا ہے۔ اگر وہ جھگڑا جلدی نمٹ گیا تو پرسوں آجاؤں گی ورنہ شاید دو تین دن مزید لگ جائیں۔ میری عدم موجودگی سے تم اداس تو نہیں ہورہے ہو؟''

''تم خود اندازہ لگاؤ!''

''مجھے مس تو کررہے ہوگے؟'' روحی دھیرے سے ہنسی۔ ''اچھا ان کے بارے میں تو بتاؤ...... میڈم نازیہ......! ان کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہی ہوگا۔''

''کیوں! کیا یونی میں بھی آمنا سامنا نہیں ہوتا؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔ یونی کے علاوہ بھی ایک آدھ بار سرِ راہ ملاقات ہوئی ہے۔ ایک بار ان کا فون بھی آیا تھا۔ میں نے شاید تمہیں بتایا تھا کہ میں ان سے ٹینس سیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ پوچھ رہی تھیں کب سے آؤ گے سیکھنے۔''

''بہتر ہوگا کہ نہ جاؤ۔ مجھے ان خاتون کی نیت ٹھیک نظر نہیں آتی تمہارے معاملے میں۔''

''ارے نہیں! ایسا نہیں ہے بس وہ محبت کرنے والی عورت ہیں۔''

''وہ ایک الگ بات ہے۔ اچھا خیر......! میں نے بس یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ کل نہیں آسکوں گی۔ دو ایک دن کی تاخیر اور ہوسکتی ہے۔''

''میں بے چینی سے منتظر ہوں۔'' شارق نے منافقت سے کام لیا۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے ماؤتھ پیس کا بوسہ لیا گیا ہو اور پھر سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

شارق نے اطمینان کی سانس لی۔ روحی کی باتوں سے قطعی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہوگی۔

☆☆☆

دوسرے دن روحی کراچی آگئی تھی۔ اس نے یہ اطلاع فوری طور پر نہ شارق کو دی، نہ یونی کی کسی لڑکی کو بتایا۔

دوپہر قریب تھی جب ■ اپنے گھر سے نکلی اور پیدل ہی ایک طرف چل پڑی۔ روحی کا اپارٹمنٹ جس عمارت میں تھا، وہ ایک ایسی سڑک پر تھی جہاں ٹریفک برائے نام ہوتا تھا۔ ٹیکسی رکشا تو بہت مشکل سے ملتے تھے۔ بس اکا دکا کاریں آتی جاتی نظر آجاتی تھیں۔

دو تین کاریں روحی کے قریب سے گزریں لیکن روحی نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اسے اس وقت کوئی ایسی کار کی ضرورت تھی جسے کوئی نوجوان یا جوان العمر شخص چلا رہا ہو۔

آخر اسے ایک ایسی کار مل ہی گئی جو خود ہی اس کے قریب آکر رکی تھی اور اسے چلانے والے شخص کی عمر ستائیس اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی۔

''اگر آپ کسی ٹیکسی کی تلاش میں ہیں تو ■ وہ آپ کو خاصی دور جا کر ملے گی۔'' وہ کھڑکی سے سر نکال کر روحی سے بولا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں اتنا آگے تک چھوڑ دوں جہاں سے ٹیکسی مل سکے۔'' اس کی آنکھوں میں ایسی

چمک تھی جو کسی اکیلی لڑکی کو دیکھ کر مردوں کی آنکھوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

روحی کو تلاش بھی کسی ایسے ہی شخص کی تھی۔ اس نے بہت چست جینز کے ساتھ ایسی ہلکی بنیان کا انتخاب کیا تھا کہ اس کا جسم جھلک سکے۔

''زحمت ہو گی آپ کو۔'' روحی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''زحمت کیسی محترمہ! میں تو جا ہی اس طرف رہا ہوں۔''

''اچھا...... تو ...... بہت شکریہ۔'' روحی گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والے دروازے کی طرف گئی۔

نوجوان نے جلدی سے خود ہی دروازہ کھولا۔ روحی اپنا وینیٹی بیگ سنبھالتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔

نوجوان فوراً ہی کار حرکت میں لے آیا۔

''میں اس وقت بالکل فارغ ہوں۔'' وہ بولا۔ ''بس یوں ہی تفریحاً نکل پڑا تھا اس لیے آپ کو آپ کی منزل تک بھی پہنچا سکتا ہوں۔ ٹیکسی کی ضرورت نہیں۔''

''مہربانی آپ کی۔'' روحی نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں کل ہی باہر سے آئی ہوں۔ دو ایک دوستوں سے ملنا ہے اور انہیں چھوٹے موٹے تحائف دینے ہیں۔''

''یہ بتایئے کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟''

روحی نے یوں ہی ایک پتا بتا دیا جو سات آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔

''مجھے خوشی ہو گی آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا کر۔'' نوجوان بولا۔

''آپ کی اس کرم نوازی کے لیے مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔''

''آپ کیا کرنا چاہیں گی؟'' نوجوان نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ذرا اس طرف کار روکیے۔'' روحی نے کہا۔

نوجوان نے کوئی سوال کیے بغیر کار وہیں روکی جہاں روحی رکوانا چاہتی تھی۔ اس جگہ مکمل سناٹا تھا۔ روحی نے اپنے وینیٹی بیگ سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی دوستوں کے لیے چند چھوٹے موٹے تحفے لائی تھی، اس میں سے ایک آپ کی نذر ہے۔''

''اوہ، شکریہ......! کیا ہے اس میں؟'' نوجوان نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کھول کر دیکھ لیجیے......! ایک معمولی سا رومال ہے لیکن ہے خوب صورت۔''

نوجوان نے لفافے سے رومال نکالا۔

''یہ کچھ نم ہے۔'' وہ بولا۔

''سینٹ میں بھیگا ہوا ہے۔ اس کی خوشبو آپ کو پسند آئے گی۔''

نوجوان نے فوراً رومال اپنی ناک کے قریب لے جا کر ناک سے ایک لمبی سانس لی اور دوسری سانس لینے سے پہلے ہی ایک طرف لڑھک گیا۔

نوجوان کے بے ہوش ہوتے ہی روحی بہت تیزی سے حرکت میں آئی۔ دروازہ کھول کر اتری اور نوجوان کو دوسری سیٹ پر دھکیلا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ روحی اسے فوراً حرکت میں لائی اور... بہ مشکل ایک میل آگے جا کر اسے ایک گلی میں موڑا۔

وہ اپنے علاقے کے کوچے کوچے سے واقف تھی۔ اس گلی میں بالکل ہی سناٹا رہتا تھا۔

روحی نے انجن بند کر کے وینیٹی بیگ سے ایک ڈوری نکالی اور نوجوان کے ہاتھ پیر ایک مخصوص انداز میں اتنی کس کر باندھنے لگی کہ وہ کسی طرح بھی خود کو آزاد نہ کرا سکے۔

اسے باندھنے کے بعد روحی نے وینیٹی بیگ سے ایک چوڑا ٹیپ نکالا جو اس نے نوجوان کے ہونٹوں پر چپکانے سے پہلے اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس دیا جو اسے کار ہی میں مل گیا تھا۔ اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے اس نے ساری تیاری مکمل کر لی تھی۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے اس نوجوان کے ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا۔ روحی کو ضرورت بھی اتنے ہی وقت کی تھی لیکن کچھ دیر لگ جانے کا اندیشہ بھی تھا۔ اسی اندیشے کے تحت اس نے نوجوان کو پوری طرح بے بس کر دیا تھا۔ ہوش میں آنے پر وہ ہلکی ہلکی آوازیں تو نکال سکتا تھا لیکن چیخ نہیں سکتا تھا۔ روحی نے کار کے شیشے بھی بند کر دیے تا کہ ہلکی سی آواز بھی کار کے باہر نہ جا سکے۔

یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اس نے انجن بند کر دیا تھا۔ اب پھر اسٹارٹ کیا اور کار کو ریورس میں ڈال کر گلی سے باہر لے آئی۔ معمولی رفتار سے کار چلاتے ہوئے اس نے موبائل پر شارق سے رابطہ کیا۔

''اوہ! آ گئیں تم؟'' شارق فوراً بولا۔

''ہاں۔'' روحی نے کہا۔ ''وہ جھگڑا رات ہی میں نمٹ گیا تھا۔ میں گیارہ بجے کی فلائٹ سے آ گئی۔ ڈیڈ اور مام شام کی فلائٹ سے آئیں گے۔ میں اس وقت جلدی میں

ہوں۔ دو کاموں کی وجہ سے آئی تھی۔ ایک تو ابھی کرنے جارہی ہوں۔ اس سے نمٹ کر تم سے ملنے آؤں گی۔ میڈم کے گھر ملنا۔ ایک گھنٹے کے اندر آجانا، یا اس سے بھی پہلے۔"

"میڈم کے گھر کیوں؟" شارق چونکا۔

"آج وہ یونی نہیں آئی ہیں نا۔ گھر پر ہی ہوں گی۔ میں یونی تو نہیں گئی لیکن فون کرنے سے معلوم ہوگیا تھا۔"

"میڈم ہی کے گھر کیوں؟" شارق نے بے چینی سے دوبارہ کہا۔

"میں اس وقت جلدی میں ہوں۔" روحی نے اس کی بات کاٹی۔ "وضاحت میں وقت نکل جائے گا۔ ہوسکتا ہے میں آدھے گھنٹے میں آجاؤں۔ پہلے میں نے غلط کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں آجاؤ۔ تم جلدی آؤ۔ آدھے گھنٹے میں پہنچو۔ مجھے پانچ دس منٹ کی تاخیر ہوسکتی ہے۔"

روحی نے مزید کچھ کہے سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بڑی گمبھیرتا تھی۔ یونیورسٹی سے کچھ ہی فاصلہ رہ گیا تھا جب اس نے موبائل پر فرزانہ سے رابطہ کیا۔

"ہیلو!" فرزانہ کی آواز آئی۔ اس کے پاس روحی کا نمبر نہیں تھا۔ اس کا نمبر روحی نے کسی طرح حاصل کرلیا تھا۔

"میں روحی بول رہی ہوں۔"

"اوہ!" فرزانہ چونکی، پھر طنزیہ انداز میں بولی۔ "زہے نصیب!"

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"کلاس میں تھی۔ فون بند رکھنا پڑتا ہے۔ ابھی کلاس سے نکل کر کھولا ہی تھا کہ تمہاری کال آگئی۔ یاد کرنے کا مقصد؟"

"سیڑھیوں تک آجاؤ۔"

"کیوں؟"

"میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔"

"خوب! دماغ ٹھکانے آگیا؟"

"پلیز! میرا مذاق نہ اڑاؤ۔"

"میں اپنے ساتھ بھی کئی لڑکیوں کو لاؤں گی۔ ان کے سامنے معافی مانگنی ہوگی۔"

"میں تیار ہوں۔"

"تو میں آرہی ہوں۔"

روحی نے موبائل بند کیا اور کار روک دی۔ وہ یونیورسٹی کے بہت قریب تھی۔ کار چھوڑ کر وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ یونیورسٹی میں داخل ہوکر اس نے خود کو ایک ایسی جگہ آڑ میں کھڑا کیا جہاں سے وہ.... سیڑھیوں پر نظر رکھ سکے۔

منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ فرزانہ کئی لڑکیوں کے ساتھ سیڑھیوں پر دکھائی دی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔

روحی نے دانت پیس کر فرزانہ کا نشانہ لیا اور پے در پے دو گولیاں چلادیں۔ اس نے فرزانہ کو گرتے دیکھا لیکن مزید کچھ دیکھنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ ریوالور وینٹی بیگ میں رکھ کر...... باہر کی طرف بھاگی۔

گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" یونیورسٹی کے ایک چوکیدار نے گھبرائے ہوئے لہجے میں روحی سے پوچھا۔

"فرزانہ کو گولی لگی ہے۔" روحی نے گھبراہٹ ظاہر کی۔ "ایمبولینس سینٹر قریب ہی ہے۔ میں ایمبولینس لینے جارہی ہوں۔"

وہ وہاں سے نکل آئی۔ چشم زدن میں وہ کار کے پاس تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار دوڑادی۔

دو ایک موڑ لینے کے بعد اس نے فرزانہ کے ڈی ایس پی باپ سے رابطہ کیا۔

"روحی بول رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ "کیا تمہیں خبر دے دی گئی؟"

"کیسی خبر، اس فون کا مقصد؟"

"تم ہی نے شاید کہا تھا کہ اپنے دشمن کو جان سے ماردینا کوئی انتقام نہیں ہے۔ انتقام تو یہ ہے کہ اسے اذیت میں ڈالو۔"

"اس بکواس کا مقصد؟" درشت لہجے میں کہا گیا۔

"تم نے مجھے اپنی باتوں سے ذلیل کیا تھا اور میں نے قسم کھائی تھی کہ اس کا انتقام لے کر رہوں گی۔ وہ میں نے لے لیا ہے، تمہیں زندگی بھر کے لیے اذیت میں ڈال چکی ہوں۔ یونی کی خبر لو۔ وہاں تمہاری بیٹی کی لاش پڑی ہوگی۔"

"کیا!" ڈی ایس پی بوکھلا گیا۔

"فرزانہ سے مجھے کوئی دشمنی نہیں تھی کہ اسے جان سے مارتی۔ یہ صرف تم سے انتقام ہے میرا۔"

پھر اس نے ڈی ایس پی کی کوئی اور بات سنے بغیر رابطہ منقطع کردیا۔

کار کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے قریب پڑے ہوئے نوجوان پر نظر ڈالی جو اب بھی بے ہوش تھا۔

نازیہ کے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک اور سڑک پر اس نے کار چھوڑ دی اور تیزی سے نازیہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

☆☆☆

شارق اور نازیہ خاصے پریشان بیٹھے تھے۔ شارق نے اسے بتادیا تھا کہ وہ روحی کے کہنے پر اس وقت اس کے

گھر آیا ہے۔

''دماغ تھک رہا ہے سوچتے سوچتے۔'' نازیہ نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اس نے آخر تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آرہا ہے۔''

کئی منٹ سے ان دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہورہی تھیں۔

''اس کا لہجہ کیسا تھا تم سے بات کرتے ہوئے؟'' نازیہ نے پوچھا۔

''بالکل نارمل۔''

اسی وقت ایک ملازم نے آکر روحی کی آمد سے باخبر کیا۔ اس سے پہلے کہ نازیہ اس سے کچھ کہتی، روحی اندر گھستی چلی آئی۔ ملازم اس کا اور نازیہ کا منہ تکتا رہ گیا۔

''میں جلدی میں ہوں اس لیے اجازت کا انتظار نہیں کرسکی۔'' روحی بولی۔

نازیہ نے ملازم کو جانے کا اشارہ کیا۔

''بات کیا ہے روحی؟'' شارق بولا۔

لیکن روحی نے اسے جواب دینے کے بجائے نازیہ سے کہا۔ ''میں شارق سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں میڈم!''

''ہاں ہاں! تمہارا دوست ہے۔ تمہیں حق ہے اس سے تنہائی میں بات کرنے کا۔'' نازیہ نے جواب دیتے ہوئے اٹھنا چاہا۔

''نہیں نہیں۔'' روحی جلدی سے بولی۔ ''آپ یہیں بیٹھیں...... میں اور شارق اس کمرے میں چلے جائیں گے جہاں آپ نے چند روز اپنے شاگرد کو مہمان رکھا تھا۔''

شارق بول پڑا۔ ''وہی کمرا آخر کیوں؟''

''اس وقت میری کوئی بات مسترد نہ کرو۔'' اس مرتبہ روحی کے لہجے میں سختی تھی۔

''ہاں ہاں!'' نازیہ نے شارق سے کہا۔ ''اس کمرے میں چلے جاؤ۔ اس میں حرج کیا ہے؟''

اس وقت شارق نے خود کو نروس محسوس کیا۔ اسے روحی کا انداز جارحانہ معلوم ہورہا تھا۔ یہ بات نازیہ نے بھی ضرور محسوس کی ہوگی۔

شارق کے ساتھ روحی اس کمرے میں پہنچی۔

''کیسے گزرے یہ دن؟'' روحی نے پوچھا۔ وہ نہ تو خود بیٹھی تھی، نہ اس نے شارق سے بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔

''کیسے گزرتے روحی...... جیسے گزر رہے تھے ویسے ہی گزرے۔''

''میرا خیال ہے کہ ویسے نہیں گزرے۔''

''تم اس وقت نہ جانے کس موڈ میں ہو اور کیسی باتیں کررہی ہو۔''

''میں تم سے سچ سننا چاہتی ہوں لیکن تم سچ بولو گے نہیں۔''

''کیوں! میں سچ کیوں نہیں بولوں گا؟''

''اس لیے کہ ایسے سچ بولنے کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔''

''اس لیے نہیں آرہی ہوں گی کہ تمہارے دل میں چور ہے۔''

''میرے دل میں کیا چور ہوگا؟''

''یہ دن اس طرح نہیں گزرے جیسے گزرتے تھے۔''

''شاید کسی نے تمہیں کوئی الٹی سیدھی اطلاع دے دی ہے۔''

''ہاں اطلاع تو دی ہے لیکن زبانی نہیں۔'' روحی نے اپنے وینٹی بیگ سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ ''تصویری اطلاعات ہیں۔''

اس نے لفافہ شارق کی طرف پھینکا۔ لفافہ بند نہیں تھا اس لیے اس میں جو تصویریں تھیں وہ ادھر ادھر فرش پر بکھر گئیں۔

شارق کا چہرہ فق پڑ گیا۔ اس کی نظر ایک ایسی تصویر پر پڑی تھی جس میں وہ اور نازیہ ایک ڈھابے پر پائے کھا رہے تھے۔

''سب تصویریں دیکھو!'' روحی نے بہ ظاہر سکون سے کہا لیکن اس سکون کی تہ میں ایک سمندر بپھرا ہوا تھا۔

شارق تصویریں اٹھا کر دیکھنے کے بجائے روحی کا منہ تکنے لگا۔

''یہ وفاداری دکھائی ہے تم نے میرے ساتھ؟'' روحی بولی۔

شارق نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور کچھ بے باکی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ''دیکھو روحی...... ! حالات کے دھارے بدلتے رہتے ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ان دنوں میں نازیہ کے بہت قریب ہوگیا تھا۔''

''تھوڑی ہی دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ دن اسی طرح گزرے جس طرح گزرتے رہے ہیں۔''

''میں چاہتا تھا کہ تمہیں اطمینان سے بتاؤں اور سمجھاؤں۔''

''خوب!'' روحی کے لہجے میں زہر بجھا ہوا تھا۔ ''میں اتنی چھوٹی سی بچی ہوں کہ تم مجھے سمجھاؤ گے۔ مجھ سے جھوٹ نہ

بولو۔ اس وقت مجھ پر خون سوار ہے۔ ابھی میں ڈی ایس پی سے بھی اپنا انتقام لے کر آ رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' شارق چونکا۔

''جہنم میں جھونکو اس موضوع کو..... یہ بتاؤ، تمہیں ہاکس بے یاد ہے.....؟ کچھ عہد و پیماں ہوئے تھے ہمارے!''

''دیکھو روحی.....! اس معاشرے میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ تم سے شادی کر کے مجھے وہ سوشل اسٹیٹس نہیں مل سکتا جو نازیہ سے شادی کرنے کے بعد ملے گا۔''

''سوشل اسٹیٹس!'' روحی نے دانت پیسے۔ ''اور کسی وعدے کی کوئی اہمیت ہی نہیں.....؟''

''بہتر ہوگا کہ ہم بیٹھ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ.....''

''ٹھنڈا دماغ!'' یہ کہتے ہوئے روحی اچھلی اور اس کی فلائنگ کک شارق کے سینے پر پڑی۔

شارق ڈگمگاتا ہوا پیچھے ہٹا اور پھر گر ہی پڑا۔

''سیدھی طرح اپنے جرم کا اعتراف کرتے جاؤ!'' روحی غرائی۔ ''مجھ پر اس وقت خون سوار ہے۔ جی چاہ رہا ہے کہ تمہارا قیمہ کر ڈالوں..... میں نے ہاکس بے پر تم سے کہا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں وحشی ہو جاؤں گی۔''

شارق کوشش کر کے کھڑا تو ہو گیا لیکن اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور وہ اب خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ شروع میں اسے گمان تک نہ تھا کہ روحی اس حد تک آپے سے باہر ہو جائے گی۔

''اب میں صرف وحشی ہوں تمہارے لیے۔'' روحی نے دانت پیسے اور وینٹی بیگ سے ریوالور نکال لیا۔

''نہیں..... نہیں..... روحی..... پلیز!'' شارق گڑگڑایا۔

''دو گولیوں سے میں فرزانہ کو ٹھنڈا کر کے آئی ہوں لہٰذا اس ریوالور میں ابھی گولیاں باقی ہیں جو میں تمہارے سینے میں اتار دینا چاہتی ہوں۔''

یہ بات سن کر تو شارق کا چہرہ بالکل ہی سفید پڑ گیا۔

''قتل..... قتل کر کے..... آئی ہو تم؟'' وہ کسی حد تک ہکلا گیا۔

''ہاں! ڈی ایس پی سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی میں نے! فرزانہ کو ختم کر کے میں نے انتقام لے لیا ہے اور اب.....''

''روحی!'' شارق کی آواز کانپ گئی۔ ''تمہیں محبت کا واسطہ جو تمہیں مجھ سے تھی۔''

''تھی نہیں۔'' روحی کی آواز بھرا گئی۔ ''اسی محبت کی خاطر میں نے خود کو اتنا بدلا تھا لیکن حماقت کی تھی میں نے۔

سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے تم ہو۔'' روحی کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ ''اپنی اس غلطی کا انتقام آخر میں کس سے لوں؟''

''بعض معاملات..... بعض..... ایسے بھی..... ایسے بھی ہوتے ہیں..... جن کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا..... چھوڑ دیا..... چھوڑ دیا جاتا ہے۔'' شارق کی سانس لینے کی رفتار بڑھ گئی تھی۔

''وقت تو آ گیا ہے شارق.....! فرزانہ کا قتل ہی مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جائے گا..... ہمیشہ کے لیے..... یا..... لہٰذا..... لہٰذا۔'' روحی کی آنکھوں سے اب باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔ تم سے محبت مجھے بہت مہنگی پڑی ہے..... لیکن تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ یہاں آتے وقت سوچا تھا کہ تم سے بہت برا سلوک کروں گی لیکن اب محسوس ہو رہا ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ نازیہ سے تو مجھے کوئی شکایت ہی نہیں ہے۔ وہ میری ہے ہی کون کہ مجھے اس سے شکایت ہو۔ شکایت تو ان سے ہوتی ہے جو اپنے ہوں یا جن کو اپنا بنا لیا جائے یا اپنا سمجھ لیا جائے۔ تمہیں میں نے اپنا سمجھ لیا تھا۔ اس غلطی کی سزا تو مجھے ہی ملنی چاہیے۔''

روحی نے ریوالور کی نال اپنے منہ میں رکھ لی۔

''نہیں۔'' شارق چیخا۔ ''ایسا نہ کرو روحی!''

لیکن فائر ہو گیا۔ روحی گر پڑی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اس کے قریب ہی فرش پر گر گیا۔

شارق نے جھپٹ کر بھی اسے اس اقدام سے باز رکھنا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی وہ ہو گیا جو شارق کے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔

روحی فوراً ہی بے حس و حرکت ہو گئی تھی۔

شارق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے جھک کر فرش سے ریوالور اٹھایا اور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔

''قربانی دینے والی! میں بھی تمہارے پاس آ رہا ہوں۔''

فائر کی آواز نازیہ نے لان میں سنی تھی۔ وہ روحی اور شارق کے معاملے میں کچھ گڑبڑ محسوس کرتے ہوئے گھبراہٹ میں لان میں نکل آئی تھی اور بے چینی سے ٹہل رہی تھی کہ فائر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ نازیہ پاگلوں کی طرح دوڑ کر گھر میں داخل ہوئی اور اس کمرے کی طرف لپکی لیکن وہ کچھ نہ کر سکی۔

دوسرا فائر ہو چکا تھا۔

⌘⌘⌘